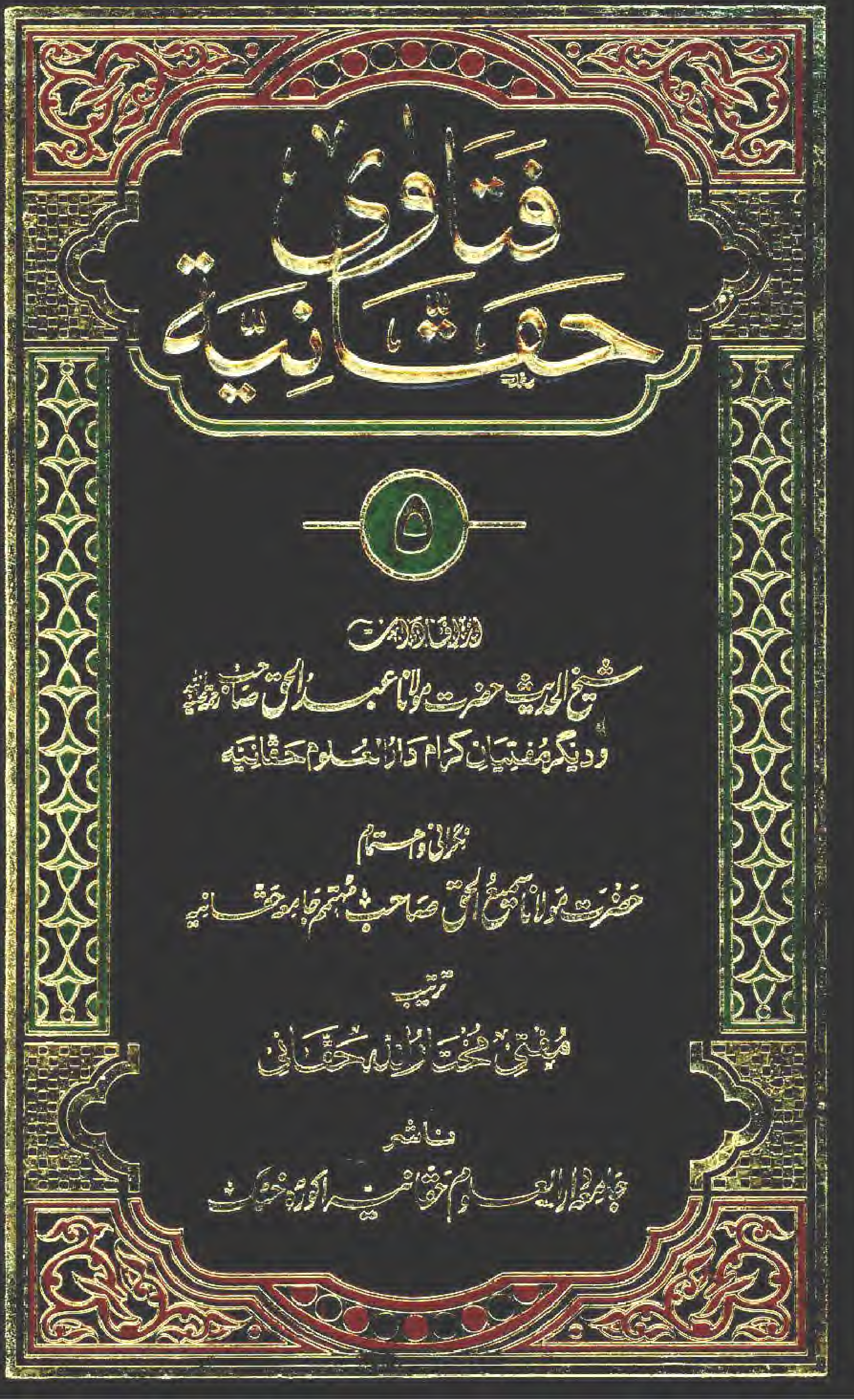

فتاویٰ حقانیہ

۵

از افادات و ہدایات

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

و دیگر مفتیانِ کرام دار العلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ

ترتیب

مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر

جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه (الآية)

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے نصف صدی کے فتاوی کا مجموعہ

فتاوی حقانیہ

جلد پنجم

افادات
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیان کرام
جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نگرانی واہتمام
مولانا سمیع الحق مہتمم و استاذ حدیث
جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ترتیب مفتی مختار اللہ حقانی

شائع کردہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ پاکستان

(جملہ حقوق واشاعت وطباعت بحق ادارہ محفوظ ہیں)

نام کتاب .... فتاوی حقانیہ (جلد پنجم)

افادات .... شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ ودیگر مفتیان کرام جامعہ ہذا

نگرانی واہتمام .... شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، مہتمم جامعہ ہذا

ترتیب .... مولانا مفتی مختار اللہ حقانی استاذ شعبہ التخصص فی الفقہ والافتاء

ضخامت .... ۵۵۰ صفحات

تاریخ طبع ہفتم ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

طابع .... مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
Mob:0300-4572899

ناشر .... جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

فہرست مضامین جلد پنجم

عنوانات	صفحہ	عنوانات	صفحہ
کتاب النفقات	۲۳	خاوند سے ناراض ہو کر باپ کے گھر گذارے ہوئے سالوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں	۲۹
بیوی کا علاج کرانا خاوند پر لازم نہیں	۲۳	چھوٹے بچے کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے	۳۰
والدین کے نان ونفقہ کا حکم	۲۴	زچہ بچہ کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے	۳۰
بالغ اولاد کے نفقہ کا حکم	۲۴	نادار والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے	۳۱
عدت کے دوران بیوہ کے اخراجات کا حکم	۲۴	باپ کی وفات کے بعد بچے کے نفقہ کا حکم	۳۱
چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے	۲۵	کتاب الأیمان والنذر	۳۲
والدین کے گھر رہنے کی صورت میں نفقہ کا حکم	۲۵	یمین منعقدہ کا حکم	۳۲
معذور اولاد کے نفقہ کا حکم	۲۶	حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام کرنیکا حکم	۳۲
ناراضگی کے ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں	۲۷	اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یمین ہے یا نہیں	۳۳
نافرمان عورت کا خرچہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں	۲۷	قرآن مجید کی قسم کھانے کا حکم	۳۴
ناچاقی کے باوجود شوہر پر اہل وعیال کا خرچہ لازم ہے	۲۸	ہزار روزے رکھنے کی قسم کھانے کا حکم	۳۵
نامرد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے	۲۸	فلاں مسجد میں نماز پڑھلوں تو کافر ہوں گا	۳۵
فاحشہ اور بدکردار بیوی کے نفقہ کا حکم	۲۹		

عنوانات	صفحہ	عنوانات	صفحہ
اگر عمر سے بات کروں تو ماں سے زنا کروں قسم نہیں	۳۶	کسی گناہ سے توبہ کرنا قسم نہیں	۴۹
		کفارہ یمین میں بیس مساکین کو دو وقت کھانا کھلانا	۵۰
بھائی کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھانا	۳۷	غیر اللہ پر قسم کھانے کا حکم	۵۰
محمد رسول اللہ ﷺ کا امتی نہ ہونے کی قسم کھانا	۳۷	وما اہل بہ لغیر اللہ سے کیا مراد ہے	۵۱
کلمہ توحید پڑھنے سے قسم کے انعقاد کا حکم	۳۸	ایصال ثواب کی نذر کی شرعی حیثیت	۵۳
آسمانی کتابوں سے بری ہونے کی قسم کھانا	۳۸	**کتاب الوقف**	۵۵
کسی دینی مصلحت کے لیئے قسم توڑنا	۳۹		
کفارات یمین میں تداخل کا حکم	۳۹	مسجد کے لیے وقف زمین پر دعوی ارث نہیں چلتا	۵۵
کفارہ قسم ادا کرنے کا طریقہ	۴۰	موقوفہ زمین کو فروخت کرنے کا حکم	۵۵
کھانا کھلانے میں تسلسل کا حکم	۴۰	باغ کے میوہ کو وقف کرنے کا حکم	۵۶
کفارہ کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے	۴۱	وقف سے رجوع کرنے کا حکم	۵۶
کفارہ یمین ایک شخص کو دینے کا حکم	۴۱	موقوفہ زمین میں امام مسجد کے لئے مکان بنانے کا حکم	۵۷
ناذر کا نذر سے کچھ کھانے کا حکم	۴۲		
نذر مانی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرنے کا حکم	۴۳	عیدگاہ میں کھیلنا جائز نہیں	۵۷
نذر کی پیشگی ادائیگی	۴۳	موقوفہ زمین میں عشر ادا کرنا ضروری ہے	۵۸
نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم	۴۴	موقوفہ زمین پر ملکیت کا دعوی کرنیکا حکم	۵۹
نذر کی ہوئی گائے کے منافع کا حکم	۴۴	موقوفہ قبرستان میں مردے دفنانے سے منع کرنیکا حکم	۵۹
نذر کا دارومدار الفاظ پر ہے	۴۵		
منذور روزوں میں عدم تسلسل کا حکم	۴۶	وقف میں واقف کی شرائط معتبر ہونیکا حکم	۶۰
نابالغ بچے کی نذر کی شرعی حیثیت	۴۶	طلباء کیلئے مخصوص وقف کا حکم	۶۱
منذور چیز نہ ملنے پر اسکے قائم مقام کا حکم	۴۷	شاملات دیہہ زمین کے وقف کا حکم	۶۱
نذر مطلق واجب التراخی ہے	۴۸	قاضی کے لیئے استبدال وقف جائز ہے	۶۲
درود شریف کی نذر ماننے کا حکم	۴۸	مشترکہ جائیداد بلا تقسیم مسجد کیلئے وقف کرنا	۶۲
بیٹا نے باپ سے نہیں ہونگا کہنے کی شرعی حیثیت	۴۹	قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنیکا حکم	۶۳

عنوانات	صفحہ
وقف مشاع کی خرید و فروخت کرنیکا حکم	۶۴
مغصوبہ جائیداد کی آمدنی مساجد کی تعمیر کے لئے وقف کرنے کا حکم	۶۴
پرانے قبرستان پہ مدرسہ تعمیر کرنیکا حکم	۶۵
جنازگاہ میں کنواں کھودنا جائز ہے	۶۵
ہبہ کے لفظ سے وقف کرنے کا حکم	۶۶
عیدگاہ میں ہسپتال بنانے کا حکم	۶۶
واقف کی شرط کے اعتبار کا حکم	۶۷
قبرستان کے لئے موقوفہ زمین میں تصرف کرنا	۶۸
جنازگاہ سے راستہ جدا کرنے کا حکم	۶۹
وقف غیر تام کے استبدال کا حکم	۶۹
وقف کے مملوک ہونے کا حکم	۷۰
موقوفہ زمین میں فلش بنانے کا حکم	۷۰
موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہ ہونے کا حکم	۷۱
متروکہ جائیداد میں وقف پہ اقرار کا حکم	۷۲
باب المساجد	۷۳
وقف کی یادداشت لکھنے کا حکم	۷۳
مسجد کے لئے موقوفہ زمین پہ دکانیں تعمیر کرنے کا حکم	۷۳
ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پہ مسجد بنانیکا حکم	۷۴
مسجد کی زمین سے ملک کے زائل ہونے کا حکم	۷۵
منہدم مسجد کی تبدیل کا حکم	۷۵
ارض مغصوبہ پہ مسجد بنانے کا حکم	۷۶
موقوفہ زمین کو مسجد کے مصالح میں استعمال کرنے کا حکم	۷۷
مسجد کی زمین پہ گھر بنانے کا حکم	۷۷
مسجد سے پرندوں کے گھونسلے اتارنے کا حکم	۷۸
مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کا حکم	۷۸
مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے میں بانی مسجد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے	۷۹
غیر آباد مسجد کی زمین زراعت کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں	۸۰
مسجد کے لئے موقوفہ مکانات میں سے تبلیغی حضرات کیلئے مکان وقف کرنیکا حکم	۸۰
مسجد کے لئے وقف شدہ کوٹھڑی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی	۸۱
قبرستان کے لئے وقف شدہ زمین پر جنازگاہ بنانے کا حکم	۸۱
مسجد کے لئے وقف شدہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا	۸۲
مسجد کے لئے موقوفہ زمین کے درختوں کا حکم	۸۳
پرانے قبرستان پہ مسجد بنانے کا حکم	۸۳
مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم	۸۴
طریق عام کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم	۸۴
مسجد کی زمین پہ ڈاکخانہ بنانے کا حکم	۸۵
مسجد میں خیاطت کرنیکا حکم	۸۶

عنوانات	صفحہ
متولی مسجد اور اہل محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیرات میں تصرف کرنا	۸۶
بانی مسجد کے لئے لوگوں کو مسجد سے منع کرنا ناجائز ہے	۸۷
ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر خرچ کرنے کا حکم	۸۷
مسجد کی چھت کی پرانی چادروں کا حکم	۸۸
متولی مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم	۸۹
مسجد کا پنکھا گھر میں استعمال کرنا جائز نہیں	۸۹
مسجد میں نکاح پڑھانے کا حکم	۹۰
ذکرواذکار اور نماز میں مشغول لوگوں کو سلام کرنے کا حکم	۹۰
مسجد میں تھوکنے کا حکم	۹۱
مسجد کے لئے موقوفہ زمین پر پیش امام کا تصرف کرنا	۹۱
ایک مسجد کی موجودگی میں دوسری مسجد تعمیر کرنا	۹۲
مسجد کے بعض حصہ کو سڑک میں شامل کرنا	۹۳
مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا	۹۳
سرکاری زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا	۹۴
مسجد کے وسیع ہونے کا حکم	۹۵
مسجد میں گم شدہ چیزوں کے اعلان کا حکم	۹۵
مسجد کی جائیداد موقوفہ پر دعوی ارث	۹۶
مسجد میں کھانے پینے کا حکم	۹۷
مدرس کو مسجد کے فنڈ سے اجرت دینا	۹۷

عنوانات	صفحہ
مسجد میں رہائش پذیر طلباء کا مسجد کی چیزوں کو استعمال کرنا	۹۸
عارضی مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں	۹۸
معتکف کا مسجد میں ہوا خارج کرنا	۹۹
مسجد کا پانی گھر لے جانا	۱۰۰
مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دینا	۱۰۰
مسجد کے فنڈ سے امام کیلئے مکان بنانا	۱۰۱
دو مساجد کا قریب قریب ہونا	۱۰۲
مسجد میں آنے سے منع کرنا	۱۰۲
مسجد میں گوبر کا استعمال	۱۰۳
ویران مسجد کا حکم	۱۰۳
مسجد شرعی کا تبادلہ	۱۰۴
مسجد میں کسی کے لئے جگہ متعین کرنا	۱۰۵
مسجد کے باغیچہ پر چھت ڈالنا	۱۰۵
متولی مسجد کا بغیر اذن چندہ دہندگان کے اجرت لینا	۱۰۶
مسجد میں ٹیپ ریکارڈر لانا	۱۰۷
بوقت ضرورت متولی کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا	۱۰۸
مسجد کے لئے باقاعدہ وقف سے ملکیت کا زائل ہونا	۱۰۸
عورتوں کا مسجد میں آنا	۱۰۹
مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم	۱۱۰
مصالح مسجد کیلئے موقوفہ زمین کا حکم	۱۱۰

عنوانات	صفحہ
مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا حکم	۱۱۱
مسجد کے ہوتے ہوئے مندر میں نماز پڑھنا	۱۱۲
قدیم مسجد کی جگہ نئی مسجد میں نماز پڑھنا	۱۱۳
مسجد میں حوض بنانا	۱۱۴
دکانوں پر مسجد بنانے کا حکم	۱۱۴
مسجد کے متولی کی شرعی حیثیت	۱۱۵
کعبۃ اللہ کی ایسی تصاویر جن میں انسانوں کی تصاویر بھی ہوں مسجد میں آویزاں کرنا	۱۱۵
مسجد پر قبضہ کی شرعی حیثیت	۱۱۶
مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے درمیان میں آنے کا حکم	۱۱۷
مسجد کی دکان پر مدرسہ تعمیر کرنا	۱۱۸
مسجد میں رقص و سرور	۱۱۸
عیدگاہ پر مسجد بنانا	۱۱۹
مسجد میں سوال کرنے کا حکم	۱۱۹
مساجد میں نمازی کی توجہ متأثر کرنے والی زینت کا حکم	۱۲۰
مسجد کے درخت اور پھلوں کا حکم	۱۲۰
امام کا مسجد کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا	۱۲۱
مسجد بنانے کے ارادے سے وہ جگہ شرعی مسجد نہیں بنتی	۱۲۲
مسجد کی ضرورت سے زائد اشیاء کی فروخت کا حکم	۱۲۲
مسجد کے چندہ کو کسی شرط سے معلق کرنا	۱۲۳

عنوانات	صفحہ
مسجد کے نیچے دکانیں بنانا	۱۲۴
منبر کو محراب کے دائیں جانب رکھنا	۱۲۵
مسجد کی آمدنی سے تجارت کا حکم	۱۲۵
مسجد کے درخت کی ملکیت کا حکم	۱۲۶
مساجد میں تعویذ فروشی کا حکم	۱۲۶
مسجد کے ساتھ متصل کمروں میں سونے کا حکم	۱۲۷
قبلہ کی تحقیق	۱۲۸
مسجد کی چھت پر بیت الخلاء بنانا	۱۲۹
مسجد کے نیچے آتش خانہ بنانا	۱۳۰
مسجد کے متصل غسل خانہ بنانا	۱۳۰
مسجد کی آمدنی کیلئے بینک میں کھاتہ کھولنا	۱۳۱
مسجد پر وقف شدہ مال کو واپس لینا	۱۳۲
مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا	۱۳۳
مسجد کے ساتھ متصل زمین کو جبراً مسجد کے لئے لینا	۱۳۳
کس برش کا استعمال مسجد میں جائز ہے	۱۳۴
عوام کی ضرورت کے لئے مسجد کو مسمار کرنا	۱۳۵
مسجد کے لئے زمین دینے کا وعدہ کرنا	۱۳۶
مسجد میں چارپائی بچھا کر سونا	۱۳۶
مسجد کے لئے وقف شدہ زمین اور عرفی سیری کی شرعی حیثیت	۱۳۷
غیر مسلم کے اموال کو جبراً مسجد پر خرچ کرنا	۱۳۸
بوقت ضرورت وقف کا تبادلہ جائز ہے۔	۱۳۹

عنوانات صفحہ
جدید قبرستان میں مسجد بنانا ۱۴۰
مندر سے مسجد بنانا ۱۴۰
مسجد میں آنے سے منع کرنا ۱۴۱
مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنا ۱۴۲
مسجد کی زمین کا تبادلہ ۱۴۲
مساجد میں سکول کھولنا ۱۴۳
مسجد کی تعمیر میں قادیانیوں کی شرکت ۱۴۴
مسجد کے لئے موقوفہ زمین کی فروخت ۱۴۵
مسجد کی زمین کا باقاعدہ وقف نہ ہو تو وہ شرعی مسجد نہیں ۱۴۶
مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی ۱۴۷
مسجد کے فنڈ سے معاوضہ دینا ۱۴۸
مسجد کی خرید وفروخت کا عدم جواز ۱۴۸
عیدگاہ میں کھیل کود اور اسے راستہ بنانے کا حکم ۱۵۰
جنوبی افریقہ کی قدیم مساجد ومدارس کا حکم ۱۵۲
کتاب الحدود والتعزیرات ۱۵۹
حدود جاری کرنا حکام کا حق ہے ۱۵۹
کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت ۱۵۹
زنا کا جرم ثابت ہو جانے پر حد جاری کرنے کا حکم ۱۶۰
نابالغہ سے زنا بالجبر کا حکم ۱۶۱
حقیقی بیٹی سے زنا کرنے کی سزا ۱۶۱

عنوانات صفحہ
پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا ۱۶۲
قابل تعزیر سرقہ کی مقدار ۱۶۳
سارق کے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنے کا حکم ۱۶۳
مزارات سے قیمتی اشیاء چرانے کا حکم ۱۶۴
رہزن کو قتل کرنے کا حکم ۱۶۴
مفسد کو سزا دینے کا حکم ۱۶۵
چارپائے کے ساتھ بدفعلی پر تعزیر کا حکم ۱۶۵
بیوی کو وطی فی الدبر کے لئے مجبور کرنے کا حکم ۱۶۶
جادوگر کی سزا کا حکم ۱۶۷
فاسق سے ترک موالات کا حکم ۱۶۷
اغلام بازی کی سزا ۱۶۸
مردہ عورت سے وطی کرنا موجب تعزیر ہے ۱۶۸
والدین کی بے ادبی کرنے والے کی سزا ۱۶۹
نابالغ قاتل کو تعزیراً سزا ۱۷۰
شاگرد کو سزا اور تعزیر دینے کا حکم ۱۷۰
بیوی کو بدفعلی کی بناء پر قتل کرنا ۱۷۱
جنگل سے جانور چوری ہونے کی صورت میں حد کا حکم ۱۷۱
سکول کالج میں طلباء کو جرمانے کا حکم ۱۷۲
فصل کو نقصان پہنچانے پر جرمانہ کا حکم ۱۷۳
حفاظت کی نیت سے مال اٹھانے پر سزا کا حکم ۱۷۳
حیوان سے بدفعلی پر سزا ۱۷۴
بجلی چوری کرنے پر سزا ۱۷۵

عنوانات	صفحہ
بیماری کی حالت میں حد جاری کرنے کا حکم	۱۷۹
زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں تفریق کی تحقیق	۱۷۹
قرائن اور شہرت کی وجہ سے عدالت کا کسی کو سزا دینا	۱۹۳
كتاب الاشربة	۱۹۷
نسوار کی شکل میں تمباکو کے استعمال کا حکم	۱۹۷
گنے کے رس سے کشید کی گئی شراب حرام ہے	۱۹۷
اضطراری حالت میں افیون کا استعمال جائز ہے	۱۹۸
الکحل ملی خوشبو کے استعمال کا حکم	۱۹۹
منشیات ہر قسم کی ممنوع ہیں	۱۹۹
نیگوشہ پودے کی جڑوں کے شربت کی تحقیق	۲۰۰
بطور دوائی شراب کے استعمال کا حکم	۲۰۱
بطور دوا شراب کے خارجی استعمال کا حکم	۲۰۲
الکحل ملی ادویات کے استعمال کا حکم	۲۰۳
افیون بطور دوائی استعمال کرنے کا حکم	۲۰۳
سیون اپ اور کوکا کولا پینے کا حکم	۲۰۳
فتاویٰ رشیدیہ کی ایک عبارت پر پیدا ہونے والے سوال کا جواب	۲۰۴
كتاب القصاص والدية	۲۱۱
قاتل کو معاف کر دینے کے بعد قصاص کا مطالبہ کرنا جائز نہیں	۲۱۱
صلح ہو جانے کے بعد عدالت کا قاتل کو سزا دینا	۲۱۱

عنوانات	صفحہ
بدل صلح صرف قاتل پر ہے	۲۱۲
قتل بالسبب کی دیت کا حکم	۲۱۳
مریض کو دوائی کھلانے سے موت واقع ہونے پر دیت کا حکم	۲۱۳
مقتول کی دیت کے مستحقین	۲۱۴
نیند کی حالت میں ماں کے نیچے دب کر بچہ مر جائے تو کفارہ اور دیت کا حکم	۲۱۴
نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر بچے کے مرنے پر پیدا ہونے والے اشکال کا جواب	۲۱۵
روپے کی شکل میں دیت کی مقدار	۲۱۶
مدہوش کی ہڈی توڑنے پر حکومت عدل کا حکم	۲۱۷
صلح کے بعد اگر زخمی مر جائے تو دیت کا حکم	۲۱۷
رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے	۲۱۸
جسم کی کسی ہڈی کو توڑنے پر حکومت عدل ہوگی	۲۱۹
والدین کی عدم حفاظت کی وجہ سے بچہ مر جائے تو موجب ضمان نہیں	۲۲۰
کسی کے ہاتھ سے اچانک کوئی چیز گرنے سے کوئی ہلاک ہو جائے تو موجب ضمان ہے	۲۲۰
سرکاری ملازم کو دوران ڈیوٹی کوئی نقصان پہنچے تو حکومت پر کوئی ضمان نہیں	۲۲۱
قتل کی نیت سے تلوار اٹھانے والے کے قتل کا حکم	۲۲۲
کسی کی ٹانگ کی دیت	۲۲۳

عنوانات — صفحہ

دیت کی شرعی مقدار ۲۲۳
قتل موجب کفر نہیں ۲۲۴
کسی کو زخمی کرنے پر قصاص کا حکم ۲۲۵
دانت توڑنے کا قصاص ۲۲۵
متسبب اور مباشر پر دیت ۲۲۶
اجنبی قاتل سے قصاص لینے کا حکم ۲۲۸
مقتول کے ورثاء کے ذریعے قصاص کے اجراء کی شرعی حیثیت ۲۲۸
قصاص کے اجراء سے گناہ کے ختم ہونے کا حکم ۲۲۹
قاضی کا اپنے علم پر قصاص کے اجراء کا حکم دینا ۲۲۹
حالت نشہ میں قتل کرنے والے سے قصاص لینے کا حکم ۲۳۰
مقدار دیت سے کم مال پر صلح کرنا ۲۳۱
مسودہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیت اور دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات و ترامیم ۲۳۲
مسودہ قانون دیت و قصاص کے بعض زیر بحث نکات ۲۳۷
عورت کی دیت نصف ہونے کا مسئلہ ۲۴۵
اسلام کا نظام قصاص و دیت ۲۵۱
ایک غلط تاثر کا دفاع (مولانا عبد الکریم کلاچوی) ۲۵۷
اصل دیت کیا ہے سو اونٹ یا دس ہزار درہم ۲۵۹
اونٹ کی طرح سونا چاندی بھی اصل دیت ہے ۲۷۱

عنوانات — صفحہ

کتاب الجہاد

باب شرائط الجہاد وآدابہ ۲۸۵
جہاد کے شرائط ۲۸۵
جہاد کی قسمیں ۲۸۵
جہاد کے دوران امیر کی اہمیت ۲۸۶
جہاد کی ذمہ داری کا حکم ۲۸۷
نفیر عام کی تعریف ۲۸۷
افغانستان کا جہاد کن لوگوں پر فرض ہے ۲۸۸
جہاد کشمیر کی فرضیت کا حکم ۲۸۸
برما کے مظلوم مسلمانوں پر جہاد کا حکم ۲۹۰
بوسنیا میں جہاد کا شرعی حکم ۲۹۱
مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد کا حکم ۲۹۲
جہاد افغانستان کی شرعی حیثیت ۲۹۲
لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دینے کا حکم ۲۹۳
کفار کے خلاف مدافعانہ اور اقدامی دونوں قسم کے جہاد مشروع ہیں ۲۹۴
مغلوب ہونے کا یقین ہو تو کمانڈر کا حکم ماننا مناسب نہیں ۲۹۵
والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جانا ۲۹۵
والدین کے علاوہ دوسرے محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے جانا ۲۹۶

عنوانات	صفحہ
اہل وعیال کے لئے نان ونفقہ کا متبادل انتظام نہ ہونے کی صورت میں جہاد کے لئے جانا	۲۹۷
جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں سے مشورہ کرنا	۲۹۷
عالم دین کیلئے جہاد میں جانے کا حکم	۲۹۸
جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں عالم اسلام کی ذمہ داریاں	۲۹۹
مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت مسلم ارباب اقتدار کی ذمہ داری ہے	۳۰۰
لفظ فی سبیل اللہ کی تحقیق	۳۰۱
دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم	۳۰۱
دشمن کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا	۳۰۳
اہل حرب کے باغات اور فصلوں کو برباد کرنا	۳۰۳
جنگ کے دوران کافر اگر کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں	۳۰۴
جنگ کے دوران کافر باپ کے قتل کا حکم	۳۰۴
کمیونسٹوں کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کے احکام	۳۰۵
کمیونسٹوں کے معاونین کا حکم	۳۰۶
کمیونسٹوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا	۳۰۷
دشمن سے اسلحہ لیکر اسے مجاہدین کے خفیہ راز بتانیوالے کو قتل کرنیکا حکم	۳۰۸
جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا	۳۰۸

عنوانات	صفحہ
دشمن سے تحفظ دین کی خاطر توریہ کا بروئے کار لانا	۳۰۹
جنگ کے دوران مسلمان افواج کا پیچھے ہٹ جانے کا حکم	۳۱۰
باب الغنائم وقسمتها	۳۱۱
مال غنیمت غانمین کا حق ہے نہ حکومت کا	۳۱۱
مال غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ سرمایہ ہے	۳۱۱
تنفیل نہ ہونے کی صورت میں مال غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ ہوگا	۳۱۲
دارالحرب سے مال غنیمت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کا حکم	۳۱۳
دارالحرب میں مسلمان تاجر کے مال کا حکم	۳۱۴
مال غنیمت میں خیانت کرنا حرام ہے	۳۱۴
مال غنیمت کی نیت سے جہاد کرنیکا حکم	۳۱۵
شہید کے ورثاء کو مال غنیمت میں حصہ دینے کا حکم	۳۱۵
مالِ غنیمت میں عورتوں کے حصہ کا حکم	۳۱۶
باب المستامن	۳۱۷
دارالاسلام بننے کے لئے شرائط	۳۱۷
دارالحرب بننے کے لئے شرائط	۳۱۷

عنوانات — صفحہ

سندھ کا دارالحرب میں داخل ہونا ۳۱۸
کسی حربی کی دارالاسلام میں قیام امن کی مدت ۳۱۸
غیر مسلم قیدیوں کے معاملہ کا حکم ۳۱۹
حربی کا بغیر اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونے کا حکم ۳۲۰
افغانستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کا حکم ۳۲۱
اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے لئے نئی عبادت گاہیں بنانیکا حکم ۳۲۱
دارالاسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا حکم ۳۲۲

باب معاملات مع الکفار ۳۲۳

غیر مسلم کو سلام کرنا ۳۲۳
غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا ۳۲۳
غیر مسلموں کو عبادت خانوں کی راہبری کرنا ۳۲۴
غیر مسلم کی عزت و توقیر کرنا ۳۲۴
غیر مسلموں کے برتنوں میں کھانا پینا ۳۲۵
غیر مسلموں کے ساتھ کھانا پینا ۳۲۶
غیر مسلم کی ملازمت کرنا ۳۲۶
ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کا حکم ۳۲۷
اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کے ذبیحہ کا حکم ۳۲۸
اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق ۳۲۸
غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کا حکم ۳۲۹

عنوانات — صفحہ

اسلامی ملک میں غیر مسلموں کا نئی عبادتگاہ بنانا ۳۳۰
غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا ۳۳۰
مساجد میں غیر مسلم کا چندہ استعمال کرنا ۳۳۱
ہندوؤں کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا ۳۳۱
غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا ۳۳۲
مسلمانوں کا غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا ۳۳۳
قادیانیوں سے لین دین کرنے کا حکم ۳۳۳
مرتد کے ساتھ تعلقات قائم کرنا ۳۳۴
قادیانی کا چندہ مسجد میں لگانا ۳۳۴
قادیانی کی نماز جنازہ کا حکم ۳۳۵
قادیانیوں کو مسلمانوں کی قبرستان میں دفن کرنے کا حکم ۳۳۶
قادیانی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا ۳۳۶
مرتد کی میراث کا حکم ۳۳۷
مرزائی کی دعوت طعام قبول کرنا ۳۳۷
شیعہ کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا حکم ۳۳۸
شیعہ کا مال جبرًا لینے کا حکم ۳۳۹
شیعہ پر نماز جنازہ پڑھنا ۳۳۹
مسلمان کو کافر کی میراث نہیں مل سکتی ۳۴۰
کفار کیلئے دعائیں کرنا ۳۴۰
غیر مسلموں سے امداد لینے کا حکم ۳۴۱
مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنا ۳۴۲

سی ٹی بی ٹی کی شرعی حیثیت

عنوانات	صفحہ
ابتدائیہ	۳۴۳
استفتاء	۳۴۴
الجواب اعداد آلات حرب قرآن کی روشنی میں	۳۴۷
اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے اقوال	۳۴۸
آلات حرب یا عسکری قوت کو ضائع کرنے یا ان کو منجمد کرنے پر وعیدیں	۳۴۹
وہ معاہدہ جو مسلمانوں کے مفادات ہو اسکی پابندی ضروری نہیں	۳۵۱
یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت	۳۵۲
دستخط کرنے کی صورت میں کفار کی طرف سے امداد کے وعدے	۳۵۳
فتویٰ کا خلاصہ اور حاصل	۳۵۴
کتابُ القضاء	۳۵۹
قاضی کے علم پر فیصلے کا حکم	۳۵۹
قاضی کا مدعی یا مدعی علیہ کے ہاں قیام کرنیکا حکم	۳۵۹
مدعی اور مدعی علیہ کا قاضی کے تعین میں اختلاف کا حکم	۳۶۰
فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنیکا حکم	۳۶۱

عنوانات	صفحہ
حکومت کی طرف سے مقرر کردہ جج کی شرعی حیثیت	۳۶۲
اہل بدعت کا اعلیٰ منصب پر فائز ہونیکا حکم	۳۶۲
مدعی علیہ قسم سے انکار کر دے تو فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا	۳۶۳
جج کا ثالث کے فیصلے پر فیصلہ سنانے کا حکم	۳۶۴
دعویٰ کے اثبات کے لئے تحریری ثبوت پیش کرنے کا حکم	۳۶۴
مدعی کا مدعی علیہ سے مقدمہ کا خرچہ لینے کا حکم	۳۶۵
حاکم وقت کا مملوکہ زمین قاضی کو بطور عطیہ دینے کا حکم	۳۶۶
ایک بھائی کی عدم موجودگی میں مشترکہ جائیداد کے فیصلے کا طریقہ کار	۳۶۷
مکرہ کے اقرار پہ فیصلے کا حکم	۳۶۸
شریک کی عدم موجودگی میں قاضی کے فیصلے کا جائزہ	۳۶۸
اقرار کے بعد مقروض کا قرض سے انکار اور اس پہ ایک عدالتی فیصلے کا جائزہ	۳۶۹
باپ کو عدالتی سزا سے بچانے کے لئے اعتراف جرم کرنے کا حکم	۳۷۰
مدعی کے بیانات میں تعارض کا جائزہ	۳۷۱
ملک اور بیع کے دعویٰ میں فیصلہ بیع کے گواہوں پہ ہوگا	۳۷۲
حدود بیان کیے بغیر زمین پہ ملکیت کے دعویٰ کا حکم	۳۷۳

عنوانات	صفحہ	عنوانات	صفحہ
فصل کے نقصان کی وجہ سے پڑوسی سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کے مطالبہ کا حکم	۳۷۳	حکومت کی اجازت سے موات اراضی آباد کرنے کا حکم	۳۸۴
عاریۃً کسی کی زمین پر تصرفات کی وجہ سے استحقاق کا دعویٰ کرنا	۳۷۴	موات کو آباد کرنے کی وجہ سے چشمہ کا پانی دوسرے اراضی پر بند کرنے کے متعلق فیصلہ	۳۸۵
کسی کی مملوکہ زمین پر قبضہ کے متعلق فیصلہ کا حکم	۳۷۵	مشترکہ زمین میں دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حکم	۳۸۵
مدعی کا زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں	۳۷۶	عرصہ دراز تک آمدورفت کی وجہ سے راستہ پر حق مرور کا دعویٰ کرنے کا حکم	۳۸۶
زمین کے نامعلوم حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم	۳۷۶	ایک ہی شخص سے خریدی ہوئی زمین پر ملکیت کے دعوی میں تاریخ کی تقدیم وتاخیر کا حکم	۳۸۷
عاریۃً پر لی ہوئی زمین سے معیر کو تنگ کرنے کیلئے مستعیر کا درخت نہ کاٹنے کے متعلق فیصلہ	۳۷۷	مقتول کے وارث کی طرف سے قاتل کو معاف کرنے کے بعد قتل کے دعویٰ کا جائزہ	۳۸۸
والد کا عقد بیع کی اجازت سے انکار کے متعلق فیصلہ	۳۷۸	بیٹے کو ہبہ کی ہوئی زمین پر ورثاء کے دعویٰ ملکیت کا جائزہ	۳۸۹
مشترکہ چشمہ پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ	۳۷۸	ہلاک شدہ مال کے بارے میں قرض اور مضاربت کے اختلاف کا فیصلہ	۳۹۰
رنجش کی وجہ سے پانی کا قدیم راستہ روکنے کے متعلق فیصلہ	۳۷۹	غیر اختیاری کاموں میں کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کے متعلق فیصلہ	۳۹۱
حصہ دار کی اجازت کے بغیر اس کی زمین فروخت کرنے کا حکم	۳۸۰	کسی کے عقد پر دوبارہ عقد بیع کرنے کے متعلق فیصلہ	۳۹۱
متوفیٰ بھائی کے بیٹوں کی موجودگی میں اس کی ذاتی جائیداد باپ کے ترکہ میں شامل کرکے تقسیم کرنے کا حکم	۳۸۱	باپ کی وفات کے بعد بیٹوں کا اس کے عقد بیع سے انکار	۳۹۲
حکومت کی طرف سے دی گئی زمین پر فریقین کے دعویٰ ملکیت میں اختلاف کے متعلق فیصلہ	۳۸۲	عقد مضاربت کے متعلق ایک فیصلہ کی تصحیح	۳۹۳
کسی غیر کے نام مندرج زیر قبضہ زمین میں فریقین کے اختلاف کا فیصلہ	۳۸۳		

عنوانات — صفحہ
ٹیوب ویل کی نوکری پر فریقین کے تنازعہ کا فیصلہ ۳۹۴
بیٹے کا باپ کے ترکہ میں سے اپنے لیے زمین کا کچھ حصہ ہبہ کرنے کے دعویٰ کا جائزہ ۳۹۵
عقد بیع میں اختلاف کے متعلق فیصلہ ۳۹۸
شفعہ کے دعویٰ میں راستہ کا شریک پڑوسی پر مقدم ہے ۳۹۹
فریقین میں سے ہر ایک کا زمین پر ملکیت اور قبضہ کے دعویٰ کا جائزہ ۴۰۲
فریقین میں سے ہر ایک کا دوسرے کی مقبوضہ جائیداد میں ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ ۴۰۳
قدیم راستہ میں تنازعہ کے متعلق فیصلہ ۴۰۶
گواہوں پر جرح کے متعلق قاضی کے فیصلہ کا جائزہ ۴۰۸
نوے سال سے قابض زمین پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ ۴۰۹
آباؤاجداد کی شرکت کی وجہ سے ورثاء کا شریک کی جائیداد میں کچھ حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ ۴۱۰
فیصلہ شرعی درباب شفعہ دعویٰ ۴۱۲
راضی نامہ کے بعد دعویٰ کرنا اور مدعا علیہ سے قسم لینا ۴۱۹
مدعیٰ بہ کی مقدار میں غلطی ہو جانا مسقط دعویٰ نہیں ۴۲۰
دعویٰ ہبہ کے لئے معتبر شہادت ضروری ہے ۴۲۱
الحق لا یسقط بتقادم الزمان کا مطلب ۴۲۱

عنوانات — صفحہ
دعویٰ کب تک قابل سماعت ہے ۴۲۲
پاگل کے دعویٰ کا حکم ۴۲۳
نابالغ بیٹے کی جگہ باپ کو قسم دینے کا حکم ۴۲۴
مصالحت کے بعد ارث کا دعویٰ کرنا ۴۲۴
دعویٰ کے ثبوت کے لئے شرعی ضابطہ ۴۲۵
ہبہ تام کے بعد دعویٰ ارث ناقابل سماعت ہے ۴۲۶
تنازعہ تقسیم ترکہ میراث الحاج نواب (مرحوم) پلوسی پشاور ۴۲۷
فیصلہ شرعی مابین سید یوسف خان وسلطان شاہ پسران حیات شاہ ۴۳۲
مدعی اور مدعی علیہ میں سے قسم کس پر ہے ۴۳۴
زمین کے تنازعہ پر فریقین میں فیصلہ شرعی ۴۳۵
مدعی مدعی علیہ کو قسم دینے کے بعد گواہ پیش کرے ۴۳۷
مدعی علیہ کے تصرفات پر اظہار رضامندی کے بعد دعویٰ کرنا ۴۳۷
کاغذی ثبوت پیش کرنے کے بعد مدعی علیہ کا انکار کرنا ۴۳۹
مدعیٰ بہ کے سامنے ہونے کی صورت میں اشارہ کافی ہے ۴۴۰
مقدار مدعیٰ بہ میں غلطی ہو جانا ۴۴۱
فیصلہ شرعی بین الفریقین ۴۴۲
فیصلہ شرعی ۴۴۵

عنوانات	صفحہ
باب التحکیم	۴۴۷
ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت	۴۴۷
کسی فاسق کو ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت	۴۴۷
دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنیکا حکم	۴۴۸
ثالث کا شرعی اصول کے خلاف فیصلہ کرنیکا حکم	۴۴۹
قاضی اور حکم کا فرق	۴۵۰
معزول ثالث کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا	۴۵۱
فریقین کا تحکیم سے رجوع کے بعد حکم کے لئے اجرت لینا جائز نہیں	۴۵۱
علاقائی اصلاحی کمیٹی کی شرعی حیثیت	۴۵۲
کسی فریق کی عدم موجودگی میں ثالث کے فیصلے کا حکم	۴۵۳
ثالث کے فیصلے سے انکار کا حکم	۴۵۳
ثالث معزول کرنے کا حکم	۴۵۴
فیصلے کے لئے مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کے باہمی اختلاف کا حکم	۴۵۵
اسلامی قوانین کی جامعیت واہمیت	۴۵۶
قانون کی حقیقت	۴۵۷
قانون کی ضرورت	۴۵۷
قانون کی ابتداء	۴۵۸

عنوانات	صفحہ
قانون کی قسمیں	۴۵۹
انسانی قانون کی حیثیت	۴۵۹
مقننہ کے مختلف شعبے	۴۶۰
سربراہ مملکت	۴۶۰
آئین ساز ادارے	۴۶۰
عدالتی نظام	۴۶۰
رحمانی قانون کی حقیقت	۴۶۱
رحمانی قانون کے مآخذ	۴۶۱
اسلامی قانون کے بارے میں غیر مسلموں کے تاثرات	۴۶۲
اسلامی قانون کے اہم شعبے	۴۶۳
اسلام کا شخصی قانون	۴۶۳
اسلام کا ملکی قانون	۴۶۴
حفاظت نفس	۴۶۳
حفاظت نسب	۴۶۴
حفاظت مذہب	۴۶۵
حفاظت مال	۴۶۵
حفاظت عقل	۴۶۵
حفاظت عزت	۴۶۵
غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقہ کار	۴۶۶
نظام قضاء کے لئے قوت تنفیذی کی ضرورت	۴۶۷
غیر اسلامی علاقوں میں نظام قضاء کے چند نظائر	۴۶۸
فقہی جزئیات کی تائید	۴۶۹

عنوانات	صفحہ
مسلمانوں کے اتفاق سے قاضی کی تقرری	۴۶۹
عصر حاضر میں غیر اسلامی ممالک میں قضاء کی چند صورتیں	۴۷۰
پہلی صورت	۴۷۰
انفرادی طریقہ کار کی کمزوریاں	۴۷۰
دوسری صورت	۴۷۱
غیر اسلامی حکومت سے عہدہ قضاء قبول کرنے کی شرعی حیثیت	۴۷۲
انصاف کی رعایت ہونے کے وقت عہدہ قضاء قبول کرنا جائز نہیں	۴۷۳
اسلام کا نظام عدل وانصاف	۴۷۴
عدل کی ہمہ گیری	۴۷۵
مروجہ بین الاقوامی قوانین اور انکے نتائج	۴۷۶
نظام عدل کا مرکزی نکتہ	۴۷۶
حضرت ماعزؓ کا واقعہ	۴۷۷
رات کی تاریکی میں خوف خدا کا اثر	۴۷۷
شہادت حق اور قرابتیں	۴۷۹
حضرت اسامہ کی سفارش پر دربار نبوت کا ردعمل	۴۷۹
عدل فاروقی کی ایک جھلک	۴۸۰
امیر المؤمنین قاضی کی عدالت میں	۴۸۰
انصاف کی نظر میں عمر فاروق اور ایک آدمی برابر ہیں	۴۸۱

عنوانات	صفحہ
اسلامی نظام عدل نے شاہان وقت کو بھی معاف نہیں کیا	۴۸۱
اہل اسلام کا طرہ امتیاز	۴۸۲
اہل مغرب کا سفاکانہ کردار	۴۸۲
روسی کمیونسٹوں کا مسلم اقلیت سے ظالمانہ سلوک	۴۸۳
برطانوی دور کے مظالم	۴۸۴
دشمن سے اسلام کا روادارانہ سلوک	۴۸۴
حقوق کے اقسام	۴۸۴
دور صدیقی کے عہد نامے	۴۸۵
حضرت عمرؓ کا ایک لطیف استدلال	۴۸۶
ذمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خصوصی ہدایت	۴۸۷
شہادت کے اصول	۴۸۸
رشوت کے اقسام اور انکے احکام	۴۸۹
شرعی عدالت میں شاہ وگدا برابر ہیں	۴۹۰
قاضی عدالتوں کو کتاب وسنت کا پابند کرانا ہوگا	۴۹۱

کتاب الشہادۃ

عنوانات	صفحہ
سگے بھائی کے لئے گواہی دینا جائز ہے	۴۹۷
نابینا کی گواہی کی شرعی حیثیت	۴۹۷
وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت	۴۹۸
اجرتی قاتل کی گواہی کی شرعی حیثیت	۴۹۹
داڑھی منڈانے والے کی شہادت کا حکم	۴۹۹

عنوانات	صفحہ
قتل میں عورت کی گواہی کا حکم	۵۰۰
دشمن کی گواہی کی شرعی حیثیت	۵۰۰
گواہی کے لئے آمدورفت کا خرچہ لینے کا حکم	۵۰۱
قبضہ اور ملکیت میں شہادت کا حکم	۵۰۲
شہادت غیر قابض کی قبول ہوگی	۵۰۳
زیر کاشت زمین پہ ملکیت کا دعویٰ کرنے میں گواہ خارج کے مقدم ہونگے	۵۰۴
نکاح کی مجلس میں بغیر حاضر ہوئے نکاح کی گواہی دینا جائز ہے	۵۰۵
اثبات زیادتی کی وجہ سے خارج کے گواہوں کا حکم	۵۰۵
زیادت کا دعویٰ کرنے والے کے گواہ مقدم ہوں گے	۵۰۶
گواہوں کی عدم موجودگی میں محض شک کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم	۵۰۷
شرکائے کاروبار کا ایک دوسرے کے لئے گواہی دینا	۵۰۸
باپ کا بیٹے کیلئے گواہی دینا	۵۰۹
ہیجڑے کی گواہی کا حکم	۵۰۹
تائب فاسق کی گواہی کا حکم	۵۱۰
بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم	۵۱۰
قوت گویائی سے محروم شخص کی شہادت کا حکم	۵۱۱
گواہ کی خفیہ تحقیقات کرنیکی شرعی حیثیت	۵۱۲
علت زائل ہونے کے بعد اس مقدمے میں شہادت کا حکم	۵۱۳

عنوانات	صفحہ
شہادت میں مشہود لہ یا علیہ کا نام مع ولدیت لینا	۵۱۴
شہادت کے لئے خود مشاہدہ کرنا ضروری ہے	۵۱۴
صرف عورتوں کی گواہی کا حکم	۵۱۵
اثبات جرم کے ریکارڈ شدہ شہادت کافی نہیں	۵۱۶
اثبات جرم کے لئے تصویر کا حکم	۵۱۶
قاتل کے جسم یا کپڑوں پہ مقتول کا خون لگا ہو تو	۵۱۷
مسودہ قانون شہادت میں مولانا سمیع الحق کی بعض دیگر ترامیم و تقاریر	۵۱۸
اقرار اور اقبال جرم	۵۱۸
اقرار کے شرائط	۵۳۰
شادی وغیرہ کا ثبوت	۵۲۰
دوران ازدواج بچے کی پیدائش	۵۲۱
مدت حمل	۵۲۱
اکثر مدت حمل میں اقوال اور حکمت خداوندی	۵۲۲
وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت	۵۲۳

عنوان	صفحہ نمبر
اسلام اور خواتین کی شہادت	۵۲۵
شیعہ مسلک اور خواتین کی شہادت	۵۲۶
عورت کی امامت اور حکمرانی	۵۲۷
حکمت اور علت حکم میں فرق	۵۲۷
شہادت فرض ہے حق نہیں	۵۲۸
فرائض اور احکام میں عورتوں سے رعایت	۵۲۸
کسی غیر مکلف کو نصوص میں مخاطب نہیں بنایا	۵۲۹
کتاب القسمۃ	۵۳۳
کسی ایک شریک کے مطالبہ پر جائیداد کی دوبارہ تقسیم کا حکم	۵۳۳
نابالغ کے حصہ کی تقسیم کا حکم	۵۳۴
کسی ایک شریک کی غائبانہ حالت میں جائیداد تقسیم کرنا	۵۳۴
قرعہ اندازی کے بغیر جائیداد تقسیم کرنا	۵۳۵
غبن کی صورت میں تقسیم جائیداد کا اعادہ کا حکم	۵۳۶
غلطی کی صورت میں تقسیم کا اعادہ	۵۳۶

عنوان	صفحہ نمبر
مشترکہ منافع کو تقسیم کرنے کا حکم	۵۳۷
ایک فریق کی عدم موجودگی میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ	۵۳۸
مشترکہ اراضی کی تقسیم کا مسئلہ	۵۴۰
کتاب الاکراہ	۵۴۱
حکومت کا رعایا کی کسی چیز پر جبراً قبضہ کرنا	۵۴۱
جبراً نکاح کا حکم	۵۴۲
جبراً زنا میں عورت گنہگار نہ ہوگی	۵۴۲
اکراہ کی صورت میں کلمہ کفر کہنا	۵۴۳
حالت جبر میں زنا کا حکم	۵۴۳
کسی مسلمان کو حالت جبر میں قتل کرنا	۵۴۴
جبراً شراب پینے پر حد نہیں	۵۴۴
جبراً زنا کی صورت میں حد کا حکم	۵۴۵
مجبور مزنیہ پر حد زنا کا حکم	۵۴۶
جبراً ہلاک شدہ مال کے ضمان کا حکم	۵۴۶
جبراً کھلائے گئے مال پر ضمان کا حکم	۵۴۷
مجبور مفعول پر حد جاری کرنے کا حکم	۵۴۸

كتاب
النفقات والأيمان والنذر

لينفق ذو سعة من سعته

ومن قدر عليه رزقه

فلينفق ممآ أته الله

↕

من حلف كاذباً

ادخله الله النار.

کتاب النفقات

(خرچہ کے احکام و مسائل)

بیوی کا علاج کرانا خاوند پر لازم نہیں

سوال:۔ زید کی بیوی کافی عرصہ سے بیمار تھی اُس کے والدین بخوشی علاج کی غرض سے اپنے گھر لے گئے اور وہاں اس کا علاج معالجہ کرایا گیا، کچھ عرصہ بعد عورت کے والدین نے زید سے علاج معالجہ پر خرچ ہونے والی رقم کا مطالبہ کیا، تو کیا ان کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیوی کا علاج معالجہ کرانا بہرحال خاوند پر واجب نہیں البتہ مروت کے باب میں علاج کرانا مناسب ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولقائل ان یقول علیها کاُجرة الطبیب الخ

(فتح القدیر ج ۴ ص ۲ باب النفقة۔ کتاب النکاح)[1]

والدین کے نان ونفقہ کا حکم

سوال:۔ والدین کا نان ونفقہ اولاد پر واجب ہے یا نہیں؟ نیز اگر اولاد تنگدست ہو تو پھر بھی اسے والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر خود غنی ہوں تو اولاد کو ان کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا چاہے اولاد خوشحال ہی کیوں نہ ہو، لیکن جب والدین کا متبادل بندوبست نہ ہو تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری بالغ اولاد پر عائد ہوتی ہے تاہم اگر اولاد خود تنگدست ہو تو اُسے اس کے لیے مجبور کرنا بھی مناسب نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (ولابویه واجداده وجداته لو فقراء) ای تجب

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: وقید بالنفقة لان المداوٰة لا تجب علیه اصلاً۔ (البحرالرائق ج ۴ ص ۱۸۲ باب النفقة)

ومثلهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۵۴۹ کتاب النکاح۔ الباب النفقة۔

النفقة لهم كا...... واطلق في الابن ولم يقيد في الغنى مع انهٗ مقيد به لما في شرح الطحاوي ولا يجبر الابن على نفقة الابوين المعسرين اذا كا معسرًا۔

(البحر الرائق ج۴ ص۳۵ باب النفقة۔ كتاب النكاح) [1]

بالغ اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ بالغ اولاد کے اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے یا وہ اپنے اخراجات کی خود ذمہ دار ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اولاد جب تک نابالغ ہو تو اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر والد فقیر ہو تو پھر بھی اس کو اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری ہے، البتہ جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری والد سے اٹھ جاتی ہے لیکن بچیوں کا خرچہ ان کی شادی ہونے تک والد ہی برداشت کرے گا۔

لما قال العلامة ابن نجيمؒ: وقيد بالعجز عن الكسب وهو بالانوثة مطلقًا...... فلا يعتبر في الانثىٰ الا الفقر۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۱۰ باب النفقة) ...... [2]

عدّت کے دوران بیوہ کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کے عدت کے دوران اخراجات کون برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ کسی شخص کی وفات سے اس کے ترکہ میں جملہ شرعی ورثاء کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، اسی طرح خاوند کی وفات کے بعد اس کے ترکہ میں ثمن (آٹھواں حصہ) یا ربع

---

[1] لما قال شيخ الاسلام برهان الدين المرغينانيؒ: وعلى الرجل الموسر ان ينفق على ابويه واجداده وجداته اذا كانوا فقراء وان خالفوه في الدين۔
(الهداية ج۲ ص۳۴۰ باب النفقة كتاب النكاح)
وَمِثْلُهٗ في الهندية ج۱ ص۵۸۳ كتاب النكاح۔ الباب في النفقة۔

[2] لما قال العلامة ابن همامؒ: والاولاد كبارًا ما اناث..... فللاناث عليه نفقتهن الى ان يتزوجن اذا لم يكن لهن مالٌ۔ (فتح القدير ج۴ ص۲۱۶ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ في الهندية ج۱ ص۵۸۳ كتاب النكاح۔ الباب في النفقة۔

چوتھا حصہ ہے کے علاوہ اخراجات کے نام سے کچھ زائد لینے کی عورت مجاز نہیں اور نہ ہی دیگر ورثاء پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے عورت خاوند کے ترکہ سے اپنا حصہ لے کر عدت کے دوران گذارہ کرے گی، اگر اس سے اس کے اخراجات پورے نہ ہوسکتے ہوں اور محارم میں سے کوئی بھی اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر وہ ہاتھ کی کمائی سے گذارہ کرے گی۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (قوله لا للموت .....) ای لا تجب النفقة لمعتدة الموت۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۰۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة) [1]

چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے

سوال:۔ ایک شخص کی بیوی کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان بچوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا یا ماں کے؟

الجواب:۔ بچوں کا جب اپنا مال نہ ہو تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے خواہ یہ بچے باپ کے گھر میں رہ رہے ہوں یا میاں بیوی میں جدائی کی صورت میں والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہوں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: نفقة البنت البالغة یجب کالصغیرة ولکل علیه اذا لم یکن للصغیر مال۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۶۳ کتاب النکاح۔ فصل فی النفقة) [2]

والدین کے گھر رہنے کی صورت میں نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کی بیوی اس کی رضامندی سے اپنے والدین کے گھر رہتی ہو تو کیا شوہر کو اس کے

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا نفقة للمتوفی عنها زوجها۔
(فتح القدیر ج۴ ص۲۱۴ باب النفقة)

[2] قال العلامة قاضیخانؒ: نفقة الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لا یشارکه فیها احد ولا یسقط بفقره۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۵ فصل فی النفقة)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۶۰ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے یا اس کے والدین کو؟

الجواب:۔ خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر جانا عورت کے لیے مرخص ہے اس لیے اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر رہے تو اس کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں گے، گویا عورت کے محض والدین کے گھر رہنے سے خاوند اخراجات کی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو سکتا جب تک یہ عورت ناشزہ (نافرمان) نہ ہو۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: فتجب للزوجة علی زوجها (ولو هی فی بیتِ ابیها) اذا لم یطالبها الزوج بالنقلة به یفتی۔

(الدر المختار شرح تنویر الابصار ج۳ ص۵۲۵ باب النفقة)[1]

معذور اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بچہ جب بالغ ہو جائے لیکن معذور یعنی نابینا ہو اور اپنے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہو تو اس کا خرچہ باپ پر واجب ہے یا اس کے بالغ ہونے کے ساتھ ہی باپ کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔

الجواب:۔ اگر کسی کا بچہ معذور ہو تو بالغ ہو جانے کے باوجود اس کا نفقہ باپ سے ساقط نہیں ہوتا، جب تک والد زندہ ہو تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ معذور بچے کے اخراجات پورے کرے ورنہ بصورتِ دیگر دوسرے ورثاء پر بقدر الارث یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ: والذکور اما عاجزون عن الکسب لزمانة وعمی اوشلل او ذهاب عقل فعلیه نفقتهم۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۷ باب النفقة)

---

[1] قال العلامة قاضی خانؒ: الناشزة لا نفقة لها وهی التی خرجت عن منزل الزوج بغیر حق۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۶ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۴ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وحکم ولد الکبیر الزمن والانثیٰ مطلقاً کالصغیر لما سیأتی۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۹۶ باب النفقة۔ کتاب النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۶۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

ناراضگی کے ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں

سوال:۔ اگر کوئی عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال تک والدین کے ہاں رہے اور بعد میں عدالت میں ناراضگی کے ایام کے نفقہ کی دعویداری کردے تو کیا یہ عورت گذشتہ ایام کے نفقہ کی حقدار ہے یا نہیں جبکہ زیادتی شوہر کی طرف سے ہو؟

الجواب:۔ غلطی شوہر کی ہو یا بیوی کی اگر عورت ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو ناراضگی کے زمانہ کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں تاہم اگر قاضی بیوی کے حق میں فیصلہ کرے کہ شوہر بیوی کو اتنا نفقہ سالانہ یا ماہانہ ادا کرے گا لیکن بعد القضاء بھی اگر خاوند نفقہ نہ دے تو اس صورت میں یعنی قضاء کے بعد والے ایام کا نفقہ خاوند کے ذمے واجب الاداء ہے جو قرض شمار ہوگا۔

لما قال العلامة قاضیخانؒ: لا تطالب بنفقة ما مضیٰ من الزمان قبل الفرض لانا عندنا لا تصیر النفقة دیناً الّا بالقضاء۔ (فتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۴۳۰ باب النفقة)[1]

نافرمان عورت کا خرچہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ اگر ایک عورت بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلی جائے اور بار بار بلانے کے باوجود خاوند کے گھر نہ آئے تو اس کا نفقہ خاوند کے ذمہ رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت کا بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلے جانا اور بلانے کے باوجود نہ آنا نشوز کے حکم میں ہے، ایسی ناشزہ (نافرمان) عورت کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں، جب تک عورت نافرمانی ترک کرکے خاوند کے گھر نہ آجائے اس وقت تک وہ خاوند سے خرچہ کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

قال المرغینانیؒ: وان نشزت فلا نفقة لها حتیٰ تعود الیٰ منزله. (الهدایة ج۲ ص۴۱۶ باب النفقة)[2]

---

[1] قال العلامة ابن همامؒ: واذا مضت مدة لم ینفق الزوج علیها وطالبه بذلك فلا شیٔ لها الا ان یکون القاضی فرض لها النفقة۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۰ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۵۹۳ باب النفقة۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: لا نفقة لاحد عشر (وعد منها) وخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۷۳ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۵ الباب السابع عشر فی النفقات الفصل الاوّل فی نفقة الزوجة۔

ناچاقی کے باوجود شوہر پر اہل وعیال کا خرچہ لازم ہے

سوال:۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے زید نے اپنے اہل وعیال پر نفقہ بند کر دیا اب اس کی بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ شوہر کے ذمّے اہل وعیال کا خرچہ شرعاً لازم ہے اگر وہ کسی وجہ سے خرچہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو اس کو بذریعہ جرگہ وغیرہ خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے یا پھر وہ طلاق دے کر بیوی کو فارغ کر دے، بلا عذر شرعی اہل وعیال کا خرچہ بند کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمة اللہ علیہ: ویجب لو فات الامساك بالمعروف۔

(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار جلد ۲ ص ۵۷۲ کتاب الطلاق)[1]

نامرد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے

سوال:۔ اگر شوہر عنین (نامرد) ہو اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کی بیوی کا نفقہ کس کے ذمّے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عورت اس شخص کے لیے محبوس ہے، اس لیے کہ دونوں کا نکاح ہو چکا ہے تو بیوی کا خرچہ اس کے ذمّے لازم ہے اگرچہ وہ وطی کرنے پر قادر نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: فتجب للزوجة بنکاح صحیح۔ الخ علیٰ زوجها لانها جزاء الاحتباس۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص ۶۹۹ باب النفقة)[2]

---

[1] قال الامام ابو زہرةؒ: لقوله تعالیٰ: (ولا تمسکوهن ضراراً لتعتدوا) وقوله تعالیٰ: (فامساك بمعروف او تسریح باحسان) وان الواقع عدم الانفاق ضرار۔ وامساك بغیر معروف، وکان حقاً علیه ان یطلق زوجته۔ ولما لم یقم بذلك وقد تعین علیه قام القاضی مقامه فیه۔ (الاحوال الشخصیة ص ۳۴۹ باب اللعان۔ التفریق لعدم الانفاق)

ومثلهٗ فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۱۱ ص ۱۱۳ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابو بکر المرغینانی رحمہ اللہ: النفقة واجبةٌ للزوجة علیٰ زوجها مسلمة کانت او کافرةً اذا سلمت نفسها الیٰ منزله فعلیه نفقتها وکسوتها وسکناها الخ۔

(الهدایة ج ۲ ص ۴۱۳ کتاب الطلاق، باب النفقة)

ومثلهٗ فی بدائع الصنائع ج ۴ ص ۱۵ کتاب النفقة۔

فاحشہ اور بدکردار بیوی کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کی بیوی بدچلن اور بدکردار ہو اور شوہر کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی بدچلنی سے باز نہیں آتی ہو مگر رہتی شوہر کے ساتھ اسکے گھر میں ہو تو کیا ایسی عورت کا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہوگا؟

الجواب:۔ جو کوئی جس کی وجہ سے محبوس ہو اُس کا خرچہ بھی اُسی کے ذمّے لازم ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ عورت باوجود اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے شوہر کے لیے محبوس ہے اس لیے شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ : فتجب للزوجة بنكاح صحيح...... على زوجها لانها جزاء الاحتباس ۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۶۹۹ باب النفقة)[1]

خاوند سے ناراض ہو کر باپ کے گھر گذارے ہوئے سالوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ ایک عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال اپنے والدین کے گھر رہی، اب جرگہ (پنچایت) والے میاں بیوی کے درمیان فیصلہ (راضی نامہ) کرانا چاہتے ہیں لیکن عورت والدین کے گھر گذارے ہوئے سالوں کے خرچے کا مطالبہ کرتی ہے، کیا شرعاً شوہر کے ذمّے ان گذشتہ سالوں کا خرچہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں ان سالوں کا خرچہ شوہر کے ذمّے واجب نہیں اس لیے عورت مذکورہ کا یہ مطالبہ ناقابلِ قبول ہے تاہم اگر شوہر بخوشی یہ خرچہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله :۔ والنفقة لا تصير دينا

---

[1] قال العلامة قاضي خان رحمه الله : واما نفقة المرأة فمقابلة بالاحتباس وقد احتبست بحق الزوج فتكون لها النفقة على الزوج۔ (الخانية على هامش الهندية ج۱ ص۴۲۵ باب النفقة)

ومثله في الهداية ج۲ ص۴۱۵ باب النفقة۔ هكذا في مجمع الانهر ج۲ ص۴۹۲ باب النفقة)

الا بالقضاء او الرضاء۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۷۱۵ باب النفقۃ) [۱]

چھوٹے بچے کا نفقہ باپ کے ذمے ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے جبکہ اس کا ایک چھوٹا بچہ ماں کے پاس ہے، تو کیا اُس بچے کا خرچہ باپ کے ذمے ہے یا نہیں؟ جبکہ بچے کا باپ خرچہ دینے سے انکار کرتا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے اگرچہ سات سال تک بچے کی پرورش کا حق عورت (ماں) کو دیا ہے، بصورتِ مسئولہ میں اس بچے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا، باپ حقِ حضانت کی وجہ سے بچے کے نفقہ سے بری نہیں ہوگا اور اس کا انکار درست نہیں ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وتجب النفقۃ بانواعھا علی الحر لطفلہ یعم الانثیٰ والجمع۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۷۲۸ باب النفقۃ) [۲]

زچہ بچہ کا خرچہ شوہر کے ذمے ہے

سوال:۔ بچے کی ولادت کے وقت زچہ خانے میں عورت پر جو خرچہ ہو تو اسکی دائیگی شوہر کے ذمے لازم ہے یا عورت کے والدین کے ذمے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً یہ بچہ شوہر کا ہے لہٰذا اس کی پیدائش پر جو خرچہ ہوگا وہ بھی اسی کے ذمے لازم ہوگا۔

قال المرغینانیؒ: ونفقۃ الاولاد الصغار علی الاب لایشارکہ فیھا احد کما لایشارکہ فی نفقۃ الزوجۃ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۴۲ باب النفقۃ) [۳]

---

[۱] قال المرغینانیؒ: واذا مضت مدۃ لم ینفق الزوج علیھا وطالبتہ بذلک فلا شئ لھا الا ان یکون القاضی فرض لھا النفقۃ او صالحت الزوج علی مقدار نفقتھا فیقضی لھا بنفقۃ ما مضی۔ (الھدایۃ ج۲ ص۴۲۳ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مجمع الانھر باب النفقۃ ج۲ ص۴۹۹ باب النفقۃ۔

[۲] قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: نفقہ صغیر بذمہ پدر است، حسب عرف نفقہ از پدر گرفتہ شود و تا ہفت سال نزد حاضنہ اُم یا اُمّ الاُم یا غیر او شاں بماند۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۱۱ ص۱۱۸ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج۲ ص۸۱ باب النفقۃ۔

[۳] قال العلامۃ قاضیخانؒ: نفقۃ الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لایشارکہ فی ذلک احد۔

(فتاویٰ الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۱ ص۴۳۵ فصل فی نفقۃ الاولاد)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۵۶۰ الفصل الرابع فی نفقۃ الاولاد۔

نادار والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں بوڑھا اور نادار شخص ہوں جبکہ میرے دو بیٹے صاحب ثروت (مالدار) ہیں، کیا میرا نان و نفقہ ان کے ذمے ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گذارنے کے لیے کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر لازم ہے، اگر اولاد ادا نہ کرتی ہو تو گنہگار ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وتجب علی موسر الخ النفقة لاصوله الفقراء۔

(الدر المختار علی هامش ردّ المحتار جلد۲ ص۷۳۶ باب النفقة) [1]

باپ کی وفات کے بعد بچے کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی بچے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس بچے کا خرچہ ماں کے ذمے ہے یا کسی اور کے؟

الجواب: جس بچے کی حالتِ صغر میں اس کا باپ فوت ہو جائے اور وہ بچہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا جملہ خرچہ اس کی ماں کے ذمے لازم ہوگا۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: وهی اولٰی بالتحمل من سائر الاقارب۔

(ردّ المحتار ج۲ ص۹۲۲ باب النفقة) [2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وعلی الرجل ان ینفق علی ابویه واجداده وجداته اذا کانوا فقراء وان خالفوه فی دینه۔
(الهدایة ج۲ ص۴۲۴ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی معین القضاة والمفتین ص۸۵ مادة ۴۹۵ الفصل الثالث عشر فی احکام النفقة۔

[2] وفی الهندیة: الامّ اولٰی بالتحمل من سائر الاقارب حتی لو کان الاب معسرًا والامّ موسرة وللصغیر جدّ موسر تؤمر الأمّ بالانفاق من مال نفسها۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۵۶۲ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۷ باب النفقة۔ کتاب الطلاق۔

کتاب الایمان والنذر

(قسم اور نذر کے احکام ومسائل)

یمینِ منعقدہ کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکی کے والد نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا۔ اب فریقین کی آپس میں صلح ہوگئی ہے البتہ قسم کا معاملہ باقی ہے، اب اگر یہ آدمی (لڑکی کا والد) اُس شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی دیدے تو اُس پر کیا لازم آئے گا؟

الجواب:۔ اگر لڑکی کے والد نے یوں قسم کھائی ہو کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا تو عقدِ نکاح کر دینے سے حانث ہوگا جس کے بدلے میں کفارہ لازم آئے گا، تاہم اگر لڑکی بالغ ہو تو وہ والد کے کسی دخل کے بغیر اس شخص سے نکاح کرسکتی ہے اور اِس سے اُس کا والد حانث نہیں ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (و) ثالثها (منعقدة وهي حلفه علیٰ مستقبل (آت) الخ... (و) هذا القسم (فی الکفارة) الخ... فقط الخ..... ان حنث۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۵۲ کتاب الایمان)[1]

حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں کام نہ کیا تو تمام حلال چیزیں مجھ پر حرام ہوں گی، تو اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اس سے قسم منعقد ہوگی یا نہیں؟ اگر منعقد ہوگی تو اس کا کفارہ کس وقت ادا کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں یہ شخص موت سے قبل وہ جائز کام کرے تو حنث سے بچ جائے گا، تاہم اگر پوری زندگی معہودہ جائز کام کرنے سے یہ شخص قاصر رہے تو زندگی کی آخری گھڑیوں میں حانث متصوّر ہوگا جس کی وجہ سے اس کے ورثاء پر کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ تمام

---

[1] قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وعلیٰ آت منعقد وفیه الکفارة فقط۔ (کنز الدقائق ص۱۶۲ کتاب الایمان)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان۔ الباب الاول۔

حلال چیزوں کے عموم کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی بھی اس وقت طلاقِ بائن سے جدا ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (کل حل) او حلال الله او حلال المسلمین (علیّ حرام) زاد الکمال او الحرام یلزمنی ونحوه (فهو علی الطعام والشراب) ولکن (الفتوی فی زماننا (علی انه تبین امرأته الخ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۶۵ کتاب الایمان)[1]

اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یمین ہے یا نہیں؟

سوال: ایک شخص نے یوں قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا۔ اب اگر وہ اس کام کو کرے تو اس کے عقیدے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب: اگر یہ شخص بے علم ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایسی قسم سے حانث کافر ہو جاتا ہے تو یہ حنث کی صورت میں کافر ہو جائے گا، بصورتِ دیگر کافر تو نہ ہوگا بلکہ حانث ہو کر کفارہ لازم آئے گا۔

لما فی الهندیة: ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله أو یعبد الصلیب او نحو ذلك مما یکون اعتقاد کفر فهو یمین استحسانًا کذا فی البدائع فی لو فعل ذلك الفعل یلزمه الکفارة وهل یصیر کافرًا اختلف المشائخ فیه قال شمس الائمة السرخسیؒ والمختار للفتوی انهٗ ان کان عندهٗ انهٗ یکفر متی أتی بهذا الشرط ومع هذا أتی یصیر کافرًا لرضاه بالکفر وکفارته أن یقول لا اله الا الله محمد رسول الله وان عنده انهٗ اذا أتی بهذا الشرط لا یصیر کافرًا لا یکفر وهذا اذا حلف بهذه الالفاظ علی أمرٍ فی المستقبل وأما اذا حلف بهذه الالفاظ علی أمر فی الماضی بان قال هو یهودی أو نصرانی أو مجوسی ان فعل کذا أمس وهو یعلم انهٗ قد کان فعل أنه

---

[1] قال العلامة ابو البرکات عبد الله بن احمد بن محمود النسفیؒ: کل حل علیّ حرام علی الطعام والشراب والفتوی علی انهٗ تبین امرأته بلا نیة۔ (کنز الدقائق ص۱۶۶ کتاب الایمان)

ومثلهٗ فی الهندیة ج۲ ص۵۵، ۵۶ کتاب الایمان۔ الباب الثانی۔ الفصل الاول۔

لا یلزمه الکفارة عندنا لانه یمین غموس وهل یصیر کافرًا اختلف المشائخ فیه قال شمس الائمة السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انه کان عندهٗ أن هذا یمین ولا یکفر متٰی حلف به لا یکفر وان عندهٗ انه یکفر متٰی حلف به یکفر لرضاءه بالکفر۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۵۴ کتاب الایمان، الباب الثانی) [1]

قرآن مجید کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ قرآن پاک کی قسم کھانا کیسا ہے؟ کیا اس سے قسم ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اس لیے متأخرین اربابِ فتوٰی نے عرف کی بناء پر قرآنِ کریم کی قسم کھانے کو الفاظِ یمین سے شمار کیا ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: قال الکمالؒ ولا یخفٰی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینًا واما الحلف بکلام الله فیدور مع العرف۔ وقال العینیؒ وعندی أن المصحف یمین لاسیما فی زماننا وعند الثلاثة المصحف والقرآن وکلام الله یمین۔ (الدر المختار علٰی هامش رد المحتار ج۲ ص۵۱، ۵۲ کتاب الایمان) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: (و) القسم بقوله (ان فعل کذا فهو) یهودی او نصرانی او فاشهدوا علیّ بالنصرانیة او شریک الکفار او (کافر) فیکفر بحنثه لو فی المستقبل اَمّا الماضی عالمًا بخلافه فغموس واختلف فی کفره (و) الاصح ان الحالف (لم یکفر) سواء (علقه بماضٍ أو آتٍ ان کان عندهٗ) فی اعتقاده انهٗ (یمین وان) جاهلا و عندهٗ انه یکفر فی الحلف بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (یکفر فیهما لرضاه بالکفر)۔ (الدر المختار علٰی هامش رد المحتار ج۳ ص۵۹ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۳ ص۱۲۴ کتاب الایمان۔ الفصل الثانی۔

[2] قال العلامة زین الدین ابن نجیم المصریؒ: وفی فتح القدیر ثم لا یخفٰی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینًا کما هو قول الائمة الثلاثة۔

(البحر الرائق ج۴ ص۲۸۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۵۳ کتاب الایمان، الباب الثانی، الفصل الاوّل۔

ہزار روزے رکھنے کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ میں کسی کی غیبت نہیں کروں گا اور اگر کی تو قسم ہے میں ایک ہزار روزے رکھوں گا، بعد ازاں اس شخص نے کسی کی غیبت کی تو اب اس پر پورے ہزار روزے رکھنا لازم ہیں یا کفارۂ قسم؟

الجواب:۔ یہ شخص کفارۂ یمین (یعنی تین روزے رکھنے) سے فارغ الذمہ ہوسکتا ہے۔

لما فی الهندیة: وان علق بشرط لا یرید کدخول الدار ونحوه یتخیر بین الکفارة وبین عین ما التزمه۔ وروی ان ابا حنیفةؒ الی التخییر ایضاً وبهذا یفتی اسماعیل الزاهد قال رضی الله عنه هو اختیاری ایضاً کذا فی المبسوط۔

(الفتاوی الهندیہ ج ۲ ص ۶۵ کتاب الایمان، الفصل الثانی فی الکفارہ)[1]

فلاں مسجد میں نماز پڑھاؤں تو کافر ہوں گا

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر میں فلاں مسجد میں نماز پڑھا دوں تو کافر ہوں گا، پھر اُس نے اس مسجد میں نماز پڑھا دی، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ شخص اس مسجد میں نماز پڑھانے کے بعد حانث ہوکر کفارہ ادا کرے گا لیکن کافر نہ ہوگا۔

لما فی الهندیة: ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله او یعبد الصلیب أو نحو ذلک مما یکون اعتقاده کفر فهو یمین استحساناً کذا فی البدائع حتی لو

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ان فعلت کذا فعلیّ حجة أو صوم سنة او صدقة ما أملکه أجزاه من ذلک کفارة یمین وهو قول محمدؒ و یخرج عن العهدة بالوفاء بما سمی ایضاً اذا کان شرطاً لا یرید کونه لان فیه معنی الیمین وهو المنع وهو بظاهره [illegible] فیتخیر و یمیل الی ای الجهتین شاء۔ (البحر الرائق ج ۴ ص ۲۹۵ کتاب الایمان)

ومثله فی الهدایة ج ۲ ص ۵۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی۔

فعل ذٰلك الفعل يلزمه الكفّارة وهل يصير كافرًا اختلف المشائخ فيه۔ قال شمس الائمة السرخسیؒ والمختار للفتوىٰ انه ان كان عندهٗ انهٗ يكفر متى أتى بهٰذا الشرط ومع هٰذا أتى يصير كافرًا لرضاه بالكفر وكفارته أن يقول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وان كان عندهٗ انهٗ اذا أتى بهٰذا الشرط لا يصير كافرًا لا يكفر الخ۔ (الفتاوىٰ الهندية ج ۲ ص ۵۴ الباب الثانی فيما يكون يمينًا وما لا يكون يمينًا) ؎١

اگر عمر سے بات کروں تو ماں سے زنا کروں، قسم نہیں

سوال: زید نے کہا اگر میں نے عمر سے بات کی تو یہ ایسا ہے کہ میں نے اپنی ماں سے زنا کیا، اب زید کو عُمر سے باتیں کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو باتیں کرنے کی صورت میں زید پر کچھ لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں زید عمر سے باتیں کرسکتا ہے اور اس میں کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ یہ قسم نہیں، مزید برآں یہ الفاظ موجبِ ظہار بھی نہیں لعدم التشبیہ اور نہ موجبِ ایلاء ہے لعدم ارادة زوجته۔

لما فی الهندية: لو قال ان فعلت كذا فانا زانٍ أو سارق أو شارب خمر أو آكل ربًا فليس بحالف كذا فی الكافی۔ (الفتاوىٰ الهندية ج ۲ ص ۵۵ الباب الثانی فيما يكون يمينًا وما لا يكون يمينًا۔ الفصل الاول) ؎٢

؎١ قال العلامة الحصكفیؒ: (و) القسم بقوله (ان فعل كذا فهو) يهودی او نصرانی أو فاشهدوا علیّ بالنصرانية او شريك للكفار او (كافر) فيكفر بحنثه لو فی المستقبل اما الماضی عالمًا بخلافه فغموس واختلف فی كفره (و) الاصح أنّ الحالف (لم يكفر) سواء (علقه بماضٍ أو آتٍ ان كان عندهٗ) فی اعتقاده انهٗ (يمين وان) جاهلًا و (عنده انهٗ يكفر فی الحلف) بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (يكفر فيهما لرضاه بالكفر)۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۳ ص ۵۵ کتاب الايمان)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوىٰ ج ۲ ص ۱۲۷ کتاب الايمان، الجنس الاول)

؎٢ قال العلامة الحصكفی رحمه اللّٰه: (و ان) فعله غضبه الخ (او هو زان او سارق أو شارب خمر او آكل ربا لا) يكون قسمًا لعدم التعارف فلو تعورف هل يكون يمينا ظاهر كلامهم نعم وظاهر كلام الكمال لا وتمام فی

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۶۲ کتاب الايمان)

وَمِثْلُهٗ فی كنز الدقائق ص ۱۵۵ کتاب الايمان۔

بھائی کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں آج کے بعد اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ تعلقات نہیں رکھوں گا، اب وہ والدہ کے ناراض ہونے کی صورت میں بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے، اور اگر وہ قسم توڑ دے تو شرعاً اس کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسی قسم کا توڑ دینا واجب ہے، یہ شخص بھی قسم توڑ کر کفارہ دیدے ورنہ گنہگار رہیگا۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع ابویه اوقتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج ۳ ص ۶۲ مطلب کفّارة الیمین)[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی نہ ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے یوں کہا کہ اگر میں نے فلاں کپڑے پہن لیے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی نہیں ہوں گا، بعد میں اُس شخص نے وہ کپڑے پہن لیے، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ الفاظ یمین میں سے ہیں لہٰذا حنث کی صورت میں یہ شخص کفارہ ادا کرے گا تاہم حانث ہونے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تعلیق الکفر بالشرط یمین وسیجئ بانهٗ ان اعتقد الکفر به یکفر والاّ یکفر (ای تلزمه الکفّارة)۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج ۳ ص ۵۲ مطلب فی القرآن انما الخلق بکلام الله)[2]

---

[1] قال العلامة عبید الله بن مسعود بن تاج الشریعةؒ: ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع ابویه حنث وکفر۔ (شرح الوقایة ج ۲ ص ۱۳۹ کتاب الایمان)

وَمثلهٗ فی مختصر القدوری ص ۲۰۲ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی قوله هو یهودی ان فعل کذا وحنث لزمته الکفّارة وهل اختلف المشائخ فیه قال الشیخ الامام شمس الائمة ان اعتقد یمینا یکون یمینا واعتقده کفرا یکون کفرا علی ما یأتی فی الفاظ الکفر۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۱ کتاب الایمان)

وَمثلهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۵۲ الباب الاوّل، الفصل الثانی۔

کلمۂ توحید پڑھنے سے قسم کے انعقاد کا حکم

سوال: بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کسی بات کا یقین دلانے اور مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے کلمہ توحید پڑھ کر بات کرتے ہیں، عرف میں اس فعل کو قسم سمجھا جاتا ہے، کیا صرف کلمہ پڑھنے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب: واضح رہے کہ قسم کے انعقاد کا حکم نیت اور ارادہ پر ہے جس کے انعقاد میں عرف کا کافی عمل دخل پایا جاتا ہے۔ کلمہ پڑھنا اگرچہ بذاتِ خود قسم نہیں لیکن جہاں عرف کی موجودگی میں کلمہ پڑھنا قسم کی نیت سے ہو تو اس سے قسم واقع ہو جائے گی۔

لما فی الهندیة: ولو قال لا اله الا الله لا فعلن کذا لا یکون فلیس بیمین الا أن ینوی یمینًا وکذلك سبحان الله والله اکبر لا فعلن کذا فی سراج الوهاج۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۵۵ الباب الثانی الفصل الاول)[1]

آسمانی کتابوں سے بری ہونے کی قسم کھانا

سوال: زید نے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں چاروں آسمانی کتابوں سے بری ہوں گا، اس کے بعد اس نے وہ کام کر لیا، تو اب اس صورت میں وہ حانث ہو گا یا نہیں؟

الجواب: یہ الفاظ قسم کے ہیں اس لیے حنث کی صورت میں اس شخص پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔

قال العلامة ابو اللیث السمرقندیؒ: ولو قال ان فعل کذا فانا بریٔ من الکتب الاربعة فان حنث فعلیه کفارة واحدة۔ (الفتاوی النوازل ص۱۶۳)[2]

---

[1] قال الشیخ طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی التجرید عن محمد لو قال لا اله الا الله افعل کذا او سبحان الله لیس بیمین الا ان ینوی۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۲۶ کتاب الایمان۔ الجنس الاول)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۵۲ کتاب الایمان۔

[2] وفی الهندیة: ولو قال ان فعلت کذا فانا بریٔ من الکتب الاربعة فهو یمین واحدة

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۵۵ الباب الثانی۔ الفصل الاول)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۲۸۵ کتاب الایمان۔

کسی دینی مصلحت کے لیے قسم توڑنا

سوال :- اگر قسم کھانے کے بعد انسان کو یہ احساس ہو کہ قسم کھاتے وقت میں نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے، تو کیا ایسی حالت میں قسم کا پورا کرنا ضروری ہے یا حانث ہو کر کفارہ دینا مناسب ہے؟

الجواب :- اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائے اور بعد ازاں اس کام کی مخالفت میں کوئی دینی مصلحت سامنے آئے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی مخالفت کر کے کفارہ ادا کرے۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما علی الارض یمین احلف علیها فاریٰ غیرها خیراً منها الا اتیته۔ (سنن النسائی ج۲ ص۱۴۳ باب من حلف علی یمین غیرها خیراً۔) [1]

کفاراتِ یمین میں تداخل کا حکم

سوال :- ایک شخص نے متعدد بار قسمیں کھا کر ہر دفعہ قسم پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے حانث ہوتا رہا، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو کیا اس شخص کے لیے تمام قسموں کا ایک ہی کفارہ کافی ہوگا یا متعدد کفارہ جات کی ادائیگی ضروری ہوگی؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ کے مطابق احتیاط اسی میں ہے کہ متعدد کفارات ادا کئے جائیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تتعدد الکفارة لتعدد الیمین۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۵۲)

ان اگر پہلے کفارہ ادا نہیں کیا تو امام محمدؒ کے نزدیک ایک کفارہ بھی کافی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله، وفی البغیة کفارات الایمان اذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارة الواحدة عن عهدة الجمیع۔ وقال شهاب الائمة

---

[1] قال الامام الحافظ المجتهد ابو عبد الله محمد بن الحسن الشیبانیؒ: وقد بلغنا عن النبیؐ انہٗ قال من حلف علی یمین فرأی غیرها خیراً منها فلیأت الذی هو خیر ولیکفر عن یمینه۔ (کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۳ ص۱۹۰ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی الهدایة ج۲ ص۴۸۳ کتاب الایمان۔

هٰذا قول محمدؒ قال صاحب الاصل هوالمختار عندی اھ مقدسی۔ ومثله فی القهستانی عن المنیة۔ (ردالمحتار ج ۳ ص۵۲ کتاب الایمان) [1]

کفارۂ قسم ادا کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر کوئی شخص قسم توڑ دے تو اس پر کتنا کفارہ لازم ہوگا؟

الجواب:۔ قسم کا کفّارہ ایک غلام کو آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو پوشاک دینا جو بدن کے اکثر حصہ کو ڈھانپ لے، البتہ اگر کوئی مالی کفّارہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو پھر تین روزے رکھنے سے وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو سکے گا۔

قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۸۹) [2]

کھانا کھلانے میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ جس طرح روزہ کے کفارہ میں مساکین کو کھانا کھلانے میں تسلسل کا ضروری ہے اسی طرح قسم کے کفارہ میں بھی تسلسل کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ کبھی ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلایا اور پھر ناغہ کر دیا پھر کبھی ایک دو مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلا دیا، اسی طرح مختلف اوقات میں

---

[1] وفی الهندیة: اذا حلف الرجل علی امر لا یفعله ابداً ثم حلف فی ذٰلک المجلس او مجلس اٰخر لا فعله ابداً ثم فعله کانت علیه کفارة یمینین وهٰذا اذا نوی یمیناً اخریٰ ونوی التغلیظ اولم یکن له نیةٌ واذا نوی بالکلام الثانی الیمین الاولیٰ علیه کفارة واحدة۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۵۲ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج ۳ ص۲۳۸،۲۳۷ کتاب الایمان۔

[2] قال ابوالبرکات النسفیؒ: وکفارته تحریر رقبة او اطعام عشرة مساکین کهما فی الظهار او کسوتهم بما یستر عامة البدن فان عجز عن احدها صام ثلٰثة ایام متتابعات۔

(کنز الدقائق ص۱۶۶،۱۶۵ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۷۱ کتاب الایمان۔

حساب پورا کردینے سے کفارہ ادا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں اگر دس دن مسلسل کھانا نہیں کھلایا جاسکا بلکہ بیچ میں کچھ ناغے ہوگئے تو کچھ حرج نہیں صرف شمار اور تعداد پوری کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة قاضیخانؒ: وفی کفارة یمین یعتبر العدد۔ (فتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۸۶)[1]

کفارہ کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے

سوال: حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کے روزے رکھنے میں تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں رکھے جانے والے روزوں میں تسلسل ضروری ہے اگر کسی وجہ سے درمیان میں ناغہ ہوجائے تو از سرِنو روزے رکھنے ہوں گے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: فان لم یقدر علی احد الاشیاء الثلاثة صیام ثلاثة ایام متتابعات۔ وقال الشافعیؒ: یخیر لاطلاق النص ولنا قراءة ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہما فصیام ثلاثة ایام متتابعات وھی کالخبر المشھور۔ (الہدایہ ج۲ ص۴۶۰ فصل فی کفارة الیمین)[2]

کفارۂ یمین ایک شخص کو دینے کا حکم

سوال: کفارۂ یمین (قسم) کی ادائیگی میں اگر دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت پیش ہو تو کیا یہ تمام فدیہ کسی ایک مسکین کو بطور ملکیت دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یا دس مسکینوں کو ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب: کفارۂ یمین کا فدیہ کسی ایک مسکین کو ایک ہی دن میں یکمشت دینا اگرچہ بعض

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ولو عشاھم فی رمضان عشرین لیلة اجزاہ الخ۔ (رد المحتار ج۳ ص۵۳ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۲۵ جنس آخر فی کفارة الیمین۔

[2] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفیہ ایضاً کفارة المعسر صیام ثلاثة ایام متتابعات ولو حاضت المرأة فی الثلاث استقبلت بخلاف کفارة صیام رمضان۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۲۵ کتاب الایمان، کفارة الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۲ ص۶۱ کتاب الایمان، الفصل الثانی۔

اقوال کی رُو سے فراغتِ ذمہ کے لیے کافی ہے لیکن صحیح رائے کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس میں تعدد کی رعایت ہو اور فدیہ دس مسکینوں کو علیحدہ علیحدہ دیا جائے۔

وفی الھندیۃ: ولو اعطی مسکیناً واحداً عشرة اثواب فی مرة واحدة لم یجزه کما فی الطعام وان اعطاه فی کل یوم ثوبا حتی استکمل عشرة اثواب فی عشرة ایام اجزاه کما فی الطعام۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۶۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی)[1]

ناذر کا نذر سے کچھ کھانے کا حکم

سوال:۔ اگر نذر ماننے والا شخص بہت زیادہ غریب ہو تو وہ اپنی نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر شدہ چیز واجب التصدق ہوتی ہے اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں اس لیے نذر سے نہ تو اغنیاء کو کچھ کھلایا جا سکتا ہے اور نہ ناذر خود کھا سکتا ہے اگرچہ نذر ماننے والا فقیر ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ نذر غربت سے متاثر نہیں ہوتی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (ولو ترك التضحیة ومضت ایامها تصدق بها حیة ناذر) فاعل تصدق (لمعینة) ولو فقیرا ولو ذبحها تصدق بلحمها ولو نقصها تصدق بقیمة النقصان ایضاً ولا یأکل الناذر منها فان اکل تصدق بقیمة ما اکل۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۰۳/۲۰۴ کتاب الاضحیۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ای تحقیقاً او تقدیراً حتی لو اعطی مسکیناً واحداً فی عشرة ایام کل یوم نصف صاع یجوز ولو اعطاه فی یوم واحد بدفعات فی عشر ساعات قیل یجوز وقیل لا هو الصحیح۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۶ کتاب الایمان، مطلب کفارة الیمین)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۸۷ کتاب الایمان۔

[2] قال الشیخ طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: لا یأکل الناذر منها ولو أکل منها فعلیه قیمتها۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۲ کتاب الاضحیة، الفصل الرابع فیما یجوز من الاضحیة وفیما لا یجوز)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۸ کتاب التضحیة۔ فصل واما کیفیة الوجوب فانواع۔

نذر مانی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے یوں نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں گائے یا بھینس ذبح کرکے اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کروں گا، کام ہوجانے پر اب نذر ماننے والا گائے یا بھینس کا گوشت فقراء میں تقسیم کرنے کی بجائے اس کی قیمت دینا چاہتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے نذر ادا ہوجائے گی یا عینِ منذور چیز ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی میں بنیادی فلسفہ فقراء اور غرباء کی ضروریات کی تکمیل اور انکی حاجت برآری ہے جس کا وعدہ اللہ تعالےٰ نے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا سے کیا ہے، اس لیے ناذر کو اختیار ہے کہ عینِ منذور ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: نذر ان یتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغیره جاز ان ساوی العشرة کتصدقه بثمنه۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۷ مطلب فی احکام النذر۔ النذر غیر المعلق لا یختص بزمان ومکان ودرهم وفقیر)[1]

نذر کی پیشگی ادائیگی کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں چیز اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ کام ہوجانے سے پہلے ہی نذر دے دے تو کیا اس سے نذر ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ یا کام ہوجانے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ نذر کا وجوب جب کسی کام کے ساتھ مشروط ہوجائے تو شرط کی موجودگی سے پہلے مشروط واجب نہیں ہوتا اور نہ اس کی ادائیگی درست ہے اس لیے کام ہونے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہوسکتا بلکہ کام ہوجانے کے بعد دوبارہ نذر پوری کرنا ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: بخلاف النذر المعلق فانه لا یجوز

---

[1] وفی الهندیة: ویجوز دفع القیم فی الزکوٰة عندنا وکذا فی الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر کذا فی الهدایة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸۱ الباب الثالث فی زکوٰة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثانی فی العروض)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۴۳ کتاب الزکوٰة۔ الفصل الثامن فی اداء الزکوٰة۔

تعجیلہ قبل وجود الشرط۔ (رد المحتار ج۳ ص۷۴ مطلب فی احکام النذر، النذر غیر المعلق لا یختص بزمان ومکان ودرہم) [1]

نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص چند روزے رکھنے کی نذر مانے تو کیا ان میں تسلسل ضروری ہے یا جب چاہے مختلف اوقات میں رکھ کر پورے کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر پے درپے روزوں کی نیت نہیں کی ہو تو نذر کے روزے رکھنے میں تسلسل ضروری نہیں ورنہ تسلسل کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

وفی الہندیۃ: ولو قال للہ علیّ ان اصوم شہراً متتابعاً لزمہ التتابع وان اطلق لیخیر۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۱ کتاب الصوم الباب السادس فی النذر) [2]

نذر کی ہوئی گائے کے منافع کا حکم

سوال:۔ ایک گائے جو کہ اللہ کیلئے نذر کی گئی ہو اگر اس گائے کے بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ بچہ ناذر کا ہوگا یا اس کو بھی صدقہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ جب کسی جانور کو نذر کیا جائے تو یہ حکم اس کے جملہ اجزاء کو شامل

---

[1] قال العلامۃ علاؤ الدین الکاسانیؒ: وان کان معلقاً بشرط نحو ان یقول ان شفی اللہ مریضی او ان قدم فلان الغائب فللہ علیّ ان اصوم شہراً او اصلی رکعتین او اتصدق بدرہم ونحو ذٰلک فوقتہ وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذٰلک قبل وجود الشرط یکون نفلاً لان المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط۔

(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۹۳ کتاب النذر۔ فصل واما حکم النذر الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۲۹۱ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور بن محمود المعروف بقاضیخانؒ: لو قال للہ علیّ صوم مثل شہر رمضان قال ان اراد ومثلہٗ فی الوجوب فلہٗ ان یفرق وان اراد فی التتابع فعلیہ ان یتتابع وان لم یکن لہٗ نیۃ فلہٗ ان الصوم متفرقاً۔

(الفتاوی قاضیخان ج۱ ص۲۰۵ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۰۹ کتاب الصوم۔ الباب السادس فی النذر۔

ہوتا ہے بچہ بھی اس کا ایک جزو ہے، اس لیے گائے کی طرح بچہ بھی واجب التصدق ہوگا۔

قال العلامة الحصكفيؒ: و ت الاضحية ولد قبل الذبح يذبح الولد معها و عند بعضهم يتصدق به بلا ذبح۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۰۵ کتاب الاضحیۃ)[1]

نذر کا دار و مدار الفاظ پر ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر مجھے فلاں چیز مل گئی تو اتنی رقم خیرات کروں گا جبکہ دل میں ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ چیز صحیح ہو لیکن زبان پر یہ تعین نہیں ہوا، اب متعلقہ چیز ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو خراب ہے، تو کیا اس شخص پر اتنی ہی رقم خیرات کرنا واجب ہے یا مطلوبہ چیز میں نقص کی وجہ سے خیرات کی رقم میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟

الجواب:۔ نذر کی تکمیل کا تمام تر دار و مدار الفاظ پر ہوتا ہے، نیت کا زیادہ دخل نہیں رہتا اس لیے جب الفاظ مطلق ہوں تو اس چیز کے ملنے پر مقررہ رقم خیرات کرنا واجب ہے اگر وہ چیز درست حالت میں نہ ہوں۔

قال العلامة التمرتاشيؒ: ومن نذر نذراً مطلقاً او معلقاً بشرط وكان من جنسه (واجب) فرض وهو عبادة مقصودة وجد الشرط المعلق به لزم الناذر (كصوم وصلوٰة وصدقة۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۶۶، ۶۷ کتاب الایمان)[2]

---

[1] قال الامام فخر الدين حسن بن منصور المعروف بقاضي خانؒ: ولو ولدت ولدا يكون ولدها للاضحية۔ (فتاوىٰ قاضي خان على هامش الهندية جلد ۳ ص ۳۴۷ کتاب الاضحیۃ۔ فصل في صفة الاضحية ووقت وجوبها ومن تجب عليه)

وَمِثْلُهُ في بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج ۵ ص ۷۸، ۷۹ کتاب التضحیۃ فصل واما بيان ما يستحب قبل التضحية۔

[2] قال العلامة برهان الدين ابو الحسن علي بن ابي بكر المرغينانيؒ: وان علق النذر بشرط فوجد الشرط فعليه الوفاء بنفس النذر۔

(الهداية ج ۲ ص ۴۶۳ کتاب الایمان۔ فصل في الكفارة)

وَمِثْلُهُ في شرح الوقاية ج ۲ ص ۲۴ کتاب الایمان۔

منذور روزوں میں عدم تسلسل کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! مجھے کینسر کا مرض لاحق تھا، بیماری کے دنوں میں میں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرمائی تو میں دو ماہ روزے رکھوں گا۔ اب الحمد للہ میں صحتیاب ہوں اور روزے رکھنے کے قابل ہوں تو کیا میں دو ماہ مسلسل روزے رکھوں یا غیر مسلسل بھی رکھ سکتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ بیماری کی وجہ سے جسم میں کمزوری بھی بہت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ کے جواب میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر تو آپ نے نذر مانتے وقت تتابع یعنی دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کی نیت کی ہو تو پھر دو ماہ مسلسل روزے رکھنے ہوں گے اور اگر یہ نیت نہ کی ہو تو شرعاً آپ کو اجازت ہے کہ غیر مسلسل روزے رکھیں یا مسلسل، غیر مسلسل کی صورت میں ساٹھ روزے پورے کرنے ہوں گے۔ باقی اگر کمزوری بہت زیادہ ہے تو مکمل صحتیابی تک انتظار بھی کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله : وکذا الحکم لو نکر السنة او شرط التتابع فیفطرها لکنه یقضیها هنا متتابعة ویعید لو افطر یوماً بخلاف المعینة ولو لم یشترط التتابع یقضی خمسة وثلاثین۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار جلد ۲ ص ۴۳۴ کتاب الصوم، مطلب فی الکلام علی النذر)[1]

نابالغ بچے کی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :- جناب مفتی صاحب! میرے ایک بچے کی عمر دس سال ہے اور وہ پانچویں جماعت کا طالبعلم ہے جب اس کا سالانہ امتحان قریب آیا تو اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میں امتحان میں

---

[1] لما قال العلامة مولانا اشرف علی التھانویؒ، فی الدر المختار قبیل بالاعتکاف، وکذا الحکم لو نکر السنة او شرط التتابع الیٰ قوله ولو لم یشترط التتابع یقضی خمسة وثلاثین اھ
اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر تتابع کی شرط نہیں تو تتابع واجب نہیں البتہ ایام منہیہ کے عوض روزے رکھنے پڑیں گے تاکہ ایک ماہ کی تکمیل ہو جاوے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۷، ص ۵۵۸ کتاب النذر)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۶۱ الفصل الرابع فی النذر۔

کامیاب ہوگیا تو چار روزے اور سؤ روپے اللہ کے نام نذر دوں گا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ امتحان میں پاس ہونے کے بعد اس بچے کے لیے چار روزے اور سؤ روپے اللہ کے نام نذر دینا لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب :- نابالغ بچہ چونکہ غیر مکلف ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کی مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر آپ کا بچہ پانچویں جماعت کے امتحان میں کامیاب بھی ہو جائے تو بھی اس کے ذمے چار روزے رکھنا اور سؤ روپے کی نذر دینا واجب نہیں۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ ، **سوال** (۲۷۶) طفلِ نابالغ جو عقل رکھتا ہے اس نے نذر معین یا غیر معین مانی، بعد حصولِ مقصود اُس پر ادا کرنا اس نذر کا واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب: واجب نہ ہوگا، اگر وہ نذر مالی ہے تو ادا کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۷ کتاب النذر)

منذور چیز نہ ملنے پر اس کے قائم مقام کا حکم

سوال :- ایک شخص نے اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی لیکن اس کے علاقے میں اونٹ ملنا مشکل ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو اتنا مہنگا کہ اس کی قوتِ خرید سے باہر ہے، اب اس شخص کے لیے اونٹ ہی ذبح کرنا ضروری ہے یا کوئی اور جانور اس کے بدلہ میں ذبح کر سکتا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب :- اگر یہ شخص واقعی کسی ایسے علاقہ میں رہتا ہے جہاں اونٹ ملنا مشکل ہے تو اب اس کو اختیار ہے کہ یا تو سات بکریاں ذبح کر کے اپنی نذر پوری کرے یا پھر درمیانی قسم کے اونٹ کی قیمت صدقہ کر دے، اس سے اس کی نذر پوری ہو جائے گی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولو قال للہ علیٰ ان اذبح جذورًا وتصدق بلحمہ فذبح مکانہ سبع شاۃ جاز۔ (الدر المختار بحوالہ امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۲ کتاب النذر) [1]

---

[1] لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ : اس صورت میں اختیار ہے خواہ سات بکریاں ذبح کر کے مساکین کو خیرات کر دیجئے یا متوسط درجہ کے اونٹ کی قیمت مساکین کو تقسیم کر دیجئے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۲ کتاب النذر)

نذرِ مطلق واجب علی التراخی ہے

سوال: ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں تین روزے رکھوں گا، لیکن اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ اب الحمد للہ اس شخص کا کام ہو گیا ہے، جبکہ موسم بہت گرم ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے روزے رکھنا بہت مشکل ہے۔ تو کیا یہ شخص سردی کے موسم میں یہ روزے رکھ سکتا ہے یا کام ہو جانے کے فوراً بعد گرم موسم میں ہی رکھنے ضروری ہیں؟

الجواب: نذرِ مطلق جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہ ہو اس کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق اس شخص کے لیے نذر روزوں کا رکھنا مرخص ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ کام ہو جانے کے فوراً بعد نذر کے روزے ادا کیے جائیں۔

لما فی الھندیۃ: لو قال للہ علیّ ان اصوم یوماً فانہٗ یلزمہ صوم یوم و تعیین الاداء الیہ وھو علی التراخی بالاجماع۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۲۰۹ الباب السادس فی النذر)

درود شریف پڑھنے کی نذر ماننے کا حکم

سوال: میں نے ایک کارخانے میں نوکری کے لیے درخواست دی تھی، اس کی منظوری کے لیے میں نے نذر مانی کہ نوکری ملنے کے بعد چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھوں گا، اب جبکہ میری درخواست منظور ہو گئی ہے اور اسی جگہ مجھے نوکری مل گئی ہے تو کیا مجھ پر چالیس دن تک روزانہ درود شریف پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل کسی مقام پر فرض یا واجب ہو، درود شریف پڑھنا بھی بعض مواقع میں واجب ہے، اس لیے درود شریف پڑھنے کی نذر ماننا صحیح ہے اگرچہ بعض علماء کرام کا اس میں کلام ہے مگر صحیح اور راجح قول صحت کا ہے۔ لہٰذا اب آپ پر چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھنا واجب ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو نذر ان یصلّی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کل یوم کذا لزمہ وقیل لا۔ قال ابن عابدینؒ: تحتہ قولہ لزمہ لان من جنسہ فرضاً........ منہ یعلم انہٗ لا یشترط کون الفرض قطعیاً وقولہ قیل لا لعل وجھہ اشتراط کون الفرض قطعیاً...... قلتُ والاحوط الاوّل۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۱۰۵ بحوالہ امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۹۲ کتاب النذور)

"میں اپنے باپ سے نہیں ہوں گا" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ پختون معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بات پر کسی کو پختہ یقین دلانا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام اس طرح نہ کیا تو میں اپنے باپ کے نطفہ سے نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے الفاظ سے یمین (قسم) منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنی اس قسم کو پورا نہ کر سکے تو کیا اس کے ذمہ کفّارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اٹھائی جائے بدون اس کے یمین منعقد نہیں ہوگی۔ صورتِ مسئولہ کے الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی اور نہ مخالفت کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔

لما قال العلامة المفتی عزیز الرحمٰن رحمه الله: (سوال) اگر یہ کہہ دے کہ اگر میں آپ کے گھر جاؤں تو اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی خاکروب سے ہوں، پھر اگر چلا جاوے تو کفارہ لازم ہے یا نہ؟

(الجواب) اس میں کچھ کفّارہ نہیں جانا درست ہے۔ (عزیز الفتاویٰ ج ۱ ص ۵۷۲ کتاب الایمان)

کسی گناہ سے توبہ کرنا قسم نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے بھرے مجمع میں کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا، کچھ عرصہ تو وہ اس توبہ پر قائم رہا لیکن پھر اس سے چوری کا جرم سرزد ہوگیا، اب اس شخص پر شرعاً کیا حکم لاگو ہوگا؟ یعنی توبہ کے مذکورہ الفاظ قسم شمار ہو کر اس شخص پر کفارۂ قسم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کے الفاظ اگرچہ کسی بات کی توثیق کے لیے مفید ہوتے ہیں مگر یہ یمین کے لیے مثبت نہیں اس لیے اس شخص پر کوئی کفارہ نہیں، البتہ چوری جیسے قبیح فعل کے دوبارہ ارتکاب پر مال اصل مالک کو واپس کرے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو ان شاء اللہ گناہ معاف ہو جائے گا۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی رحمه الله: (سوال) اگر کسی نے یہ کہا کہ میں فلاں گناہ سے توبہ کرتا ہوں اب کبھی نہ کروں گا، تو یہ قسم ہوگی یا نہیں؟

(الجواب) یہ قسم نہیں ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۵۴۹ کتاب الایمان)

کفارۂ یمین میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کفارۂ یمین کی ادائیگی اس طرح کرے کہ بیسؔ مساکین کو ایک ہی وقت کھانا کھلادے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کفارۂ یمین میں دسؔ مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایک وقت میں بیسؔ مسکینوں کو کھانا کھلادے تو اس سے دو وقتوں کی تلافی نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک وقت کا کھانا متصور ہوگا اس کے ذمے دوسرے وقت کا کھانا کھلانا لازم ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واذا غدی مسکیناً وعشی غیرہ عشرۃ ایام لم یجزہ لانہٗ فرق طعام العشرۃ علیٰ عشرین کما اذا فرق حصۃ المسکین علیٰ مسکینین۔ (ردّ المحتار ج ۳ ص ۷۲۶ کتاب الیمین۔ مطلب کفارۃ الیمین) [۱]

غیر اللہ پر قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں کے لوگ جب کسی بات کی توثیق کرتے ہیں تو دوسرے سے کہتے ہیں کہ تیرے سر کی قسم میں یہ کام کروں گا۔ تو کیا اس سے شرعاً قسم منعقد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم اٹھانے کی صورت میں دو مقصد پیشِ نظر ہوتے ہیں (۱) مقسم بہٖ کی تعظیم (۲) بات کی پختگی۔ اگر صورتِ مسئولہ میں اس قسم کی یمین سے بات کی پختگی مراد ہو اور مقسم بہٖ کی تعظیم کا کوئی شائبہ نہ ہو تو یہ شرعی قسم نہیں صرف بات کو پختہ کرنے کی وجہ سے اس کو یمین کہا گیا ہے، اس لیے فقہاءِ کرام نے اس کو جائز کہا ہے اور اگر مقسم بہٖ کی تعظیم مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں مشارکت کی بناء پر جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وهل یکرہ الحلف بغیر اللہ تعالیٰ قیل نعم للنهی وعامتهم لا وبه افتوا لا سیما فی زماننا وحملوا النهی علی الحلف بغیر اللہ لا علیٰ وجه الوثیقۃ کقولهم بابیك ولعمرك ونحو ذلك۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۳ ص ۷۰۵ کتاب الیمین۔ مطلب فی حکم الحلف بغیرہ تعالیٰ)

---

[۱] ولما قال العلامۃ ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: وان غدا عشرۃ وعشا عشرۃ غیرهم لم یجزیه وکذا اذا غدا مسکیناً وعشا غیرہ عشرۃ ایام لم یجزیه لانه فرق طعام العشرۃ علیٰ عشرین یحصل لکل واحد منهم المقدار المقدر کما اذا فرق حصۃ المسکین علیٰ مسکینین۔

(الجوهرۃ النیرہ ج ۲ ص ۲۹۲ کتاب الایمان)

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ سے کیا مراد ہے؟

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی جنگل میں سفر کر رہا ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کی موت واقع ہونے کا بھی خدشہ ہے، جبکہ اس کے پاس کھانے کی صرف دو چیزیں موجود ہیں، ایک نذر غیر اللہ کی اور دوسرے خنزیر کا گوشت۔ اس صورت حال میں ان دونوں چیزوں میں سے کون سی کھانا اس کے لیے مرغوب ہے کہ اس سے اس کی جان بچ جائے؟ جبکہ قرآن کریم کی اس آیت اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (   ) میں مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور نذر لغیر اللہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیتِ کریمہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب :- مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دوسری یہ کہ اس سے غیر اللہ کے نام کی نذر مراد ہے، یعنی کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو غیر اللہ کے لیے نامزد کی گئی ہوں اور اس سے غرض یہ ہو کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ کی پہلی قسم اور خنزیر حرمت میں دونوں برابر ہیں، مضطر کو اختیار ہے کہ حالتِ اضطرار میں ان دونوں میں سے جو چاہے بقدرِ ضرورت اتنا کھالے کہ مرنے سے بچ جائے۔ اور دوسری قسم جو کہ نذر لغیر اللہ ہے وہ اگرچہ حرام ہے مگر حرمت میں خنزیر سے کمتر ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خنزیر کی حرمت لعینہٖ ہے اور غیر اللہ کے نام کی نذر کی حرمت لغیرہٖ ہے، اور حرمت لغیرہٖ بہ نسبت حرمت لعینہٖ کے کمتر درجے کی حرمت ہے۔ اس لیے مضطر پر لازم ہے کہ خنزیر کو چھوڑ کر نذر لغیر اللہ سے بقدرِ ضرورت اتنا کھالے کہ مرنے سے بچ جائے۔ فقط واللہ اعلم

ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :- ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ میں اپنے مرحوم والد کے ایصالِ ثواب کے لیے ہر روز چار رکعت نفل نماز پڑھوں گا اور ہر ماہ ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ کئی ماہ تک تو اس شخص نے اس پر عمل کیا مگر کچھ حادثات کی وجہ سے اب وہ مالی مشکلات سے دو چار ہے اور نفل نماز تو پڑھ لیتا ہے مگر ہر ماہ بکرا ذبح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اس شخص کے لیے شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ اگر یہ شخص ہر ماہ بکرا ذبح نہ کرے تو کیا وہ عنداللہ مجرم ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جنس سے کوئی واجب یا فرض عمل موجود ہو۔ چونکہ ایصالِ ثواب ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی جنس میں کوئی واجب عمل موجود نہیں اسلئے صورتِ مسئولہ میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر منعقد نہیں ہوئی ہے، اور اب یہ شخص چونکہ نادار اور غریب ہے اور ہر ماہ بکرا ذبح نہیں کر سکتا تو اس عمل کے ترک کرنے سے وہ عنداللہ مجرم نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) ایصالِ ثواب کی نذر منعقد نہیں ہوتی کیونکہ اس کی جنس سے کوئی واجب نہیں اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ما لیس من جنسه واجب لا ینعقد النذر به؟ اور گو تصدق کی جنس سے واجب ہے مگر یہاں اصل مقصود ایصالِ ثواب بروحِ میت ہے تصدق کی نذر تبعًا ہے اور نذر صحیح میں بھی صحت نذر کی تعیین مکان و زمان و تعیین فقیر نہیں بلکہ اس میں تغیر کا اختیار رہتا ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۰ کتاب الایمان والنذر) [1]

---

[1] قال العلامة ابن العربیؒ: حقیقة النذر التزام الفعل بالقول مما یکون طاعة لله عز وجل ومن الاعمال قربة ولا یلزم نذر المباح، بدلیل ما روی فی الصحیح ان النبی صلی الله علیه وسلم رأی ابا اسرائیل قائما فسأل عنه فقالوا نذر أن یقوم ولا یقعد ولا یستظل ویصوم فقال النبی صلی الله علیه وسلم مروه فلیصم ولیقعد ولیستظل فاخبره باتمام العبادة ونهاه عن فعل المباح۔

(احکام القرآن ج۱ ص۳۵۲ سورة آل عمران)

ومثله فی احکام القرآن للشیخ ظفر احمد العثمانی رحمه الله ج۲ ص۱۸ سورة آل عمران۔

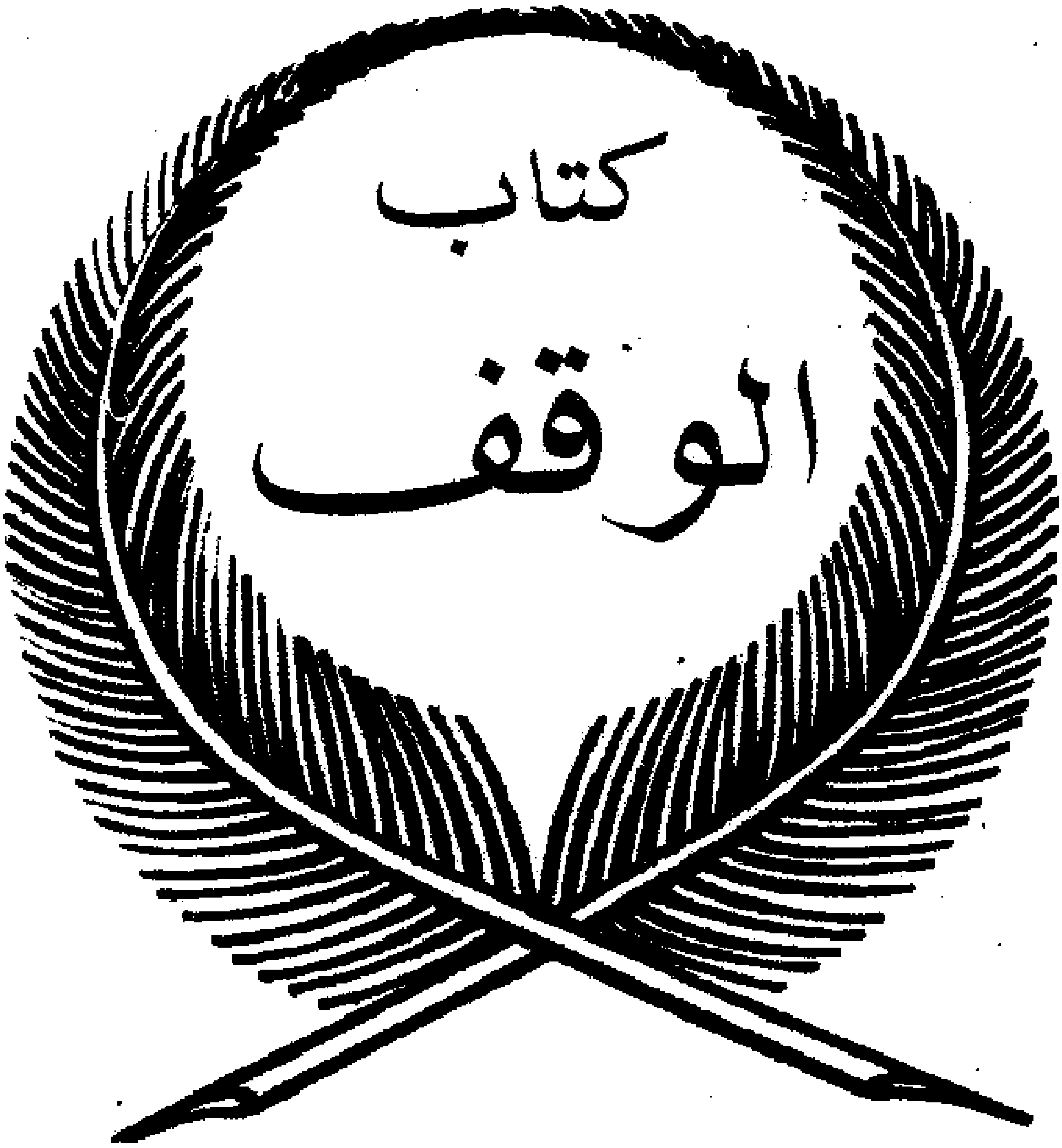

كتاب

الوقف

کتاب الوقف

(وقف کے مسائل واحکام)

مسجد کے لیے وقف مکان میں دعویٰ ارث نہیں چلتا

سوال:- مسجد کیلئے وقف مکان میں امام مسجد رہائش پذیر تھے ان کی وفات کے بعد ورثاء ارث کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ورثاء مسجد کی امامت و خطابت جیسی ذمہ داریوں سے وابستہ نہیں ہیں، تو کیا ایسی حالت میں ورثاء اس مکان میں ارث کا دعویٰ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کی موقوفہ جائیداد پر کسی کو ارث کے دعویٰ کا حق حاصل نہیں، مذکورہ مکان اگر مسجد کے لیے باقاعدہ وقف ہو تو امام کی موت کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں، صرف مسجد کے منافع کے لیے اس کا استعمال ہوگا۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالیٰ وصرف منفعتها على من احب ولو غنيا فيلزم فلا يجوز ابطاله ولا يورث عنه وعليه الفتوىٰ۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۶ کتاب الوقف)[1]

موقوفہ زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد یا قبرستان کے لیے باقاعدہ طور پر وقف کی، اب واقف موقوفہ زمین کو فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف کو موقوفہ جائیداد میں کسی قسم کے

---

[1] وقال العلامة المرغيناني رحمه الله: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه لانه يحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ۔

(الهداية ج۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف، فصل في المسجد۔

ومثله في الهندية ج۲ ص۴۶۶ کتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر۔

ردّو بدل کا اختیار حاصل نہیں اور نہ اس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: واذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج ۲ ص ۲۴۰ کتاب الوقف)[1]

باغ کے میوہ کو وقف کرنے کا حکم

سوال: ایک آدمی نے اپنا باغ وقف کرتے وقت زمین یا آمدنی کا تعین نہیں کیا، اس کی وفات کے بعد جب باغ کے درخت فائدہ کے قابل نہ رہے تو ورثا نے زمین کا دعویٰ کر دیا، ان کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے مورث نے باغ کے درخت اور اس کی آمدنی وقف کی تھی زمین نہیں، چونکہ اب نہ تو باغ کے درخت رہے ہیں اور نہ اس کی آمدنی، اس لیے یہ زمین ہم آپس میں تقسیم کرتے ہیں، تو اس معاملہ میں ان کو کہاں تک حق بجانب سمجھنا چاہیئے؟

الجواب: شرعاً باغ کی زمین کی طرح اس کے درخت اور میوہ کا وقف کرنا بھی جائز ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں واقف کے الفاظ اور عرف کو مدِنظر رکھ کر فیصلہ کرنا زیادہ مناسب ہے، اگر علاقہ میں وقف صرف درخت اور میوہ کیا جاتا ہو تو پھر اس کا اعتبار ہوگا ورنہ زمین بھی وقف متصور ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: لان هٰذا صدقة بالمنفعة او بالغلة وذٰلك قد يكون مؤبداً فمطلقه لا ينصرف الى التابيد فلا بد من التنصيص۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۳۹ کتاب الوقف)[2]

وقف سے رجوع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی اور وقف تام بھی ہوگیا، اب وہ اس

---

[1] قال العلامة التمرتاشیؒ: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملك ولا یعار ولا یرهن ای لا یملك لتملیك لغیره بالبیع۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۱ فصل حکم الواقف الجائز۔

[2] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: واذا وقف مالاً لاجل المساجد فانه جائز لجريان العرف به۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۱۵ کتاب الوقف الفصل الثالث)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانية ج ۵ ص ۷۲۰ کتاب الوقف۔

وقف سے رجوع کرنا چاہتا ہے، تو کیا واقف اپنے وقف سے رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو کوئی اپنی مملوکہ زمین ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کر دے اور وقف بھی تام ہو جائے تو اس کے بعد واقف اپنے وقف سے رجوع کرنے کا شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة فخر الدین الرازی الشهیر بقاضی خانؒ: وعن محمدؒ وعن ابی حنیفةؒ اذا جعل ارضه وقفاً علی المسجد جاز ولا یکون له ان یرجع۔

(فتاویٰ قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۱ باب الرجل یجعل داره مسجداً الخ)[1]

موقوفہ زمین میں امام مسجد کے لیے مکان بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے مصالح کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اب مسجد کی انتظامیہ امام مسجد کے لیے اس موقوفہ زمین میں رہائشی مکان تعمیر کرنا چاہتی ہے، تو کیا انتظامیہ کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے مصالح کے لیے وقف ہو اس میں انتظامیہ کو امام مسجد کے لیے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے، کیونکہ امام مسجد کی ضرورت بھی مسجد کے مصالح میں شامل ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وبما ذکرناه علم انه لو بنی بیتاً علی سطح المسجد لسکنی الامام فانه لا یضر فی کونه مسجداً لانه من المصالح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد)[2]

عید گاہ میں کھیلنا جائز نہیں

سوال:۔ عید گاہ میں کھیلنا اور ورزش کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ عید گاہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں، اسی لیے بعض فقہاء اس میں

---

[1] وقال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: واذا صح الوقف لم تجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ فصل الذی یرجع الی الموقوف۔

[2] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: ویبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو اقرب لعمارته کامام مسجد ومدرس مدرسة یعطون بقدر کفایتهم۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۶۶ مطلب یبدأ من غلة الوقف بعمارته)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۱۱ کتاب الوقف۔

ادب و احترام کے اس درجہ کے قائل نہیں جو مساجد کے لیے ہوتا ہے تاہم ہمارے معاشرہ میں عیدگاہ کو مسجد کی طرح سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کا احترام زیادہ مناسب ہے اور اس میں ہر قسم کے کھیل کود سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحؒ: اما مصلی العید لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی لہٗ حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف وفیما سوی ذٰلک فلیس لہ حکم المسجد وقال بعضہم یکون مسجداً حال اداء الصلوٰة لا غیر وھو والجبانة سواءٌ ویجنب ھٰذا المکان عما یجنب عنه المساجد احتیاطاً والظاھر ترجیح الاول لانہٗ فی الخانیة یقدم الاشہر۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۶ الوقف فی احکام المسجد)[1]

موقوفہ زمین میں عشر ادا کرنا ضروری ہے

سوال: ایک شخص نے مدرسہ کیلئے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف تام بھی ہوگیا ہے تو کیا اس موقوفہ زمین میں عُشر دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مدرسہ وغیرہ کے لیے وقف ہو جائے اور اس کے بعد اس میں کاشت وغیرہ کی جائے تو اس کی آمدنی میں عُشر دینا ضروری ہے۔

لما قال فی الھندیة: قال ارض الوقف اذا کانت عشریة دفعھا القیم مزارعة اومعاملة فعشر جمیع الخارج فی نصیب الدافع وھٰذا علی قول ابی حنیفة رحؒ فان عندہٗ فی الاجارة بالدراھم العشر علی الاجر کالخراج وعندھما یجب فی الخارج

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحؒ: وما تخذ لصلوٰة العید فانہٗ لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی لہٗ حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف امافیما سوی ذٰلک لیس لہٗ حکم المسجد قال بعضہم لہٗ حکم المسجد حال اداء الصلوٰة لا غیر ھو والجبانة سواء ویجنب ھٰذا المکان عما یجنب المسجد احتیاطاً وفی الواقعات المسجد الذی اتخذ لصلوٰة العید۔ فالمختار للفتوٰی انہٗ مسجد فی حق جواز الاقتداء وان انفصلت الصفوف واما فی ما عدا ذٰلک فلا رفقاً بالناس۔

(فتاوٰی تاتارخانیة ج۵ ص۸۴۵ کتاب الوقف، مسائل وقف المساجد)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔

فکذلك المزارعة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۲۴ کتاب الوقف- الباب الخامس)[1]

موقوفہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے کا حکم

سوال:- کافی مدت سے ایک زمین مسجد کے لیے وقف کی ہوئی ہے لیکن اب وہ آدمی اسی زمین کی دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہے، تو کیا شرعًا اس شخص کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر اس زمین کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ مسجد ہی رہے گی اور کسی کی ملکیت متصور نہ ہوگی اور نہ رجوع صحیح ہے۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی ؒ: ومن اتخذ ارضه مسجدًا لم یکن له ان یرجع فیه ولا بیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصًا لله تعالیٰ۔

(الهدایة ج۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف)[2]

موقوفہ قبرستان میں مردے دفنانے سے منع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے قبرستان کے لیے اپنی زمین وقف کی جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مُردوں کو دفنایا جا چکا ہے، اب محلہ کی تنظیم والے اس قبرستان میں لوگوں کو اموات کے دفنانے سے روکتے ہیں، تو کیا اس تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعًا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر اس قبرستان کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ قبرستان ہی رہے گی، اور محلہ کی تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعًا درست نہیں ہے، اس قبرستان میں مُردوں کو دفنایا جائے گا منع کرنا ناجائز ہے۔

---

[1] قال العلامة المرغینانی ؒ: قال ابو حنیفة ؒ فی قلیل ما اخرجته وکثیره العشر سواء سقی سیحًا او سقته السماء۔ (الهدایة ج۱ ص۲۰۱ باب العشر)

ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۹ کتاب الصلوٰة۔

[2] وقال فی الهندیة: اما حکمه عندهما زوال العین عن ملکه .... فانه یصح حتی لا یملك بیعه ولا یورث۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفه)

ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب۔

لما قال فی الهندیة : واذا کان یزول الملك عندهما یزول ملکه بالقول عند ابی یوسفؒ وهو قول الائمة الثلاثة وهو قول اکثر اهل العلم وعلیٰ هذا مشائخ بلخ وعلیه الفتویٰ ...... اما حکمه عندهما زوال العین عن ملکه الیٰ ...... فانه یصح حتیٰ لایملك بیعه ولا یورث۔
(الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص ۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفه الخ)[1]

وقف میں واقف کی شرائط کے معتبر ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے حالتِ حیات میں محلہ والوں کو مدرسہ کی تعمیر کے لیے جگہ دے دی اور کہا کہ جب تک اس مدرسہ میں طلباء تعلیم حاصل کرتے رہیں گے تو مجھے اور میرے ورثاء کو اس زمین میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے مدرسہ میں سلسلۂ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف میرا یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگا۔ تو کچھ عرصہ کے بعد سلسلۂ تعلیم بند ہوگیا ہے تو اس شخص نے کہا کہ اب میں اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہوں، اس پر لوگوں نے اُسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو کیا اس آدمی کو حقِ استرداد شرعاً حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں چونکہ واقف نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر سلسلۂ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف کردہ زمین میری یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگی، تو یہ وقف عدمِ تابید کی وجہ نامنظور ہے اور وقفِ تام نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ واقف کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے اس لیے واقف مذکورہ زمین کو واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان یجعل ها له حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفا من الفقراء۔
(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۱ کتاب الوقف)[2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع ولا بیعه ولا یورث عنه۔ (الهدایة ج ۲ ص ۶۴۵ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص ۳۶۷ کتاب الوقف۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ : شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة۔ (الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۱۲۶ کتاب الوقف۔

طلباء کے لیے مخصوص وقف کا حکم

سوال:۔ دینی مدارس کے لیے جو بکرے یا گوشت آتا ہے کیا طلباء کے علاوہ اساتذہ اور دیگر عملہ بھی اس میں سے کھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گوشت اور بکرے واقف نے صرف مدرسہ کے طلبہ کے لیے وقف کیے ہوں تو اس گوشت وغیرہ کو طلباء کے علاوہ کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں واقف کی شرط سے مخالفت لازم آتی ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ شرطِ واقف شارع کی نص کی طرح ہے، تاہم صرف مدرسہ کو دے کر مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کو اختیار دینے کی صورت میں مدرسہ کے لیے دیئے گئے دیگر عطایا کے حکم میں ہو کر طلباء کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ اور ملازمین بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الاسعاف یجب صرف الغلة علی ما شرط الواقف وفی غیره شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالة۔
(تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۱۲۶ کتاب الوقف)[1]

شاملات دیہہ زمین کے وقف کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی تمام گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور سرکاری کاغذات میں وہ شاملاتِ دیہہ ہے، گاؤں کے چند آدمیوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف کر دیا اور وقف کی تحریری دستاویز پر انگوٹھے اور دستخط وغیرہ ثبت کیے، جبکہ گاؤں کے تمام لوگ اس وقف پر راضی نہیں، تو کیا ایسا وقف شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ زمین واقعی پورے گاؤں والوں کی مشترکہ ہے اور اس کو تمام مالکان نے نہیں بلکہ بعض نے وقف کیا ہو تو یہ وقف شرعاً صحیح نہیں کیونکہ یہ وقف مشاع ہے لہٰذا شاملات دیہہ زمین کا وقف بدون تمام شرکاء کی رضا کے درست نہیں۔

لما قال العلامة فخر الدین حسن بن منصور الشهیر بقاضی خانؒ، وقف المشاع

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: قولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)
ومثلُهٗ فی الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۲۲۴ کتاب الوقف۔

عند محمدؒ لا یجوز والفتویٰ علیٰ قول محمدؒ ۔ (فتاویٰ قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۳ ص ۳۱۰ فصل وقف المشاع)[1]

قاضی کے لیے استبدالِ وقف جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دینی مدرسہ کے لیے کچھ زمین وقف کرے اور بعد میں کسی مصلحت کی بنا پر اس کو بدلنا چاہے تو شریعت کی رو سے اس طرح کی استبدال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاءِ کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر قاضی استبدالِ وقف میں مصلحت سمجھے تو اسے شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ وقف میں استبدال کرے البتہ قاضی کے علاوہ کسی اور کو شرعاً یہ اختیارات حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور الشہیر بقاضی خانؒ: اما بدون الشرط اشار فی السیر انہ لا یملک الاستبدال الا القاضی اذا رأی المصلحۃ فی ذٰلک۔
(فتاویٰ قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۳ ص ۳۰۶ فصل فی مسائل الشرط فی الوقف)[2]

مشترکہ جائیداد بلا تقسیم مسجد کے لیے وقف کرنا

سوال:۔ کئی مالکوں میں ایک زمین مشترکہ تھی ان میں سے چند ساتھیوں نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی جبکہ ان میں بعض ساتھی اس پر راضی نہیں ہیں، تو کیا شریعت کی رو سے یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مشترکہ جائیداد بغیر تقسیم کیے وقف مشاع کے مترادف ہے اس لیے وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے ناراض مالکوں کی طرف وقف کنندگان بھی اپنے اپنے حصص سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

لما قال فی الہندیۃ: واتفقا علیٰ عدم جعل المشاع مسجداً او مقبرۃ

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرۃ غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۹۲ کتاب الوقف)
ومثلہ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۴۲۶ کتاب الوقف۔

[2] قال العلامۃ زین الدین بن ابراہیم الشہیر ابن نجیمؒ: شرط الوقف عدم الاستبدال فللقاضی الاستبدال اذا کان اصلح۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۳۰ کتاب الوقف)
ومثلہ فی مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۱۳ کتاب الوقف۔

مطلقاً سواء کان مما لا یحتمل القسمة او یحتملها ۔

(الفتاوی الہندیة ج۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع)[۱]

قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کو فروخت کرکے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگادی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے، خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لیے وقف ہو تو اس کے درخت فروخت کرکے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جاسکتی ہے ۔

لما فی الہندیة: مقبرة علیہا اشجار عظیمة فہذا علی وجہین اما ان کانت الاشجار قبل اتخاذ الارض مقبرة او نبتت بعد اتخاذ الارض مقبرة ففی الوجہ الاول المسألة علی قسمین اما ان کانت الارض مملوکة لہا مالک او کانت مواتاً لا مالک لہا واتخذہا اہل القریة مقبرة ۔ (الفتاوی الہندیة ج۲ ص۴۷۳ الباب الثانی عشر الخ)[۲]

---

[۱] وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرة غیر جائز مطلقاً اتفاقاً وفی غیرہما ان کان مما لا یحتمل القسمة جاز اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۵ کتاب الوقف)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف ۔

[۲] وقال العلامة طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: مقبرة علیہا اشجار ان کانت نابتة قبل اتخاذ الارض مقبرة والارض مملوکة لہا مالک جعلہا مقبرة فالاشجار باصلہا علی ملک رب الارض یصنع الورثة بالاشجار ما شاؤا لان الشجرة لا تدخل تحت الوقف ... وان کانت الارض مواتاً لا مالک لہا باصلہا علی حالہا القدیمة ہذا کلہ اذا کانت الاشجار نابتة قبل اتخاذہا مقبرة ولم ینبت بعد ذلک لا یخلو اما ان علم غارسہا او لا یعلم ان علم کانت للغارس وان لم یعلم بہا غارس فالحکم للقاضی ۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف الفصل الثالث نوع آخر)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔

وقف مشاع کی خرید و فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر چند آدمی کچھ رقم اکھٹی کرکے مسجد کے لیے زمین خریدیں جس کے مالکانہ حقوق بھی ان کو منتقل ہوئے ہوں لیکن اب اس جگہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے، تو کیا یہ اشخاص اس جگہ کو فروخت کرکے کسی دوسری جگہ مسجد کے لیے زمین خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ چند اشخاص کا مشترکہ طور پر مسجد کے لیے زمین خریدنا وقف مشاع کے حکم میں ہے۔ جو صحیح نہیں، اس لیے صورت مذکورہ میں ان اشخاص کی خریدی ہوئی جگہ مسجد کے لیے وقف نہ ہونے کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زمین خریدنے سے قبل یہ اشخاص کسی ایک کو رقم ہبہ کردیں اور موہوب لہٗ اپنی رقم اور موہوبہ رقم ملاکر اس سے زمین خریدے اور بعدازاں اس کو مسجد کے لیے وقف کردے، اس طرح کرنے سے اس جگہ کی تبدیلی جائز نہیں ہوگی۔

لما قال فی الھندیة: وقف المشاع المحتمل للقسمة لایجوز عند محمدؒ وبه اخذ مشائخ بخاری وعلیه الفتوی۔ (الفتاوی الھندیة ج ۲ ص ۳۶۵ فصل فی وقف المشاع)[1]

مغصوبہ جائیداد کی آمدنی مساجد کی تعمیر کیلئے وقف کرنا

سوال:۔ ایک شخص تقریباً ۶۰ سال سے ایک وسیع جائیداد پر غاصب ہے اور اس جائیداد کی کافی آمدنی ہے، اب اگر یہ شخص اس جائیداد کی آمدنی کا کچھ حصہ مساجد کی تعمیر یا دیگر رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کرے تو کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مغصوبہ جائیداد واجب الرد ہے اور ایسی جائیداد کی آمدنی غاصب کیلئے ذاتی طور پر استعمال کرنا حلال نہیں اور نہ ثواب کی نیت سے کسی مسجد یا مفاد عامہ کے لیے وقف کرسکتا ہے، کیونکہ وقف کی صحت کے لیے اس چیز کا مالک ہونا ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرةً غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۹۷ کتاب الوقف)
ومثلهٗ فی الھدایة ج ۲ ص ۶۰۱ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: ھو حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعة۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۱ کتاب الوقف) [1]

پرانے قبرستان پر مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم

سوال: یہاں ایک ایسا قبرستان ہے جس کی تاریخ معلوم نہیں، قبریں بالکل ہموار ہو چکی ہیں، ان کے آثار پر حیوانات چرتے ہیں اور لوگوں کے واسطے بول و براز کا مرکز بن چکا ہے، کیا ایسے قبرستان پر دینی مدرسہ قائم کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر واقعی قبرستان کی موقوفہ زمین پر قبروں کے نشانات نہ ہوں اور پرانا قبرستان ہو اور اس کی زمین بھی ہموار ہو چکی ہو تو چراگاہ بنانے اور بول و براز پھینکنے کے بجائے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ اس پر کوئی دینی مدرسہ تعمیر کر لیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز) [2]

جنازہ گاہ میں کنواں کھودنا جائز ہے

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین جنازہ گاہ کے لیے وقف کی جبکہ ایک دوسرے شخص نے اس میں ایک کنواں اس غرض سے کھودا کہ لوگ اس کے پانی سے وضو وغیرہ کریں گے، تو کیا اس شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مرقومہ کے مطابق چونکہ کنواں کھودنے والے کا عمل اور ارادہ زمین وقف کرنے والے کے عمل اور ارادے کے منافی نہیں بلکہ کنواں کھودنے والا واقف

---

[1] وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ھو حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعة۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف۔ الباب الاول فی تعریفه۔

[2] وقال فی الھندیة: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۶۷ باب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۹۵ باب الجنائز۔

کے عمل و ارادے کے لیے مکمل اور معاون ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ۔

لما قال فی الهندیة : الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لا ثم الی ما هو اقرب الی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة ثم السراج و البسط کذٰلک الی آخر المصالح ۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۸ ۔ الوقف ۔ الباب الثانی)[1]

ہبہ کے لفظ سے وقف کرنے کا حکم

سوال :- اگر ایک شخص زمین وقف کرتے وقت "ہبہ" کا لفظ استعمال کرے یا یوں کہے کہ میں نے یہ زمین مسجد کو دے دی ہے، کیا اس سے وقف جائز ہے یا نہیں ؟ اور کیا یہ زمین وقف متصور ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :- چونکہ "ہبہ" اور "اعطاء" کے لفظ سے بھی دائمی حقوق دیئے جاتے ہیں اس لیے فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں "ہبہ" اور "اعطاء" سے بھی وقف صحیح ہے لہٰذا یہ زمین موقوفہ (وقف شدہ) زمین ہوگی ۔

لما قال فی الهندیة : ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هٰذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیک اذا سلمه للقیم ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۶۰ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد)[2]

عیدگاہ میں ہسپتال بنانے کا حکم

سوال :- شہر سے باہر لوگوں نے نمازِ عیدین کے لیے ایک میدان مقرر کیا ہے تقریباً نو ۹ سال تک

---

[1] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : الشعائر التی تقدم شرط ام لم یشرط بعد العمارة هی امام .... وقنادیل وحصر وماء وضوء ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۶۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۸۸ قبل کتاب اللقطة ۔

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله : ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هٰذه المائة للمسجد ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۵۳ کتاب الوقف ۔ مسائل وقف المساجد)

اس میدان میں نماز عیدین ادا کی گئی ہے، اب حکومت اس جگہ پر ہسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہے اور عیدگاہ کے لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جگہ بھی دینے کو تیار ہے، کیا حکومت کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ عیدگاہ موقوفہ ہو تو حکومت کا اس پر ہسپتال وغیرہ بنانا شرعاً جائز نہیں کیونکہ یہ جہت وقف کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہوتی ہے، البتہ اگر یہ جگہ وقف نہ ہو بلکہ ویسے ہی اس جگہ پر کئی سالوں سے نماز عیدین پڑھی جا رہی ہو تو اس صورت میں اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع و هو مالك فله ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۹۵ کتاب الوقف۔ مطلب ما خالف شرط الواقف)[1]

واقف کی شرط کے اعتبار کا حکم

سوال: اگر ایک شخص مسجد سے ملحق اپنی دو مرلہ زمین اس شرط پر مسجد کے لیے وقف کرے کہ مسجد سے ملحق ایک دوسرا پلاٹ خرید کر اس پر جنازہ گاہ بنایا جائے گا، اور اگر کسی وجہ سے ملحقہ پلاٹ نہ مل سکے تو کیا یہ شخص اپنی دو مرلہ زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین واقف نے کسی شرط کے ساتھ وقف کی ہو اور وہ شرط پوری نہ ہو سکتی ہو تو واقف اپنی زمین کو واپس لینے کا شرعاً مجاز ہے، لہٰذا موصوف اپنی دو مرلہ زمین واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حکم لا دلیل علیه سواء کان نصه فی الوقف نصاً

---

[1] ولما قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: شرط الواقف کنص الشارع مالم تخالف الشرع۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۲۵۱ الباب الثانی فی نصب المتولی ومایملکه اولا ---- کتاب الوقف) ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۵ کتاب الوقف۔

او ظاهرًا وهذا موافق لقول مشائخنا کغیرهم شرط الواقف کنص الشارع فیجب اتباعهٗ۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۹۵ کتاب الوقف، مطلب ما خالف شرط الواقف)[1]

قبرستان کے لیے موقوفہ زمین میں تصرف کرنا

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین قبرستان کے لیے وقف کر دی، واقف کے فوت ہونے کے ۳۶/۳۵ سال بعد اس کے بیٹے نے موقوفہ زمین میں کچھ یوں تصرف کیا کہ جسے چاہتا ہے میت دفن کرنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے روک دیتا ہے، اس کے علاوہ وقف شدہ زمین کے کچھ حصہ میں فصل بھی کاشت کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ والد کی موقوفہ زمین میں بیٹے کا کسی قسم کا تصرف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں واقف کا بیٹا باپ کی وفات کے بعد اس موقوفہ زمین میں کسی قسم کے تصرف کرنے کا حق دار نہیں رہتا، اس لیے کہ ایک دفعہ وقف تام ہونے کے بعد زمین مالک کی مِلک سے نکل جاتی ہے جس کے بعد واقف اور اس کے ورثاء کو تصرف کا کوئی حق نہیں رہتا۔

لمال العلامة فخر الدين الزيلعي رحمہ اللہ: وعند ابی یوسفؒ یزول مِلکه بالقول و عند محمدؒ اذا استسقی الناس عن السقایة وسکنوا الخان والرباط ودفنوا فی المقبرة زال المِلك الخ۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۱ کتاب الوقف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)

وَمِثلُهٗ فی مجموعة الفتاوی ج۲ ص۱۰۱ کتاب الوقف۔

[2] وقال فی الهندیة: من جعل ارضهٗ مقبرة لم یزل مِلکه عن ذلك حتی یحکم به الحاکم عند ابی حنیفةؒ وعند ابی یوسفؒ یزول ملکه بالقول کما هو اصله ..... ودفنوا فی المقبرة زال المِلك ویکتفی بواحد ذکر فی المبسوط ان الفتوی علی قولهما فی هذه المسائل وعلیه الاجماع۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ الباب الثانی عشر فی الرباطات والمقابر)

وَمِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۵۳ کتاب الوقف۔

جنازہ گاہ سے راستہ جدا کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے جنازہ گاہ کے لیے تین کنال زمین وقف کردی اور وقف تام بھی ہوگیا ہے، لیکن اب اس وقف شدہ زمین میں راستہ کی اشد ضرورت ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے اس سے راستہ جدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ زمین کو وقف کرنے کے بعد نماز جنازہ کے لیے استعمال کیا گیا اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو تو اس سے وقف اب وقف تام ہو گیا ہے اب اس کا استعمال راستہ وغیرہ کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملك ولا یعار ولا یرهن (ای لا یقبل التملیك لغیره بالبیع)

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۴۲ کتاب الوقف)[1]

وقف غیر تام کے استبدال کا حکم

سوال: ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے جبکہ اس کے قریب ہی ایک اور مسجد موجود ہے لیکن پھر بھی اس جگہ پر مسجد بنانے میں فائدہ ہے، لہٰذا اگر یہ شخص اس زمین کے بدلے جس پر ابھی تک مسجد نہیں بنائی گئی ہے کسی دوسری جگہ مسجد بنالے تو شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مسجد کی زمین کے وقف تام ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا راستہ الگ کرکے عام لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر اذان اور اقامت سے کم از کم ایک دفعہ نماز باجماعت ادا ہوجائے چونکہ صورتِ مذکورہ میں یہ اقدامات نہیں ہوئے ہیں، لہٰذا یہاں وقفِ تام نہ ہونے کی وجہ سے مالکِ زمین اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے، اور جب کسی زمین پر ایک دفعہ باقاعدہ شرعی مسجد بن جائے تو ایسی جگہ کو مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے استعمال میں نہیں لائی جا سکتی۔

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: اذا صح الوقف لم تجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج۲ ص۶۳۰ کتاب الوقف)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : ومن بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنه حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ واذا صلی فیہ واحد زال ملکہ۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ الوقف فصل فی احکام المسجد)[1]

وقف کے مملوکہ ہونے کا حکم

سوال: کسی نے مسجد کے واسطے زمین وقف کر دی اور اس پر مسجد بنا کر اس میں نماز باجماعت بھی ادا کی گئی، کیا یہ موقوفہ زمین مسجد کے بانی کی ملکیت متصور ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مساجد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے واسطے بنائی جاتی ہیں، اسکی زمین پر باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت بن جاتی ہے، اس لیے مذکورہ موقوفہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں آ سکتی۔

لما قال فی الھندیة : وعندھما حبس العین علی مِلکِ اللّٰہِ تعالیٰ علی وجه تعود منفعتہ الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث۔

(الفتاوٰی الھندیة ج ۲ ص ۳۵۰ کتاب الوقف)[2]

موقوفہ زمین میں فلش بنانے کا حکم

سوال: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہوتی ہو بلکہ چپلوں (جوتوں) اور

---

[1] لما قال العلامة المرغینانی رحمه اللّٰہ : واذا بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنه حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ واذا صلی فیہ واحد زال عن ملکہ۔ الخ۔ (الھدایة ج ۲ ص ۶۲۴ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج ۲ ص ۴۵۴ الوقف، الباب الحادی عشر فی المسجد۔

[2] وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰہ : وعندھما حبسھا علی حکم مِلک اللّٰہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علی من احب وعلیہ الفتوٰی قوله علی حکم مِلک اللّٰہ تعالیٰ قدر لفظ الحکم لیفید ان المراد لم یبق علی مِلک الواقف ولا انتقل إلی ملک غیرہ وقوله وعلیہ الفتوٰی ای علی قولھما یلزمہ۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۳۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۷ کتاب الوقف۔

استنجا خانوں وغیرہ کے لیے متعین نہ ہو اُس میں فلش (لیٹرین) بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہو بلکہ جوتوں، استنجا خانوں اور غسلخانوں وغیرہ کے لیے مختص ہو تو اس میں فلش (لیٹرین) بنانا جائز ہے۔

لما قال العلامة شهاب الدين احمد رحمه الله: لو جعل تحته حانوتا وجعله وقفا على المسجد قيل لا يستحب ذٰلك ولكنه لو جعل في الابتداء هٰكذا صار مسجداً وقفاً عليه ويجوز المسجد والوقف الذي تحته۔

(شلبی علی هامش تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳ کتاب الوقف) لہ

موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہ ہونے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین کا کچھ حصہ اہل محلہ کی ضروریات کے لیے وقف کر کے ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا، کیا واقف کی وفات کے بعد اس کے ورثاء یہ زمین واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اہالیانِ محلہ کو اب بھی اس کی ضرورت ہے اور متعلقہ متولّی بھی فوت ہو گیا ہے؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف یا متولّی کی وفات سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا جب تک اہلِ محلہ کو اس کی ضرورت ہو تو واقف کے فیصلہ کی رعایت ہوگی، واضح ہو کہ موقوفہ زمین میں ارث جاری نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: فلا يجوز له ابطاله

لہ لما قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: وبما ذكرناه علم انه لو بنى بيتاً على سطح المسجد لسكنى الامام فانه لا يضر في كونه مسجداً لانه من مصالح المسجد ...... اذا بنى مسجداً وبنى غرفة وهو في يده فله ذٰلك وان كان حين بناه خلى بينه وبين الناس ثم جاء بعد ذٰلك يبني لا يتركه وفي جامع الفتاوى اذا قال عنيت ذٰلك فانه لا يصدق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ الوقف، فصل فی احکام المسجد)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۰ کتاب الوقف۔

ولا يورث عنه وعليه الفتوى ابن الكمال وابن الشحنة۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۲ كتاب الوقف)[1]

متروکہ جائیداد میں وقف پر اقرار کا حکم

سوال:۔ ایک شخص فوت ہوگیا اور کچھ جائیداد ترکہ میں رہ گئی، اس کے ورثاء میں ایک بیٹا یہ اقرار کرتا ہے کہ والد صاحب نے یہ زمین باقاعدہ وقف کی تھی جبکہ باقی ورثاء اس سے انکار کر رہے ہیں، اندریں حالات کیا تمام جائیداد وقف متصور ہوگی یا یہ مقر کے حصہ تک محدود رہے گی؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں اقرار حجتِ قاصرہ بھی ہے اور دوسرے پر اقرار بھی، جو کہ صحیح نہیں اس لیے مقر کا اقرارِ وقف صرف اس کے حصہ تک محدود رہے گا اور دوسرے ورثاء پر اس کا اقرار حجت نہیں بن سکتا، وہی حصہ موقوف رہے گا جو مقر کے حصہ میں آئے۔

لما قال في الهندية: ولو اقر بالوقف الى..... وان كان مع المقر وارث آخر يجحدُ ذٰلك كان نصيب الجاحد من هٰذه الارض للجاحد يفعل ما يشآء ونصيب المقرّ يكون وقفًا على ما اقرّ به۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۲۲ الوقف، الباب الثامن في الاقرار)[2]

---

[1] وقال في الهندية: وكذٰلك اذا جعل داره في ثغر مسكنا للغزاة او المرابطين ودفعها الى وال يقوم عليها فليس لهٗ ان يرجع فيها وان مات لم تكن ميراثًا عنه وان لم يسكنها احد۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۶ الباب الثاني عشر في الرباطات)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۵ ص۲۰۶ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاري رحمه الله: واما اذا كان ثمة وارث آخر فان اقر الآخر بجميع ما اقر به هٰذا الوارث كان الجواب كما قلنا وان انكر الوقف كان نصيب المنكر ملكًا لهٗ يتصرف فيه بما شاء ونصيب المقر وقفٌ۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۷۳۳ كتاب الوقف الاقرار بالوقف)

وَمِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۲ كتاب الوقف، قبل الفصل الرابع في المسجد۔

باب المساجد

(مساجد میں وقف کے احکام و مسائل)

وقف کی یادداشت (تحریر) لکھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص مسجد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا وقف کرنا چاہتا ہے، اگر وہ بطورِ یادداشت یہ لکھے کہ میں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد کے واسطے وقف کیا، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- کسی واقعہ کا تحریر میں لانا دوام اور استحکام کی دلیل ہے، عرف میں بھی جس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے یا سرکاری کاغذات میں اندراج کیا جائے تو وہ زیادہ قوی سمجھا جاتا ہے، اس لیے وقف کو یادداشت کے لیے لکھنا یا سرکاری کاغذات میں انتقال کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے تاکہ بعد میں کسی وارث کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ فَاكْتُبُوهُ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

ولما قال العلامۃ حافظ عماد الدین رحمہ اللہ: ھٰذا ارشاد منہ تعالیٰ لعبادہ المؤمنین اذا تعاملوا بمعاملات مؤجلۃ ان یکتبوھا لیکون ذٰلک احفظ لمقدارھا ومیقاتھا واضبط للشاھد فیھا وقد نبہ علیٰ ھٰذا فی آخر الآیۃ۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۸ سورۃ البقرۃ پ ۳)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر دوکانیں تعمیر کرنے کا حکم

سوال:- گاؤں کے چند معززین نے ایک پلاٹ تقریباً ۶ کنال برائے جامع مسجد وقف کیا، جس میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی

---

[1] وقال العلامۃ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ:- معاملہ کا لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ (بیان القرآن ج ۱ ص ۱۶۸ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)
وَمِثْلُہٗ فی تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰ سورۃ البقرۃ۔

مسجد کی تعمیر سے بچ جانے والی زمین بنجر ہے جسے لوگ عیدین کی نماز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب اُن معززین نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بنجر زمین پر دکانیں یا کچھ مکانات بنا دیئے جائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مسجد پر صرف کیا جائے۔ تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ پلاٹ کے جس حصہ پر باقاعدہ مسجد بن گئی ہے خواہ اس میں مستقل چھت ڈالی گئی ہے یا عارضی چبوترہ بنا کر اس میں نماز پڑھی جا رہی ہو یا ویسے ہی کھلی جگہ ہو ایسی جگہ میں دوکانیں بنانا یا مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ مسجد کے نام سے جو زمین وقف کی گئی ہے اور اس میں کچھ حصہ ویسے ہی غیر آباد چھوڑا گیا ہے اور تاحال اس پر آبادی نہیں ہوئی ہے تو وہ جگہ مسجد کے علاوہ مذکورہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال فی الهندیة: قیم المسجد لا یجوز له ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً و مسکناً تسقط حرمته وهذا لا یجوز، والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الوقف۔ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیره فی مال الوقف علیه)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں پر ہندوؤں کی کچھ جائیدادیں رہ گئی ہیں جن پر کچھ لوگ قابض ہیں، بعض لوگوں کا تو قانونی قبضہ ہے اور بعض لوگ غیر قانونی طور پر محض قوت کے بل بوتے پر قابض ہیں، کیا ایسی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں حکومت نے قانونی طور پر جن قابضین کا حق تسلیم کر کے انہیں مالکانہ حقوق دیئے ہوں تو وہ جائز مالک متصور ہو کر ان کا وقف صحیح ہے

---

[1] وقال العلامة ابن الهمامؒ: قیم المسجد اذا اراد ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائه لا یجوز له ان یفعل لانه اذا جعل المسجد سکناً تسقط حرمة المسجد واما الفناء فلانه تبع للمسجد۔ (فتح القدیر ج ۵ ص ۲۳۶ کتاب الوقف۔ الفصل الاول فی المتولی۔) ومثله فی التاتارخانیة ج ۵ ص ۸۶۸ کتاب الوقف۔ الفصل الحادی والعشرون فی المساجد۔

لیکن جس جائیداد پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہو تو مغصوبہ جائیداد کے وقف کی عدمِ صحت کی وجہ سے اس پہ بنائی ہوئی مسجد شرعی مسجد نہیں رہے گی اِلّا یہ کہ حکومت باقاعدہ اجازت دے دے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: من شرائطہ الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضًا فوقفہا......... لا تکون وقفًا۔

(البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف) [1]

مسجد کی زمین سے مِلک کے زائل ہونے کا حکم

سوال:- مسجد کی زمین سے مالک کی مِلک کا ازالہ کب ہو جاتا ہے؟

الجواب:- مسجد کی زمین سے مالک کی ملک صرف نماز کی اجازت پر اسی مسجد میں یا انہی الفاظ کے معنی پر ملک زائل ہو جاتی ہے، اور یہی امام ابو یوسفؒ کا قول ہے اور قضاءً کے باب اور وقف میں اس کا قول راجح ہو جاتا ہے۔

وقال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: وقال ابو یوسفؒ یزول مِلکہٗ بقولہ جعلتہ مسجدًا لان التسلیم عندہ لیس بشرط لانہ اسقاط لملک العبد فیصیر خالصًا لِلّٰہِ تعالٰی بسقوط حق العبد وصار کالاعتاق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف۔ فصل فی احکام المسجد) [2]

منہدم مسجد کی تبدیلی کا حکم

سوال:- ایک مسجد کسی وجہ سے شہید ہو گئی ہے، اب گاؤں والے یہ چاہتے ہیں کہ اسکے

---

[1] وقال فی الھندیۃ: (ومنہا) الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضا فوقفہا .... لا تکون وقفًا۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف مطلب فی وقف الذی)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۳۸۱ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وعند ابی یوسفؒ یزول بمجرد قول الواقف ولا یجوز بیعہ ولو مات لا یورث۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۰ کتاب الوقف الاول)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ۔

بدلے میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کر لی جائے اور اس مسجد کا ملبہ اور زمین وغیرہ فروخت کر دیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے منہدم مسجد کا سامان اور جگہ وغیرہ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف ہو اور اس پر مسجد بن گئی ہو تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کی تبدیلی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغينانيؒ: واذ صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔

(الهداية ج ۲ ص۲۴۰ كتاب الوقف) [1]

ارضِ مغصوبہ پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے غیر مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی، لوگوں نے اس میں تقریباً ۹/۸ سال تک نمازیں بھی پڑھیں، ۸/۹ سال بعد زمین کے اصل مالک نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے اور میں نے اس کو مسجد کے لیے وقف نہیں کیا ہے، لوگوں نے کہا کہ آپ اس کے بدلہ میں دوسری جگہ لے لیں اور مسجد کو اپنی جگہ پر رہنے دیں لیکن وہ نہیں مانتا، تو اب شریعت کی رُو سے اس مسجد کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ وقف کے لیے باقاعدہ ملک تام ہونا شرط ہے، جہاں کہیں کسی غیر کی زمین کو بغیر اس کی اجازت کے مسجد کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں، اس لیے مالک اگر چاہے تو وقف کر سکتا ہے ورنہ مغصوبہ زمین سے مسجد گرا کر زمین فارغ کرانا مالک کا حق ہے۔

لما في الهندية: (ومنها) الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه او صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفا۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۵۳ كتاب الوقف مطلب في وقف لازم) [2]

---

[1] وقال العلامة التمرتاشيؒ: فاذا تم ولزم (اى الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن) اى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ كتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن نجيمؒ: من شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها...... لا تكون وقفًا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ كتاب الوقف

وَمِثْلُهٗ في رد المحتار ج۴ ص۳۸۱ كتاب الوقف۔

موقوفہ زمین کو مسجد کے مصالح میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی جس پر ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے، کیا یہ زمین مسجد کے مصالح مثلاً دوکان وغیرہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- جو زمین مسجد کیلئے وقف کی گئی ہو اور اس پر نماز بھی نہیں پڑھی گئی ہو تو اس کو مسجد کے مصالح پر صرف کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے۔

لما قال فی الهندیة: والاصح ما قال الامام ظهیر الدینؒ ان الوقف علی عمارة المسجد وعلی مصالح المسجد سواءٌ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف، الفصل الاول فی المتولی)[1]

مسجد کی زمین پر گھر بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی اور اس پر مسجد بھی بنادی گئی لیکن اب یہ مسجد گاؤں کے لیے ناکافی ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کے بدلے دوسری جگہ جس میں مسجد کے متعلقہ تمام انتظامات و سہولیات ہوں، وقف کی جائے اور پرانی مسجد کی جگہ مکان بنالیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جس زمین پر ایک مرتبہ مسجد بن گئی اور اس میں نماز بھی پڑھی گئی تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں ہے اس کو کسی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت پر مسجد کی حیثیت سے باقی رکھا جائے گا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یبقیٰ مسجداً ابداً الیٰ قیام الساعة وبه یفتی۔ وقال ابن عابدینؒ فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الیٰ مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه اولا وهو الفتویٰ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فیما لو خرب المسجد او غیرہ)[2]

---

[1] وقال العلامة ابن الهمامؒ: ان الوقف علی عمارة المسجد و مصالح المسجد سواء (فتح القدیر ج۵ ص۴۵۰ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۳ ص۴۱۲ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: واما الذی یرجع الیٰ نفس الوقف فهو التابید وهو ان یکون مؤبداً حتی لو وقت لم یجز لانه ازالة الملک لا الیٰ حد (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقة، فصل واما شرائط الجواز) ـــ وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۳۹ کتاب الوقف۔

مسجد سے پرندوں کے گھونسلے اتارنے کا حکم

سوال:- بعض اوقات پرندے مساجد میں اپنے لیے گھونسلے بناتے ہیں اور ان میں انڈے اور بچے وغیرہ بھی دیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد میں کافی گندگی پھیل جاتی ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے ان کے گھونسلے اُتار کر باہر پھینکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ پرندوں کے گھونسلوں سے مساجد میں عموماً گندگی پھیلتی رہتی ہے نیز نمازیوں کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے مساجد سے ایسے گھونسلوں کا اکھاڑنا مرخص ہے۔

لما قال فی الهندیة: ولو کان فی المسجد عش خطاف او خفاش یقذر المسجد لا بأس برمیه بما فیه من الفراخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة الباب الخامس)[ل]

مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کا حکم

سوال:- بعض لوگ جمعرات کی شب اکٹھے ہو کر مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کے ساتھ ساتھ اُچھلتے اور کودتے ہیں جس کی وجہ سے نمازیوں کو کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو کیا ان لوگوں کا یہ عمل (ذکر بالجہر) شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت گاہ ہے، اس لیے اس میں ذکر کے نام پر مذکورہ طرز اور طریقہ پر اچھلنا کودنا اور ایک ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرنا شریعت کی رُو سے ناجائز اور ممنوع ہے، البتہ اگر ذاکرین ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے نمازیوں وغیرہ کو تکلیف نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وفی الملتقیٰ وعن النبی صلی الله علیه وسلم انه کره رفع الصوت عند قرأة القرآن والجنازة فما ظنک به عند الغناء الذی یسمونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا اصل له فی الدین

[ل] وقال العلامة الحصکفیؒ: ولا بأس برمی عش خفاش وحمام لتنقیته۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۶۳ کتاب الصلوٰة مطلب فیمن سبقت ... الخ) ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۲۷ کتاب الکراهیة الفصل التاسع فی المتفرقات۔

وزاد فی الجوهرة وما یفعله متصوفة فی زماننا حرام لا یجوز القصد والجلوس الیه۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۴۹ کتاب الحظر والاباحة ۔ قبل فصل فی اللبس)[1]

مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے میں بانئ مسجد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے

سوال:۔ ایک شخص نے موقوفہ زمین پر اپنے پیسوں سے مسجد بنائی، بعد میں کچھ لوگ باہر سے آکر اس مسجد کے قریب آباد ہوگئے، اب بانئ مسجد اور اہلِ محلہ میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق کون ہے؟ بانئ مسجد یا اہلِ محلہ؟

الجواب:۔ مسجد بنانے والا اہلِ محلہ کی نسبت مسجد کے تمام امور میں تصرف کرنے پر مقدم ہے کیونکہ بانی کو مسجد کی مرمت، بجلی، پانی کے اخراجات اور امام و مؤذن کے مقرر کرنے میں اہلِ محلہ پر سبقت حاصل ہے۔

لما قال العلامة ابراهيم الحلبي رحمه الله: رجلٌ بنى مسجداً وجعله لله فهو احق بمرمته وعمارته وبسط البواري والحصير والقناديل والاذان والاقامة والامامة فيه ان كان اهلاً لذلك وان لم يكن فالرأي في ذلك اليه وكذا ولد الباني وعشيرته من بعده اولى من غيرهم۔ (حلبی کبیری ص۶۱۵ فصل فی احکام المسجد)[2]

---

[1] وقال العلامة حموی رحمه الله: واجمع العلماء سلفاً وخلفاً على استحباب ذكر الله تعالى جماعة في المساجد وغيرها من غير نكير الا ان يشوش جهرهم بالذكر على نائم او مصلٍ او قارئ كما هو مقرر في كتب الفقه۔
(عیون البصائر حاشیة الاشباه والنظائر ج۴ ص۱۶ القول فی احکام المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج۵ ص۲۲۴ کتاب السیر الفصل الاول فی بیان صفة الجهاد۔

[2] وقال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: فیکون اولیٰ بولایة کمن اتخذ مسجداً یکون اولیٰ بعمارته ونصب المؤذن فیه۔
(البحر الرائق ج۵ ص۲۲۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۳۳ کتاب الوقف۔

غیر آباد مسجد کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسجد ویران ہو جائے اور لوگ اس میں نمازیں پڑھنا چھوڑ دیں تو اس کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا از روئے شریعت درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس زمین پر ایک دفعہ شرعی مسجد بن جائے تو قیامت تک کے لیے وہ مسجد ہی رہتی ہے اس میں کسی قسم کی فصل کاشت کرنا یا کسی دوسرے دنیاوی کام کے لئے استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے اگرچہ ویران ہی ہو جائے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: يبقى مسجداً ابداً الى يوم القيامة وبه يفتى۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ الوقف۔ مطلب فیما لو خرب المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ مکانات میں سے تبلیغی حضرات کے لیے مکان وقف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک جامع مسجد بناتے وقت ابتداءً مسجد کے نیچے کچھ مکانات تعمیر کر کے کرائے پر دے دیئے گئے اور ان کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف ہو رہی ہے، اب مسجد کی موجودہ انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان مکانات میں سے ایک مکان تبلیغی حضرات کے لیے وقف کیا جائے تو کیا عند الشرع یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اگر ان واقفین نے مکانات کے متعلق کوئی تصریح نہ کی ہو بلکہ مطلقاً وقف کیا ہو تو متولی اور انتظامیہ مسجد کے اہل حل وعقد کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، وہ اس مکان کو تبلیغی حضرات کی سکونت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں ورنہ واقفین کی شرائط کی پابندی ضروری ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: قال واذا اراد القيم ان يبنى

---

[1] وقال العلامة الكاسانيؒ: واما الذى يرجع الى نفس الوقف فهو التابيد وهو ان يكون مؤبداً حتى لو وقت لم يجز لانه ازالة الملك لا الى حد۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف والصدقة۔ الفصل واما شرائط الجواز)

ومثله فى الهداية ج۳ ص۶۳۹ كتاب الوقف۔

فیها قریة لاکرتها وحفاظها فیحرز فیها الغلة لحاجته إلی ذلك كان له أن یفعل ذلك۔ الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۴۲۵ کتاب الوقف، الفصل السابع فی تصرف القیم ۔الخ)[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ گھڑی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی

سوال:۔ کسی جگہ پر فوج کے ۲ دو یونٹ اکٹھے قیام پذیر تھے، وہاں پر ایک مسجد بھی تھی جس کے لیے ان فوجیوں نے مشترکہ طور پر چندہ کر کے ایک گھڑی خرید کر وقف کی، کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک یونٹ والے وہاں سے جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ یہ وقف شدہ گھڑی ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ اس یونٹ والوں کا مذکورہ گھڑی کو اپنے ساتھ لے جانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ کے مطابق یہ گھڑی چونکہ مسجد کے لیے وقف کی گئی اور وقف تام ہونے کے بعد وہ کسی کی ملکیت نہیں رہی، لہٰذا اس موقوفہ گھڑی کو کسی بھی یونٹ والے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: إذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)[2]

قبرستان کے لیے وقف شدہ زمین پر جنازہ گاہ بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے قبرستان

---

[1] وقال العلامة فخر الدين الرازي الشهير بقاضی خان رحمه الله: وكذا لو كان الوقف خانا على الفقراء واحتاج إلى خادم يكسح الخان ويقوم ويفتح بابه ويسده فسلم بعض البيوت إلى رجل أجرة له ليقوم بذلك كان له ذلك۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندية ج۳ ص۳۰۰ کتاب الوقف، باب الرجل يجعل داره مسجداً)

ومثله في الهندية ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف، الفصل الثاني في الوقف على المسجد ... في مال الوقف۔

[2] وقال العلامة التمرتاشي رحمه الله: فإذا تم ولزم (أي الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن (أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع۔ (تنوير الأبصار على صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)

ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف، فصل وأما الذي يرجع إلى الموقوف فأنواع۔

کے لیے زمین وقف کی، اب چونکہ قبرستان کے لیے جنازہ گاہ کی بھی اشد ضرورت ہے تو کیا واقف کی اجازت سے اس وقف شدہ زمین میں جنازہ گاہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ وقف میں واقف کی نیت معتبر ہوگی لہٰذا اس کے لیے سوائے معصیت کے ہر قسم کے تصرفات جائز ہیں، اور مذکورہ صورت میں جنازہ گاہ چونکہ ضروریاتِ مقبرہ میں سے ہے اور واقف کی اجازت بھی موجود ہے لہٰذا جنازہ گاہ بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية وله ان يخص صنفاً من الفقراء۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ مطلب شرائط الواقف المعتبرة)[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کی آمدن مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا

سوال: کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کیلئے وقف کرکے اُسے کرایہ پر دیدیا جس سے کافی آمدنی حاصل ہوئی، تو سوال یہ ہے کہ اس موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس سے آمدنی بھی حاصل ہوتی ہو تو متولی کے لیے اس آمدنی کو مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا جائز ہے۔

لما في الهندية: مسجد له مستغلات واوقاف اراد المتولي ان يشتري من غلة الوقف للمسجد دهناً وحصيراً وحشيشاً...... تفعل ما ترى من مصلحة المسجد كان له ان يشتري للمسجد ما شاء وان لم يوسع۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۰ كتاب الوقف الفصل الثاني ...... في مال الوقف)[2]

---

[1] وقال العلامة ابن نجيم رحمه الله: شرط الواقف كنص الشارع يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۵ كتاب الوقف — ومثله في تنقيح الحامدية ج۱ ص۱۲۶ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله: والذي يبدأ به ارتفاع الوقف اي من غلته عمارته شرط الواقف اولا ثم ما هو اقرب الى العمارة واعم للمصلحة كالامام للمسجد...... ثم السراج والبساط الى آخر المصالح۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۶۷ كتاب الوقف)

ومثله في الخانية على هامش الهندية ج۳ ص۲۹۷ كتاب الوقف۔ باب الرجل يجعل داره مسجداً۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کے درختوں کا حکم

سوال:- ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کی، مسجد کی دیوار سے ملحق ہی واقف کا گھر ہے، واقف نے وقف شدہ مسجد کے صحن میں اخروٹ کے درخت لگائے تھے، اب وہ کہہ رہا ہے کہ ان درختوں کے پھل پر صرف میرا ہی حق ہے جبکہ اہلِ محلہ اس کو اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو پورے محلہ کا حق قرار دیتے ہیں، شرعاً اس پھل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ وقف میں واقف کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، مذکورہ صورت میں واقف نے اگر وقف کرتے وقت تصریح کی ہو کہ میں نے اس درخت کو بھی وقف کیا تھا یا کچھ بھی نہ کہا ہو تو دونوں صورتوں میں درخت وقف ہوگا، البتہ اگر وقف کرتے وقت واقف نے اس درخت کا استثناء کیا ہو تو اس صورت میں واقف کے قول کا اعتبار کرکے درخت وقف شمار نہ ہوگا بلکہ واقف کی علیحدہ ملکیت متصوّر ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الاسعاف ویدخل فی وقف الارض ما فیہا من الشجر والبناء دون الزرع۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۶۱ مطلب فی وقف المنقول تبعاً للعقار)[1]

پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کے متصل بہت پرانا قبرستان ہے جس میں دو سو سال سے کسی بھی میّت کو دفن نہیں کیا گیا، اب اہلِ محلہ مسجد میں توسیع کے خواہشمند ہیں اور قبرستان کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنا چاہتے ہیں، تو کیا محلہ والوں کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ قبرستان اگر موقوفہ ہو اور اموات کے اجسام ظنِ غالب میں خاک ہو چکے ہوں اور گاؤں والوں نے اس میں اموات کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو پھر اس قبرستان کو مسجد میں شامل کرنا قابلِ اعتراض نہیں۔

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان الوقف کالبیع لا یدخل فیہا الزرع والثمر الا بالذکر۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔

ومِثلُہٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۱۹ کتاب الوقف۔ الفصل الثالث۔

لما قال فی الهندیة: لو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه ـ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز)[1]

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال: کیا محلہ والے یا حاکمِ وقت متولیٔ مسجد کو معزول کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: متولیٔ مسجد اور اسی طرح امام مسجد کو بغیر خیانت کے کوئی بھی معزول نہیں کر سکتا البتہ اگر شرعی جرم ثابت ہو جائے تو متولی اور امام مسجد کو اہلِ محلہ یا قاضی معزول کرنے کے مجاز ہیں۔

لما قال فی الهندیة: ولو ان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مأمون علی الوقف فللقاضی ان ینزعها من یده ـ

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۰۹ کتاب الوقف، الباب الخامس فی ولایة الوقف)[2]

طریقِ عام کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے مسجد کیلئے زمین وقف کی جو کہ طریقِ عام کے ساتھ متصل ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ مسجد نمازیوں کیلئے ناکافی ہوتی جا رہی ہے، اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس عام راستہ سے زمین کا کچھ حصہ مسجد میں فراخی کے لیے شامل کر لیا جائے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر راستہ کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنے سے راستہ تنگ نہ ہوتا ہو

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه ـ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز. الفصل السادس ـ

[2] ولما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: لا یصح عزل صاحب وظیفة بلا جنحة او عدم اهلیة ـــــ قال فی البحر واستفید من عدم عزل الناظر بلا جنحة عدمها لصاحب وظیفة فی وقف بغیر جنحة وعدم اهلیة

(رد المحتار ج۴ ص۳۸۲ کتاب الوقف)

ومثله فی الهدایة ج۳ ص۶۳۳ کتاب الوقف ـ

اور لوگوں کو آمد و رفت میں تکلیف نہ ہوتی ہو تو ایسا کرنا شرعاً مرخص ہے ورنہ نہیں؟

لما قال العلامة فخر الدين عثمان الزيلعي رحمه الله: اذا بنى قوم مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع فادخلوا شيئاً من الطريق فى المسجد وكان ذلك لا يضر باصحاب الطريق جاز ذلك۔ (تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۱ كتاب الوقف، فصل ومن بنى مسجداً الخ)[1]

مسجد کی زمین پر ڈاکخانہ بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف بھی تام ہوا ہے، اب حکومت اس مسجد کے ایک گوشہ میں ڈاک خانہ بنانا چاہتی ہے جس کی آمدنی مسجد کو ملے گی لیکن ملکیت حکومت کی رہے گی، اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے لیے وقف شدہ زمین حکومت کے اغراض و مقاصد کے لیے دینا شریعت مقدسہ کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے ایک دفعہ وقف کی گئی ہو تو اس میں ماسوائے مسجد کے متعلقہ امور کے دیگر امور مثلاً دوکان یا ڈاکخانہ وغیرہ بنانا جائز نہیں کیونکہ واقف کی نیت سے مخالفت لازم آتی ہے اور واقف کی نیت کے خلاف کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص والحكم به حكم بلا دليل۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۵ كتاب الوقف)[2]

---

[1] قال العلامة شهاب الدين احمد شلبي رحمه الله: طريق للعامة وهي واسعة فبنى فيه اهل المحلة مسجداً للعامة ولا يضر ذلك بالطريق قالوا لا بأس به، قوم بنوا مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع المسجد فأخذوا من الطريق فادخلوه فى المسجد اذا كان ذلك يضر باصحاب الطريق لا يجوز والا فلا بأس به۔ (شلبى على هامش تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۱ كتاب الوقف) ــ ومثله فى البحر الرائق ج۵ ص۲۵۶ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم بلا دليل اى لا دليل عليه سواء كان نصه فى الوقف نصاً او ظاهراً وهذا موافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه كما صرح به فى شرح المجمع۔

(رد المحتار ج۳ ص۳۴۴ كتاب الوقف)

ومثله فى الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ كتاب الوقف۔

مسجد میں خیاطت کرنے کا حکم

سوال :- مسجد میں خیاطت کرنا (کپڑے سینا) شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- خیاطت کا تعلق چونکہ دنیاوی امور سے ہے اور مسجد میں دنیاوی امور سے اجتناب ضروری ہے، لہٰذا مسجد میں خیاطت (درزی کا کام) کرنا شرعاً مکروہ ہے البتہ اگر کوئی مسجد کی حفاظت کے واسطے مسجد میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ : والخیاطۃ فیہ تکرہ الا اذا کان لضرورۃ حفظہ عن الصبیان و نحوھم۔

(حلبی کبیری ص٦١١ کتاب الصلوٰۃ. فصل فی احکام المسجد) [1]

متولی مسجد اور اہل محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیرات میں تصرّف کرنا

سوال :- ایک شخص نے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی اور بعد میں وہ اس مسجد کا متولی مقرر ہوا، اب دوسرے محلے کا ایک شخص اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جبکہ متولی اس کی اجازت نہیں دے رہا، تو کیا از روئے شرع متولی کا انکار جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں متولی مسجد اور اہلِ محلہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے محلہ والے کو اس مسجد میں ھدماً و بناءً تصرّف کرنا جائز نہیں، ایسے معاملات کے اختیارات صرف اہل محلہ اور متولی ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : اراد ونقض المسجد وبناءہ واحکم من الاوّل ان لم یکن البانی من اھل المحلۃ لیس لھم ذلک وان کان

---

[1] وقال العلامۃ حافظ الدین محمد بن محمد البزاز رحمہ اللہ : والخیاطۃ فیہ تکرہ الا اذا کان لحفظ المسجد عن الصبیان وخاط وکن الکاتب۔

(البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۴ ص٨٢ کتاب الصلوٰۃ الفصل السادس والعشرون)

ومثلہ فی الاشباہ والنظائر ج۴ ص۱۵۸ القول فی احکام المسجد۔

من اهل المحلة لهم ذلك ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد)[1]

بانی مسجد کے لیے لوگوں کو مسجد سے منع کرنا ناجائز ہے

سوال :- ایک مسجد کے لیے کچھ زمین وقف تھی، کسی نے اس زمین پر اپنے خرچ سے مسجد بنائی اور مسجد کی آبادی میں کسی نے بھی اس سے تعاون نہیں کیا، اب اس بانی کے ساتھ اہلِ محلہ اور پیش امام کی ناراضگی پیدا ہوگئی ہے جبکہ بانی مسجد یہ چاہتا ہے کہ اہلِ محلہ اور پیش امام کو مسجد میں آنے جانے سے روک دے، تو کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- بشرط صدق وثبوت بانی مسجد کا پیش امام یا اہلِ محلہ کو مسجد سے منع کرنا شرعاً حرام ہے۔

لما قال الله تبارك وتعالیٰ : وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ۔ (سورة البقرة آیت ۱۱۴)[2]

ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر خرچ کرنے کا حکم

سوال :- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا اس وقت درست ہے جب اس مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر فی الحال اس چندہ کی مسجد کو ضرورت نہ ہو اور آئندہ ضرورت پیش آنے کا امکان ہو تو پھر بھی دوسری مسجد میں اس چندہ کا استعمال

---

[1] وقال فی الهندیة : وفی الکبریٰ مسجد مبنی اراد رجل ان ینقضه ویبنیه ثانیاً احکم من البناء الاول لیس له ذلك لانه لا ولایة له کذا فی المضمرات ۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۵۷ کتاب الوقف الباب الحادی عشر)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۲۶۸ کتاب الوقف باب الرابع فی المسجد

[2] وقال العلامة بیضاوی رحمه الله : عام لکل من خرب مسجداً او سعی فی تعطیل مکان مرشح للصلوٰة ۔ (تفسیر بیضاوی ج۱ ص۱۰۲ ۔ سورة البقرة)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۵۶ سورة البقرة ۔

درست نہیں، تاہم اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو پھر کسی دوسری مسجد پر صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعن الثانی ینقل الیٰ مسجد آخر باذن القاضی..... حشیش المسجد وحصرہ مع الاستغناء عنهما وکذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف فی وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الیٰ اقرب مسجد او رباط او حوض۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)[۱]

مسجد کی چھت کی پرانی چادروں کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد جو کہ ۱۹۰۵ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی چھت چادروں کی تھی بعد میں اسے شہید کرکے اس میں توسیع کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اہل محلہ پیش امام کیلئے ایک مکان بھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اب اگر اس مسجد کی پرانی چادروں کو پیش امام کے گھر میں استعمال کیا جائے تو شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ چادریں مسجد کے کسی کام میں استعمال نہ ہو سکتی ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کو فروخت کرنا یا امام صاحب کے گھر میں استعمال کرنا از روئے شریعت مرخص ہے بلکہ ان کو فروخت کرکے رقم مسجد کی تعمیر جدید میں خرچ کرنا بھی جائز ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: سئل ابوبکر عن حشیش المسجد یخرج من المسجد ایام الربیع؟ قال ان لم یکن له قیمة فلا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس برفعه والانتفاع به۔ (فتاویٰ تاتارخانیة ج۵ ص۸۵۵ کتاب الوقف، الفصل الحادی والعشرون فی المساجد)[۲]

---

[۱] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد او حوض خرب ولا یحتاج الیه لتفرق الناس هل للقاضی ان یصرف اوقافه الیٰ مسجد آخر او حوض آخر؟ قال نعم۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج۵ ص۸۷۷ کتاب الوقف) ـــ ومثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۳۔

[۲] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: حشیش المسجد اذا اخرج من المسجد ایام الربیع ان لم یکن له قیمة لا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس بدفعه والانتفاع به۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۵ کتاب الوقف، الفصل الرابع)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۹ کتاب الوقف، الباب الحادی عشر۔

متولی مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کسی مسجد کا بانی تھا اور مسجد کے تمام اختیارات اس کو حاصل تھے، تو اس کی وفات کے بعد اس کے اختیارات اُس کی اولاد کو منتقل ہوسکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کے بانی اور متولی کو تمام تر اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں اور مسجد کے لیے مؤذن، امام و خطیب وغیرہ مقرر کرنا اسی کا حق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی وفات کے بعد تمام تر اختیارات اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوں گے، وہ اپنی خوشی سے مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ رحمہ اللہ: والباني احق بالامامة والاذان وولدہٗ من بعدہ وعشیرتہٗ اولیٰ بذٰلك من غیرھم وفي المجرد عن ابي حنیفۃؒ ان الباني اولیٰ بجمیع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تأھل للامامۃ۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف) [1]

مسجد کا پنکھا گھر میں استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے پنکھا خریدا اور مسجد کے لیے وقف کیا، تو کیا مسجد کا پیش امام اس پنکھے کو اپنے گھر میں استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر یہ پنکھا واقعتاً مسجد کے لیے وقف شدہ ہو تو مسجد کے پیش امام کے لیے اس پنکھے کا اپنے گھر میں استعمال شرعاً جائز نہیں، اگرچہ پیش امام کا وجود مصالح مسجد میں سے ہے تاہم اگر واقف نے علی الاطلاق نیت کی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال في الھندیۃ: متولي المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد

---

[1] وقال الشیخ ابراھیم الحلبي رحمہ اللہ: وکل اولاد الباني وعشیرتہ من بعدہٗ اولیٰ من غیرھم۔ (حلبي کبیری ج ص ۶۱۵ فصل في احکام المسجد)
ومثلہٗ في خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۲۱ کتاب الفصل، الباب الرابع۔

الیٰ بیتہٖ ولہٗ ان یحملہ من البیت إلی المسجد ۔

(الفتاوی الهندیۃ ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں نکاح پڑھانے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مسجد میں نکاح پڑھانے کو سنت سمجھتے ہیں، کیا واقعی مسجد میں نکاح پڑھانا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح پڑھانا خود ایک مسنون عمل ہے جو عبادت کا ایک شعبہ ہے اسلئے مسجد میں نکاح کے ایجاب وقبول کرانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم ایسے مواقع پر کوئی ایسی حرکت کرنا جو مسجد کے آداب کے منافی ہو سے اجتناب کرنا اشد ضروری ہے ۔

لما ورد فی الحدیث : عن عائشۃ رضی اللہ عنہا) قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلنوا ھٰذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔

(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح)[2]

ذکر واذکار اور نماز میں مشغول لوگوں کو سلام کرنے کا حکم

سوال:۔ مسجد میں لوگ عموماً ذکر واذکار اور نماز میں مشغول ہوتے ہیں، تو ایسی حالت میں مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے اُن پر سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والا شخص بھی حکماً ذاکر ہے جیسا کہ روایت

---

[1] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : متولی المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد إلی بیتہ ولہٗ ان یحمل من البیت الی المسجد۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف۔ الفصل الرابع)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۵۱ کتاب الوقف۔ الفصل الحادی والعشرون۔

[2] وقال فی الهندیۃ : مباشرۃ عقد النکاح فی المساجد مُسْتَحَبٌ ۔

(الفتاوی الهندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۲۸۳ کتاب النکاح۔

سے ثابت ہے، اس لیے یہ بھی ذاکر کے حکم میں ہو کر اس کو سلام کرنا جائز نہیں، تاہم اگر کوئی نماز کے بعد ویسے ہی فارغ بیٹھا ہو تو اسے سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جلس مجلس ینتظر الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ۔ (ترمذی ج۱ ص۱۱۱ ابواب الجمعۃ) [1]

مسجد میں تھوکنے کا حکم

سوال: سنا ہے کہ انسان کے منہ سے نکلنے والا تھوک پاک ہے، اس کے پاک ہونے کی صورت میں کیا مسجد میں تھوکنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مساجد اللہ تعالیٰ کا گھر اور مسلمانوں کی عبادت گاہ ہیں اس لیے ان کی عظمت اور عزت برقرار رکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، ایسے کام جن میں حقارت کا معمولی سا شائبہ بھی ہو ان سے بھی مساجد کو پاک رکھا جائے، مسلمان کی تھوک اگرچہ بالاتفاق پاک ہے لیکن مسجد کی عظمتِ شان اور آداب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں تھوکنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: ولا یبزق علی حیطان المسجد ولا علی ارضہ ولا علی البواری وکذا المخاط لکن یأخذہ بطرف ثوبہ ویدلک بعضہ ببعض۔ (کبیری ص۶۱۲ فصل فی احکام المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر پیش امام کا تصرف کرنا

سوال: مسجد کے ساتھ متصل زمین مسجد کے

---

[1] وقال فی الھندیۃ: ویکرہ السلام عند قراءۃ القرآن جھراً وکذا عند مذاکرۃ العلم وعند الاذان والاقامۃ والصحیح انہ لا یرد فی ھٰذہ المواضع ایضاً۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراھیۃ۔ الباب السابع)
وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۱ ص۴۵۶ باب ما یفسد الطلاق۔ مطلب المواضع التی یکرہ فیھا السلام۔

[2] لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم البزاق فی المسجد خطیئۃ وکفارتھا دفنھا۔ (ابوداؤد ج۱ ص۶۸ باب کراھیۃ البزاق فی المسجد)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس۔

مصارف کے لیے وقف کی گئی تھی، اس زمین میں مسجد کا پیش امام اپنے لیے کھیتی باڑی کرتا رہا، کچھ عرصہ بعد پیش امام نے چپکے سے مسجد کی انتظامیہ یا کسی اور کو بتائے بغیر اس زمین کا سرکاری کاغذات میں انتقال اپنے نام کرالیا ہے، تو پیش امام کے اس اقدام کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا یہ زمین پیش امام کی ملکیت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مذکورہ زمین مسجد اور مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی گئی ہے جس میں پیش امام کی شخصیت کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا مسجد کے مصارف کے لیے جو چیز وقف ہو وہ مسجد ہی کا حق ہے اور پیش امام کا قبضہ اور اپنے نام انتقال کرانا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے پیش امام کا یہ اقدام خلافِ شرع ہو کر اس زمین کا مالک متصور نہ ہوگا۔

لما قال فی الھندیۃ: ارض وقف علی مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلھا رجل حوضاً للعامۃ لا یجوز للمسلمین انتفاع عاد ذلک الحوض۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۶۴ کتاب الوقف الفصل الثانی)

ایک مسجد کی موجودگی میں دوسری مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ ایک وسیع و عریض مسجد کے باوجود بعض لوگ امام سے اختلاف کا بہانہ بنا کر دوسری مسجد تعمیر کرلیں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے قوم میں بے اتفاقی کا احتمال بھی ہو۔

الجواب:۔ ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے قوم میں بے اتفاقی اور اختلافات کا ذریعہ بننا بدقسمتی کی دلیل ہے۔ اگر امام سے اختلاف ذاتی وجوہات یا غیر شرعی امور کی وجہ سے ہو تو ایسے اختلافات کا شکار ہونا خود بھی گناہ ہے، پھر اس ایک گناہ کے ارتکاب کے بعد مسلمانوں میں بے اتفاقی کا موقع فراہم کرنا دوسرا بڑا جرم ہے۔ ایسی صورت میں دوسری مسجد بنانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم اگر ان واقعات کی وجہ سے کوئی شخص زمین باقاعدہ وقف کرکے اس پر مسجد بنائے تو دوسری مسجد بھی مسجدِ شرعی رہے گی، اس کے ذاتی اغراض کا معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ البتہ بوقتِ ضرورت یا باہمی اختلافات سے بچنے کے لیے دوسری مسجد بنانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم المحلۃ المسجد وضربوا فیہ حائطاً ولکل منھم امام علی حدۃ ومؤذنھم واحد لا بأس بہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا)

مسجد کے بعض حصہ کو سڑک میں شامل کرنا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جو اپنے رقبہ کے لحاظ سے نمازیوں کی تعداد کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے، اور مسجد کے متصل ایک سڑک بھی بن رہی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کا کچھ حصہ اس سڑک میں شامل کردیا جائے تاکہ سڑک وسیع ہو کر لوگوں کے مفاد میں بہتر ثابت ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کا کچھ حصہ افادۂ عام کے لیے سڑک میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اسے کسی اور کام میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں اگرچہ فوائد اس میں زائد ہوں، لہٰذا مسجد کا کوئی بھی حصہ سڑک میں شامل کرنا جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ (جعل شئ) ای جعل البانی شیئا (من الطریق مسجدا) لضیقه ولم یضر بالمارین (جاز) لانهما للمسلمین (کعکسه) ای کجواز عکسه وهو ما اذا جعل فی المسجد ممر لتعارف اهل الامصار فی الجوامع وجاز لکل احد ان یمر فیه حتی الکافر الا الجنب والحائض والدواب زیلعی (کما جاز جعل) الامام (الطریق مسجدا لا عکسه) لجواز الصلوٰة فی الطریق لا المرور فی المسجد۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۷۷ احکام المساجد کتاب الوقف)؎

مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا

سوال:۔ مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا جیسا کہ آجکل جلسوں میں ہوتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مساجد میں بلند آواز سے تقریر کرنا اور ایسے ہی نعت خوانی کرنا اگر کسی نمازی کی نماز میں باعثِ تشویش نہ ہو تو جائز ہے، لیکن اگر کہیں نمازیوں کی نماز میں تشویش کا ذریعہ ہو تو مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ انشاد ضالة او شعر الا ما فیه ذکر ورفع صوت بذکر الا للمتفقهة۔

؎ وفی الهندیة ان ارادوا ان یجعلوا شیئا من المسجد طریقا للمسلمین فقد قیل لیس لهم ذلک وانه صحیح کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۵ کتاب الوقف)
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۵ کتاب الوقف۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول و فی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانیؒ. اجمع العلماء سلفاً وخلفاً علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا ان یشوش جهرهم علی نائم او مصل او قاری. الخ. (رد المحتار ج ۱ ص ۶۶۰ احکام المساجد کتاب الصلوٰۃ) [1]

سرکاری زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا

سوال :- ایک مقام پر بعض لوگوں نے گورنمنٹ کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے مسجد تعمیر کرلی جبکہ حکومت نے انہیں مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی۔ اب حکومت اپنے نقشہ کے مطابق شہر کی تعمیر چاہتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی غصب شدہ زمین پر بنائی گئی مسجد مسجدِ شرعی کے حکم میں ہے؟ اور کیا حکومت اس کو منہدم کرکے اپنے مصرف میں لاسکتی ہے؟

الجواب :- مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے لیے واقف کا ملکِ تام ہونا شرط ہے، جبکہ یہ زمین حکومت کی ملکیت ہے، تو عوام کو حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں۔ کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے وہاں مسجد بنالی جائے تو وہ شرعی مسجد نہیں، اسلئے اگر حکومت ایسی مسجد کو منہدم کرکے اس جگہ کو کسی اور مصرف میں استعمال کرے تو جائز ہے تاہم اگر ضرر نہ ہو تو اسی جگہ مسجد کو باقی رکھنا بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لا بد ان یکون مالکاً له وقت الوقف ملکاً باتاً ولو بسبب وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولی جاز۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [2]

---

[1] فی الصحیح البخاری عن السائب بن یزید قال: کنتُ قائماً فی المسجد فحصبنی رجلٌ فنظرت الیه فاذا عمر بن الخطابؓ اذهب فأتنی بهذین فجئته بهما فقال ممن انتما او من این انتما قال من اهل الطائف قال لو کنتما من اهل البلد لأوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص ۶۷ باب رفع الصوت فی المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص ۲۰۴ کتاب الصلوٰۃ۔

[2] قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائط الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفها ثُمَّ اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۸ کتاب الوقف)   وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۳۵۳ کتاب الوقف۔

مسجد کے مسبع ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد جو کہ عوام کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے لیکن ڈیزائن اور نقشہ کے لحاظ سے مسبع ہے جبکہ عام مساجد کی تعمیر مربع اور مستطیل شکل میں ہوتی ہے اور فقہاء امت کے اقوال سے بھی اس کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مروجہ طریقہ کو چھوڑ کر جدید طریقہ سے مسجد بنانا جائز ہے؟ جبکہ اس مسجد کا ڈیزائن بعض غیر مسلم عبادت گاہوں سے بھی متشابہ ہے؟

الجواب:۔ مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہ اور شعائر اللہ میں سے ہیں جن کا مقصد یادِ الٰہی اور صلوٰۃ و اذکار ہیں، ان کی یہ حیثیت تب برقرار رہتی ہے جب یہ اسلامی مساجد کی ہیئت اور شکل و صورت کی طرح ہوں اور ان کو بعض غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کا ہم شکل بنانا جائز نہیں، تاہم اگر تشبہ کی نیت کے بغیر محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسا نقشہ اختیار کیا گیا ہو تو پھر اس مسجد کی شرعی حیثیت پر یہ نقشہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۔ الآیۃ (سورۂ ھود، رکوع ۱۰)

عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم۔ رواہ احمد وابوداؤد۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۷۵ کتاب اللباس)[1]

مسجد میں گم شدہ چیزوں کے اعلان کا حکم

سوال:۔ لاؤڈ سپیکر سے استفادہ کی خاطر عموماً گم شدہ اور جلسوں کے اعلانات مساجد میں ہوتے رہتے ہیں، کیا از روئے شرع یہ امور جائز ہیں؟

الجواب:۔ مسجد عبادت گاہ ہے اس لیے جو چیز مسجد سے باہر گم ہو گئی ہو تو اس کا اعلان مسجد میں کرنا جائز نہیں البتہ جو چیز مسجد میں گم ہوئی ہو تو اس کا اعلان مسجد کے اندر بھی مرخص ہے۔ اسی طرح مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان کرنا انسانی جان کی عظمت کی وجہ سے جائز ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ (یکرہ انشاد الضالۃ) قال السید احمد الطحطاوی فی حاشیۃ علی الدر المختار تحت قولہ وانشاد الضالۃ لقولہ علیہ السلام اذا رأیتم من ینشد الضالۃ فی المسجد فقولوا لا ردھا اللّٰہ علیک قولہ الا ما فیہ ذکر نحوہ الموعظۃ لانہ

---

[1] وَمِثْلُہٗ فی ابی داؤد ج ۲ ص ۲۰۳ کتاب اللباس، باب القمیص

کان ینشد الشعر بین یدیه صلی اللّٰه علیه وسلم وهو فی المسجد ویأمر حسانا بذٰلك۔ (الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۲۷۸ مکروهات الصلوٰة۔ فصل فی احکام المساجد) [1]

مسجد کی جائدادِ موقوفہ پر دعویٰ ارث

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی اور مکان کسی شخص نے مسجد کی ضروریات کے لیے وقف کیا، امام کو مسجد کے مکان میں رہائش کی اجازت دی گئی، جب تک موصوف مسجد کے امام تھے تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا لیکن موصوف کی رحلت کے بعد اس کے پسماندہ ورثاء مکان پر قبضہ جما کر مالکانہ حقوق کا دعویٰ کررہے ہیں ـــــ کیا مسجد کی موقوفہ جائداد پر کسی کے ارث کا دعویٰ درست ہے؟

الجواب:۔ اگر مکان اور زمین مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہوں تو امام صاحب کے پسماندہ ورثاء بطور وراثت اس پر قابض نہیں ہوسکتے، کیونکہ مسجد کے لیے وقف شدہ چیز کسی کی ملک نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ مسجد کی ضروریات کے لیے ہی استعمال ہوگی۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجدًا لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصًا للّٰه تعالیٰ وهذا لان الاشیاء کلها للّٰه تعالیٰ۔ (الهدایة ج ۲ ص ۶۲۱ کتاب الوقف، فصل فی المسجد) [2]

---

[1] لما قال العلامة محمد یوسف البنوری: واما انشاد الضالة فلها صورتان احدهما وهی اقبح واشنع بان یضل شیء خارج المسجد ثم ینشد فی المسجد لاجل اجتماع الناس فیه۔

والثانیة ان یضل فی المسجد نفسه فینشد فیه وهذا یجوز اذا کان من غیر لغط وشغب۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۳۱۳ باب ماجاء فی کراهیة البیع والشراء.....والشعر فی المسجد)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۱ ص ۶۶۰ مطلب فی افضل المساجد، کتاب الصلوٰة۔

[2] وفی الهندیة: اما حکمه عندهما زوال العین عن ملکه الی اللّٰه تعالیٰ وعند ابی حنیفة رحمه اللّٰه تعالیٰ حکمه صیرورة العین محبوسة علی ملکه بحیث لا تقبل النقل عن ملك الی ملك والتصدق بالغلة المعدومة متی صح الوقف بان قال جعلت ارضی هذه صدقة موقوفة مؤبدة او اوصیت بها بعد موتی فانه یصح حتی لا یملك بیعه ولا یورث عنه لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۳۵۲ الباب الاول فی تعریف الوقف، کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲/۳۵۱ کتاب الوقف۔

مسجد میں کھانے پینے کا حکم

سوال:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں تو ان میں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد میں کھانا پینا صرف معتکف کے لیے جائز ہے، البتہ غیر معتکف یا مقیم وغیرہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں کھانا کھانا چاہتے ہیں تو بغیر نیت اعتکاف کے مکروہ ہے، لہٰذا مسجد میں کھانا کھاتے وقت اعتکاف کی نیت کرلی جائے۔ مسجد کے ساتھ متصل زمین یا کمرہ کو چھوڑ کر بغیر مسجد میں ہی کھانا کھانا اچھا نہیں۔[1]

وفی الهندیة: ویکره النوم والاکل لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیه ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ماشاء کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیه ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة۔ الباب الخامس فی آداب المسجد ـه

مدرس کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا

سوال:۔ مسجد میں بچوں کو پڑھانے والے استاد کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مدرس کو مسجد کے لیے جمع شدہ فنڈ سے تنخواہ دینا جائز نہیں کیونکہ مدرس مسجد کے مصارف میں سے نہیں ہے، اس لیے مدرس کی تنخواہ کا کوئی اور انتظام کیا جائے۔ البتہ اگر جمع شدہ فنڈ مسجد کی ضروریات سے زائد ہو تو اس کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جا سکتا ہے جو اقرب الاقرب ہو۔

قال الحصکفیؒ: حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و(کذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (الی اقرب مسجد او رباط او بئر) وحوض (الیه)۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)

تاہم اگر واقف نے مال دیتے وقت یہ نیت کی ہو کہ اس مال سے مسجد اور اس کے متعلق امام و مؤذن اور مدرس کو تنخواہ دی جائے تو اس صورت میں جائز ہے۔[2]

---

[1] قال قاضی خانؒ: ویباح للمعتکف الاکل والشرب فی معتکفه (ج۱ ص۲۳۲ باب الاعتکاف، قاضیخان علی هامش فتاوی هندیه)۔ وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۱ ص۶۶۱ احکام المساجد۔

[2] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئًا من ذلک الی امام المسجد والی مؤذن المسجد لیس له ذلک الا ان کان الواقف شرط ذلک فی الوقف۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد۔ الفصل الثانی)

مسجد میں رہائش پذیر طلباء کا مسجد کی چیزوں کو استعمال کرنا

سوال:۔ مسجد میں رہائش پذیر طلباء جو کہ علم دین حاصل کر رہے ہوں کیا وہ مسجد کی اشیاء مثلاً بجلی، لکڑی، دری وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ اشیاء کا طلباء کو استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ طلباء کرام مساجد کے مصالح سے متعلق نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو امام و مؤذن کی طرح ان کے لیے بھی استعمال جائز ہے۔

قال ابن عابدین (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفين على المسجد احدهما على العمارة والآخر الى امامه اومؤذنه والامام والمؤذن لا يستقر لقلة المرسوم للحاكم الدين ان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الاصلاح من اهل المحلة۔ (ردالمحتار ج۳ ص۴۳۶ کتاب الوقف)[1]

عارضی مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں

سوال:۔ ہم ایک سرکاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں جبکہ اس کالونی میں کوئی مسجد نہیں ہے اور حکومت نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نقشہ کے مطابق آپ کو مسجد کے لیے زمین دیں گے، کالونی میں دو دکانیں اور ان کے سامنے برآمدہ بھی ہے۔ کیا فی الحال عارضی طور پر ہم ان دو دکانوں کی ہیئت کو بدل کر مسجد بنا سکتے ہیں؟ مثلاً ان کے درمیان میں محراب بنایا جائے جبکہ یہ دکانیں حکومت کی ملک ہیں۔ اور بعد میں جب حکومت کی طرف سے مسجد کے نام پر زمین الاٹ ہوگی تو اس الاٹ شدہ زمین پر مستقل طور پر مسجد بنائی جائے گی۔ کیا یہ دو دکانیں جن میں عارضی طور پر مسجد بنائی گئی تھی بعد میں اس کو دوبارہ دکانوں کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ جس زمین پر عارضی طور پر مسجد بنائی جائے یا مغصوبہ زمین پر مسجد بنائی جائے تو یہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں، ضرورت ختم ہونے پر مالک اس زمین کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتا ہے، چونکہ یہ دوکانیں بھی مالک کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے استعمال ہوئی ہیں

---

[1] وفی الهندية: واذا اراد ان يصرف شيئاً من ذلك الى امام المسجد او الى مؤذن المسجد فليس له ذلك الا ان كان الواقف شرط ذلك فی الوقف كذا فی الذخيرة۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۳ كتاب الوقف)۔ ومثله فی خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۶

اس لیے یہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں بلکہ بعد مالک یعنی حکومت اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افادات الواقف لا بدّ ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب فاسد وان لا یکون محجورًا عن التصرف حتّٰی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو جاز المالك وقف الفضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [1]

معتکف کا مسجد میں ریح (ہوا) خارج کرنا

سوال:۔ رمضان المبارک میں اعتکاف کے دوران خروجِ ریح کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بدبو پھیلنے کے سبب مسجد میں ہوا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے جس سے مسجد کو پاک رکھا جائے، چونکہ معتکف کے لیے مسجد میں سونے کی اجازت ہے اس لیے سونے کے ساتھ جو اس کے لوازمات ہیں وہ سب جائز ہیں تاہم بہتر نہیں۔

وفی الهندية: اختلف فی الذی یفسوا فی المسجد فلم یر بعضهم بأسًا وبعضهم قالوا لا یفسوا ویخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح ولا بأس للمحدث ان یدخل المسجد فی اصح القولین ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف۔
(الفتاوی الهندية ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهية الباب الخامس) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائطه الملك وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضًا فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفًا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۲ ص۳۵۴ کتاب الوقف)

[2] قال ابن عابدینؒ: وکذا لا یخرج فیه الریح من الدُّبر کما فی الاشباه واختلف فیه السلف فقیل لا بأس وقیل یخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص۲۸۶ احکام المساجد)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۲ ص۶۲ کتاب الوقف۔

مسجد کا پانی گھر لے جانا

سوال:۔ بعض علاقوں میں مسجد کا پانی اکثر لوگ گھر لے جاتے ہیں، کیا مسجد کا پانی گھر لے جانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ یہ پانی اگر صرف مسجد کے لیے وقف ہو تو پھر مسجد کی ضروریات تک محدود رہے گا، مسجد سے گھروں کو پانی لے جانا جائز نہیں، البتہ اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں لیکن مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔

اب اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے تو وقف کیا ہے مگر پانی بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہو تو اس میں بھی چندہ دہندگان کی نیت ضروری ہوگی۔

قال ابن نجیمؒ التوضی من السقایة اذا اتخذها للشرب اختلف المشائخ ولو اتخذها للتوضوء لا یجوز الشرب منه بالاجماع۔ (البحر الرائق جلد ۵ ص۲۵۵ کتاب الوقف)[1]

مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی تھی جس میں اس نے یہ تعین کیا تھا کہ نصف زمین کو فروخت کرکے مسجد کی تعمیر پہ لگا دی جائے اور نصف زمین مزارعت کے لیے ہے اور اس سے حاصل شدہ منافع امام کی تنخواہ میں صرف کیا جائے۔ اب جس مزارع کے پاس زمین ہے وہ نفع دینے سے انکاری ہے، ان حالات میں مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا فنڈ جو مسجد کی تعمیر کے لیے خاص ہو اس سے امام کو تنخواہ نہیں دی جاسکتی، اگر واقف اس کی نیت کرے تو اس صورت میں دینا جائز ہے، البتہ مسجد کی عام ضروریات کے لیے رکھے ہوئے چندہ سے امام کو تنخواہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ بھی مسجد کی ضرورت ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتحد الواقف والجهة) ان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والآخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر

---

[1] قال ابو اللیث السمرقندیؒ: یبدل بثمنه فی مسجد آخر فی موضع ما لعمارة المسجد او فی الظرف للشرب لا یجوز التوضی به الا اذا کان کثیراً وکذا لا یجوز دفع الجر من السقایة۔ (الفتاوی النوازل ص۲۲۳ کتاب الوقف) ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف)

لقلة المرسوم للحاکم الدین وان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۶۰ کتاب الوقف مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوه)[1]

مسجد کے فنڈ سے امام کے لیے مکان بنانا

سوال:- ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس کے ساتھ متصل رقبہ مسجد کے لیے وقف ہے اس میں بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کرالیا جائے، لیکن مکان کی تعمیر کے لیے مستقل چندہ نہیں کیا گیا بلکہ مسجد کے فنڈ سے ہی مکان کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ کیا عند الشرع مسجد کے فنڈ سے امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں مکان کی تعمیر مسجد کے فنڈ کے مصارف میں سے نہیں ہے البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے کہ اس فنڈ سے امام مسجد کے لیے مکان بھی تعمیر کرلیا جائے تو پھر شرعاً جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والاخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۶۰ کتاب الوقف)[2]

---

[1] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولو شرط الواقف فی الوقف الصرف الی امام المسجد وبیّن قدره یصرف الیه ان کان فقیراً وان کان غنیاً لا یحل له وکذا الوقف علی الفقهاء والمؤذنین۔
(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ الباب الحادی عشر فی المسجد والفصل الثانی فی الوقف علی المسجد۔

[2] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذٰلك الی امام المسجد او الی مؤذن المسجد فلیس له ذٰلك الّا ان کان الواقف شرط ذٰلك فی الوقف کذا فی الذخیرة۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف الباب الحادی عشر فی المسجد الفصل الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

دو مسجدوں کا قریب قریب ہونا

سوال:۔ ہماری مسجد کے قریب تقریباً ۵ گز کے فاصلہ پر ایک چبوترہ ہے، ہمارے محلہ میں عقائد کے لحاظ سے بہت اختلاف ہے، اسی اختلاف کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز کو جائز نہیں سمجھتے، ان حالات میں ہر فریق نے اپنے لیے الگ الگ مسجد بنائی ہے لیکن دونوں مساجد اتنی قریب ہیں کہ بسا اوقات ایک دوسرے کی تکبیرات اور قرأت سُنی جاتی ہے۔ ان حالات میں دوسری مسجد کا قیام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اہل محلہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ آپس میں صلح کرلیں اور اختلاف کو رفع کر دیں اور اگر اختلاف رفع نہ ہو سکے تو رفع فساد کے لیے ایک مسجد کو تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے اس لیے قریب میں دوسری مسجد بنانا بطریق اولیٰ جائز ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فيه حائطاً ولكل منهم امام على حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۳۵ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکرہ فیہا)[1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:۔ کسی کو مسجد میں آنے سے منع کرنے کا شرع میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ ایک عبادت گاہ ہے جس میں ہر ایک کو آنے کا حق حاصل ہے کہ اس میں نماز و تلاوت و ذکر کرے۔ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (سورۃ الجن آیت ۱۸) اس لیے مساجد میں آنے سے کسی کو منع کرنا گناہِ عظیم ہے، قرآن کریم میں مساجد میں آنے سے منع کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے، ارشادِ ربانی ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا (البقرہ ۱۱۴) البتہ اگر مسجد تنگ ہو تو اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر دوسرے محلے والوں کو مسجد آنے سے روکا جا سکتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی القنية ولكن لاهل المحلة ان يمنعوا من ليس منهم

---

[1] قال الحصکفیؒ: وجعل المسجدين واحدا وعكسه لصلوٰة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۶۳ احکام المساجد)۔ ومثله فی الهندية ج ۵ ص ۳۲۰ كتاب الكراهية ۔

عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بہم مسجد۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۶۲ کتاب الصلوٰۃ) [1]

مسجد میں گوبر کا استعمال

سوال:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال کیسا ہے؟ جیسا کہ بعض مساجد میں آگ جلانے یا مٹی میں خلط کرکے گارا بنا کر استعمال کیا جاتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال جائز نہیں، البتہ ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے تاہم اگر گوبر کے علاوہ کسی متبادل چیز سے ضرورت پوری ہوسکتی ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس متبادل چیز کو استعمال کیا جائے۔

قال ابن عابدینؒ: (ولا تطیینہ بنجس) فی الفتاویٰ الھندیۃ یکرہ ان یطین المسجد بطین تدبل بماء نجس بخلاف السرقین اذا جعل فیہ الطین لان فی ذٰلک ضرورۃ وھو تحصیل غرض لا یحصل الا بہ کذا فی السراجیۃ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المساجد) [2]

ویران مسجد کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک پرانی مسجد ہے جو کسی وقت آباد تھی لیکن اب لوگ اس میں نماز نہیں پڑھتے، بعض لوگ اس میں مویشی بھی باندھتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس پرانی اور ویران مسجد کو جنازہ گاہ میں تبدیل کیا جائے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب کسی مقام پر ایک دفعہ مسجد بنا دی جائے اور مستقلاً اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہو تو اس کو ویران ہونے کے بعد کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، لہٰذا اس ویران مسجد کو جنازہ گاہ یا اصطبل میں بدلنے کی اجازت

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وکذا لاھل المحلۃ ان یمنعوا من لیس منھم عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بھم المسجد۔ (البحرالرائق ج ۵ ص۲۵۰ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۳۲۲ کتاب الکراھیۃ)

[2] قال ابن نجیمؒ: اذا نزح الماء النجس من البئر کرہ لہ ان یبل بہ الطین فیطین بہ المسجد علیٰ قول من اعتبر نجاسۃ الطین۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۳۱۷ کتاب الکراھیۃ الباب الخامس فی اداب المسجد۔

نہیں بلکہ اگر ہو سکے تو از سرِ نو اس مسجد کو تعمیر کر کے آباد کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حولہ واستغنی عنہ یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعۃ (وبہ یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد اٰخر سواء کان یصلون فیہ اولا وھو الفتوٰی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیہ مجتبیٰ وھو الاوجہ۔

(ردالمحتار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف مطلب فیما لوخرب المسجد وغیرہ)[1]

مسجدِ شرعی کا تبادلہ

سوال:۔ زید نے مسجد کے لیے ایک جگہ دی تھی اور باقاعدہ طور پر اہلِ محلہ نے وہاں مسجد تعمیر کر کے نماز شروع کر دی، اب یہ شخص کہتا ہے کہ یہ جگہ مجھے واپس کر دی جائے میں اس کے بدلہ میں دوسری جگہ دیتا ہوں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ جو جگہ ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کر دی گئی اور باقاعدہ طور پر وہاں مسجد بھی بنائی گئی اور نماز شروع ہو گئی تو ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی، اب اس کو منہدم کر کے اس کے بدلے میں دوسری مسجد بنانا یا اس کی جگہ کو تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حولہ واستغنی عنہ یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعۃ (وبہ یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد اٰخر سواء کان یصلون فیہ اولا وھو الفتوٰی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیہ مجتبیٰ وھو الاوجہ۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۵۸ باب الوقف مطلب فیما لوخرب المسجد وغیرہ)[2]

---

[1] قال طاہر البخاریؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریۃ فیہا المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیہ احد فلا بأس بان یاخذہ صاحبہ ویبیعہ وھو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثتہ وھو مسجد ابداً۔ (خلاصۃ الفتاوی جلد۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد واوقافہ) ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] وفی الخلاصۃ الفتاوی: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریۃ التی فیہا المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیہ احد فلا بأس بان یاخذہ صاحبہ ویبیعہ وھو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثتہ وھو مسجد ابداً۔ (ج۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد وغیرہ) ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

مسجد میں کسی کے لیے جگہ متعین کرنا

سوال:۔ بعض لوگ مسجد کے اندر اپنے رفقاء کے لیے بیٹھنے کی جگہ متعین کر دیتے ہیں اور اس جگہ پر چادر یا جائے نماز رکھ کر دوسروں کو وہاں بیٹھنے نہیں دیتے جبکہ ابھی تک وہ لوگ مسجد میں موجود ہی نہیں ہوتے۔ کیا اس طرح کسی کے لیے مسجد میں جگہ متعین کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں غیر موجود لوگوں کے لیے جگہ روکنا خصوصاً جمعہ کے دن ایسا کرنے کو غیر مستحسن اور ناجائز سمجھا گیا ہے کیونکہ مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ حق پہلے آنے والوں کا بنتا ہے، علاوہ ازیں بعد میں آنے والا شخص بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنوں یا کندھوں کے اوپر سے گذر کر جائے گا اور دوسرے مسلمانوں کی ایذا رسانی کا سبب بنے گا جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

عن ابی سعیدؓ و ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اغتسل یوم الجمعۃ ولبس من احسن ثیابہ ومس من طیب ان کان عندہ ثم اتی الجمعۃ فلم یتخط اعناق الناس ثم ما کتب اللہ لہ ثم انصت اذا خرج امامہ حتی یفرغ من صلوتہ کانت کفارۃ لما بینہا وبین جمعۃ التی قبلہا۔ رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲۲ باب التنظیف والتبکیر، الفصل الثانی) [1]

مسجد کے باغیچہ پر چھت ڈالنا

سوال:۔ مسجد کے ساتھ صحن میں ایک باغیچہ ہے بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ اس باغیچہ پر چھت ڈال دی جائے تاکہ طلباء کرام دینی علوم حاصل کر سکیں یا کسی اور مصالح میں اس کو استعمال کیا جا سکے، کیا عند الشرع ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر مسجد کا یہ چمن مسجد کی حدود میں داخل ہو اور اس میں مستقل طور پر کسی وقت نماز

---

[1] حدثنا ہارون بن معروف نا بشر بن السری نا معاویۃ بن صالح عن الزاہدیۃ قال کُنّا مع عبد اللہ بن بسر صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبد اللہ بن بسر جاء رَجُلٌ یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجلس فقد اذیت۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۵۹ باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الجامع الترمذی ج ۱ ص ۶۷ باب فی کراہیۃ التخطی یوم الجمعۃ۔

پڑھی گئی ہو تو اب یہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کو کسی اور مصرف میں لانا عند الشرع جائز نہیں۔ تاہم چونکہ دینی تعلیم کا حصول مساجد کے مقاصد میں شمار ہوتا ہے اس لیے مسجد یا اس کے کسی کونے کو مدرسے کے طور پر استعمال کرنا مرخص ہے لیکن دیگر مصالح کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں۔

لما روی ابو ھریرۃؓ عن النبیؐ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من جاء مسجدی لم یأت الا الخیر یتعلمه او یعلمه فھو بمنزلة المجاھد فی سبیل اللہ۔ الخ قال الملا علی القاری فیه دلالة علی جواز التدریس فی المسجد۔ (المرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۲ ص۲۲۱ باب المساجد الفصل الثالث، کتاب الصلوۃ)[1]

متولی مسجد کا بغیر اذن چندہ دہندگان کے اُجرت لینا

سوال:۔ اہلِ محلہ نے اپنی مسجد کے لیے ایک متولی مقرر کیا ہے لیکن اس کے لیے اہلِ محلہ نے کوئی مشاہرہ مقرر نہیں کیا، تو کیا متولی بغیر اذنِ اہلِ محلہ مسجد کے فنڈ میں سے اپنی اُجرت لے سکتا ہے؟

الجواب:۔ چندہ کے اموال ایک امانت ہوتے ہیں اور یہ وقف عرفی ہے شرعی نہیں، لہٰذا ایسے امور کے لیے واقفین سے اس کی اجازت لینا ضروری ہے، بغیر اذن کے متولی کو مسجد کے فنڈ سے تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الھندیة: لو وقف دراھم او مکیلًا او ثیابًا لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذلك یعنی بالجواز قیل کیف الدراھم تقرض للفقراء ثم یقبضھا او تدفع مضاربة و یتصدق بالربح والحنطة تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منھم والثیاب الاکسیة تعطی للفقراء لیلبسوھا عند حاجتھم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیة۔ (الفتاوی الھندیة ج۲ ص۳۶۲ کتاب الوقف الباب الثانی فیما یجوز وقفه الخ)

فھو فی الشرع عند ابی حنیفة رحمه اللہ تعالیٰ حبس العین علی ملك الواقف والتصدق بالمنفعة علی الفقراء او علی وجه من وجوه الخیر بمنزلة العواری کذا فی الکافی فلا یکون

---

[1] وفی الھندیة: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیه استعمال اللبود والبواری المسبلة لاجل المسجد۔ (الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۲۱ الباب الخامس فی آداب المسجد) ومثله فی امداد المفتیین المعروف بفتاوی دار العلوم دیوبند ج۲ ص۸۱۲۔

لازمًا وله ان يرجع ويبيع كذا في المضمرات ولا يلزم الا بطريقين احدهما قضاء القاضي بلزومه والثاني ان يخرج مخرج الوصية..... وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالى على وجه تعود منفعته الى العباد فيلزم ولا يباع ولا يوهب ولا يورث كذا في الهداية الى العيون اليتيمة ان الفتوى على قولهما كذا في شرح الشيخ ابي المكارم للنقاية۔

(فتاوی هندیة ج ۲ ص ۳۵۰ كتاب الوقف، الباب الاول في تعريفه الخ)[1]

مسجد میں ٹیپ ریکارڈ لانا

سوال:۔ بعض لوگ مساجد میں ٹیپ ریکارڈر لے آتے ہیں جس سے تقاریر اور تلاوت وغیرہ سنتے ہیں اور ریکارڈ کرتے ہیں، کیا ان کا یہ فعل شرعًا جائز ہے؟

الجواب:۔ ٹیپ ریکارڈ بذاتِ خود ایک آلہ ہے، اس کو اچھے اور بُرے دونوں کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اگر اسے اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے مثلاً تلاوتِ قرآن یا کسی کی تقریر ٹیپ کرنا، اگر اس نیت سے مسجد میں لایا جائے تو شرعًا اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ اگر اس ٹیپ ریکارڈ سے گانے سُنے جائیں یا کسی اور گناہ کے کام کے لیے لایا جائے تو مسجد و خارج مسجد دونوں میں مطلقًا جائز نہیں۔

قال طاهر بن عبد الرشيدؒ: وفي الفتاوى استماع صوت الملاهي كالضرب بالقصب وغيره حرام لانه من الملاهي وقال عليه الصلوٰة والسلام استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسوق والتلذذ بها من الكفر هذا على وجه التحديد ولكن وجب عليه ان يجتهد حتى لا يسمع لما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم انه ادخل اصبعه في اذنه منذ ذكر اشعار العرب ان كان فيها ذكر الفسق كره هم بالمعصية

---

[1] قال الحصكفي (حبس العين على حكم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو في الجملة والاصح انه (عنده) جائز غير لازم كالعارية (وعندهما هو حبسها على حكم (ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من احب۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۵۷ كتاب الوقف)

قال المرغيناني: لا يزول ملك الواقف الا ان يحكم به الحاكم او يعلقه بموته فيقول اذا مت فقد وقفت داري على كذا وقال ابو يوسفؒ يزول ملكه بمجرد القول وقال محمدؒ لا يزول حتى يجعل للوقف۔ (الهداية ص ۶۳۷ ج ۲ كتاب الوقف)

ان عزم علیه الاثم۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۵ کتاب الکراهیة الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی)[1]

بوقتِ ضرورت متولی کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ اگر مسجد کے گر جانے کا خوف ہو تو دوسرے محلہ میں سے کسی شخص کو بغیر اذن متولی یا اہلِ محلہ کے اس کو شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بسا اوقات ایسے بلا اجازت تصرفات سے بہت سی بے اعتدالیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے مساجد کا انتظام بری طرح متاثر ہوتا ہے، ایسی مساجد میں جملہ تصرفات بانیٔ مسجد، متولی یا اہلِ محلہ کی اجازت پر موقوف رکھے جائیں، تاہم کسی متعنت اور اناڑی متولی کے جابرانہ رویہ کا اعتبار نہیں۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: البانی اولی بنصب الامام والمؤذن وولی البانی وعشیرته اولی من غیرهم بنی مسجدا فی محلة تنازعه بعض اهل المحلة فی العمارة فالبانی اولی مطلقاً۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف)

مسجد کے لیے باقاعدہ وقف سے ملکیت کا زائل ہونا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے، اس زمین سے اس شخص کی ملکیت کب زائل ہوگی کیا وقف کے بعد اس کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل رہتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین کا وقف باقاعدہ اجازت سے نماز باجماعت پڑھنے پر موقوف ہے لہٰذا ایک دفعہ نماز باجماعت پڑھنے سے اس کی ملکیت زائل ہوگئی، البتہ امام ابویوسفؒ

---

[1] قال الحصکفیؒ: (و) کرہ (کل لهو) لقوله علیه الصلوٰۃ والسلام کل لهو المسلم حرام الا ثلاثة ملاعبته اهله وتادیبه لفرسه ومناصلته بقوسه (درمختار جلد۵ ص۲۵۳ کتاب الکراهیة فصل فی البیع)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیه ج۵ ص۳۵۱ کتاب الکراهیة۔

[2] قال طاهر بن عبدالرشیدؒ: رجل بنی مسجدا فی سکة فنازعه بعض اهل السکة فی عمارته او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولی وفی العمارة اولی بالاتفاق۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۱ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ باب احکام المساجد کتاب الوقف۔

کے نزدیک اس میں نماز پڑھنا بھی ضروری نہیں بلکہ صرف اس کے قول سے ملکیت زائل ہوجاتی ہے، باقاعدہ وقف کے بعد واقف کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (ویزول ملکہ عن المسجد والمصلّی) بالفعل (وبقولہ جعلتہ مسجدا) عند الثانی (وشرط محمد) والامام (الصلاۃ فیہ) بجماعۃ وقیل یکفی واحد وجعلہ فی الخانیۃ ظاہر الروایۃ۔ (الدر المختار ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۶۹ کتاب الوقف)[1]

عورتوں کا مسجد میں جانا

سوال: ہمارے شہر رما میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے وہاں کے لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ اگر شریعت میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے تو ایک جگہ متعین کر کے عورتوں کے لیے بھی مسجد بنا دی جائے جس میں عورتیں نماز پڑھیں اور وعظ و نصیحت کی مجالس میں شمولیت اختیار کرسکیں۔ ایسا کرنا اس دور میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قرونِ اولیٰ میں اگرچہ عورتوں کو مساجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن اس دور میں فتنہ و فساد کے عموم کی وجہ سے فقہاء نے انہیں مسجدوں میں جانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عورتوں کی مساجد میں حاضری کے اتنے فوائد نہیں جتنے نقصانات یقینی ہوتے ہیں، لہٰذا فسادِ زمانہ کی وجہ سے عورتوں کا مسجد میں آنا مستحسن نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (ویکرہ حضورہن الجماعۃ) ولو لجمعۃ وعیدٍ ووعظٍ (مطلقاً) ولو عجوزاً لیلاً (علی المذہب) المفتی بہ لفساد الزمان۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۱ ص[illegible] باب الامامۃ)[2]

---

[1] واذا بنی مسجدا لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عن ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسف یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الہدایۃ ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف فصل فی المسجد)
ومثلہ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

[2] قال طاہرؒ: اما اذا ام الرجل النساء فی مسجد بجماعۃ لیس معہن رجلٌ لا باس بہ وفی غیر المسجد من البیوت ونحوہا یکرہ الا ان یکون معہ ذات رحم محرم وتخرج العجوز الی العید والجمعۃ وفی الفجر والعشاء دون الظہر والعصر والمغرب مختلف فالحال ان فی المغرب اختلاف الروایۃ وعندہما تخرج الی جمیع الصلوٰۃ ہذا جواب الاصل وقال فی الفتاویٰ لا تخرج العجائز فی زماننا الی الجماعات۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۱۵۵ کتاب الصلوٰۃ)
ومثلہ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۵۹ فصل فی الجماعۃ۔

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کے متولی کو بعض لوگ معزول کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس کی معزولی کے اسباب نہ جاننے کی وجہ سے ایسی سرگرمیوں میں شرکت نہیں کرتے۔ کیا کسی متولی مسجد کو اہلِ محلہ یا حاکم معزول کرسکتا ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:- اہلِ محلہ یا حاکم نے جن امورِ شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کو متولی بنایا تھا اگر یہ متولی اُن امورِ شرعیہ کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ کہیں خیانت کا ارتکاب کرکے وقف کے اموال کو غیر شرعی طور سے استعمال کر رہا ہو اور اسی طرح ایسے دوسرے امور کا ارتکاب کر رہا ہو جس سے اہلِ محلہ تنگ ہوں تو امورِ فسقیہ کی وجہ سے اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر ایسے امور کا خود واقف بھی مرتکب ہو تو اسے بھی معزول کیا جاسکتا ہے۔

قال الحصکفیؒ (جعل الواقف الولایة لنفسه جاز) وکذا لو لم یشترط لاحد فالولایة له عند الثانی وهو ظاهر المذهب نهر خلافاً لما نقله المصنف ثم لوصیه ان کان والا فللحاکم فتاوی ابن نجیمؒ، قاری الهدایة وسیجئی (وینزع وجوباً بزازیة ولو) الواقف درر فغیره بالاولی (غیر مامون) او عاجزا او ظهر به فسق کشرب خمر ونحوه فتح او کان یصرف ماله فی الکیمیا نهر بحثاً (وان شرط عدم نزعه)[1]

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۳۸۴ کتاب الوقف)

مصالح مسجد کے لیے موقوفہ زمین کا حکم

سوال:- اکبر اور ریحان کے آباؤ اجداد نے مسجد میں پانی کی نکاسی کے لیے ایک رہٹ لگایا تھا اور اس رہٹ کے اخراجات کے لیے ۵ کنال اور تین مرلے زمین بخشی تھی جس کا اندراج کاغذات میں موجود ہے۔ اب جبکہ مسجد میں بجلی کا پمپ بھی ہے اور لکڑی کے رہٹ کے بجائے لوہے کا رہٹ لگا دیا گیا ہے، لہٰذا اس زمین سے جو اخراجات اس رہٹ کے پورے کیے جاتے تھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اہلِ مسجد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ زمین جو پانی کی نکاسی

---

[1] وفی الهندیة: ولو ان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مامون علی الوقف فللقاضی ان ینزعها من یده کذا فی الهدایة۔ (ج۲ ص۴۰۹ کتاب الوقف)

ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۲۳ کتاب الوقف)

کے لیے وقف کی گئی تھی اس کو مسجد کے کسی اور مصرف میں لایا جائے، مثلاً اجارہ پر دے دی جائے یا جن کے قبضہ میں ہے اُن سے آدھا نفع لے کر مسجد کے مصالح میں خرچ کر دیا جائے، لیکن ریحان اور اکبر مسجد کی اس اراضی کو اپنے قبضہ سے نکالنے کو تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف رہٹ کے ذمہ دار تھے جبکہ اب زمین اس سے مستغنی ہوگئی ہے لہٰذا یہ زمین اب ہماری ملک ہے، اب ہم اسے اپنے مصرف میں خرچ کریں گے، کیا ان کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ عرف کو دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ وقف کا ہے لہٰذا جس نے اپنی زمین کی آمدنی مسجد کے لیے معین کردی ہے تو یہ زمین بھی وقف سمجھی جائے گی اس لئے ریحان اور اکبر کو اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بلکہ اس کی آمدنی کو پمپ یا مصالح مسجد میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

ونظیرہ قال ابن نجیمؒ اشتروا من غلۃ داری ھٰذہ کل شھر بعشرۃ دراھم خبزًا وفرقوہ علی المساکین صارت دار وقفًا۔ (البحرالرائق ج ۵ ص ۱۹۱ کتاب الوقف)[1]

مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کیا حکم ہے، خصوصاً جب مسجد میں کیا جائے؟ اس دور میں مساجد میں عام طور پر چندہ مانگا جاتا ہے۔ اگر کسی محلہ والوں کو ایک عام اور کچی مسجد بنانے کی استطاعت ہو لیکن وہ پکی مسجد بنانے کے لیے چندہ کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مساجد کو تعمیر کرنا اصل کے لحاظ سے سلطانِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ، فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجدًا من بیت المال ومن مالہم ان لم یکن لہم بیت مال کذا فی فتح القدیر۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۳۵۸ کتاب الوقف)

جبکہ اس دور میں عموماً سلاطین مساجد کی تعمیر کے لیے متوجہ نہیں ہوتے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مساجد کی تعمیر کے لیے چندہ کریں، چاہے یہ چندہ مساجد میں کریں یا مساجد سے

---

[1] وفی الھندیۃ رجل قال فی مرضہ اشتروا عن غلۃ داری ھٰذہ کل شہر بعشرۃ دراھم خبزًا وفرقوا علی المساکین صارت الدار وقفًا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۹ کتاب الوقف فصل فی الالفاظ التی یتم بہا الوقف)

ومثلہٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص ۳۵۹ کتاب الوقف)

باہر، اور بعض روایات سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

عن جریرٍ قال کنا فی صدر النہار عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فجاءہ قوم عراۃ مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتہم من مضر بل کلہم من مضر فتمعّر وجہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما رای بہم من الفاقۃ فدخل ثم خرج فَاَمَرَ بِلَالًا فاذن واقام فصلّٰی ثم خطب فقال یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (الٰی اٰخر الاٰیۃ) اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔ الاٰیۃ۔ التی فی الحشر اِتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ــــ تصدق رجل من دینارہ من درہمہ من ثوبہ من صاع برہ من صاع تمرہ حتّٰی قال ولو بشق تمرۃ الٰی اٰخر۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۳ کتاب العلم)[1]

مسجد کے ہوتے ہوئے مندر میں نماز پڑھنا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں اکثر مہاجرین رہتے ہیں جب ہم ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تو اس علاقے میں کسی جگہ پر بھی کوئی مسجد نہیں تھی البتہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا جس کو ہم لوگوں نے نماز کے لیے متعین کر دیا اور کچھ عرصہ باقاعدہ اس میں نماز پڑھتے رہے بعد میں گورنمنٹ سے منظوری لے کر ایک جگہ مسجد کے لیے متعین کرکے اس پر مسجد تعمیر کر دی، لیکن بعض لوگ اب بھی اس مسجد کے ہوتے ہوئے مندر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ تو کیا مسجد کے ہوتے ہوئے اس مندر میں نماز پڑھنی جائز ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ سوال میں مندر کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں،[1] اگر اس کو مستقل طور پر مسجد کی ہیئت میں بنا دیا گیا ہو اور اس کی پہلی شکل میں تبدیلی کر دی گئی ہو تو اس کا حکم مسجد جیسا ہے لہٰذا یہ مندر بھی مسجد میں شمار ہوگا۔ البتہ اگر مندر کی صورت تبدیل نہیں کی گئی ہو اور اس کو اپنی اصلی حالت میں رکھا گیا ہو اور نہ ہی اس کو مستقل مسجد بنانے کی نیت کی گئی ہو تو یہ مسجد کے حکم میں نہیں اور اس میں نماز پڑھنا تشبہ بالکفار کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے، تشبہ بالکفار کی حرمت پر بے شمار دلائل ہیں ــــ کما قال تعالٰی: لَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا

---

[1] وفی المسلم: عن جریر قال خطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فحث علی الصدقۃ بمعنی حدیث جریر۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۴۱ کتاب العلم باب من سن سنۃ حسنۃ الخ)

فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم ۔
(ابوداؤد ج ۲ ص ۵۵۹ کتاب اللباس، باب لبس الشھرۃ)[1]

قدیم مسجد کی جگہ نئی مسجد میں نماز پڑھنا

سوال:۔ ہمارے شہر میں ایک مسجد تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے اور اس کی عمارت بھی بوسیدہ ہو چکی ہے جس کے گرنے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے، اگر کوئی شخص اس مسجد کو ترک کر کے دوسری نئی مسجد میں جو کہ قریب ہی تھوڑے سے فاصلے پر بنائی گئی ہے، نماز پڑھے تو شرعاً کیسا ہے؟ بعد میں اگر کسی شخص نے اس بوسیدہ مسجد کی عمارت کو شہید کر کے نئے سرے سے اس کی تعمیر کرائی ہے، اس صورت میں اس قدیم مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا جدید مسجد میں؟

الجواب:۔ کسی جگہ جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا قدیم مسجد جب نئے سرے سے بنائی گئی ہو تو اس کے حقوق مسجد قریب ہونے کی بہ نسبت دوسری مسجد کے زیادہ ہیں لہٰذا اس قدیم مسجد کو ہی آباد کیا جائے، بہرحال جدید مسجد میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں ۔

قال ابن عابدینؒ ومسجد حیۃ وان نقل جمعہ افضل من الجامع وان کثر جمعہ ۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۸۸ باب ما یفسد الصلوٰۃ)[2]

مسجد میں حوض بنانا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں نمازیوں کی سہولت کے لیے ایک حوض بنانے کا ارادہ ہے، لیکن اگر حوض کو کامل طریقہ سے بنایا جائے تو مسجد کا کچھ حصہ اس حوض میں شامل ہوگا، اور مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنی

---

[1] وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ من تشبہ بقوم فھو منھم قال الملا علی القاری ای من تشبہ نفسہ بالکفار مثلاً فی اللباس وغیرہ ۔۔۔ فھو منھم ای فی الاثم ۔ (مرقاۃ جلد ۸ ص ۲۵۵ کتاب اللباس الفصل الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی جواھر الفقہ ج ۱ ص ۲۲۱ مساجد کی نئی شکلیں اور ان کے مقاصد

[2] وفی الخلاصۃ ان نسخۃ القاضی للامام رجل یصلی فی الجامع لکثرۃ الجمع ولا یصلی فی مسجد حیہ فانہ یصلی فی مسجد منزلہ وان کان قومہ اقل وان لم یکن لمسجد منزلہ موذن فانہ یؤذن ویصلی وان کان هناك واحد ۔ (ج ۱ ص ۲۲۹ الفصل السادس والعشرون فی المسجد ینقل بعم

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۸۳ باب الامامۃ ۔

بڑی ہے کہ اس کا کچھ حصہ حوض میں شامل کرنے کی وجہ سے مسجد کے صفوف میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کے بعض حصے کو حوض میں شامل کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہ تا قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس لیے مسجد کے کسی بھی حصے پر حوض بنانا جائز نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: لانہ مسجد الی عنان السماء وفی رد المحتار وکذا الی تحت الثریٰ۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۱ ص۴۸۵ کتاب الصلوٰۃ فی الکعبۃ)

علاوہ ازیں فقہاء کرام نے مسجد میں مضمضہ واستنشاق مکروہ لکھا ہے، اسلئے مسجد کے کسی حصہ میں حوض بنانے سے اس کراہیت کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے۔

البتہ اگر مسجد بنانے کے ابتداء ہی میں کوئی جگہ حوض یا وضو کے لیے متعین کر دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الخلاصۃ ویکرہ التوضی والمضمضۃ فی المسجد الا ان یکون فیہ موضع اتخذ للوضوء ولا یصلی فیہ۔ (ج ۱ ص۲۲۹ الفصل السادس والعشرون وما یتصل بہ)[۱]

دکانوں پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک مسجد ہے جو چند دکانوں کے اوپر واقع ہے اور باقاعدہ اس میں اذان وجماعت بھی ہوتی ہے جبکہ یہ دوکانیں مالک کی مِلک میں ہیں۔ کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کو مسجدِ شرعی کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دوکانوں کے اوپر مالک کی اجازت سے مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں، اس میں نماز بلا کراہیت جائز ہے، اگر مالک کی اجازت کے بغیر یہ مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز مکروہ ہے، البتہ یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں بلکہ عُرفی مسجد کے حکم میں ہے، شرعی مسجد کا حکم اس پر

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وفی الخلاصۃ وغیرھا ویکرہ الوضوء والمضمضۃ فی المسجد الا ان یکون موضع فیہ اتخذ للوضوء ولا یصلی فیہ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۳۴ فصل مما فرغ من بیان الکراہۃ فی الصلوٰۃ)

ومثلہ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۱ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ وما لا یکرہ۔

اُس وقت ہوگا جب دو کانوں سے مالک کی ملکیت کو ختم کر کے مسجد کی ملکیت میں دیدی جائیں۔

قال ابن عابدینؒ: وفی القهستانی ولا بد من افرازه ای تمیزه عن ملکه من جمیع الوجوه فلو کان العلو مسجدا والسفل حوانیت او بالعکس لا یزول ملکه لتعلق حق العبد به کما فی الکافی۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص ۳۷۰ کتاب الوقف)[1]

مسجد کے متولی کی شرعی حیثیت

سوال: کیا تولیت مسجد میں ارث جاری ہو سکتا ہے اور متولی مسجد کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

الجواب: متولی نسلاً بعد نسلٍ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ بعد میں آنے والے کے اندر صلاحیت ہو امام و مؤذن اور مسجد کی دوسری ضروریات کا اہتمام کرنا متولی کے فرائض منصبی ہیں۔

قال ابن نجیمؒ: البانی اولی بنصیب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرته اولی من غیرهم بنی مسجدا فی محلة فنازعه بعض اهل المحلة فی العمارته فالبانی اولی مطلقاً۔

(الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب الوقف)[2]

کعبۃ اللہ کی ایسی تصاویر جن میں انسانوں کی تصاویر بھی ہوں مسجد میں آویزاں کرنا

سوال: مسجد میں خانہ کعبہ کی ایسی تصاویر آویزاں کرنا جن میں کعبۃ اللہ کی تصویر کے علاوہ انسانی شکلیں بھی طواف کی ہیئت کو

---

[1] من بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلوٰة فیه فاذا صلّی فیه واحد زال ملکه۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف)

وایضاً قال ابن نجیمؒ: وحاصله ان شرط کونه مسجداً ان یکون سفله وعلوه مسجداً لینقطع حق العبد عنه لقوله تعالیٰ وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۱ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۲ ص ۶۲۴ کتاب الوقف)

[2] وفی الهندیة: قال فی الجامع الفصولین لو شرط الواقف ان یکون المتولی من اولاده واولاد اولاده هل للقاضی ان یولی غیره بلا خیانة لو ولاه هل یکون متولیاً قال الشیخ الاسلام برهان الدین فی فوائده لا کذا فی النهر الفائق۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۱۲ کتاب الوقف)

(وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۱ کتاب الوقف)

ظاہر کرتی ہوں کیا ایسی تصاویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہیں ؟

الجواب:۔ کعبۃ اللہ ایک قابلِ احترام جگہ ہے اور ایسے ہی غیر ذی روح ہونے کی بنیاد پر اس کی تصویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہے، البتہ کعبۃ اللہ کی ایسی تصویر آویزاں کرنا جس میں لوگوں کو طواف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو اور جس میں اشخاص کی معرفت ہوتی ہو شرعاً ناجائز ہے پھر جائز نہ ہونے کے علاوہ ایسی تصاویر کو مسجد میں آویزاں کرنا یہ زیادت حمل الاثم ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے جیسا کہ مسجد میں تصویریں لگانا مسجد کی عظمت کے منافی ہے۔

عن عائشةؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اشد الناس عذاباً یوم القیامة الذین یضاهون بخلق اللہ ۔ متفقٌ علیه (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)

عن عبد اللہ بن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون ۔ متفقٌ علیه ۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)[1]

مسجد پر قبضہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ دو قوموں کا ایک قطعۂ زمین پر جھگڑا تھا ایک قوم نے دوسری قوم کی املاک پر حملہ کر کے جبراً قبضہ کر لیا اور تمام مکینوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان املاک میں مکان اور زمین کے علاوہ مساجد بھی ہیں اور ان مساجد پر بھی غاصبانہ طریقہ سے قبضہ کر لیا گیا ہے۔ اندریں صورت ایسی مساجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ قریہ مذکورہ میں جو مساجد ہیں وہ غصب سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں جو کسی کی ملک نہیں اور غاصبین بھی مسلمان ہیں جن کے نزدیک بھی مساجد کا احترام ملحوظ ہے، ایسی مساجد میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت نہیں اور ان مساجد پر اس قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ کسی کو

---

[1] عن عائشةؓ تقول دخل علیّ رسول اللہ ... یا عائشة اشد الناس عذاباً عند اللہ یوم القیمة الذین یضاهون بخلق اللہ ۔

عن عبد اللہ بن مسعودؓ یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اشد الناس عذاباً یوم القیمة المصورون ۔ (مسلم ج۲ ص۲۰۱ باب تحریم تصویر صورة الحیوان وتحریم الخ)

مسجد سے منع کرنا ظلم عظیم کے مترادف ہے۔

وفی الھندیة: قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اذا غصب ارضاً فبنی فیھا مسجداً اوحماماً اوحانوتاً فلا بأس بالصلوٰۃ فی المسجد۔ (ج ۵ ص ۳۲۲ کتاب الکراھیة)[1]

مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے درمیان میں آنے کا حکم

سوال: ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جو کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی ہے، اس کے قریب ہی ایک خالی پلاٹ واقع ہے جبکہ مسجد اور پلاٹ کے درمیان ایک پختہ قبر ہے، اگر اس پلاٹ کو مسجد میں شامل کردیا جائے تو قبر مسجد کے دروازہ پر آتی ہے جس سے مسجد کی زینت خراب ہوتی ہے، اگر اس دروازہ کو بند کیا جائے تو دوسری طرف دروازہ نکالنے پر حُسن قائم نہیں رہتا، اندریں صورت قبر کے ساتھ کیا کیا جائے؟

الجواب: جب مسجد کی وسعت ناگزیر ہو تو قبر کے درمیان میں آنے کی صورت میں اگر قبر اتنی پرانی کہ اس میں انسانی اعضاء بوسیدہ ہوگئے ہوں تو اس صورت میں اس قبر کو بالکل منہدم کرکے مسجد کے ساتھ اس جگہ کو ملانے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبر جدید ہو تو پھر قبر کے اردگرد تعین کے لیے دیوار بناکر دوسرے حصہ میں مسجد بنائی تاہم اس بات کا خیال رہے کہ مسجد کی وضع ایسی ہو کہ قبر کی طرف کہیں توجہ نہ رہے تاکہ قبر پرستی کا شبہ نہ رہے، ایسی حالت پر زینت کا مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ و زراعتہ والبناء علیہ (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ باب الجنائز)

قال الطحطاویؒ وفی القہستانی عن جنائز المضمرات لا تکرہ الصلوٰۃ الخ

---

[1] قال فی الینابیع اذا غصب ارضاً فبنیٰ ھا مسجداً اوحماماً فلا بأس بدخول المسجد للصلوٰۃ۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص ۲۵ کتاب الوقف)

قال قاضیخانؒ: عن ابی یوسفؒ ذکرہ الناطفی رحمہ اللہ تعالیٰ فی الواقعات اذا بنی فی ارض الغصب مسجداً اوحماماً اوحانوتاً لا بأس بالصلوٰۃ فی المسجد۔

(الفتاویٰ قاضی خان علی ھامش الھندیة ج ۱ ص ۶۶ فصل فی المسجد)

جهة القبر الا اذا کان بین یدیه بحیث لو صلی صلوٰة خاشعین دفع بصره علیه۔
(طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۶۱ مکروهات الصلوٰة)[1]

مسجد کی دوکان پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال:- مسجد کے غسلخانوں اور دوکانوں پر دینی علوم کا مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کے غسل خانے اور دوکانیں اگرچہ مسجد کے لیے وقف ہیں لیکن احکام کے اعتبار سے من کل الوجوہ ایک ہیں، لہٰذا جب مسجد کو دینی علوم کے لیے استعمال کرنا جائز ہے تو ان مقامات پر مدرسہ تعمیر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

وفی الخلاصة: اما المعلم الذی یُعلّم الصبیان باجر اذا جلس فی المسجد یعلّم الصبیان لضرورة الحر وغیرہ لا یکرہ۔ (ج۱ ص۲۲۹ کتاب الصلوٰة)[2]

مسجد میں رقص وسرود

سوال:- مسجد میں رقص وسرود کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- رقص وسرود از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے مساجد تو درکنار کسی بھی مقام پر اس کا اہتمام اور اس میں شرکت عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

وفی الهندیة: قال رحمه الله تعالیٰ السماع والقول والرقص الذی یفعله المتصوفة فی زماننا حرام لا یجوز القصد الیه والجلوس علیه۔
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۲ کتاب الکراهیة الباب السابع عشر فی الغناء واللهو)[3]

---

[1] لما فی الهندیة: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۶۷ کتاب الجنائز الفصل السادس فی القبر والدفن)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۹۵ کتاب الجنائز۔

[2] قال ابن نجیمؒ: لان المسجد ما بنی الا لها من صلوٰة واعتکاف وذکر شرعی وتعلیم علم وتعلمه وقراءة قرآن۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۴) وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۱۰ کتاب الصلوٰة)

[3] قال المرغینانیؒ: ان الملاهی کلها حرام حتی التغنی بضرب القضیب وکذا قول ابی حنیفه (الهدایة ج۳ ص۴۵۳ کتاب الکراهیة فصل فی الاکل والشرب)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۹۵ کتاب الکراهیة، فصل فی البیع۔

عیدگاہ پر مسجد بنانا

سوال:۔ ایک شخص نے عیدگاہ کے لیے زمین وقف کی، اب وہاں لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ کیا شرعاً اس عیدگاہ کے رقبہ پر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی قطعہ زمین صرف عید کی نماز کے لیے وقف کیا گیا ہو تو بغیر اذن واقف کے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت میں واقف کی شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جب تک شریعت کے موافق ہوں۔ جب واقف اجازت دے دے تو اس تعمیر میں کوئی حرج نہیں البتہ اگر یہ قطعہ زمین قانونی وقف ہو شرعی وقف نہ ہو تو اس کی خرید فروخت بھی جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصریؒ:۔ شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة کما بیناه فی شرح الکنز الا فی مسائل۔ (الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں سوال کرنے کا حکم

سوال:۔ عموماً سائلین مساجد میں عوام کی حاضری کو غنیمت سمجھ کر سوال کرتے ہیں، ان کا یہ اقدام کیسا ہے اور ایسے سائلین کے ساتھ مالی تعاون کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں سوال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور ان کو دینے میں دو قول ہیں، بعض علماء تو مطلق کراہیت کے قائل ہیں، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر نمازیوں کی رعایت رکھ کر سائل سوال کر رہا ہے تو اس کو دینا جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول (ویحرم فیه السوال ویکره الاعطاء مطلقاً وقیل ان تخطی) ای هو الذی اقتصر علیه الشارح فی الحظر حیث قال فرع یکره اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار لان علیاً تصدق بخاتمه فی الصلوٰة فمدحه اللّٰه تعالیٰ

---

[1] قال ابن عابدینؒ فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان یجعل ماله حیث شاء ما لم یکن معصیة وله ان یخص صنفا من الفقراء ولو کان الوضع فی کلهم قربة۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۴۳ کتاب الوقف مطلب شرائط الواقف معتبرة۔۔ الخ)

بقوله وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۹ فی افضل المساجد)[1]

مساجد میں نمازی کی توجہ متاثر کرنے والی زینت کا حکم

سوال:۔ مساجد میں بطور آرائش و زیبائش ایسا نقش و نگار کرنا، طغرے یا خطوط لکھنا جو نمازی کے لیے نماز میں باعثِ تشویش و خلل اندازی ہوں۔ کیا اس طرح مسجد کی زیبائش کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد ایک عبادت گاہ ہے اور اس کی تعمیر فقط عبادت اور یادِ الٰہی کے لیے ہوتی ہے، اور اگر اس میں ایسے نقوش جو آجکل کی مروجہ تعمیرات میں ہیں بنا دیئے جائیں تو اس سے مسجد کی تعمیر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ جدید عمارات کی طرح یہ بھی ایک سیر و تفریح کا مقام بن جائیں گی، پھر اس میں نماز پڑھنے والے کا دھیان مکمل طور پر نماز میں بھی نہیں ہوگا۔

لہٰذا مسجد کی اتنی زینت کر لی جائے جس سے مسجد خوبصورت اور صاف ستھری نظر آئے البتہ ضرورت سے زیادہ اموال خرچ کر کے مسجد کو مزین کرنا مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: (ولا بأس بنقشه خلا محرابه) فانه يكره لانه يلهی المصلی ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها خصوصاً فی جدار القبلة ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۸ احکام المساجد)[2]

مسجد کے درخت اور پھلوں کا حکم

سوال:۔ ہماری مسجد کے صحن میں پھلدار درخت ہیں۔ کیا شرعاً ان پھلوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہے یا ان کی قیمت سے مسجد کے مصارف پورے کئے جائیں؟

الجواب:۔ مسجد میں پھلدار درخت اگر وقف برائے مسجد ہوں تو ان کا کھانا جائز نہیں،

---

[1] اعطاء سوال المسجد انه اذا كانوا لا يتخطون رقاب الناس ولا يمرون بين يدی المصلين يسألون ما لا بد لهم منه ولا يلحون فی السوال فلا بأس ولا بالمطانة ۔ (فتاوی غياثية ص ۲۱)

[2] وفی الهندية: اما المتولی يفعل من مال الوقف ما يرجع الی أحكام البناء دون ما يرجع الی النقش حتی لو فعل يضمن كذا فی الهداية ۔
(الفتاوی الهندية ج ۱ ص ۱۰۹ الفصل الثانی فيما يكره فی الصلٰوة وما لا يكره)
وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج ۱ ص ۱۴۲ باب ما يفسد الصلٰوة وما يكره فيها ۔

البتہ اگر واقف نے ابتداءً اس کی شرط رکھی ہو تو پھر جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ مسجد کے پھل فروخت کرکے اس کی قیمت مسجد کے مصارف میں خرچ کی جائے۔

قال ابن نجیمؒ: وفی الحاوی وما غرس فی المساجد من الاشجار المثمرۃ ان غرس للسبیل وھو الوقف علی العامۃ کان لکل من دخل المسجد من المسلمین ان یأکل منھا وان غرس للمسجد لایجوز صرفھا الا الی مصالح المسجد الاھم فالاھم کسائر الموقوف۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف) [1]

امام کا مسجد کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا

سوال:- مسجد کا صحن یا برآمدہ جس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھائی جاتی ہو، کسی وقت حالات کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص یا امام مسجد اپنے ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کے برآمدہ یا صحن کو جب باقاعدہ مسجد کا حصہ قرار دیا جا چکا ہو تو ایک دفعہ مسجد بن جانے کے بعد وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس کو اب کسی دوسرے امور میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر یہ برآمدہ کہیں مسجد کے لیے وقف ہو لیکن نماز اس میں نہیں پڑھی گئی ہو تو ایسی صورت میں مسجد پہ وقف ہو کر واقف کی اجازت یا متولی کی صوابدید پر امام کا اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو خرب ما حولہ واستغنی عنہ یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعۃ (وبہ یفتی)۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیہ اولا وھو الفتوی حاوی القدسی

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن احمد بن عبد الرشید البخاریؒ: وسئل ابوبکر عن وقف شجرۃ اصلھا والشجرۃ فیما ینتفع باوراقھا وثمرھا۔ قال فالوقف جائز وینتفع بثمرھا ولا یقطع اصلھا الا ان یفسد اغصانھا فان لم ینتفع باوراقھا وثمرھا فانھا تقطع وتصرف ثمنھا علی سبیلہ فان نبت ثانیاً والا غرس مکانھا۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف۔ نوع منہ)
ومثلہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۷۷ کتاب الوقف۔

واکثر المشائخ علیه مجتبیٰ وهو الاوجه فتح۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ مطلب فیما لو خرب المسجد)[1]

مسجد بنانے کے ارادہ سے وہ جگہ شرعی مسجد نہیں بنتی

سوال:۔ اہل محلہ نے ایک جگہ کا تعین کرکے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور پتھر وغیرہ بھی جمع کرلیے، بعض وجوہات کی وجہ سے اس جگہ مسجد بنانا موزوں نہیں سمجھا گیا، اب ایک دوسری جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے، کیا یہ تبادلہ جائز ہے یا اسی جگہ پر جہاں پہلے ارادہ کیا گیا تھا مسجد کے لیے کام شروع کیا جائے؟

الجواب: صرف ارادہ کرنے سے یہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کے علاوہ نماز پڑھنی بھی ضروری ہے لہٰذا وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جگہ دوسرے مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنی ذاتی اغراض کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال المرغینانیؒ: واذا بنی مسجداً لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویاذن للناس بالصلوٰة فیه فاذا صلی فیه واحدٌ زال عند ابی حنیفةؒ عن ملکه وقال ابو یوسفؒ یزول ملکه بقوله جعلته مسجداً۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف فصل فی المسجد)[2]

مسجد کی ضرورت سے زائد اشیاء کی فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک پرانی مسجد کا کچھ سامان مثلاً شہتیر وغیرہ زائد از ضرورت پڑا ہے، اگر اسے فروخت نہ کیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ کیا مسجد کے زائد سامان کو فروخت کرنا جائز ہے جبکہ اس کے نفع کو مسجد پر ہی خرچ کیا جائے؟

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاویٰ اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احدٌ فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمد وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملك الباني ولا الی ملك ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد واوقافه)

ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولو جعل داره مسجداً یجوز بالاجماع ولا یجوز مشاعاً وانما یجوز اذا سلمه والتسلیم ان یصلی فیه بجماعة باذان واقامة باذنه عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ۔

(خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

الجواب: مسجد کے اموال کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی منقول چیز ہو یعنی جو مسجد کی جزئیت میں داخل نہ ہو، مثلاً دری وغیرہ۔ اگر اس کی ضرورت نہ رہے اور مالک موجود ہو یا مالک کے فوت ہونے کی صورت میں اسکے ورثاء موجود ہوں تو مالک یا ورثاء کی اجازت سے اس کی فروخت جائز ہے۔ اور اگر ان میں کوئی نہ ہو تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی و حاکم کی اجازت سے فروخت جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ چیزیں باقاعدہ مسجد کا حصہ بن جائیں اور علیحدہ کرنے میں مسجد کا نقصان ہو لیکن کہیں تعمیر کی نیت سے یہ چیزیں الگ کی گئی ہوں تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی کی اجازت سے ان کی فروخت جائز ہے۔

وفی الهندیة: ذکر ابو اللیث فی نوازله حصیر المسجد اذا صار خلقاً واستغنی اهل المسجد عنه وقد طرحه انسان ان کان الطارح حیا فهو له وان کان میتاً ولم یدع له وارثاً ارجو ان لا بأس بان یدفع اهل المسجد الی فقیر و ینتفعوا به فی شراء حصیر آخر للمسجد والمختار انه لا یجوز لهم ان یفعلوا ذلک بغیر امر القاضی کذا فی محیط السرخسیؒ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۸ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے چندہ کو کسی شرط سے معلق کرنا

سوال: کیا مسجد کے چندہ کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کر کے دیا جا سکتا ہے؟ مثلاً بصورت نیلام ایک شخص کہتا ہے کہ اگر میری بولی پوری نکلی تو میں ۹۰۰ روپے مسجد میں بطور چندہ دوں گا، اب اس کی بولی پوری نکل آتی ہے اور یہ ۹۰۰ روپے چندہ مسجد کے لئے دے دیتا ہے تو دوسرا شخص

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (حشیش المسجد) ای الحشیش الذی یفرش بدل الحصر کما یفعل فی بعض البلاد کبلاد الصعید کما اخبرنی به بعضهم قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشه اذا استغنی عنهما یرجع الی مالکه عند محمدؒ وعند ابی یوسفؒ ینقل الی مسجد آخر ۔۔۔ وصرح فی الخانیة بان الفتوی علی قول محمدؒ قال فی البحر وبه علم ان الفتوی علی قول محمدؒ فی آلات المسجد۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۹ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۲ کتاب الوقف۔

اس کی بولی پر بولی ہوتا ہے تو یہ شخص چندہ دینے سے انکاری ہے اور واپسی کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا یہ شخص چندہ کی واپسی کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کا چندہ ایک صدقہ ہے جس سے مقصود رضاء الٰہی کا حصول ہے، اگر اس کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے تو شرط باطل ہو کر صدقہ جائز ہو جاتا ہے بعد ازاں اس میں رجوع کا حق حاصل نہیں، لہٰذا یہ شخص متولی کے قبضہ کرنے کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔

وفی الهندیة: وما لا یبطل بالشروط الفاسدة ستة وعشرون) القرض والهبة والصدقة (ج۴ ص۳۹۶ کتاب الهبة) الصدقة بمنزلة الهبة فی المشاع وحاجتها الی القبض الا انه لا رجوع فی الصدقة۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۰۶ الباب الثانی عشر فی الصدقة)[1]

مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا

سوال:- سکھوں کے دور میں بازار کے اندر ایک خالی مقام کو مسلمانوں نے مسجد کے لیے متعین کیا اور اس پر نمازیں پڑھنے لگے، جب اس اراضی کی فروخت شروع ہوئی تو سکھ اس کو خریدنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے اس پہ ایک کمرہ تعمیر کر لیا اور بعد میں اس پہ دوسری منزل بنا دی اور باقاعدہ اس میں پنجگانہ نمازیں شروع کیں، یہاں تک کہ جمعہ و عیدین بھی اس میں پڑھنے لگے۔ اب اس مسجد کے فنڈ میں کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے نچلے حصے دوکانیں بنا دی جائیں اور اوپر والا حصہ مستقل طور پر مسجد ہی رہے گا، جبکہ متولی کہہ رہا ہے کہ جس وقت ہم مسجد کی دوسری منزل بنا رہے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوگی تو ہم نچلے حصہ میں دوکانیں بنائیں گے۔ اندریں صورت مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قبہ مسلمانوں نے مشترکہ طور پر مسجد کے لیے متعین کیا ہے اور حکومتِ وقت کی طرف سے اس پر مسلسل خاموشی اختیار کرنا دلالۃً مسجد کی اجازت ہے۔ لہٰذا جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے تو اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا اسلئے

---

[1] قال الحصکفیؒ: (و) حکمها انها (لا تبطل بالشروط الفاسدة) فهبة عبد علی ان یعتقه تصح و یبطل الشرط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۶۸۸ کتاب الهبة)

(و) الصدقة کالهبة) بجامع التبرع وحینئذ (لا تصح غیر مقبوضة ولا فی مشاع یقسم ولا رجوع فیها)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۷۰۹ کتاب الهبة)

مسجد کے نچلے حصہ میں دوکانیں بنانا اگرچہ مسجد کے مصالح میں سے ہیں جائز نہیں۔ البتہ اگر کوئی ابتداً سے ہی نیچے دوکانیں بنائے اور اوپر مسجد بنائے اور وہ دوکانیں مصالح مسجد کے لیے ہوں تو یہ جائز ہے۔

وفی الهندیة: قیم المسجد لا یجوز له ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً او مسکناً تسقط حرمته وهذا لا یجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الوقف، الفصل الثانی الوقف فی المسجد) [1]

منبر کو محراب کی دائیں جانب رکھنا

سوال:۔ زمانۂ قدیم سے منبر عموماً محراب کے دائیں جانب رکھا جاتا تھا، موجودہ دور میں بعض مقامات پر ایسا نہیں ہوتا۔ کیا محراب کی دائیں طرف منبر کا ہونا ضروری ہے یا محض عرف کا فیصلہ ہے؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں منبر مصلّٰی کے دائیں طرف ہوا کرتا تھا، لہٰذا سنت یہ ہے کہ منبر محراب و مصلّٰی کے دائیں جانب رکھا جائے۔

کان سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم عن یمین المحراب اذا استقبلت القبلة۔ (بذل المجهود ج ۲ ص ۱۷۸ باب موضع المنبر) [2]

مسجد کی آمدنی سے تجارت کا حکم

سوال:۔ کیا مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا متولی مسجد کی بہتری کے لیے اپنی صوابدید پر مسجد کے چندہ میں تصرفات کر سکتا ہے، اگر خرید و فروخت میں مسجد کا فائدہ ہو تو متولی کو یہ حق حاصل ہے تاہم

---

[1] قال ابن نجیمؒ: فی المجتبیٰ لا یجوز لقیم المسجد ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فنائه۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف)

[2] وقال النوویؒ: فی مناسکه ما لفظه وفی احیاء علوم الدین انه ای المصلّی یجعل عود المنبر حذا منکبه الایمن ویستقبل الساریة التی الی جانبها الصندوق وتکون الدائرة التی فی قبلة المسجد بین عینیه فذلك موقف رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (وفا الوفا ج ۱ ص ۳۷۲ محراب المسجد النبی ومتی)

چندہ دہندگان سے اجازت مستحسن ہے ۔

وفی الهندیة: القیم اذا اشتری من غلة المسجد حانوتاً او دارا ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان له ولایة الشراء واذا جاز له ان یبیعه کذا فی السراجیة ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے درخت کی ملکیت کا حکم

سوال:- مسجد کے صحن میں امام صاحب نے پھلدار درخت لگایا تھا، اب جبکہ وہ درخت تناور ہو کر قیمتی درختوں میں اس کا شمار ہوتا ہے تو امام موصوف اس درخت کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے ۔ از روئے شریعت اس درخت کا مالک امام موصوف ہے یا مسجد ؟

الجواب:- کاشت کرتے وقت جب ذاتی اغراض کی نیت نہیں کی ہو جیسا کہ عام مسلمانوں سے یہی توقع کی جاتی ہے، تو مسجد کی ملکیت شمار ہوگی ۔

وفی الهندیة: سئل نجم الدین عن رجل غرس تالة فی مسجد فکبرت بعد سنین فاراد متولی المسجد ان یصرف هذه الشجرة الی عمارة بئر فی هذه السکة والغارس یقول هی لی فانی ما وقفتها علی المسجد قال الظاهر ان الغارس جعلها للمسجد فلا یجوز صرفها الی البئر ولا یجوز للغارس صرفها الی حاجة نفسه کذا فی محیط ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۴۷۷ کتاب الوقف) [2]

مساجد میں تعویذ فروشی کا حکم

سوال:- بعض لوگ مساجد میں مستقل طور پر تعویذ فروخت کرتے ہیں جس کے لیے نامحرم عورتیں بھی مساجد

---

[1] قال ابن نجیمؒ: قیم یبیع فناء المسجد لیتجر فیه القوم او یضع فیه سررًا اجرها لیتجر فیها الناس فلا بأس اذا کان لصلاح المسجد ویعذر المستاجر ان شاء الله تعالیٰ اذا لم یکن ممر العامة ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد ۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وفی المحیط رجل غرس فی المسجد یکون للمسجد لانه بمنزلة البناء بالمسجد ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۰۴ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الخلاصة ج ۴ ص۴۲۰ کتاب الوقف الفصل الثالث فی صحة الوقف ۔

کا رُخ کرتی ہیں، عین ممکن ہے کہ ان میں بعض عورتیں ایسی بھی ہوں جو طبعی بیماریوں کی وجہ سے مساجد میں داخل ہونے کی اہل نہیں بمطلب۔ تو کیا مساجد میں تعویذ فروشی کرنا جائز ہے اور ایسی حالت میں شرعاً عورتوں کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں عورتوں کا فی نفسہٖ داخل ہونا جائز ہے لیکن فسادِ ازمنہ کی وجہ سے انہیں مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے تو تعویذ کے لیے کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے، خاص کر جبکہ ان میں بہت سی عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں اور ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تاہم اگر پاک ہوں تو حدود کی رعایت رکھ کر تعویذ لے سکتی ہیں، لیکن مسجد میں تعویذ فروشی کا دھندہ مطلق جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (و) یمنع حل (دخول مسجد) ای ولو مسجد مدرسۃ اودار لا یمنع اھلھا الناس من الصلوۃ فیہ۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص ۲۹۱ باب الحیض) [1]

مسجد کے ساتھ متصلہ کمروں میں سونے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے ساتھ متصل جو کمرے ہوتے ہیں ان میں سونے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ان کمروں اور مسجد کا حکم ایک ہی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصلہ کمرے اگر ابتداء ہی سے مسجد سے باہر بنائے گئے ہوں تو ان میں سونا بلا کراہیت جائز ہے، البتہ اگر شروع ہی سے یہ کمرے مسجد میں شامل تھے بعد میں انہیں مسجد سے نکال کر کسی عذر کی بناء پر کمرے بنائے گئے ہوں تو ان کا حکم اور مسجد کا حکم ایک ہے، ان میں بلا ضرورت سونا مکروہ ہے۔

وفی الھندیۃ ویکرہ النوم والاکل فیہ لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذلک

---

[1] وفی الھندیۃ (ومنھا) انہ یحرم علیھما وعلی الجنب الدخول فی المسجد سواء کان للجلوس او للعبور ھکذا فی منیۃ المصلیؒ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۳۸ الفصل الرابع فی احکام الحیض)

رجل یبیع التعویذ فی المسجد الجامع ویکتب فی التعویذ التوراۃ والانجیل والفرقان ویاخذ علیہ المال ویقول ادفع الی الھدایۃ لا یحل لہ ذلک۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراھیۃ الباب الخامس فی آداب المسجد)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۸ باب الحیض۔

ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیہ ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ثم یفعل ما شاء کذا فی السراجیۃ ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد فی الصحیح من المذھب والاحسن ان یتورع فلا ینام کذا فی خزانۃ الفتاویٰ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراھیۃ) [1]

قبلہ کی تحقیق

سوال :- ہمارے ہاں تقریباً ایک سو بیس سال سے آباد ایک پرانی مسجد ہے، اب بوسیدہ ہونے کی بناء پر اس کو شہید کرکے اس کی از سر نو تعمیر کرنے کے لیے جب نئی بنیادیں رکھنے کا وقت آیا تو مستری نے کہا کہ میں قطب ستارہ کا ماہر ہوں اور قطب ستارہ کی رُو سے اس مسجد کی سمتِ قبلہ صحیح نہیں۔ اب اگر اس کی بنیادوں میں تبدیلی کی جائے تو اس میں کئی مفاسد شرعیہ ہیں، مثلاً مسجد کے بعض حصے کا راستہ میں شامل ہوجانا وغیرہ جو کہ شرعاً جائز نہیں۔ کیا ایسی صورت میں اس مستری پر اعتماد کرکے اس کی بنیادوں میں برائے تعیینِ سمتِ قبلہ تبدیلی کی جاسکتی ہے یا قدیمی حالت میں بدستور برقرار رکھی جائے؟

الجواب :- اس مسئلہ پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ استقبالِ قبلہ فرض ہے البتہ اس کی تفصیل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ علماء احناف نے عوام کی آسانی کے لیے یہ حکم فرمایا کہ نمازی کا بحالتِ نماز مواجہت ما بین المغربین اگر ہو تو استقبالِ قبلہ ہوجاتا ہے۔ یعنی موسمِ سرما میں مغرب کا آخر وقت اور موسمِ گرما میں مغرب کا آخر وقت کے درمیان میں جو فاصلہ ہو، اگرچہ عین قبلہ سے قدرے انحراف ہی کیوں نہ پایا جائے

البتہ مستری کا یہ کہنا کہ میں قطبی ستارہ کا ماہر ہوں، یہ اس کا دعویٰ ہے، اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہو اور اس میں اُس کی شہرت ہو تو اس پر اعتماد کرلیا جائے ورنہ نہیں، بہرحال تحقیق پھر بھی ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وقال فی شرح زاد الفقیر وفی بعض الکتب المعتمدۃ فی استقبال القبلۃ الی الجہۃ اقاویل کثیرۃ واقربہا الی الصواب قولان الاول ان ینظر

---

[1] قال القاضی خانؒ: وقیل لا بأس للغریب ان ینام فی المسجد۔
(فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۶۶)
ومثلہ فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۶۱ مکروہات الصلوٰۃ مطلب احکام المسجد۔

فی مغرب الصیف فی اطول ایامہ ومغرب الشتاء فی اقصر ایامہ فلیدع الثلثین فی الجانب الایمن والثلث فی الایسر والقبلۃ عند ذلک ولو لم یفعل ھکذا وصلی فیما بین المغربین یجوز واذا دفع خارجا منھا لا یجوز بالاتفاق۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۴۳۰ مبحث فی استقبال القبلۃ)

قال ابن عابدین رحمہ اللہ (قولہ کالقطب) ھو اقوی الادلۃ وھو نجم صغیر فی بنات الصغری بین الفرقدین والجدی اذا جعلہ الواقف خلف اذنہ الیمنی کان کان مستقبلا القبلۃ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۳۰ مبحث فی استقبال القبلۃ)[1]

مسجد کی چھت پر بیت الخلاء بنانا

سوال: مسجد کے اوپر راستہ کی طرف اگر بیت الخلاء بنا دیا جائے تو کیا شرع میں اس کی گنجائش ہے؟

الجواب: مسجد کی حدود میں بیت الخلاء بنانا شرعاً جائز نہیں، اگرچہ مسجد کی چھت پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا راستہ علیحدہ ہو۔ البتہ مسجد کے نیچے ابتداء سے واقف کی نیت سے بیت الخلاء وغسلخانہ بنانا جائز ہے۔

قال الحصکفی رحمہ اللہ (وکرہ تحریما) (الوطء فوقہ والبول والتغوط) لانہ مسجد الی عنان السماء۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد)[2]

---

[1] قال ابو اللیث رحمہ اللہ: وقبلۃ اھل خراسان ما بین مغیب الصیف ومغیب الشتاء قال ابو منصور قبلۃ ما وراء النھر ھو ان یترک الثلثین من یمین المصلی والثلث من یسارہ من المغربین۔ (فتاوی نوازل ص۳۷ فصل فی شروط الصلوۃ)

وفی الطحطاوی اصابہ جھتھا فالمغرب قبلۃ لاھل المشرق بالعکس (ص۱۱۵ باب شروط الصلوۃ)

اما فی البحار فدلیل القبلۃ النجوم وقد روی عن عمر رضی اللہ عنہ انہ قال تعلموا من النجوم ما تھتدوا بہ الی القبلۃ اھ۔ وذلک کالقطب۔ (طحاوی ص۱۴۱)

[2] قال ابن نجیم (والوطء فوقہ والبول والتخلی) ای کرہ الوطء فوق المسجد وکذا البول والتغوط لان سطح المسجد لہ حکم المسجد۔
(البحر الرائق۔ باب ما یفسد الصلوۃ وما یکرہ فیھا)
ومثلہ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۰۹ فصل فی غلق باب المسجد)

مسجد کے نیچے آتش خانہ بنانا

سوال:۔ مسجد کے تہہ خانہ میں سردی کے موسم میں بوقتِ ضرورت آگ جلانے کے لیے جگہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نفسِ مساجد میں آگ لے جانا یا جلانا بذاتِ خود ممنوع نہیں البتہ مجوسیوں کی طرح معبد گاہ بنانا جائز نہیں۔ اگر یہ آگ مسجد کے مصالح کے لیے جلائی جائے مثلاً پانی گرم کرنے یا مسجد کے گرم کرنے کے لیے، جیسا کہ بعض ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ مسجد کے تہہ خانہ میں آگ جلائی جاتی ہے جس سے موسمِ سرما میں مسجد گرم ہو جاتی ہے۔ تو یہ جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (واذا جعل تحته سردابا لمصالحه) ای المسجد (جاز) کمسجد القدس اذا کان السرداب والعلو موقوفاً لمصالح المسجد فهو کسرداب بیت المقدس هذا هو ظاهر الروایة وهناك روایات ضعیفة مذکورة فی الهدایة۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فی احکام المساجد) [1]

مسجد کے متصل غسل خانہ بنانا

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کی دیوار کے متصل غسلخانہ بنایا ہے اور غسل خانہ کی چار دیواری میں سے ایک دیوار مسجد کی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ غسل خانہ کو مسجد کے اندر بنانا جائز نہیں، البتہ واقف مصالحِ مسجد کی رعایت کرتے ہوئے مسجد کے نیچے غسل خانہ اور بیت الخلاء بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ بہرحال اگر کسی نے مسجد کے ساتھ متصل اپنی زمین میں غسل خانہ بنایا ہے اور مسجد کی دیوار کو بطورِ پردہ استعمال کیا ہے تو یہ جائز ہے اِس میں کوئی قباحت نہیں لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اس بات کی رعایت ضرور رکھی جائے گی کہ اس سے مسجد کو نقصان نہ پہنچے اور کل کہیں محض پردہ کے استفادہ سے اس دیوار کی ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔

قال ابن عابدینؒ: لوجعل الواقف تحته بیتاً للخلاء هل یجوز کما فی مسجد

---

[1] وفی الهندیة: ومن جعل مسجداً تحته سرداب او فوقه بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزله فله ان یبیعه وان مات یورث عنه ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الهدایة۔
(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۵ کتاب الوقف) ـــــ ومثله فی الهدایة ج ۲ ص ۶۴۴ کتاب الوقف۔

محلة الشحم فی دمشق؟ لم اکرہ صریحًا نعم سیأتی متنا فی کتاب الوقف انہ لو جعل تحتہ سردابًا لمصالحہ جاز تامل۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ مکروہات الصلوٰۃ۔ مطلب احکام المسجد) ؎۱

مسجد کی آمدنی کے لیے بینک میں کھاتہ کھولنا

سوال: کیا امام یا خزانچی مسجد کا فنڈ اپنے نام پر بینک میں جمع کرا سکتا ہے؟ اور کیا اس فنڈ کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے؟

الجواب: مسجد کا فنڈ خرچ ہونے سے پہلے وقف عرفی ہوتا ہے شرعی نہیں ہوتا۔ امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چندہ دہندگان کی اجازت کے بغیر مسجد کا فنڈ بینک میں داخل کرائے یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے، البتہ اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو امام اسے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اور بینک میں جمع کرنا بغیر اضطراری حالت کے اچھا نہیں، اگرچہ بغیر سود کے ہی کیوں نہ ہو۔

وفی الهندیة: لو وقف دراهم او مکیلا او ثیابا لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذلك یفتی بالجواز قیل کیف قال الدراهم تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منهم والثیاب والاکسیة تعطی للفقراء لیلبسوها عند حاجتهم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۳۶۲ کتاب الوقف)

قال الحصکفی: (حبس العین علی) حکم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فی الجملة والاصح انه (عنده) جائز غیر لازم کالعاریة (وعندهما هو حبسها علی) حکم (ملك الله تعالی و) صرف (منفعتها علی من احب) (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۷ کتاب الوقف) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة ومن جعل مسجدًا تحته سرداب او فوقه بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزله فله ان یبیعه وان مات یورث عنه ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الهدایة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۵ کتاب الوقف)
ومثله فی الهدایة ج ۲ ص ۶۲۳ کتاب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد۔

؎۲ قال المرغینانی: قال ابو حنیفة لا یزول ملك الواقف عن الوقف الا ان یحکم به الحاکم او یعلقه بموته فیقول اذا مت فقد وقفت داری علی کذا۔ وقال ابو یوسف یزول ملکه بمجرد القول۔ وقال محمد لا یزول حتی یجعل للوقف متولیًا ویسلمه الیه۔ (الهدایة ج ۲ ص ۶۱۴ کتاب الوقف)

مسجد پر وقف شدہ مال کو واپس لینا

سوال: ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ہزار روپے چندہ دیا، اور اس میں سے بعض رقم مسجد کی تعمیر میں خرچ ہو گئی ہے، جبکہ اس شخص کا اب یہ مطالبہ ہے کہ میں نے جو رقم مسجد کی تعمیر کے لیے دی تھی وہ مجھے واپس کی جائے میں اس رقم کو دوسری مسجد کی تعمیر کے لیے دیتا ہوں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنی تمام رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں نہیں دے گا بلکہ نصف رقم اپنی ذات کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا اس شخص کو وقف کی رقم واپس لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: مساجد یا دینی مدارس میں جو چندہ دیا جاتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے اور صدقہ جب متصدق کے ملک میں داخل ہو جائے تو پھر اس میں رجوع کرنا درست نہیں۔

چونکہ فقہاء کی عبارات کی روشنی میں مسجد کے لیے تملیک درست ہے تملیک کے بعد چندہ معطی کی ملک سے خارج متصور ہوتا ہے، لہٰذا دینی مدارس یا مساجد میں چندہ دینے کے بعد معطی کو حقِ رجوع حاصل نہیں۔

لما قال فی الهندیة۔ رجل اعطی درهمًا فی عمارة المسجد او نفقة المسجد او مصالح المسجد صحّ لانّه وان کان لایمکن تصحیحه وقفًا یمکن تصحیحه تملیکًا للمسجد فاثبات الملك للمسجد علی هٰذا الوجه صحیح فیتمّ بالقبض...... کما لو قال وقفتُ هٰذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیك اذا سلمه للقیّم۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۰ کتاب الوقف، الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم ---الخ)

وایضًا قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: الصدقة کالهبة لاتصح الّا بالقبض ولارجوع فی الصدقة لان المقصود هو الثواب وقد حصل۔

(الهدایة ج۳ ص۲۹۳ کتاب الهبة، فصل فی الصدقة)[1]

---

[1] لما قال الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ: التملیك للمسجد صحیح قلت فی الحدیث دلیل لما قال علماؤنا من ان التملیك للمسجد صحیح فی الهندیة..... الخ (اعلاء السنن ج۱۳ ص۱۹۸ باب الوقف علی المصالح المسجد وحکم مایهدی الیه من الاموال۔)

لما قال العلامة ابوبکر بن علی الحداد الیمنی: الصدقة کالهبة لاتصح الّا بالقبض لانها تبرع کالهبة.... ولاتصح الرجوع فی الصدقة بعد القبض لانه قد کمل فیها الثواب من الله تعالی۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۱۹ کتاب الهبة)

مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا

سوال:۔ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا اور اسی طرح مسجد کی چار دیواری کا انتظام نہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی چار دیواری تو مسجد کے فنڈ اور رقم سے بنائی جاتی ہے اور اگر مسجد کا فنڈ اتنا نہ ہو کہ اس سے مسجد کی چار دیواری تعمیر کی جا سکے اور اہلِ محلہ بھی باوجود قدرت رکھنے کے اس کا انتظام نہیں کرتے جس سے مسجد کی املاک کے تلف یا ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو عند اللہ اہلِ محلہ گنہگار رہوں گے۔ البتہ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا یا اس میں گندے پانی کی نالی گذارنا عند الشرع جائز نہیں، کیونکہ مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی:

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ (سورۃ البقرۃ) [1]

مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کو جبرًا مسجد کے لیے لینا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں مسجد کے ساتھ متصل ایک قطعہ زمین ہے جو کہ حکومت کی ملکیت ہے اور جو مسجد کے تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کو درکار ہے جبکہ حکومت یہ زمین مسجد کو دینے سے انکاری ہے۔ کیا مسجد کی ضرورت کے پیشِ نظر جبرًا یہ زمین مسجد میں شامل کی جا سکتی ہے؟

الجواب: مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ متصلہ زمین عام راستہ ہے یا مکان اور دوکان ہے، اگر راستہ ہو تو لوگوں کی مصلحت کو دیکھ کر اس کو مسجد میں شامل کر دیا جائے۔ البتہ اگر اس کو مسجد میں شامل کرنے سے لوگوں کو تکلیف ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں، اور مکان و دوکان کو مسجد میں شامل کرنے کے لیے قاضی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

وفی الهندیة: قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الی مکان یتسع المسجد واخذوا من الطریق وادخلوه فی المسجد ان کان یضر باصحاب الطریق لا یجوز و ان کان

---

[1] قال ابن عابدین: (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۵۶، مطلب فی احکام المسجد)۔ ومثله فی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۶۴ فصل فی المسجد۔

لا یضرہم رجوعُ ان لا یکون بہ بأس کذا فی المضمرات۔۔۔ ایضاً لہم ارض وقف علی مسجد والارض بجنب ذٰلک المسجد وأرادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئًا من الارض جاز لکن یرفعون الی القاضی لیاذن لہم ومستغل الوقف کالدار والحانوت علی ھٰذا کذا فی الخلاصۃ۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج ۲ ص ۴۵۶ کتاب الوقف

تاہم اگر مسجد کے ساتھ متصل زمین ہو اور حکومت دینے سے انکار کرتی ہو تو مسجد کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر جبرًا قیمتًا حاصل کی جا سکتی ہے۔

ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبہ ارض لرجل توخذ ارضہ بالقیمۃ کرھا کذا فی فتاوٰی قاضی خان۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج ۲ ص ۴۵۶ کتاب الوقف)[1]

کس برش کا استعمال مسجد میں جائز ہے؟

سوال:- آجکل جو صفائی کے برش رائج ہیں اُن میں اکثر خنزیر کے بال استعمال کیے جاتے ہیں، اور یہ برش کئی لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں، اور بعض مساجد میں بھی دیکھا گیا ہے کہ صفائی کے لیے یہ برش استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیا ایسے برش کا مسجد میں استعمال شرعًا جائز ہے؟

الجواب:- مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں ان کو نجاست سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے، چونکہ خنزیر کا ہر ہر جزء نجس العین ہے اس لیے اس سے کسی صورت میں بھی انتفاع جائز نہیں، لہٰذا ایسے برش جو نجاست سے مخلوط ہوں مساجد ان سے پاک رکھی جائیں۔ لیکن بلاتحقیق کسی چیز کے بارے میں نجس کا حکم صادر کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں۔

قَوْلُہٗ تَعَالٰی: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ (سورۃ البقرۃ)

قال العلامۃ فخر الدین: ولا یبزق فی المسجد لا فوق البواری ولا تحت الحصیر لانا امرنا بتعظیم المسجد وصونہ عن النجاسۃ فیاخذ النخامۃ

---

[1] قال الحصکفی: (وتؤخذ ارض) ودار وحانوت (بجنب مسجد ضاق علی الناس بالقیمۃ کرھا)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۷۹ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۶ کتاب الوقف۔

بشوبه ولا یلقیها فی المسجد۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۱ ص ۶۴ فصل فی المسجد)[1]

عوام کی ضرورت کے لیے مسجد کو مسمار کرنا

سوال :۔ ہمارے علاقہ میں عرصہ قدیم سے ایک مسجد آباد ہے جس میں گردونواح کے لوگ نماز پڑھتے ہیں، جبکہ یہ مسجد سڑک اور دوکانوں کے قریب واقع ہے۔ بعض دوکانداروں نے حکومت کو یہ درخواست دی ہے کہ اس مسجد کو مسمار کیا جائے کیونکہ اس مسجد کی وجہ سے ہمارے کاروبار میں فرق آتا ہے، کیونکہ یہ مسجد ہماری دوکانوں کے سامنے واقع ہے جس سے ہماری دوکانیں مخفی ہو جاتی ہیں۔ اندریں صورت کسی مسجد کو مسمار کرنا بوقتِ ضرورت جائز ہے؟

الجواب :۔ امتِ مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ کسی مقام یا جگہ میں جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی، اس کو مسمار کرنا یا کسی اور کام میں لانا شرعاً جائز نہیں، جن لوگوں نے اس کو مسمار کرانے کی درخواست دی ہے انہیں توبہ کرنی چاہیئے کسی مسلمان یا مومن سے ایسی درخواست کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

قال الحصكفیؒ: ولو خرب ماحوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ: (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اٰخر سواء کانوا یصلون فیه اولاً وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبیٰ وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۸ باب الوقف، مطلب فیما لو خرب المسجد)[2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اهـ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ مطلب احکام المسجد)

ومثله فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۱۱ فصل غلق المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد)

مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرنا

سوال :- اگر ایک شخص کسی جذباتی فیصلہ کے تحت مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرے لیکن بعد ازاں اس وعدہ پر پابندی نہیں کرتا ہو۔ کیا اس پر زمین دینا ضروری ہے؟

الجواب :- مسجد کے لیے زمین دینے کے وعدہ سے وقف تام نہیں ہوتا بلکہ وقف کے لیے یہ شرط ہے کہ پہلے زمین کو اپنی ملک سے خارج کرکے باقاعدہ عوام کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے، لہٰذا صرف وعدہ کی صورت میں وقف تام نہیں ہوا، تاہم وعدہ کی خلاف ورزی گناہ ہے ۔

وفی الهندیة: من بنی المسجد لم یزل ملکه عنه حتّٰی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلوٰة فیه اما الافراز فلانه لا یخلص لله تعالیٰ الا به کذا فی الهدایة ۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص ۴۵۴ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں چارپائی بچھا کر سونا

سوال :- کیا مسجد میں سونا جائز ہے؟ جبکہ بعض لوگ مسجد میں چارپائی بچھا کر سوتے ہیں، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب :- مسجد میں سونا بغیر شرعی عُذر کے مکروہ ہے، البتہ عذر شرعی ہو مثلاً معتکف ہو یا مسافر وغیرہ، تو اس کو مسجد میں سونا جائز ہے۔ اور جس طرح مسجد میں بغیر چارپائی کے سونا جائز ہے اسی طرح چارپائی بچھا کر بھی سونا جائز ہے ۔

وفی الهندیة: ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلك ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیه ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ثم یفعل ما شاء کذا فی السراجیة ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد

---

[1] قال برهان الدین المرغینانیؒ: واذا بنٰی مسجدًا لم یزل ملکه عنه حتّٰی یفرزه عن مِلکه بطریقه ویأذن للناس بالصلوٰة فیه فاذا صلی فیه واحد زال عند ابی حنیفه (رحمه الله) عن مِلکه اما الافراز فلانه لا یخلص لله تعالیٰ الا به۔
(الهدایة ج۲ ص ۶۲۴ کتاب الوقف، فصل فی المسجد)
ومِثلُهٗ فی کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف ۔

فی الصحیح من المذهب والاحسن ان یتورع فلاینام کذا فی خزانة الفتاویٰ۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة)[1]

البتہ اگر کوئی غیر معذور آدمی بھی اعتکاف کی نیت سے مسجد میں سوجائے تو جائز ہے۔

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین اور عرفی سیریٔ کی شرعی حیثیت

سوال:- بعض مساجد کے ساتھ موقوفہ جائداد ہوتی ہے جس سے امام اور خطیب استفادہ کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ زمین مستقل طور پر مسجد کے لیے وقف ہوتی ہے، ائمہ محض منصب امامت وخطابت کی وجہ سے اس سے استفادہ کے حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری ایسی جائداد بھی ہوتی ہے جو کسی امام کو شخصی طور پر دی جاتی ہے تاہم اس میں امام کے موجودہ منصب امامت کا دخل بھی ضرور ہوتا ہے جو اس کے لیے ترجیح کا کام دیتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں کیا یہ جائدادیں امام قانونی طور پر اپنے نام کرا سکتا ہے؟ اور امام کی وفات کے بعد اگر اس کی اولاد امامت پر مامور نہ ہو پھر بھی اس کی حقدار ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاں تک اول الذکر قسم کا تعلق ہے تو چونکہ یہ مسجد کے لیے موقوفہ جائداد ہے اس کا کسی شخص کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں ارث جاری نہیں ہوسکتا، جو بھی منصب امامت پر فائز ہو وہ اس سے استفادہ کا حقدار ہوگا، اور جب اس ذمہ داری سے علیحدہ ہوجائے تو یہ شخص اس جائداد سے استفادہ کا حقدار نہیں رہتا، اس کی خرید وفروخت یا تقسیم کرنے کا اختیار اس کو حاصل نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ وهذا لان الاشیاء کلها لله تعالیٰ۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۵ باب الوقف)

وفی الهندیة: واما حکمه فعندهما زوال العین عن ملکه الی الله تعالیٰ وعند

---

[1] عن ابن عمرؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان اذا اعتکف طرح له فراشه او یوضع له سریرٌ وراء اسطوانة التوبة۔ (ابن ماجة ص۱۲۷ باب فی المعتکف یلزم مکانا من المسجد)

ومثلهٗ فی ردّ المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۶۱ مکروهات الصلوٰة مطلب احکام المسجد۔

ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ علیٰ ملکہ بحیث لا تقبل النقل ...... فانہ یصح حتیٰ لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن یتطوان خرج من الثلث یجوز۔

(الہندیۃ ج ۲ ص۳۵۲ کتاب الوقف)[1]

البتہ مؤخر الذکر جائداد کے بارے میں تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موہوب لہ کی ملکیت ہے کیونکہ یہ اس کو ذاتی طور پر دی جاتی ہے، اس میں مسجد پر وقف کرنے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا اور محض امام وخطیب کے منصب کی تعظیم کی وجہ سے کوئی چیز دینے سے مسجد پر وقف نہیں سمجھا جاتا" لہٰذا اس صورت میں امام مسجد کو جملہ مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے، حین حیات میں اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور اس منصب سے معزول ہونے کے بعد بھی یہ جائداد اس کی رہے گی اور مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

غیر مسلم کے اموال کو جبراً مسجد پر خرچ کرنا

سوال:- ایک جگہ پر کسی مسجد کی تعمیر کیلئے روپوں اور مال کی ضرورت تھی، بعض لوگوں نے غیر مسلموں سے جبراً مال اور روپے وصول کر کے مسجد کی تعمیر میں خرچ کیے۔ کیا غیر مسلم کا مال جبراً وصول کر کے مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے ؟

الجواب:- دارالاسلام میں غیر مسلموں کی کئی اقسام ہیں۔ ایک غیر مسلم وہ ہے جو مستامن یا ذمی ہے، معاملات کے احکام میں مسلمان وذمی ومستامن آپس میں برابر ہیں، ان کے اموال کو جبراً وصول کر کے مسجد میں خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ احکام کے لحاظ سے مسلمانوں مثل ہیں۔

البتہ جو حربی ہوں اور دارالاسلام میں بغیر امان کے داخل ہوئے ہوں اُن کا مال مالِ فئے

---

[1] قال ابن نجیمؒ: (قولہ ولا یملک الوقف) باجماع الفقہاء کما نقلہ فی فتح القدیر ولقولہ علیہ السلام لعمر رضی اللہ عنہ تصدق باصلہا لا تباع ولا تورث ولانہ باللزوم خرج عن ملک الواقف وبلا ملک لا یتمکن من البیع۔

(البحر الرائق ج ۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ الا ان یکون مشاعاً عند ابی یوسفؒ فیطلب الشریک القسمۃ فیصح مقاسمۃ۔ (الہدایۃ ج ۲ ص۶۲۰ کتاب الوقف)

اور غنیمت ہے، ان کا مال مسجد کیلئے جبراً وصول کیا جاسکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لا یمکن حربی مستامن فینا سنة وقیل له ان اقمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی ولا جزیة علیه فی حول المکث الا بشرط اخذها منه فیه ویجری القصاص بینه وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه وتجب الدیة علیه اذا قتله خطاء ویجب کف الاذی عنه۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله لا یمکن حربی مستامن) قید بالمستامن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان وما معه فیئا ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔

(ردالمحتار ج۴ ص۱۶۸ فصل فی استیمان الکافر۔ کتاب الجهاد)

تاہم حرام مال کو مسجد پر خرچ کرنا جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هذا القول (قوله ولو بماله الحلال) قال تاج الشریعة اما لو انفق فی ذلك مالا خبیثا ولا سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالیٰ لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بما لا یقبله۔ (ردالمحتار علی الدر المختار جلد۱ ص۶۵۸ باب الامامة۔ مطلب کلمة لا بأس دلیل علی انه المستحب)[1]

اور حرام مال سے بنائی ہوئی مساجد شرعی مساجد کے حکم میں سے نہیں ہیں لہٰذا ایسی مساجد میں نماز پڑھنے سے اجتناب کیا جائے البتہ پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ واجب نہیں۔

بوقتِ ضرورت وقف کا تبادلہ جائز ہے

سوال: مسجد کی کچھ دوکانیں ایسی جگہ واقع ہیں جو مسجد سے دور ہیں۔ کیا مسجد کے قرب و جوار میں واقع بعض دوکانوں سے ان کا تبادلہ جائز ہے؟ جبکہ قریب کی دوکانوں میں یہ احتمال بھی ہے کہ کبھی مسجد کی توسیع میں کام آسکیں گی؟

الجواب: مسجد کے لیے ایسے فائدہ کی توقع میں وقف کا استبدال اور مبادلہ جائز ہے

---

[1] عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل الله الا الطیب فان الله یتقبلها بیمینه ثم یربیها لصاحبها کما یربی احدکم فلوه حتی تکون مثل الجبل۔ مُتفقٌ علیه۔ (مشکوٰة ج۱ ص۱۶۷ باب فضل الصدقة)
وَمِثلُهٗ فی البخاری ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة۔

لہٰذا ان دوکانوں کے تبادلہ میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الھندیۃ: مبادلۃ دار الوقف بدار اخریٰ انما تجوز اذا کانت فی محلۃ واحدۃ تکون المحلۃ المملوکۃ خیرًا من محلۃ الموقوفۃ وعلی عکسہ لا یجوز۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۴۰۲ کتاب الوقف۔ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف)[1]

جدید قبرستان میں مسجد بنانا

سوال:۔ ایک قبرستان جس میں اب بھی مُردے دفنائے جاتے ہوں، کیا کسی محلہ میں مسجد کی ضرورت پڑنے پر قبرستان کو ہموار کرکے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جس قبرستان میں مُردے فی الحال دفنائے جاتے ہوں اس کو مسجد کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، تاہم جو قبرستان پرانا ہو چکا ہو اور اس میں مُردوں کی لاشیں گل سڑ کر ان کے نشانات ختم ہو چکے ہوں تو اس کو ہموار کرکے اس پر مسجد بنانا جائز ہے البتہ مملوکہ ہونے کی صورت میں مالک سے اجازت لینا ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ۔ وقال الزیلعی ولو بلی المیّت وصار ترابًا جاز دفن غیرہٖ فی قبرہٖ وزرعہ والبناء علیہ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۲۳۲ مطلب فی دفن المیت، کتاب الجنائز)[2]

مندر سے مسجد بنانا

سوال:۔ تقسیم ہند کے وقت جو ہندو اور سکھ پاکستان سے چلے گئے تھے، اُن کے مندروں اور گوردواروں کو مسلمان مساجد میں تبدیل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو کیا ان میں تغیر ضروری ہے؟

الجواب:۔ ہندوؤں اور سکھوں کے معابد (مندر اور گوردوارے) مساجد میں تبدیل کرنا

---

[1] قال ابن نجیمؒ۔ وفی القنیۃ مبادلۃ دار الوقف بدار اُخریٰ انما تجوز اذا کانتا فی محلۃ واحدۃ او تکون المحلۃ المملوکۃ خیرًا من المحلۃ الموقوفۃ وعلی عکسہ لا یجوز۔
(البحر الرائق ج ۵ ص۲۲۳ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۸۶ کتاب الوقف، مطلب فی شرط الاستبدال۔

[2] وفی الھندیۃ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہٖ وزرعہ والبناء علیہ۔
(فتاویٰ ہندیۃ ج ۱ ص۱۶۷۔ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی آخر۔
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ کتاب الجنائز۔

شرعاً جائز ہیں بشرطیکہ ان کی عبادت کے نشانات مٹادیئے جائیں اور اس میں تغیر کر دیا جائے، مثلاً ان کو قبلہ رو کرنا، اس میں محراب بنانا یا ان کو مستقل طور سے گرا کر از سرِ نو ان پر مسجد بنانا۔

عن طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلّینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃً لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہٖ فدعا بماءٍ فتوضاء وتمضمض ثمّ صبّہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانھا بھذا الماء واتخذوھا مسجداً قلنا ان البلد بعید والحرّ شدید والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبًا۔ رواہُ النّسائی۔

(مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۶۹ باب المساجد)

وفی حاشیتہ فاکسروا الخ غیروا محرابھا وحولوہ الی الکعبۃ وقیل خربوہ۔[1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:۔ بعض لوگوں نے مسجد کیلئے چندہ جمع کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا ہے، لیکن ایک شخص اس تعمیر سے روک رہا ہے اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال کر رہا ہے، ایسے ہی ایک اور شخص مسجد کے راستہ کو بند کر رہا ہے جس سے مسجد ویران ہو رہی ہے اور اس سے مسجد میں آنے جانے والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد کی تعمیر سے منع کرنا اور ایسے ہی مسجد کا راستہ بند کرنا از روئے شرع جائز نہیں، یہ ایک فاسقانہ کام ہے اور یہ شخص قابلِ تعزیر ہے۔ البتہ اگر یہ راستہ مسجد کا نہ ہو بلکہ اس کی اپنی ملکیت ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کا استعمال مالک کی اجازت پر

---

[1] عن ابیہ طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی النبیؐ فبایعناہ وصلّینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃً لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہٖ فدعا بماءٍ فتوضأ وتمضمض ثمّ صبّہ فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانھا بھذا الماء واتخذوھا مسجداً قلنا ان البلد بعیدٌ والحر شدیدٌ والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبًا فخرجنا حتّٰی قدمنا بلدنا فکسرنا بیعتھا ثمّ نضحنا مکانھا فاتخذناھا مسجداً فنادینا فیہ بالاذان۔۔۔۔۔ الخ

(سنن النسائی ج ۱ ص ۱۱۳ باب اتخذ البیع مساجد)

پر موقوف ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا۔ (الآیۃ)

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیۃ)

(مشکوٰۃ ج ۱ ص ۶۹ باب المساجد، الفصل الثانی)

مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنا

سوال: مسجد کی اشیاء کو عاریۃً کوئی شخص اپنے استعمال میں لا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کی اشیاء وقف علی المسجد ہیں ان کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو گنجائش ہے۔

قال الحصکفیؒ: فاذا تم ولزم الوقف ولا یملک ولا یعار ولا یرھن۔

قال ابن عابدینؒ: ولا یعار ولا یرھن لاقتضائھما الملک۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۵۱ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب)[1]

مسجد کی زمین کا تبادلہ

سوال: ہمارے والد صاحب نے ایک قطعۂ اراضی مسجد کے لیے وقف کیا تھا اور باقاعدہ اس کی حد بندی کی گئی تھی اور اس میں شکرانے کے نفل بھی پڑھے گئے تھے، اب ہمارے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کے بدلے دوسری زمین مسجد کے لیے متعین کر دیں اور اس قطعۂ اراضی کو اپنے مصرف میں استعمال کریں۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: جب کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ زمین وقف کر کے اپنے سے جدا کر دے تو اب اس زمین کے ساتھ اس کا مالکانہ تعلق ختم ہو گیا یہی وجہ ہے کہ واقف کے

---

[1] قال فی الہندیۃ: ولا یحمل القیم سراج المسجد الی بیتہ ویحمل من بیتہ الی المسجد ولا بأس ان یترک سراج المسجد الی ثلث اللیل ولا یترک اکثر من ذلک الا اذا شرط الواقف ذلک او کان ذلک معتاداً ذلک الموضع۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص ۱۱۰، ھل فی کرہ غلق باب المسجد)

ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۲۲۳ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد۔

مرنے کے بعد اس موقوفہ زمین میں ورثاء کا حق وراثت ثابت نہیں اور اس کی بیع بھی جائز نہیں، جہاں تک استبدال کا تعلق ہے تو اس کی بھی چند صورتیں ہیں :۔

(۱) واقف اپنے لیے یا کسی وارث کے لیے استبدال کی شرط رکھے۔

(۲) اور اگر شرط نہ رکھی ہو لیکن اس جگہ سے انتفاع کلیۃً ختم ہو چکا ہو تو اس صورت میں باذن القاضی یا حاکم کے استبدال اصح قول کے مطابق درست ہے۔

چونکہ صورت مسئولہ میں دونوں وجوہ مفقود ہیں اس لیے مذکورہ زمین مسجد کی رہے گی اس کو دوسری کسی زمین میں تبدیل کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ: وقوله ولو شرط ان یستبدل بها ارضا اخری تکون وقفاً مکانه فهو جائز عند ابی یوسفؒ وهلال والخصاف وهو استحسان وکذا لو قال علی ان ابیعها واشتری بثمنها اخری مکانا وکذا لیس للقیم الاستبدال الا ان ینص له بذلك..... ولو قید شرط الاستبدال للقیم بحیاة الواقف لیس له ان یستبدل بعد موته۔ وفی فتاوی قاضیخان قول هلال وابی یوسفؒ هو الصحیح..... وکذا ارض الوقف اذا قل نزلها بحیث لا تحتمل الزراعة ولا تفضل غلتها عن مونتها ویکون صلاح الارض فی الاستبدال بارض اخری وفی نحو هذا عن الانصاری صحة الشرط لکن لا یبیعها الا باذن الحاکم وینبغی للحاکم اذا رفع الیه ولا منفعة فی الوقف ان یاذن فی بیعها اذا راٰه انظر لاهل الوقف۔

(فتح القدیر ج ۵ ص ۴۳۹ کتاب الوقف)[1]

---

[1] لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اعلم ان الاستبدال علی ثلاثة وجوه۔ الاول: ان یشرطه الواقف لنفسه او لغیره او لنفسه وغیره فالاستبدال فیه جائز علی الصحیح وقیل اتفاقاً والثانی: ان لا یشرطه سواء شرط عدمه او سکت لکن صار بحیث لا ینتفع به بالکلیة بان لا یحصل منه شیئ اصلاً او لا یفی بمؤنته فهو ایضاً جائز علی الاصح اذا کان باذن القاضی وراٰیه المصلحة فیه۔ والثالث: ان لا یشرطه ایضاً ولکن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا ونفعا وهذا لا یجوز استبداله علی الاصح المختار۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۴ کتاب الوقف۔ مطلب فی استبدال الوقف وشروطه)

وَمِثْلُهُ فی امداد المفتین الشهیر بفتاوی دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۶۴۹۔

مساجد میں سکول کھولنا

سوال:۔ آجکل حکومت کی طرف سے مسجد مکتب سکول کے نام سے مساجد میں پرائمری سکول کھولے جارہے ہیں، اساتذۂ کرام مساجد میں کرسیاں لگا کر عام پرائمری سکولوں کی طرح بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے مسجد کا تقدس بھی پامال ہوتا ہے اور مسجد کی حالت ایک عام حجرہ اور بیٹھک جیسی ہوجاتی ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ حالات کی روشنی میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے مسجد کا تقدس اور عظمت باقی نہیں رہتا جس سے اس خدشے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ یہ کہیں خیرخواہی کے لبادہ میں شعائر اللہ کی توہین کا منظم پروگرام تو نہیں؟ اس لیے تعلیم کا یہ سلسلہ کسی دوسری جگہ پر جاری رکھنا چاہیئے، مساجد کو نماز، ذکر اللہ اور قرآن وحدیث کی تعلیم تک محدود رکھیں۔

لما قال الشیخ احمد الحمویؒ: فی شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی ولا یجوز تعلیم الصبیان القرآن فی المسجد للمروی جنبوا صبیانکم المساجد انتھٰی۔ وھو صریح فی عدم الجواز سواء کان بأجرۃ ام لا۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۵۶ القول فی احکام المسجد)[1]

مسجد کی تعمیر میں قادیانیوں کی شرکت

سوال:۔ کسی مسجد کی تعمیر کے لیے ایک قادیانی نے دو ہزار اینٹیں دیں، کیا از روئے شریعت یہ اینٹیں مسجد میں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

الجواب:۔ قادیانی اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان اور اہلِ قبلہ کہتے ہیں، لیکن عقیدۂ ختمِ نبوت کے انکار اور دیگر بہت سی ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے مرتد کے زُمرہ میں داخل ہیں، اس صورت میں ان کا ہبہ موقوف رہے گا اور اگر یہ اسلام قبول کرلیں تو وہ ہبہ نافذ ہوگا، اور اگر اپنے ارتداد پر بدستور قائم رہیں تو بوجہ مرتد ہونے کے ان کا ہبہ باطل ہے۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ: لما اخرجه المنذری: مرفوعاً جنّبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشرائکم ورفع اصواتکم الی آخرہ۔
(ردّ المحتار ج۱ ص۶۵۶ احکام المسجد)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس فی آداب المسجد۔

قال ابن نجیمؒ: توقف مبایعته وعتقه وهبته فان امن نفذ وان هلك بطل۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۳۳ باب المرتد) [1]

قادیانیوں کے اموال قبول کرنے سے ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ ان کے کفر کے بارے میں پوری اُمتِ مُسلمہ کا جو عقیدہ ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لیے ان کا ہبہ کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کی فروخت

سوال:- کیا مسجد کی منتظمہ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کر دے یا اجارہ پر دے یا اُسے کسی اور مصرف کے لیے استعمال میں لائے؟

الجواب:- مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ زمین کے تبادلہ کا جواز کتبِ فقہ سے ثابت ہے، یہ تبادلہ بھی اُس صورت میں جائز ہے کہ جس میں مسجد کا فائدہ ہو، اسی طرح مسجد کے نفع کی خاطر اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے۔

وفی الهندیة: مبادلة دار الوقف بدار اخری انما تجوز اذا کانتا فی محلة واحدة تکون المحلة المملوکة خیرًا من محلة الموقوفة وعلی ملکه لا یجوز۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴ کتاب الوقف، الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: یتوقف منه عند الامام وینفذ عندهما کل ما کان مبادلة مال بمال او عقد تبرع (کالمبایعة) والصرف والسلم والعتق والتدبیر والکتابة والهبة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص۲۵۰ باب المرتد، قریب من مطلب المعصیة تبقی بعد الردة)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج ۲ ص۳۷۹ کتاب السیر۔

[2] قال ابن عابدین: قال وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخری انما یجوز اذا کانتا فی محلة واحدة او محلة الاخری خیرًا وبالعکس لا یجوز وان کانت المملوکة اکثر مساحة وقیمة واُجرة لاحتمال خرابها فی ادون المحلتین لدناءتها وقلة الرغبة فیها۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۸۶ کتاب الوقف مطلب فی شروط الاستبدال)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۲۳ کتاب الوقف۔

جس مسجد کی زمین کا باقاعدہ وقف نہ ہو تو وہ شرعی مسجد نہیں

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ انگلینڈ میں مکانات کی دو قسمیں ہیں، ایک فری ہولڈ اور دوسرا لیس فری ہولڈ۔ قسم اول میں زمین اور عمارت مالک مکان کی ملکیت ہوتی ہے اور قسم ثانی میں صرف مکان پر مالک کی ملکیت کا حق ہوتا ہے جبکہ زمین اجارہ کی ہوتی ہے، لیکن یہ فرق بھی صرف امتیازی ہوتا ہے۔ دونوں قسموں کی صورت میں حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں قسموں کے لیے حکومت کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہوتی ہے۔ اگر مقررہ مدت سے قبل حکومت کو اس زمین کی ضرورت پڑ جائے تو حکومت اس مقررہ مدت کو منسوخ کر کے اس زمین کو اپنے مصرف میں لاسکتی ہے، اس میں کسی شخص کو بھی حکومت کے فیصلے کو چیلنج کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

آیا ایسی زمین جس پر مالک کو مکمل اختیار حاصل نہیں اگر اس پر مسجد تعمیر کر لی جائے اور باقاعدہ اس میں اذان اور جماعت بھی ہوتی ہو، لیکن جب اس زمین کو جس پر مسجد واقع ہے ضرورت پڑنے کی وجہ سے حکومت اسے اپنے مصرف میں لانے کا ارادہ کرے اور اس کے مالک کو اپنی جانب سے اس عمارت کا عوض دے دے، تو کیا ایسی زمین پر مسجد تعمیر کرنا مسجدِ شرعی کے حکم میں ہوگی؟ اور آیا اس کی خرید و فروخت اور اس میں تغیر و تبدل جائز ہے؟ اور اس شہید کر کے کسی اور مصرف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

الجواب :- اہلِ علم کی تحقیق کے مطابق مسجدِ شرعی کے لیے زمین اور مکان دونوں کا وقف مؤبد ہونا شرط ہے، جبکہ یہ شرط یہاں متحقق نہیں۔ اور اہلِ علم کے نزدیک مسجد کے معاملہ میں اگر کوئی ایسی شرط لگادی جائے جس سے وقف مؤبد میں فرق آرہا ہو تو وہ شرط باطل ہے اور وقف مطلق اور مؤبد ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ : تحت ھذا القول (قولہ ولا ذکر معہ اشتراط بیعہ الخ) فی الخصاف لو قال علی ان لی اخراجھا من الوقف الی غیرہ او علی ان اھبھا واتصدق بثمنھا او علی ان اھبھا لمن شئت او علی ان ارھنھا متی بدالی واخرجھا عن الوقف بطل الوقف ثم ذکران ھذا فی غیر المسجد اما المسجد لو اشترط ابطالہ او بیعہ صح وبطل الشرط۔ (الدر المختار مع صدر رد المحتار ج ۳ ص ۴۳۲ کتاب الوقف قبیل مطلب فی وقف المرتد والکافر)

جس ملک میں خود مالک کو کسی زمین یا مکان پر ملکِ مؤبد حاصل نہیں اور اُس کو اس زمین میں تصرف من کل الوجوہ حاصل نہیں تو وہ کس طرح وقف مؤبد کر سکتا ہے اور کس طرح اس مسجد کو مسجدِ شرعی کا حکم دیا جا سکتا ہے؟ اس لیے یہ شرعی مسجد نہیں ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لابد ان یکون مالکه وقت الوقف ملکاً باتاً ولو بسبب فاسدٍ وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراءٍ او صلح ولو اجاز المالك وقف فضولی جاز۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ)[1]

مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی

سوال: ایک شخص نے کسی محلہ میں مسجد بنوائی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی عام اجازت دیدی، کچھ مدت کے بعد اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مسجد میری ملکیت ہے لہٰذا اس میں تمام تصرف میرا ہی چلے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد کسی شخص کی ملکیت میں آسکتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ اس نے خود ہی یہ مسجد تعمیر کرائی ہو؟

الجواب: جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے اور اس میں لوگوں کو نماز کے لیے باقاعدہ اذنِ عام ہو تو پھر یہ کسی کی ملکیت نہیں رہتی، البتہ بانی کو تولیت کا حق حاصل ہے۔

قال الحصکفیؒ: اراد اهل المحلة نقض المسجد وبنائه احکم من الاول ان البانی من اهل المحلة لهم ذلك الا لا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص۳۵۷، کتاب الوقف، احکام المساجد)[2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: من شرائطه الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: رجل بنی مسجداً فی سکة فنازعه بعض اهل السکة فی عمارته او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولی وفی العمارة اولی باتفاق۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۴۲۱ الفصل الرابع فی المسجد واوقافه الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج ۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف۔

مسجد کے فنڈ سے معاوضہ دینا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں مسجد کے محراب کے ساتھ کچھ دوکانیں تھیں، جب مسجد کو شہید کرکے از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تو یہ دوکانیں بھی منہدم ہوگئیں، حکومت نے دوکانداروں کی درخواست پر اس کے متبادل جگہ ان کو دے دی، اب اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ جتنے دن ہمارے کاروبار میں فرق آیا ہے اس کا معاوضہ دیا جائے' ہر دوکاندار تقریباً پانچ ہزار روپے کا طالب ہے اس طرح کل رقم تقریباً بیس ہزار روپے بنتی ہے، جبکہ مسجد کے پاس فنڈ بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ کیا دوکانداروں کے مطالبہ پر اُن کو یہ معاوضہ مسجد کے فنڈ سے دینا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں دوکانداروں کا یہ مطالبہ کہ تعمیرِ مسجد کی وجہ سے جتنے دن ہمارا کاروبار متاثر ہوا ہے اس کا معاوضہ ہمیں دیا جائے' غیر شرعی ہے۔ کیونکہ مالک مکان پر کاروبار کے متاثر ہونے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، تاہم ان ایام کا کرایہ دوکانداروں سے وصول نہیں کیا جاسکتا' اس لیے ایسا غیر شرعی خرچہ مسجد کے فنڈ سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اگر شر وفساد کا خطرہ ہو تو دفع شر کیلئے کچھ رقم دینا مرخص ہے لیکن دوکانداروں کے لیے اس کی وصولی ناجائز اور حرام ہے۔

قال ابن عابدینؒ: الثالث اخذ المال یسوی امرہ عند السلطان دفعاً للضرر او جلباً للنفع وھو حرام علی الاخذ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۰۳، کتاب ادب القاضی، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والھدیۃ)[1]

مسجد کی خرید وفروخت کا عدم جواز

سوال:۔ قیامِ پاکستان کے وقت جب ہندو اور سکھ پاکستان سے کوچ کرکے ہندوستان چلے گئے تو اپنے بہت سے مکانات' زمینیں اور جائداد چھوڑ گئے، مہاجرین کی ایک جماعت نے ایک جگہ کا انتخاب کرکے باقاعدہ ڈپٹی کمشنر سے اجازت لیکر اور نقشہ منظور کراکر مسجد تعمیر کی' بعد ازاں جب حکومت متروکہ زمین کی قیمت وصول کرنے لگی تو حکومت نے اس جگہ کی قیمت وصول

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ومنها اذا دفع الرشوۃ یسوّی امرہ عند السلطان حل له الدفع ولا یحل للاخذ ان یأخُذَ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۲۶۲ کتاب ادب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر علی الھدایۃ ج۶ ص۳۵۹ کتاب ادب القاضی۔

کرنے سے پہلے ہی مسجد اپنی تحویل میں لے لی اور تقریباً اٹھارہ سال تک اپنی تحویل میں رکھا اور مسجد کے لیے موقوفہ دو دکانوں کی آمدنی بھی حکومت وصول کرتی رہی، اب جبکہ حکومت نے اس سے اپنا قبضہ اٹھا لیا ہے تو حکومت اس مسجد کی جگہ کی قیمت کا مطالبہ کرتی ہے، حالانکہ ہم نے یہ مسجد حکومت کی اجازت سے ہی بنائی تھی۔ اندریں صورت کیا اب مسجد کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: مستفتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد حکومت کی اجازت سے تعمیر کی گئی۔ لہٰذا اگر کسی سرکاری جگہ پر قیمت کی ادائیگی کے بغیر حکومت کی اجازت سے مسجد تعمیر کی جائے تو اس سے وہ جگہ مسجدِ شرعی بن جاتی ہے، کیونکہ مساجد کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال او من مالہم ان لم یکن لہم بیت المال۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۳۹، کتاب الوقف، مطلب لو وقف علی الاغنیاء وحدہم لم یجز)

اور حکومت کا نقشہ کی منظوری دینا باقاعدہ اجازت کے مترادف ہے، اب باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد اس کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للہ تعالیٰ وھذا لان الاشیاء کلہا للہ تعالیٰ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۴۲ باب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد)[1]

---

[1] وفی الھندیۃ: اما حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالیٰ وعند ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ عن ملکہ بحیث لا تقبل النقل عن ملک الیٰ ملک والتصدق بالغلۃ المعدومۃ متیٰ صح الوقف بان قال جعلت ارضی ھٰذہ صدقۃ موقوفۃ مؤبدۃ او اوصیت بہا بعد موتی فانہ یصح حتیٰ لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)۔

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۹۱ کتاب الوقف۔

عیدگاہ میں کھیل کود اور اسے راستہ بنانے کا حکم

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک مسئلہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے وہ یہ کہ گاؤں کی وقف عیدگاہ ہے، محلے کے بچے جوتوں سمیت اس میں کھیلتے رہتے ہیں اس عیدگاہ کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ گاؤں کی طرف اور دوسرا سڑک کی طرف کھلتا ہے گاؤں کی طرف کھلنے والے دروازے کو لوگ عیدگاہ سے گذرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں بعض اوقات حیض اور نفاس والی خواتین بھی گذرتی ہیں۔ اب ایک صاحب نے عیدگاہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس کے ایک دروازے کو بند کر دیا ہے مگر گاؤں کے لوگ خصوصاً عیدگاہ کے قرب و جوار میں رہنے والے اُس صاحب کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس پر سخت ناراض بھی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ عیدگاہ کو گذرگاہ بنانا، اس میں چلنا پھرنا اور کھیلنا کودنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: عیدگاہ اور جنازہ گاہ کا مسجد شرعی کے حکم میں ہونا اگرچہ مختلف فیہ ہے مگر راجح مذہب یہ ہے کہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے۔

کما قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: مسجد اتخذ لصلاۃ الجنازۃ او لصلوۃ العید هل یکون له حکم المسجد اختلف المشائخ فیہ قال بعضهم یکون مسجدا حتی لو مات الواقف لا یورث۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیہ ج۳ ص۲۹۰ کتاب الوقف)

وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: المتخذ لصلوۃ الجنازۃ والعید فهو مسجد فی جواز الاقتداء وان انفصل الصفوف رفقا بالناس لا فی حق غیرہ بہ یفتی نهایۃ۔ اھ وعبارۃ النهایۃ والمختار للفتوی انه مسجد فی حق جواز الاقتداء..... فان الباقی لم یعدہ لذلك فینبغی ان لا یجوز..... وما صححه تاج الشریعۃ ان مصلی العید له حکم المساجد وتمامه فی الشرنبلالیۃ۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۶۲ کتاب الوقف)

وفی احسن الفتاوی: جمیع احکام میں عیدگاہ کا بحکم مسجد ہونا مختلف فیہ ہے، شامیہ سے جمیع احکام میں بحکم مسجد ہونے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ (احسن الفتاوی ج۶ ص۴۲۸ کتاب الوقف)

اس لیے عیدگاہ میں ہر وہ عمل جو اس کی بے حرمتی اور بے احترامی کی طرف مفضی ہو ناجائز و حرام ہے، مثلاً عیدگاہ میں راستہ بنانا اور اس میں ہر قسم کے لوگوں (حائضہ، نفساء، جنب وغیرہم) کا گذرنا، اس کو کھیل کود کا میدان بنانا، اس کی بے حرمتی کرنا وغیرہ۔

کما قال العلامة ابن نجیمؒ: وقال بعضھم له حکم المسجد حال اداء الصلوٰۃ لاغیر وھو والجنانة سواءٌ ویجتنب ھذا المکان عما یجتنب المسجد احتیاطاً۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف)

وفی کفایت المفتی: عیدگاہ کے احاطے کے اندر کارخانہ کھولنا جس میں ہر قسم کے آدمی کام کرتے ہوں جائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۷ ص ۱۱۴

وفی امداد المفتیین: نیز احتیاطاً تعظیم وحرمت میں بھی فقہاء نے اس کو مثل مسجد قرار دیا ہے اور زراعت اس کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد ۲ ص ۸۱۵)

وفی احسن الفتاویٰ: عیدگاہ کا احترام بہرکیف واجب ہے، اگرچہ اس کے مسجد ہونے میں اختلاف ہے مگر بےحرمتی سے حفاظت بہرحال ضروری ہے لہٰذا امور مسئولہ (کھیل کود، دعوت وغیرہ) کا انتظام کرنا کی اجازت نہیں۔ (احسن الفتاویٰ جلد ۶ ص ۴۲۸ کتاب الوقف)

اور عیدگاہ میں یہ امور اس لیے بھی جائز نہیں کہ واقف نے اس زمین کو ان امورِ مذکورہ کیلئے وقف نہیں کیا ہے بلکہ اس کا وقف صرف اور صرف عیدگاہ تک محدود ہے اور واقف کی نیت کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ شامی میں ہے: نیة الواقف کنص الشارع۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)

اور پھر جب عیدگاہ کے ساتھ دوسرا متبادل راستہ موجود ہو تو پھر بھی اس میں راستہ بنانا مسجد میں راستہ بنانے کے مترادف ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لا تجعلوا المساجد ممراً (الحدیث) کہ مسجد کو راستہ مت بناؤ۔

اس لیے شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عیدگاہ کی حفاظت کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کو راستہ نہ بنایا جاسکے، اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ تعاون کریں جو اس کی حفاظت کرتا ہو، عیدگاہ کو کھیل کود کا میدان یا راستہ بنانے سے منع کرنے والے پر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا شرعاً حق حاصل نہیں، اس جگہ کو صرف عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس کو بطور راستہ، کھیل کے میدان اور دیگر خلافِ شرع امور میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

جنوبی افریقہ کی قدیم مساجد و مدارس وغیرہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل سوالوں کے اندر کہ:

(۱) جنوبی افریقہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے، حقیقت میں یہ ملک غیر آباد تھا۔ سب سے پہلے ہالینڈ کی ڈچ قوم جا واسے تین سو سال پہلے یہاں آئی تھی۔ اور یہی ڈچ قوم قریباً ڈیڑھ سو ملائی مسلمان، جو کہ سیاسی قیدی تھے، اپنے ساتھ لائی تھی، پھر انگریز آئے اور انہوں نے ہندوستان سے ہندوستانیوں کو کام کاج کے واسطے بلایا، جب ان ہندوستانیوں کا وقت پورا ہو گیا تو بعض واپس ہندوستان چلے گئے اور اکثر یہاں پر ہی مقیم ہو گئے جن میں سے کچھ تو تجارت، کچھ مزدوری اور کچھ زراعت میں مشغول ہو گئے۔ اس ملک میں سفید فام قوم ۳۵ لاکھ، جبشی نژاد ۱۵ لاکھ، ایشیائی قوم ۵ لاکھ، خالص حبشی ایک کروڑ بیس لاکھ اور مسلمان تقریباً ایک لاکھ ہوں گے۔ اور حکومت اس ملک پر سفید فام عیسائی قوم کی ہے، مسلمان نماز، اذان، قربانی اور حج وغیرہ ادا کرنے میں آزاد ہیں، مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے آباد ہیں، اب حکومت نے نسلی امتیاز کا قانون بنایا ہے جس کی بنیاد رنگ پر ہے، مذہب پر نہیں۔ اس قانون کی وجہ سے ہر قوم کو الگ الگ جگہوں پر آباد کیا جاتا ہے، اب جو علاقے سفید فاموں کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں وہاں سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے اور ان کے مکانوں اور زمینوں کی معمولی قیمت دے کر زبردستی ان کو بے دخل کیا جا رہا ہے — اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ملک دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر دارالحرب ہے تو پھر مسلمانوں کو یہاں پر رہنا جائز ہے یا ہجرت کر کے چلے جانا چاہیئے؟

(۲) جو علاقے سفید فام قوم کے لیے مقرر ہو چکے ہیں ان علاقوں کے اندر جو مسجدیں آ گئی ہیں ان کو فروخت کر کے قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا ان کو ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیئے، جبکہ آج ان کی قیمت کئی لاکھ پونڈ سے بھی زیادہ ہے، اور جب ان علاقوں میں مسلمان ہی نہ رہیں گے تو یہ مسجدیں بھی غیر آباد اور شہید ہو جائیں گی۔ اب آپ سے التجا ہے کہ یہ ملک کیا ہے؟ اور جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے اندر آ گئی ہیں اُن کے

واسطے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے؟

الجواب:۔ محترم! آپ کے سوالات کے جوابات شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عباراتِ فقہیہ پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا ملک یعنی جنوبی افریقہ آپ کے واسطے نہ دارالحرب ہے کہ جس سے ہجرت لازم ہو جائے اور نہ مکمل دارالاسلام ہے، بلکہ دارالامن اور دارِ عہد اگر اس کو کہا جائے تو بجا ہے۔ اس بارے میں فقہائے کرام کی چند عبارات ملاحظہ ہوں:۔

(ل) فتاوٰی عالمگیری میں ہے: اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وهو اظهار حکم الاسلام فیها قال محمدؒ فی ان یا دات انما تصیر دارالاسلام دارالحرب عند ابی حنیفةؒ بشروط ثلاثه احدها اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتهار وان لا یحکم فیها بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلة بدارالحرب لا یتخلل بینهما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لا یبقی فیها مؤمن ولا ذمی آمنًا بامان الاول الذی کان ثابتًا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامه والذمی لعقد الذمة۔ وقال ابو یوسفؒ بشرط واحد لا غیر وهو اظهار احکام الکفر وهو القیاس۔ (ج۲ ص۲۳۶)

(ب) خزانة المفتین میں ہے: دارالاسلام لا تصیر دارالحرب الا باجراء احکام الشرك فیها وان یکون متصلًا بدارالحرب لا یکون بینها وبین دارالحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقی فیها مسلم وذمی بالامان الاول فما لم توجد هذه الشرائط لا تصیر دارالحرب وقالا اذا اجدوا فیها احکام الشرك فانها تصیر دارالحرب سواء کانت متصلة بدارالحرب او لم تکن بقی فیها مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول او لم یبق۔

(ج) اور فتاوٰی بزازیہ میں ہے: قال السید الامام والبلاد التی فی ایدی الکفرة الیوم لاشك انها بلاد الاسلام بعد اتصالها ببلاد دارالحرب ولم فیها احکام الکفر بل القضاة مسلمون اما البلاد والتی

عليها قال مسلم جهتهم فيجوز فيها اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاة وتزويج الايامى والارامل لاستيلاء المسلم عليه اما البلاد التي عليها ولاة كفار فيجوز فيها ايضاً اقامة الجمع والاعياد والقاضي قاضٍ بتراضي المسلمين الخ۔ وذكر الحلواني انه انما تصير دار الحرب باجراء احكام الكفر وان لا يحكم فيها بحكم من احكام الاسلام وان يتصل بدار الحرب وان لا يبقى فيها مسلم ولا ذمي آمناً بالاول فاذا وجدت الشرائط كلها صارت دار الحرب وعند تعارض الدلائل والشرائط يبقى ما كان او يترجح جانب الاسلام احتياطاً۔ انتهى ملخصاً۔

(د) اور شرح زیادات للعتابی میں ہے: دار الاسلام انما تصير دار الحرب بثلاث شرائط احدها اجراء احكام الكفار على سبيل الاشتهار، والثاني ان تكون متا بدار الحرب اي متصلة لا يتخلل بينهما بلدة من بلاد المسلمين والثالث ان لا يبقى فيها مسلم او ذمي آمناً بالامان الاول فشرط هذه الشرائط لا يكون علماً على تمام القهر والاستيلاء اذ دار الاسلام يحتاط لانباطلها وعندهما يصير دار الاسلام دار الحرب باجراء احكام الكفر فيها۔ انتهى

(ہ) اور طحطاوی حاشیہ درمختار میں ہے: قوله باجراء احكام الشرك اي على الاشتهار وان لا يحكم فيها بحكم اهل الاسلام هندية۔ وظاهره انه لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرك لا تكون دار الحرب۔ انتهى

ان مجموعہ عبارات اور ان کے امثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں شرط یہ ہے کہ احکام کفر علی سبیل الاشتہار جاری ہوں اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کر دیئے جائیں اور شعائر اسلام وضروریات دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں، اور یہ شرط اتفاقی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کیں، ایک یہ کہ اس بلاد میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکت اہل اسلام کا باقی نہ رہے، دوسرے یہ کہ امان اول مرتفع ہو جاوے اور بامان کفار اقامت کی نوبت آتی ہو، اور دارالحرب سے دارالاسلام ہونے میں ایک شرط ہے، اور وہ ہے اظہار حکم اسلام۔

اس ساری تفصیل کی روشنی میں جب جنوبی افریقہ کے ملک پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ شرائط مذکورہ کی رو سے دارالحرب نہیں ہے، اور یہ اس وجہ سے کہ وہاں شعائر اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت و ممانعت نہیں ہے، جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سفید فام عیسائی قوم کی ہے اور مسلمان جو کہ تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ اذان، نماز، قربانی اور حج وغیرہ شعائر اسلام میں آزاد ہیں، اس لیے اس ملک کو نہ تو دارالحرب کہہ سکتے ہیں اور نہ دارالاسلام کہہ سکتے ہیں کیونکہ سلطنت اور حکومت مسلمانوں کی نہیں ہے، اور نہ پہلے کبھی اس ملک پر اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے، جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس ملک پر اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی بلکہ یہ ملک غیر آباد تھا، اور سب سے پہلے ایک ڈچ کافر قوم کی حکومت قائم ہوئی، پھر انگریزوں کی حکومت آئی اور اب سفید فام عیسائیوں کی حکومت ہے۔ غرضیکہ احکام مسلمین اور احکام شرک دونوں اس میں جاری ہیں، لہٰذا جانب اسلام کو ترجیح دے کر دارالسلام بھی نہیں کہا جا سکتا، البتہ ایک درمیانی صورت ہے کہ اس کو دارالامن اور دار عہد کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یا تو آپ کا سفید فام حکومت سے باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوگا اور اگر باقاعدہ معاہدہ نہ ہوا ہو تو آپ کے ملک کے حالات پر نظر ڈالنے سے عملاً معاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور آپ اپنے تصفیہ طلب معاملات ان کی عدالتوں میں لیجاتے ہیں اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں، اور دیگر معاملات میں بھی ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقینِ معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ توڑا بھی نہیں ہے کیونکہ آپ نے کوئی قومی تحریک شروع نہیں کی جس کی وجہ سے توڑ پھوڑ، مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی چیزوں تک نوبت پہنچ گئی ہو، اس لیے عہد بھی قائم ہے اور امن بھی، پس آپ کا ملک (جنوبی افریقہ) دارالامن اور دار عہد ہے۔ ھٰذا ما ظھر لی وان لم یشرح به القلب و لم تطمئن به النفس فان للمقال فیه مجالاً، واللہ اعلم

(۲) جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے کے اندر آگئی ہیں مجبوراً آپ ان کا عوض لے سکتے ہیں، ان کو فروخت کر کے قیمت لینا اور اس سے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کرنا درست

ہے۔ چند عبارتیں کتب فقہ کی اس مدعیٰ کے اثبات کے لیے درج کی جاتی ہیں:

وفی الخانیة: رباط بعید استغنیٰ عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السید الامام ابو شجاع: تصرف غلته الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنیٰ عنه اهل القریة فرفع ذلك الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز۔

وفی فتاوی النسفی: سئل شیخ الاسلام عن اهل القریة رحلوا وتداعیٰ مسجدها الی الخراب وبعض المتغلبة لیستولون علی خشبه وینقلونه الی دورهم هل الواحد من اهل المحلة ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسك الثمن لیصرفه الی بعض المساجد او الی هذا المسجد قال نعم۔ اھ (شامی ج ۳ ص ۵۱۳)

اس فتویٰ کی تائید میں علامہ شامیؒ نے یہ دلیل بیان کی ہے: فان المسجد اوغیرہ من رباط او حوض اذا لم ینقل یاخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون کما هو مشاهد۔

ہاں اگر ان کے ساتھ اس بات کا سمجھوتہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے شعائرِ دین کو اپنے حال پر ہی رہنے دیں گے اور انہیں ڈھا کر ویران و برباد نہ کریں گے تو اس صورت میں اصل حکم یہ ہے کہ ان مساجد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو فروخت نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انهٗ لایعود الی ملك مالك ابدًا کذا فی المضمرات۔ (فتاویٰ عالمگیری ج۲ ص ۴۴۵)

فقط واللہ اعلم

كتاب
الحدود
والتعزيرات

ادرءُوا الحدود عن المسلمين ما استطعتم

کتاب الحدود والتعزیرات

(حدود اور تعزیرات کے احکام ومسائل)

حدود جاری کرنا حکام کا حق ہے

سوال:۔ کسی مجرم کو کوڑوں یا قصاص کی سزا دینے کا استحقاق صرف حاکم کو ہے یا عوامی جرگہ بھی جاری کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ حدود جاری کرنا حکام اور ان کی طرف سے مقرر شدہ قضاۃ وغیرہ کا حق ہے کسی اور کو حدود جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

وفی الهندیة: ورکنه (الحد) اقامة الامام او نائبه فی الاقامة۔

(الفتاوی الہندیہ ج۲ ص۱۴۳ کتاب الحدود)[1]

کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت

سوال:۔ اسلامی قانون یا حدود اور تعزیرات میں جو کوڑے لگائے جاتے ہیں اس کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ وہ کس طرح کا ہونا چاہیئے اور کس چیز سے بنا ہوا ہونا چاہیئے اور اس کی لمبائی چوڑائی کا کیا اعتبار ہے؟

الجواب:۔ حدود وتعزیرات میں استعمال ہونے والے کوڑے کی ساخت متوسط ہونا ضروری ہے خواہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہو تاہم اگر لکڑی کا ہو تو نرم سی چھڑی ہونی چاہیئے حدود وتعزیرات میں لاٹھی کا استعمال جائز نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: (بسوط لا ثمرة له متوسطا) ای لا عقدة له لان

---

[1] وقال الامام علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانیؒ: واما شرائط جواز اقامتها فمنها ما یعم الحدود کلها ومنها ما یخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلها فهو الامامة وهو ان یکون المقیم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهذا عندنا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۵۷ کتاب الحدود)

ومثله فی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ج۵ ص۲۴۹ کتاب الحدود۔

علیا رضی اللہ عنہ لما اراد أن یقیم الحد کسر ثمرته والمتوسط بین المبرح وهو الجارح وغیر المؤلم لافضاء الاول الی الهلاك وخلو الثانی عن المقصود وهو الانزجار کذا فی الهداية وحاصله انه المؤلم غیر الجارح۔

(البحر الرائق جلد ۵ ص۹ کتاب الحدود)[1]

زنا کا جرم ثابت ہوجانے پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال: - ایک بالغ لڑکے نے بالغہ لڑکی کے ساتھ زنا کیا تو کیا ان دونوں پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں جبکہ آجکل ملک میں اسلامی حکومت بھی نہیں ہے، اگر وہ دونوں آئندہ اور ماقبل تمام گناہوں سے توبہ کرلیں تو کیا ان سے حد ساقط ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: - اسلامی قانون میں زنا کی سزا محصن (شادی شدہ) مرد و عورت کو زنا ثابت ہونے پر رجم (سنگسار) کرنا ہے اور غیر محصن کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رح: واذا وجب الحدود کان الزانی محصنا رجمه بالحجارة حتی یموت اھ وان لم یکن محصناً وکان حراً فحده مائة جلدة۔ (الهداية ج۲ ص۵۰۱ کتاب الحدود)

تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے حدود کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے اسلئے اگر زنا کار مرد اور عورت توبہ کرلیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ گناہ معاف کردے گا علامہ عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اس توبہ کا طریقہ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ "اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز نفل خشوع و خضوع سے پڑھے پھر نہایت آہ و زاری سے آنسو بہا کر عاجزی ظاہر کرکے جیسے کوئی مجرم غلام اپنے آقا سے قصور معاف کراتا ہے دعائے مغفرت کرے

---

[1] قال الزیلعی: بسوط لا ثمرة له متوسطاً ان یضرب بسوط لا عقدة له ضرباً متوسطاً...... وعن علی رضی اللہ عنہ انه کسر ثمرته ولو لم یکسر الثمرة بعد کل ضربة یضرب بتین...... والضرب المتوسط هو المؤلم غیر الجارح لان الجارح یفضی الی التلف او یبقی فی جسده أثره وشینه ولهذا یکسر عقدته وغیر المؤلم لا یفید والواجب التادیب دون الاهلاك۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۱۷۱ کتاب الحدود)

اور دل میں اس گناہ سے ندامت رکھے اور یہ قصد کرے کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا، اور اس عورت کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرے اور اگر ابتداء میں وہ عورت راضی نہ تھی تو اس سے بھی عفو قصور کرالے تاکہ وہ حشر میں دامنگیر نہ ہو۔" واللہ اعلم۔ (مجموعۃ الفتاوی ج ۳ ص ۳۵ کتاب الحدود) [1]

نابالغہ سے زنا بالجبر کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک عاقل بالغ لڑکے نے نابالغ لڑکی سے زبردستی زنا کیا اور جرم ثابت بھی ہو گیا تو اس نابالغ لڑکی پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی عاقل بالغ لڑکا ایسی نابالغ لڑکی سے زنا کرے جس کے مثل کے ساتھ جماع کیا جا سکتا ہو اور قاضی کے ہاں اس کا ثبوت بھی ہو جائے تو لڑکے پر حد لگائی جائے گی اور لڑکی پر بوجہ عدم بلوغ کے کوئی حد نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (ولا) حد (بزنی غیر مکلف بمکلفۃ مطلقاً) لا علیہ ولا علیہا (وفی عکسہ حد) فقط۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۶، ۱۵۷ الباب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ) [2]

حقیقی بیٹی سے زنا کرنے کی سزا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کیا جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئی اور وہ ناجائز بچے کی ماں بن گئی اور اس نے بلا جبر و اکراہ بچے کو اپنے سگے باپ کی طرف منسوب کیا اور

---

[1] قال العلامۃ ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: فان کان محصناً رجمہ فی فضاء حتیٰ یموت ام ولو غیر محصن جلدہ مائۃ۔ (کنز الدقائق ص ۱۸۱ کتاب الحدود)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۴۵، ۱۴۶ الباب الثالث فی کیفیۃ الحد واقامتہ۔

[2] قال العلامۃ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: (قولہ وبزنا صبی اومجنون بمکلفۃ بخلاف عکسہ) ای لا یجب الحد اذا زنی الصبی او المجنون بامرأۃ مکلفۃ وھی البالغۃ العاقلۃ بخلاف العکس وھو ما اذا زنی البالغ العاقل بصبیۃ او مجنونۃ حیث یجب الحد علی الرجل۔ (تبیین الحقائق ج ۳ ص ۱۸۳ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۴۹ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ۔

باپ نے بھی بلا جبر و اکراہ بیٹی سے زنا کرنے کو تسلیم کر لیا، شریعتِ مقدسہ میں ان دونوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:- زنا کو اسلام میں ایک انتہائی قبیح فعل کہا گیا ہے، کسی بھی عورت کے ساتھ زنا کرنا قطعی حرام ہے اور بیٹی تو محرمات میں سے ہے اس کے ساتھ زنا کرنا تو اور بھی زیادہ سخت جرم ہے اور زنا کو حلال سمجھنا موجبِ کفر ہے، برادری کے لوگ ایسے شخص کے ساتھ قطع تعلق کریں اور حکومتِ وقت اس پر حدِ زنا جاری کرے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: من استحل ما حرمه الله تعالیٰ علی وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۲۴ باب المرتد)[1]

پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا

سوال:- اگر کوئی شخص کسی پاکدامن اور عفیفہ عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کی شرعاً کیا سزا ہے؟

الجواب:- جو شخص کسی آزاد مسلمان مکلف اور پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر چار گواہ پیش نہ کر سکے تو دار الاسلام میں ایسے شخص کو اسّی ۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے، اور شریعت میں اس کو حدِ قذف کہا جاتا ہے بشرطیکہ قاذف (تہمتِ زنا لگانے والا) آزاد ہو اس لیے کہ غلام کو آدھی سزا دی جائے گی یعنی چالیس ۴۰ کوڑے لگائے جائیں گے البتہ اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں قاذف توبہ کرے اور مقذوف سے معافی مانگے۔

لما فی الهندیة: اذا قذف الرجل رجلاً محصناً أو امرأة محصنة بصریح الزنیٰ بأن قال زنیت أو یا زانی وطالب المقذوف بالحد حده الحاکم ثمانین سوطاً ان کان القاذف حراً وان کان عبداً حده اربعین سوطاً کذا فی الفتح القدیر۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۶۰ الباب السابع فی حد القذف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: من استحل ما حرمه الله تعالیٰ علی وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالاً۔ (رد المحتار ج۳ ص۱۵۴ باب المرتد)

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا قذف الرجل رجلاً محصناً أو امرأة محصنة بصریح الزنا وطالب المقذوف بالحد حده الحاکم ثمانین سوطاً ان کان حراً لقوله تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الیٰ ان قال فاجلدوهم ثمانین جلدة والمراد الرمی بالزنا بالاجماع وان کان القاذف عبداً جلد اربعین سوطاً۔ (الهدایة ج۲ ص۵۲۹ کتاب الحدود، باب حد القذف)

قابلِ تعزیر سرقہ کی مقدار

سوال:- قابلِ تعزیر سرقہ کا نصاب تو دس درہم ہے لیکن آجکل کی کرنسی کے حساب سے یہ نصاب کتنا بنتا ہے؟

الجواب:- "اوزانِ شرعیہ" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے دس درہم یا پینتیس ۳۵ ماشے چاندی یا اس کی مالیت نصابِ سرقہ بنتا ہے اور یہ بات تو مسلّم ہے کہ مقدارِ حدِ سرقہ دس درہم ہے، لہٰذا موجودہ کرنسی کے اعتبار سے جتنی قیمت ۳۵ ماشے چاندی کی بنتی ہو سرقہ لازم ہو گا۔

وفی الهندیة: أقل النصاب فی السرقة عشرة دراهم مضروبة بوزن سبعة جیاد کذا فی العنایة۔ (الفتاوی الهندیه جلد۲ ص۱۷۰ کتاب السرقة) [۱]

سارق کے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنے کا حکم

سوال:- اگر سارق کا ہاتھ بطورِ حد کاٹ دیا جائے تو اجراءِ حد کے بعد اس کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- سارق کو سرقہ کے جرم میں صرف سزا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس کو ایک ہاتھ سے محروم کرنا ہے تاکہ وہ آئندہ کے لیے یہ کام نہ کر سکے اور اسے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں، اس لیے سارق کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست نہیں ہے۔

وفی الهندیة: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم وثمن الذیت وکلفة الحسم علی السارق عندنا۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۲ الباب الثانی فیما یقطع فیه وما لا یقطع۔ الفصل الثالث) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: (هی) الخ (عشرة دراهم) الخ (جیاداً ومقدارها)
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۹۲ کتاب السرقة)
وَمِثْلُهُ فی کنز الدقائق ص۱۷۰ کتاب السرقة۔

[۲] قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمه الله: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم۔
(کنز الدقائق ص۱۹۵ کتاب الحدود، باب حد السرقة)
وَمِثْلُهُ فی الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۳ ص۲۰۶ باب کیفیة القطع اثباته۔

مزارات سے قیمتی اشیاء چرانے کا حکم

سوال :- آجکل کچھ لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر عموماً قیمتی غلاف چڑھاتے ہیں اس کے علاوہ مزارات پر روپے پیسے اور قیمتی چیزیں بھی رکھی جاتی ہیں، اگر کوئی شخص ان اشیاء کو چرا لے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ ان اشیاء کو چوری کرنا جائز تو نہیں تاہم ان اشیاء کو چرانے سے حدِ سرقہ واجب نہیں ہوتی اور ان اشیاء کا وہی مالک ہوگا جس نے مزارات پر رکھی ہوں۔

وفی الهندیة: ولو سرق من القبر دراهم او دنانیر او شیئاً غیر الکفن لم یقطع بالاجماع اختلف مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ فیما اذا کان القبر فی بیتٍ مقفل الاصح انه لایقطع سواء نبش الکفن او سرق مالاً آخر من ذٰلک البیت وکذا اذا سرق الکفن من تابوت فی القافلة لایقطع فی الاصح کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۱۷۸ الباب الثانی فیما یقطع فیه وما لایقطع فیه)[1]

رہزن کو قتل کرنے کا حکم

سوال :- کیا راہزن، ڈاکو اور ہر وہ آدمی جس کا فساد ظاہر اور عام ہو تو اس کو صرف حاکمِ وقت یا قاضی تعزیراً اور سیاسۃً قتل کر سکتے ہیں یا عوام الناس بھی دفعِ فساد کے لیے اس کو قتل کرنے میں مختار ہیں؟

الجواب :- اگرچہ دفعِ فساد کے لیے حاکمِ وقت اور قاضی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو قتل کر دے، تاہم اگر عوام رہزن کو دورانِ واردات قتل کر دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (وعلیٰ هٰذا) القیاس (المکابر بالظلم وقطاع الطریق

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: (ونبش) لقبور (ولو کان القبر فی بیت مقفل فی الاصح) (او) کان (الثوب غیر الکفن) وکذا لو سرقه من بیت فیه قبر او میت لتأوّله بزیارة القبر او التجهیز۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۰ کتاب السرقة مطلب فی ضمان السارق)

ومثله فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۶۷ کتاب السرقة۔

وصاحب المکس وجمیع الظلمة اھ) وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ وفی ردالمحتار ج۳ ص۱۸۰ لعل الوجوب بالنظر للامام واعوانه والا باحة بالنظر لغیرھم۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج۳ ص۱۸۰ مطلب ویکون التعزیر بالقتل)[1]

مُفسد کو سزا دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں فساد پیدا کرتا ہو تو اس کے ساتھ شرعاً کیا سلوک کیا جائے گا؟

الجواب:۔ حاکمِ وقت کو چاہیئے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے ایسے شخص کو روکے اور اس کو تعزیراً سزا بھی دے، اور عوام الناس کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ترکِ موالات کریں حتیٰ کہ وہ اپنے اس فعلِ بد سے باز آجائے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (وعلیٰ ھٰذا) القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمة بادنیٰ شیٔ له قیمة۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار جلد۳ ص۱۸۰، ۱۸۱ مطلب یکون التعزیر بالقتل)[2]

چارپائے کے ساتھ بدفعلی پر تعزیر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بکری کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے، جبکہ اس کا یہ جرم گواہوں کے ذریعہ ثابت بھی ہو چکا ہے؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت جانور سے وطی (بدفعلی) کرنے والے پر تعزیر ہے جو قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے تاہم کوڑوں کی سزا کی صورت میں چالیس سے کم کوڑے لگائے جائیں گے، کوڑوں کے علاوہ بھی تعزیر ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ تعزیر

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرة بالظلم وقطاع الطریق ...... فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔ (البحرالرائق ج۵ ص۴۲ باب حد القذف، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاویٰ الھندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرة بالظلم وقطاع الطریق وجمیع الظلمة بادنیٰ شیٔ له قیمة وجمیع الکبائر والاعونة والظلمة والسعاة فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔

(البحرالرائق ج۵ ص۴۲ باب حد القذف، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاویٰ الھندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

جان ضائع ہونے تک نہ پہنچے، البتہ جانور کو ذبح کر کے جلا دیا جائے، تاوان وطی کرنے والے کے ذمہ ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری ؒ: وفی شرح الطحاوی رجل وطی بهیمة یعزر، فان کانت البهیمة له تذبح ولا تؤکل، وعن عمر ؓ انه امر بالبهیمة حتی احرقت بالنار۔ وفی الفتاوی الصغری فی الذی یؤکل یذبح ویؤکل عند ابی حنیفة ؒ ولا یحرق وعند ابی یوسف ؒ لا یؤکل ویحرق بالنار الخ

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۵، ۳۴۶ کتاب الحدود، الفصل الثانی فی الزنا)[1]

بیوی کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک عورت کا دعوی ہے کہ اس کا خاوند اس کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرتا ہے تو اس شخص کی سزا شرعاً کیا ہے؟ نیز اس عورت کے والدین اسے اپنے گھر لے جانے کے حقدار ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں عورت اور اس کے اولیاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس خاوند کو اس قبیح فعل سے روکیں ورنہ ارتکاب کی صورت میں حاکم اس کو تعزیراً سزا دے اور عادی ہونے کی صورت میں حاکمِ وقت اس کو قتل بھی کر سکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفی ؒ: أو (بوطء دبر) وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبده وامته او زوجته فلا حد اجماعاً بل یعزر قال فی الدرر بالاحراق بالنار۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ باب التعزیر مطلب فیمن وطی ...)[2]

---

[1] قال العلامة الحصکفی ؒ: (و) لا یحد (بوطء بهیمة) بل یعزر وتذبح ثم تحرق ویکره الانتفاع بها حیة ومیتة مجتبی وفی النهر الظاهر انه یطالب ندباً لقولهم تضمن بالقیمة۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ مطلب فی وطی الدابة)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۳ ص۱۸۱ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانی ؒ: ومن اتی امرأة فی الموضع المکروه او عمل عَمَلَ قوم لوط فلا حد علیه عند ابی حنیفة ؒ ویعزر وقال فی الجامع الصغیر ویودع فی السجن وقالا هو کالزنا فیحد۔ (الهدایة ج۲ ص۵۱۷ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

جادوگر کی سزا کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی کسی پر جادو وغیرہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل گواہی سے ثابت ہو جائے تو شرعاً اس کو کس قسم کی سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ جادوگر چونکہ مفسد فی الارض ہے اس لئے اگر جادوگر جادو کرتے ہوئے پکڑا جائے اور وہ خود بھی اس کا اقرار کرے یا گواہی سے اس کا جادو کرنا ثابت ہو جائے تو قاضی یا حاکمِ وقت اس کو قتل کر سکتا ہے تاہم اگر وہ گرفتاری سے پہلے صدقِ دل سے توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور اس کے بعد اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة علاؤ الدین الطرابلسیؒ: قال فی النوازل الخناق والساحر یقتلان اذا اقرا لانهما ساعیان فی الارض بالفساد فان تابا ان کان قبل الظهور بهما قبلت توبتهما وبعد ما اخذا لا ویقتلان کما قطاع الطریق۔ (معین الحکام ص۲۲۹)[1]

فاسق سے ترکِ موالات کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں طلاق کے بعد علماء نے اسے بتایا کہ اب بغیر حلالۂ شرعی کے یہ عورت آپ کے لیے جائز نہیں لیکن اس کے باوجود اس نے بدستور مطلقہ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے، تو ایسے اعلانیہ فاسق اور فاجر کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس کو اور اس کے والد کو مسجد میں آنے سے منع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنی مطلقہ غلیظہ بیوی کے ساتھ بغیر حلالۂ شرعی کے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا صریح زنا ہے ایسا شخص مستحقِ سزا ہے مگر خود اسے یا اس کے والد کو مسجد سے یا نماز باجماعت سے منع نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس کے رشتہ داروں اور دیگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس کا سوشل بائیکاٹ (ترکِ موالات) کریں۔

ونهی رسول الله صلی الله علیه وسلم المسلمین عن کلامنا الخ واما انا فکنت اشب القوم واجلدهم فکنت اخرج فاشهد الصلوٰة واطوف فی الاسواق ولا یکلمنی احد وآتی رسول الله صلی الله

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: قال ابو حنیفةؒ الساحر اذا اقر بسحره او ثبت یقتل ولا یستتاب منه الخ۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۹۵ قوله والکافر بسبب اعتقاد السحر، باب المرتد)
وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق للزیلعیؒ ج۳ ص۲۹۲ باب المرتدین۔

علیہ وسلم فاسلم علیہ وهو فى مجلسه بعد الصلوٰة الخ

(الصحيح المسلم ج۲ ص۳۶۱ باب حديث توبة كعب بن مالكؓ) ۱؎

اغلام بازی کی سزا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اغلام بازی (مرد کا مرد سے منہ کالا کرنے) کی شرعی سزا کیا ہے؟

الجواب:۔ اغلام بازی ایک قبیح وخبیث فعل ہے، شریعت نے اس کے لیے کوئی باضابطہ سزا تو مقرر نہیں کی، البتہ اس قبیح فعل کی سزا کو حاکم کی صوابدید کے موافق رکھا ہے وہ چاہے تو اس فعل کے مرتکب کو جلا کر ختم کردے یا کسی بلند مقام سے اُلٹا سر کے بل گرا کر اوپر سے پتھر برسانے کا حکم دے یہاں تک کہ وہ مرجائے یا اس پر دیوار گرانے کا حکم دے یا سخت سزا دے کر قید کردے یہاں تک کہ توبہ کرلے یا قید میں مرجائے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: ولا يحد بوطء دبر وقالا ان فعل فى الاجانب حد وان فى عبده اوامته اوزوجته فلاحد اجماعاً بل يعذر. قال فى الدرر بنحو الاحراق بالنار وهدم الجدار والتنكيس من محل مرتفع باتباع الاحجار۔

(الدرالمختار على هامش ردالمحتار ج۳ ص۱۶۱ كتاب الحدود) ۲؎

مردہ عورت سے وطی کرنا موجب تعزیر ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی مردہ عورت سے وطی (زنا) کرے

۱؎ قال المفتى علاؤ الدين الطرابلسى الحنفيؒ: والتعزير لا يختص بفعل معين ولا قول معين فقد عزر رسول الله صلى الله عليه وسلم بالهجر وذلك فى حق الثلاثة الذين ذكرهم الله تعالىٰ فى القرآن العظيم فهجروا خمسين يوماً لا يكلمهم احدٌ وقصتهم مشهورة فى الصحاح۔ (معين الحكام ص۲۳۱ باب التعزير)

ومثله فى شرح الصحيح المسلم للنووى ج۲ ص۳۶۳ باب حديث توبة كعب بن مالك

۲؎ لما قال المفتى محمد شفيعؒ: اس قبیح فعل کے لیے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے تاہم اس کے لیے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کردینا، تلوار سے قتل کردینا وغیرہ۔

(معارف القرآن ج۲ ص۳۴۰ سورة النساء)

تو کیا وہ حد کا مستحق ہے یا تعزیر کا؟

الجواب :۔ مردہ عورت کے ساتھ زنا کرنے والے پر حد زنا لازم نہیں آتی تاہم وہ مستحق تعزیر ضرور ہے۔

وفی الھندیۃ: رجل زنی بامرأۃ میتۃ اختلفوا فیہ قال اھل المدینۃ حد وقال اھل البصرۃ یعزر، ولا یحد وقال ابو اللیث رحمہ اللہ تعالیٰ وبہ ناخذ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ) ؎۱

والدین کی بے ادبی کرنے والے کی سزا

سوال :۔ ایک شخص اپنے والد سے ہمیشہ بری طرح پیش آتا ہے اور اس کو گالیاں بھی دیتا ہے، اس کے علاوہ بسا اوقات والد کو ایسی بے رحمی سے مارتا ہے کہ وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ والدین کو مارنے یا گالی گلوچ کرنے پر شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کی سزا حاکم وقت اور قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا تجویز کرے، اگر کوڑے مارنے کی سزا تجویز کرے تو یہ سزا انتالیس ۳۹ کوڑوں سے زیادہ اور تین ۳ سے کم نہ ہو، یا پھر اس کو جیل میں اس وقت تک ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے جرم سے توبہ نہ کرے۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: ومن یتھم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس احبسہ واخلدہ فی السجن حتی یتوب۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد۳ ص۱۸۸ مطلب فی تعزیر المتھم) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی رجل زنی بامرأۃ میتۃ لا حد علیہ ولکن یعزر۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۴ کتاب الحدود۔ الفصل الثانی فی الزنا)
ومثلہ فی فتاوی قاضیخان ج۴ ص۴۶ کتاب الحدود۔

؎۲ وفی الھندیۃ: من یتھم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس یحبس ویخلد فی السجن الی ان تظھر التوبۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۱۶۹ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر فصل فی التعزیر)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۶ ص۴۲ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر۔

نابالغ قاتل کو تعزیراً سزا دینا

سوال:- کیا حکومت کسی نابالغ قاتل کو تعزیر کے طور پر قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جن جرائم عظیمہ میں حد اور قصاص عوارض خارجیہ کی وجہ سے ساقط ہوں تو اس میں حسب مصلحت تعزیراً سزا دینا جائز ہے چاہے تعزیر سزائے موت تک پہنچ جائے خواہ مجرم نابالغ ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: رأیت فی الصارم المسلول للحافظ ابن تیمیةؒ ان من اصول الحنفیة أن ما لا قتل فیه عندهم مثل القتل بالمثقل والجماع فی غیر القبل اذا تکرر فللامام أن یقتل فاعله الخ ویسمونه القتل سیاسة وفیه ایضاً۔ ومن ذلك ما سیذکره المصنف من ان للامام قتل السارق سیاسة أی ان تکرر منه وفیه وان الحد لا یجب علی الصبی والتعزیر شرع علیه۔

(رد المحتار ج۳ ص۱۷۷ باب التعزیر، قوله ویکون التعزیر بالقتل)

شاگرد کو سزا اور تعزیر دینے کا حکم

سوال:- دینی مدارس اور سکولوں میں طلباء کو کسی شرارت پر یا سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے بطور تنبیہ اور تادیب کے سزا دی جاتی ہے، تو کیا استاد شاگرد کو شرعاً سزا دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- استاد شاگرد کو تعزیر دینے کا حق رکھتا ہے اگرچہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ نابالغ ہونے کی صورت میں تو معلم اسکے اولیاء کی طرف سے تادیب کا مالک بنا دیا گیا ہے اور بالغ نے خود معلم کو تعزیر کا اختیار دیا، لیکن یہ احتیاط ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ اس سے طالب علم بدنی یا ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله وفی القنیة الخ) وفیها عن الروضة ولو أمر غیره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر فهذا تنصیص علی عدم جواز الضرب ولد الآمر بامره بخلاف المعلم لان المأمور یضربه نیابة عن الاب بمصلحته والمعلم یضربه بحکم الملك بتملیك ابیه بمصلحة الولد اھ وهذا اذا لم یکن الضرب فاحشاً۔ (رد المحتار جلد۳ ص۱۸۹ باب التعزیر)[1]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ولو أمر غیره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر قال رضی اللہ عنه فهذا تنصیص علی عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم لان المأمور یضربه نیابة عن الاب لمصلحته والمعلم یضربه بحکم الملك بتملیك ابیه لمصلحة الولد اھ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۹ فصل فی التعزیر)

بیوی کو بدفعلی کی بنا پر قتل کرنا

سوال :۔ اگر کسی شخص کو پختہ یقین ہو کہ اس کی بیوی بدکردار (زانیہ) ہے اور اسی وجہ سے وہ اُسے قتل کر دے تو اس شخص کا یہ انتہائی اقدام درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر شوہر دورانِ زنا بیوی کو قتل کر دے تو مجرم نہ ہوگا، بصورتِ دیگر بیوی کو قتل کرنا قابلِ مواخذہ جرم ہے۔

وفی الهندیة: وان طاوعته المرأة حَلَّ لهٗ قتلها ایضاً کذا فی النهایة وفیها ایضاً ج ۲ ص ۱۶۷۔ قالوا الکل مسلم اقامة التعزیر حال مباشرة المعصیة واما بعد المباشرة فلیس ذٰلک لغیر الحاکم۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۲ ص ۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر)[1]

جنگل سے جانور چوری ہونے کی صورت میں حد کا حکم

سوال :۔ ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم بیلہ کہتے ہیں، گاؤں کے لوگ اپنے مال مویشی اس میں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جبکہ وہ جگہ غیر محفوظ ہے، اب اگر کوئی شخص اس بیلہ سے کسی کے مویشی چرا کر لے جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ قطع ید کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ چوری کسی ایسے مقام سے ہوئی ہو جو محفوظ ہے، اور اگر چوری کسی غیر محفوظ جگہ سے ہو جائے تو سرقہ کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے مجرم سے حد ساقط ہو گی تاہم وہ تعزیر سے

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: سئل الهندوانی عن رجل وجد رجلا مع امرأة ایحل له قتله قال ان کان یعلم انه ینزجر بالصیاح والضرب بما دون السلاح لا وان کان یعلم انهٗ لا ینزجر الا بالقتل حَلَّ له القتل وان طاوعته المرأة حَلَّ له قتلها۔ ایضاً وفی المنیة رأی رجلا مع امرأته وهو یزنی بها او مع محرمه وهما مطاوعتان قتل الرجل والمرأة جمیعا۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۷) ایضاً قالوا لکل مسلم اقامته حال مباشرة المعصیة واما بعد الفراغ منها فلیس ذٰلک لغیر الحاکم۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۴۲ باب حد القذف فصل فی التعزیر)
وَمِثْلُهٗ فی شرح النقایة ج ۲ ص ۳۹ فصل فی التعزیر۔

نہیں بچ سکتا۔

لما قال العلامۃ ابن البزازؒ: ومنھا ان یکون المال الماخوذ محرزاً اما بالمکان المعد للحفظ کالدور والدکّان الخ (البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۶ ص۴۳۱ کتاب السرقۃ)[1]

سکول، کالج میں طلباء کو جرمانے کا حکم

سوال: عصرِ حاضر میں سکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ کا ایک دستور ہے کہ جب کوئی طالب علم غیر حاضری کرتا ہے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اساتذہ یا ادارے کا سربراہ اس سے مالی جرمانہ وصول کرتے ہیں جو کہ اصلاً ان کے والدین سے وصول کیا جاتا ہے، تو کیا شرعاً یہ جرمانہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: طالب علم کا مدرسہ وغیرہ سے انتظامیہ کی اجازت کے بغیر کثرت سے غیر حاضر رہنا یا دیگر کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرنا اگرچہ موجبِ سزا ہے مگر یہ سزا جسمانی حد تک محدود ہونی چاہیئے مالی جرمانہ شرعاً صحیح نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جرم تو طالب علم کرے اور سزا کے طور پر مالی جرمانہ اس کے والدین ادا کریں، یہ بات مناسب نہیں۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: تعزیر بالمال یعنی جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور حدیث لا یحل مال امرئٍ مسلم الا بطیب نفس منہ اس کی مؤید بھی ہے، پس جرمانہ کے طور پر تو لینا درست نہ ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود، حکم جرمانہ بغیر حاضری طالب علم)[2]

---

[1] وفی الہندیۃ: وھی فی الشرع اخذ العاقل البالغ نصابا محرزا...... علیٰ وجہ الخفیۃ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۲ ص۱۷۰ کتاب السرقۃ)
ومثلہٗ فی الہدایۃ ج۲ ص۲۳۱ کتاب السرقۃ۔

[2] قال المفتی محمود الحسنؒ۔ (الجواب) مالی جرمانہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں منسوخ ہے اگر لیا گیا ہو تو اسکی واپسی لازم ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ج۵ ص۱۸۴ کتاب الحدود)
ومثلہٗ فی کفایت المفتی ج۲ ص۱۶۵ کتاب الحدود۔

فصل کو نقصان پہنچانے پر جرمانہ کا حکم

سوال :۔ اگر کسی کا جانور دوسرے کے کھیت میں چلا جائے اور فصل کو نقصان پہنچائے تو شرعاً جانور کے مالک کو کیا سزا دی جا سکتی ہے؟

الجواب :۔ اگر جانور کے ساتھ مالک خود موجود ہو اور اس کی موجودگی میں وہ جانور دوسرے کے کھیت میں جا کر فصل کا نقصان کرے تو شرعاً صرف نقصان کے مطابق رقم وصول کرنا درست ہے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ تاہم اگر جانور کے ساتھ کوئی بھی نہ ہو اور وہ فصل کا نقصان کرے تو اس صورت میں جرمانہ لینا ناجائز ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی تھانویؒ۔ (الجواب) اگر جانور کے ساتھ کوئی نہ ہو اس صورت میں تو یہ جرمانہ ناجائز ہے اور اگر کوئی ساتھ ہو تو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا وصول کرنا درست ہے مگر وہ کھیت والے کا حق ہے۔

(امداد الفتاوی ج۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود) [1]

حفاظت کی نیت سے مال اٹھانے پر سزا کا حکم

سوال :۔ ایک آدمی نے دوسرے پر مال چوری کرنے کا دعویٰ کیا مگر مدعیٰ علیہ (جس پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے) کہتا ہے کہ میں نے اس شخص کا مال چوری کی نیت سے نہیں بلکہ حفاظت کی نیت سے اٹھایا ہے اور میں نے اس شخص کو اطلاع بھی دی ہے، تو کیا اس شخص پر چوری کی سزا نافذ ہوگی یا نہیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے اس نے وہ مال کسی غیر محفوظ مقام سے اٹھایا ہے جس کی موصوف نے مال کے مالک کو اطلاع

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: ولو انہ قال لصاحب الدابۃ ان دابتك في الزرع ولم یقل اخرجها فاخرجها صاحبها فافسدت شیئاً فی اخراجها کان ضامناً...... ولو ان دابۃ رجل انفلتت لیلاً او نهاراً من غیر ارسال فافسدت زرع انسان لا یجب الضمان علی صاحبها لان فعل العجماء هدر۔

(الخانیۃ علی هامش الهندیۃ ج۳ ص۴۵۷ باب جنایۃ البهائم)

ومثلهٗ فی شرح المجلۃ ج۱ ص۲۵۹ کتاب الجنایۃ۔

بھی دی ہے اور دوسری طرف ملزم مال کو بطور امانت لینے کا بھی مدعی ہے، اس لیے ان حالات کے پیشِ نظر ملزم کو چوری کی سزا نہیں دی جائے گی (یعنی اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) تاہم اگر مدعی گواہانِ شرعی سے اس بات کو ثابت کر دے کہ یہ مال محفوظ مقام میں تھا تو پھر اس صورت میں اثباتِ جرم کے تحت مجرم کو چوری کی سزا دی جائے گی۔

قال العلامة الحصکفی: ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وهبانیه او من المسجد اراد به کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء و رب المتاع عنده ای بحیث یراه ولو الحافظ نائما فی الاصح۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۲ کتاب السرقة)[1]

حیوان سے بدفعلی کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی حیوان سے بدفعلی کرتے پکڑا جائے اور اس کے اس فعلِ بد پر گواہ بھی موجود ہوں تو شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کی کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنا اگرچہ شرعاً حرام اور غیر فطری فعل ہے لیکن شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کے لیے کوئی مقرر شدہ سزا نہیں ہے البتہ اس فعلِ بد کے مرتکب شخص کو تعزیراً سزا دی جا سکتی ہے جو حاکمِ وقت یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے وہ جتنی مناسب سمجھے ایسے مجرم کو سزا دے سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تحت قوله (ولا عند وطء بهیمة) وفی القنیة مر فی اجناس الناطفی فرج البهیمة کفیها لا غسل فیه بغیر انزال ویعزر وتذبح البهیمة وتحرق علی وجه الاستحباب

---

[1] قال العلامة وهبة الزحیلی: الاصل فی اشتراط هذا الشرط المتفق علیه قوله علیه السلام "لا قطع فی ثمرة ولا کثر حتی یؤویه الجرین فاذا اواه الجرین ففیه القطع" وفی روایة فاذا اواه المراح او الجرین والحرز لغة: الموضع الذی یحرز فیه الشیء وشرعاً هو ما نصب عادةً لحفظ اموال الناس کالدار والحانوت والخیمة والشخص الخ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۱۰۷ الفصل الثالث فی حد السرقة)

ولا یحرم اکل لحمها به۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۱۲۲ باب الغسل) ۱؎

بجلی چوری کرنے پر سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بجلی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور گواہان کے ذریعہ جرم ثابت ہو جائے تو کیا اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی جرم کی سزا کےلیے یہ ضروری ہے کہ اسکی جملہ شرائط پوری کی پوری پائی جائیں، اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو تو سزا جاری نہیں ہوگی۔ چوری کی سزا کے معاملہ میں یہ ضروری ہے کہ مال محفوظ جگہ سے اٹھایا جائے تب سزا نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں چونکہ بجلی مال ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہے اسلئے حد نافذ نہ ہوگی تاہم تعزیراً سزا ضرور ملنی چاہیئے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وهبانیة او من المسجد اراد به کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء ورب المتاع عنده ای بحیث یراه ولو الحافظ نائماً فی الاصح۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۲ کتاب السرقة) ۲؎

۱؎ قال الشیخ علامة شمس الحق افغانی رحمه الله: واطئ البهیمة یعزر فان کانت البهیمة للواطی ففی شرح الطحاوی وحد ودلاصل تذبح ولا تؤکل۔ وفی فتاوی الصغری انها تؤکل وافتی ابو سعید بهذا وقال صدر الشهید الاعتماد علی روایة شرح الطحاوی۔ (معین القضاة والمفتیین ص ۹۴ مادة ۵۴۴)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۶۶ کتاب الحدود۔

۲؎ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ومنها ان یکون الماخوذ منه محرزا وانما یصیر المکان حرزا باحد الامرین اما ان یکون معداً لحفظ الاموال کالدور والدکاکین والخانات والاخبیة والفساطیط او بالحافظ حتی لو سرق شیئاً من الصحراء وله حافظ بان سرق شیئاً من تحت رأسه وهو نائم فی الصحراء او فی المسجد یقطع ولو کان المال موضوعا بین یدیه اختلف المشائخ قال الامام سرخسیؒ انه محرز۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۳۴۷ کتاب السرقة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص ۱۶۸ کتاب السرقة۔

بیماری کی حالت میں حد جاری کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی شخص پر زنا کا جرم بطریقۂ شرعی ثابت ہو جائے اور وہ دل کا مریض بھی ہو، اب اگر اس پر حد جاری کی جائے تو وہ ہلاک ہو جائے گا، تو اس صورت میں شرعاً کیا کیا جائے، حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- اگر حدود کا مجرم کسی ایسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کہ حد جاری کرنے کی صورت میں اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو مرض کے ختم ہونے تک حد کو موقوف کر کے مجرم کو جیل ہی میں رکھا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تقطع یمین السارق من زندہ وتحسم الا فی حر وبرد شدیدین فلا تقطع لان الحد زاجر لا متلف ویحبس لیتوسط الامر۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله الا فی حر وبرد شدیدین) والا فی حال مرض منتاح وقیدہ فی البنایة بالمرض الشدید افادہ عن الحموی۔

{رد المحتار ج ۳ ص۲۲۶ کتاب السرقة
باب کیفیة القطع واثباته}[1]

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وشرط اصحابنا لقطع الید الیمنی ان تکون الید الیسریٰ والرجل الیمنی صحیحتین حتیٰ انه اذا کانت یدہ الیسریٰ بحیث لا ینتفع بها لا تقطع یدہ الیمنی وکذٰلك اذا کانت الید الیسریٰ صحیحة الا ان الرجل الیمنی مقطوعة او هی شلاء او بها عرج یمنع المشی علیها تقطع الیمنی۔

{الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۱۱۱ کتاب السرقة
الفصل الاول فی بیانها}

ومثله فی فتح القدیر ج ص۱۵۶ کتاب السرقة، فصل فی کیفیة قطع واثباته۔

زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں تفریق کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنا جو حرام قطعی ہے، اس کی قطعی حرمت کے پیش نظر صوبائی اسمبلی میں بعض اسلام پسند ممبروں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہے اس لیے شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کو قرآنی ہدایت کے مطابق زنا کی پاداش میں سنگسار کرنا چاہیئے اور غیر شادی شدہ زانی مرد و عورت کو سو سو دُروں کی سزا دینی چاہیئے اور دونوں قسم کے مجرمین کو سزا دینے میں نرمی یا رعایت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ مگر بجائے اس کے کہ یہ جائز اور اسلامی مطالبہ منظور کیا جاتا حکومت کی اکثریتی پارٹی نے زنا کو دو حصوں (زنا بالرضا اور زنا بالجبر) میں تقسیم کر کے زنا بالرضا کو جائز قرار دیا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومتی سطح پر قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ کی صریح خلاف ورزی کر کے ایک حرام فعل کو قانون کی مدد سے جائز قرار دیا گیا، اور دوسری طرف اسلام کے عمومی حکمِ حرمت سے زنا بالرضا کو مستثنیٰ کر کے زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان حکم کے لحاظ سے تفریق کر دی گئی ہے۔ تو کیا شرعی طور پر طے شدہ ایک حرام فعل کو جائز کرنے کا اختیار کسی شخص یا ادارہ کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو اسلامی شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا زنا کے بارے میں قرآن کریم کی مقرر کردہ سزاؤں سے زنا بالرضا مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور فقہاء امت کے فیصلوں کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب:- سوال کے مضمون پر غور کرنے سے حسبِ ذیل تین امور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) قانونی سزا کے بارے میں اسلامی شریعت زنا بالرضا اور زنا بالجبر کے درمیان تفریق کی قائل ہے؟

(۲) اگر قائل نہیں تو پھر کیا کسی با اختیار ادارہ اور برسرِ اقتدار جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شریعت کی قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کر سکے؟

(۳) حرامِ قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟

ذیل کی سطور میں تینوں اجزاء کے احکام کتاب اللہ، سنتِ رسول اور فقہاء اسلام کے قطعی فیصلوں کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں:-

(جواب جز ۱) زنا کے لیے اسلامی شریعت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے اس میں شریعت نے زنا کی دونوں قسموں کے مابین فرق اور امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے نہ وہ اس طرح کی کسی

تفریق کی قائل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کے واضح احکام کی روشنی میں فقہاء اسلام بھی اس بات پہ متفق ہیں کہ زنا کی دونوں قسموں میں زنا کرنے والے مرد پر قانونی سزا نافذ کی جائے گی، البتہ عورت زنا بالجبر کی صورت میں قانونی سزا سے مستثنیٰ ہوگی اگرچہ اختیاری زنا کی صورت میں وہ بھی مرد کی طرح سزا کی مستحق رہے گی اور مرد کی طرح اس پہ بھی حد شرعی قائم ہوگی۔ ذیل میں مذکورہ بالا دعویٰ کا تفصیلی ثبوت قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے فیصلوں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

زنا قرآن کی نظر میں قرآنِ کریم نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں تجویز کی ہیں ان میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ سزائیں جبری زنا کے لیے ہیں اور اختیاری زنا میں ان کا نفاذ نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں وہاں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے اور زنا بالجبر کا نام تک نہیں لیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا خواہ بالجبر ہو یا بالرضا قرآنی قانون کی نظر میں یکساں طور پہ جرم ہیں، اور دونوں قسم کے زنا میں یہ قانونی سزائیں نافذ کی جائیں گی۔ اختیاری اور جبری زنا کا یہ فرق اگر مغربی اور عیسائی شریعت میں ہو تو ہو مگر اسلامی شریعت اس فرق سے قطعی طور پر نا آشنا اور یقینی طور پر نابلد ہے اب ذیل میں وہ قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں زنا کے لیے قانونی احکام بیان کئے گئے ہیں۔

زنا ایک قبیح فعل ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل)۔ "زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ ایک قبیح فعل اور برا راستہ ہے"۔

اس آیت میں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے، خاص زنا بالرضا یا زنا بالجبر کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے بلکہ مطلق زنا کو فاحشہ (قبیح فعل) کہہ کر مسلمانوں کو اس کے قریب جانے سے روکا گیا ہے جس سے صاف طور پہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں مطلق زنا فاحشہ اور قبیح فعل ہے اور معاشرے کو اس سے پاک رکھنا انتہائی ضروری ہے ــــ اس بارے میں جو لوگ اس قسم کے قبیح افعال کو معاشرے میں فروغ دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ بے حیائی لوگوں میں پھیل جائے قرآنِ کریم نے صریح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النور ۱۹) "جو لوگ مسلمانوں اور مسلم معاشرے میں بیحیائی اور قبیح افعال کو فروغ دے کر پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ ہی

خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ خود زنا جیسے قبیح فعل میں اپنے آپ کو ملوث کرے یا دوسرے مسلمانوں میں اس بے حیائی کے پھیلنے کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش ظاہر کرے۔

زنا کے چور دروازے اسلام نے مسلم معاشرے میں زنا اور حرام کاری کے مکمل انسداد کے لیے یہاں تک انتظام کیا ہے کہ جو امور اس قبیح فعل کے لیے مبادی اور ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اس کے لیے بمنزلہ چور دروازہ کے ہیں قرآن کریم نے قفل لگا کر ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے اور صریح طور پر انہیں ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ "سدّ الباب" اس نے مردوں اور عورتوں دونوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلم معاشرے میں زنا وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے سب سے پہلے عورتوں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اجنبی اور غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردہ ہو کر نہ آئیں اور نہ ہی دورِ جاہلیت کے "تبرّج" کی نقالی کرتی پھریں، ارشادِ قرآنی ہے:۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الاحزاب ۳۳) "یعنی اپنے گھروں میں عزت اور وقار کے ساتھ رہو اور دورِ جاہلیت کے تبرّج کی نقالی نہ کرتی پھرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی فرمانبردار رہو"۔

لیکن بعض اوقات گھروں سے نکلنے کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ بے پردہ ہو کر نہ نکلیں بلکہ بڑی بڑی چادریں وغیرہ اپنے اوپر ڈال کر رکھیں تاکہ ایک طرف آپ کی زینت اور حسن و جمال دوسروں کے لیے باعثِ فتنہ نہ بنے اور دوسری طرف آپ کے متعلق یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ شریف اور باحیاء عورتیں ہیں جو شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں، تو بدطینت لوگ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے اور نہ کوئی بدقماش آپ کو اذیت پہنچا سکے گا۔ ارشادِ قرآنی ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (الاحزاب ۵۹) "اے پیغمبر حکم دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو، اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو کہ (گھروں سے نکلتے وقت) اپنے

اوپر بڑی بڑی چادریں وغیرہ ڈال کر نکلیں اس سے بآسانی ان کی پہچان ہو سکے گی اور انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔"

ایک دوسرے مقام پر پوری سوسائٹی کو جس میں مرد اور عورت سبھی شامل ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حجابِ شرعی کے بغیر ایک دوسرے سے آزادانہ اختلاط نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھو بلکہ دونوں فریق "غضِ بصر" پر عمل کرتے رہو، اس سے آپ کی عفت محفوظ رہ سکتی ہے، اور زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے سے بھی آپ بچ سکتے ہیں ارشادِ قرآنی ہے:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ....وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ۔ (سورۃ النور ۳۰، ۳۱) "اور مومن مردوں کو بھی یہ حکم کیجیے اور عورتوں کو بھی کہ وہ اپنی اپنی نگاہوں کو نیچے رکھ کر شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز اپنے شوہروں اور محارم کے عورتیں اپنی زینت کو دوسروں کے سامنے نہ کھولیں۔"

اس آیتِ مبارکہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ حکم کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں، اور زنا سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن "غضِ بصر" پر "حفاظت" کو مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے کا قوی ذریعہ ہے لہٰذا ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ جائے تاکہ زنا میں ملوث ہونے کی نوبت ہی پیش نہ آئے۔ اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام کاروائیاں انسدادِ زنا کے لیے تدابیر کی حیثیت رکھتی ہیں، اب اگر اسلام کی نظر میں صرف زنا بالجبر ہی ممنوع ہوتا اور اختیاری زنا ممنوع نہ ہوتا تو "غضِ بصر" کا حکم صرف مردوں ہی کو دیا جاتا تاکہ ان کے دلوں میں نظرِ شہوت سے، اجنبی عورتوں کی طرف ناجائز میلان پیدا ہو کر کسی وقت ان سے جبراً زنا کے مرتکب نہ ہوں عورتیں ہرگز اس حکم کے تحت نہ آجاتیں، کیونکہ ان کی طرف سے جبر بالزنا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آیتِ ہذا میں فریقین یعنی مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر "غضِ بصر" کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں زنا بالاختیار بھی اسی طرح ایک سنگین جرم ہے جس طرح زنا بالجبر سنگین جرم ہے اور چونکہ وہ مرد و عورت دونوں کی باہمی نظر بازی سے

پیدا ہوتا ہے اس لیے دونوں کو "غضِ بصر" کا حکم دے کر زنا بالاختیار کے اس چور دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

قانونی سزائیں قرآنِ کریم میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں دونوں قسم کے زنا کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور زنا بالاختیار ان سے مستثنیٰ نہیں ہے، ارشادِ ربانی ہے:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (النور ع۔۱) "بدکاری کرنے والی عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو مارو سَو سَو دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم کے نافذ کرنے میں اگر تم یقین رکھتے ہو خدا پر اور پچھلے دن پر، اور دیکھیں ان کی یہ سزا کچھ لوگ مسلمانوں میں سے۔"

اس آیت میں کوڑوں کی جو سزا بیان کی گئی ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لیے بیان کی گئی ہے بلکہ زانیہ عورت کو زانی مرد پر مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عورت اس سزا کی زیادہ مستحق ہے، حالانکہ زنا بالجبر کی صورت میں پوری ملت اس پر متفق ہے کہ عورت نہ سزا کی مستحق ہے اور نہ اس پر کسی قسم کی حد جاری کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں سزا کا مستحق صرف زانی) مرد ہوگا اور اُسی پر کوڑوں یا رجم کی سزا نافذ کی جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ اختیاری زنا کی سزا ہے نہ کہ جبری زنا کی، لیکن الفاظ کے عموم میں چونکہ دونوں قسم کے زنا داخل ہیں اس لیے مرد کی سزا تو دونوں قسم کے زنا میں بحال رہے گی، اور عورت جبری زنا میں چونکہ مجرم نہیں ہوتی اس لیے وہ اس صورت میں سزا کی بھی مستحق نہ ہوگی۔ چنانچہ روایات میں آگے اس کی تصریح آتی ہے۔ اب قرآنِ کریم کی اس تصریح اور واضح فیصلے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یا ادارہ اس حکم سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے تو اُس کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآنِ کریم کے صریح فیصلے میں تحریف کرنا چاہتا ہے۔

عہدِ نبوّت میں یہ قانونی سزائیں زنا کے بارے میں قرآن کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی صاف طور پر عہدِ نبویؐ کے ایسے صریح فیصلے ملتے ہیں جن میں زنا بالاختیار کی صورت میں مرد اور عورت دونوں پہ یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔ اور اس بات کے لیے عہدِ نبویؐ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی ہے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ کبھی زنا بالاختیار کی صورت میں ثبوتِ جرم کے بعد مرد یا عورت پر قانونی سزا نافذ نہ کی گئی ہو، بلکہ عہدِ نبوت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ زنا بالاختیار میں زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں پہ کوڑوں کی سزا بھی اعلانیہ طور پہ جاری کی گئی ہے اور سنگساری کی سزا بھی۔

رجم کی سزا چنانچہ مشہور صحابی حضرت ماعزؓ کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا حالانکہ وہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری۔ حضرت ماعزؓ کی سنگساری کے ہولناک واقعہ کے بعد حضرت غامدیہؓ کو بھی حضرت ماعزؓ کی طرح سنگسار کیا گیا تھا، حالانکہ حضرت غامدیہؓ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ساتھ کسی نے جبراً زنا کیا تھا ورنہ انہیں ہرگز سنگسار نہ کیا جاتا بلکہ اس شخص کو سنگسار کیا جاتا جس نے ان سے زنا بالجبر کیا تھا۔ کیونکہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ وہ سزا کی مستحق ہے۔

کوڑوں کی سزا اس کے علاوہ کوڑوں کی سزائیں بھی عہدِ نبوت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پہ دی گئی ہیں، حالانکہ عورت پہ جبری زنا کی صورت میں کوڑوں کی سزا بھی جاری نہیں کی جاسکتی۔ ذیل میں ایک دو واقعات ایسے ذکر کیے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اختیاری زنا میں مرد و عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔

زنا کا جرم قابلِ راضی نامہ نہیں ہے عن ابی ہریرۃؓ ان رجلین اختصما الی النبیؐ فقال احدھما ان ابنی کان   علی ھذا فزنی بامرأتہ فاخبرونی ان علی ابنی الرجم فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وبجاریۃ لی ثم انی سألت اھل العلم فاخبرونی ان علی ابنی جلد مائۃ وانما الرجم علی امرأتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ تعالٰی اما غنمک وجاریتک فرد علیک وجلد ابنہ مائۃ وامر انیس الاسلمیؓ ان یأتی امرأۃ الا

فان اعترفت فارجمها فاعترفت فرجمها۔ (ابو داؤد ج ۲ ص۶۱۰) ”حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمی اپنا ایک مقدمہ لے کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے پاس مزدوری کرتا تھا پس اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے بیٹے کی سزا سنگساری ہے، میں نے اس کے بدلے میں اس شخص کو سو بکریاں اور ایک جاریہ دے دی، پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سو کوڑے ہے اور سنگساری اس شخص کی بیوی کی سزا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں آپ دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ تمہاری بکریاں اور جاریہ تمہیں واپس کی جائیں گی اور سزا کے طور پر تیرے بیٹے کو سو درّے لگیں گے۔ اور انیس اسلمیؓ کو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اس کی بیوی کے پاس اور معاملہ کی تحقیق کرو، اگر اس نے زنا کا اقرار کر لیا تو اس کو رجم کرو، چنانچہ اس نے اعترافِ جرم کر لیا اور رجم کی سزا اس پر جاری کی گئی۔

اس حدیث میں زنا کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جبری زنا کا واقعہ تھا کیونکہ یہ گھر کے ایک مزدور کا گھر کی مالکہ کے ساتھ زنا کا واقعہ ہے اور اس میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس مزدور کی کیا مجال تھی کہ وہ گھر کی مالکہ کے ساتھ جبراً زنا کرے۔ اس کے علاوہ اگر یہ زنا جبری ہوتا تو عورت پر رجم اور سنگساری کی سزا جاری نہ کی جاتی، کیونکہ جبری زنا میں عورت سرے سے مجرم ہی نہیں تو اس پر سزا جاری کرنے کے کیا معنیٰ؟ اور سزا بھی وہ جو سخت ترین سزا ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت باوجود مجبور ہونے کے سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کی جائے اور مرد باوجود مجرم ہونے کے کوڑوں کی سزا کا مستحق گردانا جائے حاشا وکلّا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جرم زنا اسلامی شریعت میں قابلِ راضی نامہ نہیں ہے، ورنہ اگر یہ جرم قابلِ راضی نامہ ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ میں متاثرہ فریقین میں ہونے والے راضی نامہ کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر فسخ نہ فرماتے اور اس کے ہوتے ہوئے زانیہ عورت اور زانی مرد پر سزا جاری نہ فرماتے۔

ایک اور واقعہ عن ابن عمرؓ انہ، قال ان الیہود جاءو الی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم فذکروا لہٗ ان رجلاً منھم وامرأۃ زنیا فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تجدون فی التوراۃ فی شان الزنا فقالوا نفضحھم ویجلدون فقال عبد اللہ بن سلامؓ کذبتم ان فیہا الرجم فأتوا بالتوراۃ فنشروھا فجعل احدھم یدہٗ علی اٰیۃ الرجم ثم جعل یقرأ ما قبلہا وما بعدھا۔ فقال لہٗ عبد اللہ ابن سلامؓ ارفع یدک فرفعہا فاذا فیہا اٰیۃ الرجم فقالوا صدق یا محمد فیہا اٰیۃ الرجم فامر بہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرجما۔ قال عبد اللہ بن عمرؓ فرأیت الرجل یحنی علی امرأۃ یقیہا الحجارۃ انتہی (سنن ابی داؤد جلد ۲ ص۲۶۱)

(ترجمہ) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ زنا کے بارے میں تمہاری تورات میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان پر کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں، عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو، تورات میں تو زنا کی سزا رجم ہے، انہوں نے تورات کو لا کر کھولا تو ان میں سے ہی ایک شخص نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنا شروع کر دیں تو عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ اس نے جب ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم موجود تھی، اس پر انہوں نے کہا کہ عبد اللہ واقعی تم سچے ہو تورات میں آیت رجم موجود ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (زانی اور مزنیہ) کے بارہ میں رجم کا حکم فرمایا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ وہ مرد عورت پر جھکتے ہوئے پتھروں سے اس کو بچا رہا تھا۔"

اس حدیث میں یہودیوں کے جس سنگسار شدہ مرد اور عورت کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ عین سنگساری کے دوران بھی زانی مرد زانیہ عورت پر جُھک کر آخر دم تک پتھروں سے اُسے بچانے کی کوشش کرتا رہا، کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ خیال تک دل میں لا سکتا ہے کہ یہاں مرد نے عورت کے ساتھ جو زنا کیا تھا وہ اختیاری نہیں بلکہ زنا بالجبر تھا؟ حالانکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں اصلاً مجرم نہیں نہ وہ سزا کی مستحق ہے، پھر اس پر سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کر کے یہ دوہرا ظلم کیوں کیا گیا؟

زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے

ذیل میں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ زنا بالجبر کی

صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر زنا کی حد جاری کی جا سکتی ہے۔

عن وائل ابن حجر قال استکرهت امرأة علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فدرأ عنها الحد واقامه علی الذی اصابها۔ (جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ ص ـــــ)

(ترجمہ) وائل ابن حجرؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت سے جبراً زنا کیا گیا تو آپؐ نے عورت سے حد ساقط کر کے اسے معاف فرما دیا اور زنا کرنے والے مرد پر حد قائم کر دی۔"

وعنه ان امرأة خرجت علی عهد النبی صلی الله علیه وسلم تريد الصلوٰة فتلقاها رجل فتجللها فقضی حاجته منها فصاحت وانطلق ومرت عصابة من المهاجرين فقالت ان ذلك رجل فعل بی کذا وکذا فاخذوا الرجل فاتوا به رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال لها اذهبی فقد غفر الله لك وقال للرجل الذی وقع علیها ارجموه۔

(جامع الترمذی بحوالہ المشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۱۱، ۳۱۲)

(ترجمہ) یہ بھی وائل ابن حجرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت گھر سے نماز کے ارادہ سے نکلی، راستہ میں اسے ایک شخص ملا جس نے اسے پکڑ کر زبردستی اس سے زنا کیا، اس پر عورت نے شور مچانا شروع کر دیا جس سے گھبرا کر زنا کرنے والا شخص بھاگ گیا، اتنے میں مہاجرین کی ایک جماعت پہنچ گئی، عورت نے انہیں بتایا کہ فلاں آدمی نے مجھ سے جبراً زنا کیا ہے، انہوں نے اس آدمی کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا (اور عورت بھی اس کے ہمراہ تھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تجھے معاف کیا ہے اور زانی مرد کے بارے میں رجم کا حکم فرمایا۔ (چنانچہ وہ آپؐ کے حکم سے رجم کر دیا گیا)۔"

اس حدیث کو اوپر والی روایتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو مجموعہ روایات حدیثیہ اور نصوصِ قرآنیہ سے دو[۲] باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک[۱] یہ کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت اسلامی قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر قانونی سزا جاری کی جا سکتی ہے، دوسری[۲] یہ کہ قرآن و حدیث میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زنا کے واقعات میں جن لوگوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر واقعات بزنا اختیاری سے متعلق تھے نہ کہ زنا بالجبر سے متعلق، ورنہ پھر عورت پر مرد کی طرح ہرگز یہ قانونی سزائیں جاری نہ کی جاتیں ـــــ بہرحال قرآن و حدیث کی رو سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی

خفا نہیں ہے کہ اسلامی شریعت نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں مقرر کر رکھی ہیں، ۱) ان میں زنا بالاختیار اور زنا بالجبر میں کوئی فرق تسلیم نہیں کیا گیا ہے، نہ ہی اسلامی شریعت نے ان قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کیا ہے، بلکہ زنا کی یہ دونوں قسمیں اسلام کی نظر میں یکساں جرم ہیں اور مرتکب جرم سزا کا مستوجب ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ اسلام کی قانونی سزائیں دراصل زنا بالرضا ہی کے لیے مقرر کی گئی ہیں، کیونکہ ان قانونی سزاؤں سے اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کثرت زنا سے محفوظ رہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشرے میں جو زنا کثیر الوقوع ہے یا ہو سکتا ہے وہ زنا بالجبر نہیں وہ زنا بالرضاء ہے اور اسی کے انسداد کے لیے اسلام نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں۔ تو اگر اس (زنا بالرضاء) کو ان سزاؤں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل کے مغرب سے متاثر بعض مسلم دانشور آخر کس معقول دلیل کی بناء پر زنا بالرضاء کو اسلامی قانون سے مستثنیٰ کر رہے ہیں؟

> ”کیا اس میں یہ راز پوشیدہ تو نہیں کہ یہ حضرات اپنے اس ملک میں زناکاری کے کاروبار میں قانون کے ذریعہ سے توسیع کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس ملک میں یورپین تہذیب کی جڑوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہے ہیں؟ یا اس ملک میں پہلے سے جو عیاشی و فحاشی کا خطرناک رجحان پایا جاتا ہے اسے یہ حضرات مزید تقویت اور ترقی دینا چاہتے ہیں؟“ (اللّٰھم اھدنا وایاھم صراطك المستقیم، آمین)

(جواب جز ۲) اب دوسرے سوال کا جواب سن لیجئے۔ یہ بات مسلمات شریعت میں سے ہے اور امت مسلمہ کے ہاں طے شدہ ہے کہ جو حکم قرآن و حدیث میں منصوص طریقہ سے بیان کیا گیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اس پر اسلامی معاشرے میں عملدرآمد بھی رہا ہو، نیز کتاب و سنت سے اس حکم کا کسی مخصوص زمانے کے لیے ہونا یا کسی جزوی مصلحت پر مبنی ہونا بھی معلوم نہ ہو تو ایسے حکم میں تمام امت اور پوری ملت بھی مل کر قیامت تک ادنیٰ سے ادنیٰ ترمیم اور تغیر و تبدیل نہیں کر سکتی۔ ایسی کوئی بھی ترمیم ایک طرف آسمانی شریعت میں بندوں کی طرف سے ایک تحریف ہے اور دوسری طرف ان کی جانب سے ایک مکمل تشریع ہے اور آسمانی شریعتوں میں امتیں تحریف کی مجاز نہیں ہیں اور نہ مستقل تشریع کا حق رکھتی ہیں۔ مشرکین مکہ نے اس قسم کی ترمیموں اور تبدیلیوں کا مطالبہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے یہ کہا کہ ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ ” ہمیں کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسمیں

ہماری منشاء کے مطابق کوئی تبدیلی کرو، اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس مطالبہ کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ ملی، قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (سورۃ ـــ) (ترجمہ) "ان سے یہ کہدو کہ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے خدا کے اس قانون میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرسکوں، میرا حق صرف اس قانون کی حرف بحرف پابندی ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے مجھے بذریعہ وحی بھیجا جارہا ہے"۔ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے بھیجے ہوئے قوانین اور احکام میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں تو دوسرے لوگوں کو ایسی ترمیم اور تبدیلی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

قرآن کریم نے اس حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی ہے کہ جو لوگ اپنی خود ساختہ قانون سازی کے ذریعہ سے خدائی احکام میں تبدیلی کرتے ہیں پھر لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہمارا بنایا ہوا یہ قانون بھی اسلامی قانون کا حصہ اور مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل ہے، ایسے لوگ خدا کی نظر میں بڑے مبغوض اور عذابِ عظیم کے مستحق ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ مِّمَّا يَكْسِبُونَ (بقرہ)

(ترجمہ) "وہ لوگ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے جو اپنے ہاتھوں سے کوئی کتاب (قانون) لکھ لیتے ہیں، پھر لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا قانون ہے (ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں) کہ اس سے اپنے لیے دنیا کا قلیل منافع حاصل کریں، یہ لوگ ایسی قانون سازی کی وجہ سے بھی مبتلائے عذاب ہوں گے اور جو منافع ان کو اس سے حاصل ہوگا اس کی وجہ سے بھی ہلاکت نصیب ہوگی"۔

بہرحال قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں پوری نوعِ انسانی کے افراد مل کر بھی کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کر نہیں کرسکتے کیونکہ اس کی نوعیت مستقل تشریع (شریعت سازی) کی ہے اور تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے، البتہ غیر منصوصی مسائل اور معاملات میں ثبوتِ احکام کیلئے منصوصاتِ شرعیہ سے اجتہاد کے ذریعہ سے احکام اخذ کرکے مستنبط کیے جاسکتے ہیں مگر تشریع کا مجاز کوئی بھی فردِ بشر نہیں ہوسکتا ـــ اور جب یہ ثابت ہوا کہ کوئی بھی فرد بشر شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں کرسکتا تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ زنا جیسے قبیح جرم کی اسلامی شریعت نے جو قانونی سزائیں مقرر کی ہے اُن سے کوئی بھی با اقتدار جماعت یا ادارہ زنا بالاختیار کو

مستثنیٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

(جواب جزء ۳) رہا تیسرا سوال کہ حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ قرآن و حدیث نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اُسی کو پیش کر دوں، نیز فقہاء اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسے لوگوں کے حق میں جو احکام صادر کئے ہیں انہیں کو بیان کر دوں۔

قرآن کریم اور تحلیل حرام | یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور پوری ملتِ اسلامیہ اس پر متفق ہے کہ کائناتِ عالم کا واحد مالک اور بلا شرکتِ غیرے حقیقی حاکم اور حکمران صرف اللہ رب العالمین ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خاص ملکیت ہے اور سب کا اصل حاکم وہ ہے۔ جب تمام کائنات کا خالق و مالک وہی ہے تو تمام کا حاکم بھی وہی رہے گا اور تمام کائنات میں حکم اور قانون بھی اُسی کا چلے گا۔ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین۔ "یہ حقیقت ہے کہ پیدائش بھی خاص اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا، اللہ بڑا بابرکت اور تمام جہانوں کا مالک ہے"۔ ان الحکم الا للہ امر اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ "حکم نہیں ہے مگر اللہ کے لیے، اُسی نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت و پرستش نہ کرو"۔ وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ "وہ اپنے حکم اور فیصلے میں اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

قانون کی اس بنیادی دفعہ کے تحت اشیاء کی تحریم اور تحلیل دونوں کا حق اور اختیار صرف خالقِ اشیاء کو حاصل ہے مخلوق کو قطعاً اس کا حق حاصل نہیں ہے، اس بارہ میں قرآن کریم کا فیصلہ انتہائی صاف اور واضح ہے۔ اُس نے جس طرح تحریم حلال (خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جاننے) کی قطعی ممانعت ممانعت کر رکھی ہے اور فرمایا ہے کہ: لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ "وہ پاکیزہ چیزیں حرام نہ سمجھو جو خدا نے تمہارے لئے حلال کر رکھی ہیں اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو خدا حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اور فرمایا ہے کہ: لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔ "کیوں حرام کرتے ہو اپنے اوپر وہ چیزیں جو خدا نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں"۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ۔ "تحقیق بڑے خسارہ میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے علم کے بغیر حماقت اور نادانی سے اپنی اولاد کو قتل کیا ہے اور

خدا نے ان کو جو حلال رزق دیا ہے اُسے خدا پر جھوٹ باندھ کر حرام سمجھ رکھا ہے"۔ بعینہٖ اسی طرح قرآنِ کریم نے تحلیلِ حرام (خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال جاننے) کی بھی قطعی طور پر ممانعت کر رکھی ہے، ارشادِ ربانی ہے، وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ "یعنی مت کہو ان چیزوں کو جنہیں تمہاری زبانیں جھوٹ کے طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں، اس کا انجام خدا پر جھوٹ باندھنا ہے"۔ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْیَ شَعَآئِرَ اللّٰهِ "اشہرِ حرام اور قربانی کے جانوروں کی ہتک و حرمت کو حلال نہ سمجھو"۔ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ۔ "یہ لوگ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے ہیں اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں"۔

ان آیات میں صریح طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تحریم اور تحلیل کا حق بجز اللہ تعالیٰ کے بالذات کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، یہ حقیقت بھی قرآن کریم سے واضح ہے کہ جو چیزیں آسمانی شریعتوں کی رُو سے قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں، انہیں جب بھی کسی نے حلال سمجھنا شروع کیا آسمانی شریعتوں سے اس کا تعلق بحال نہیں رہا ہے بلکہ منقطع ہو چکا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے کفر اور عالمِ اسلام کے مابین حدِ فاصل مقرر کی ہے کہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو دل سے حرام سمجھنے اور اس کی حلال کردہ اشیاء کو دل سے حلال جاننے کا مضبوط اعتقاد رکھا جائے، اس اعتقاد کے بغیر کوئی شخص نہ مؤمن سمجھا گیا ہے نہ مسلم ـــ مثال کے طور پر شرک ہی کو لیجئے، اس کو انسانی تاریخ کے ہر دور میں آسمانی شریعتوں کی رُو سے حرمتِ قطعی کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جب بھی کسی نے اس کو جائز اور حلال سمجھا ہے تمام آسمانی شریعتوں نے اسے اپنے دائرہ سے خارج تسلیم کیا ہے اور اس کا تعلق ہر آسمانی شریعت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

حدیثِ رسولؐ اور تحلیل و تحریم قرآنِ کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی تحلیل و تحریم کے بارے میں وہی فیصلہ ملتا ہے جو قرآنِ کریم نے اس بارے میں کیا ہے۔ یعنی سنتِ رسولؐ کا فیصلہ بھی یہ ہے کہ جس نے خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جانا اس کا اسلامی شریعت سے تعلق بحال نہیں رہے گا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع رہے گا۔

علماء اور مشائخ کے بارے میں اہلِ کتاب کا عقیدہ قرآن مجید میں یہودی عوام

اور عیسائیوں کے متعلق یہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے سوا اپنے لیے معبود بنا رکھا تھا، ارشاد ربانی ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۃ آیت ــ) جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو اہل کتاب میں سے ایک یہودی عالم "عدی ابن حاتم" جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! ہم نے تو کسی عالم یا درویش کو خدا نہیں کہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اما كانوا اذا احلوا لهم شيئًا استحلوه واذا حرموا عليهم شيئًا حرموه؟ قال نعم، قال هو ذلك۔ اوکما قال (ترمذی) "کیا وہ ایسے نہیں تھے کہ جب ان کے علماء اور مشائخ ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو وہ اسے حلال سمجھتے اور جب کوئی چیز ان پر حرام کرتے تو وہ اسے حرام سمجھتے؟ عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسے تو تھے ہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کا شرک تھا۔"

حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتمؓ سے فرمایا کہ خدائی شریعت سے سند حاصل کئے بغیر جب یہود کے علماء اور مشائخ عوام پر کوئی چیز حرام کرتے تو کیا عوام اُسے حرام نہیں سمجھتے تھے؟ اسی طرح اگر خدائی شریعت سے دلیل حاصل کئے بغیر کسی چیز کو ان کیلئے حلال کرتے تو یہودی عوام اسے حلال نہیں سمجھتے تھے؟ اس کے جواب میں عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسا تو تھا ہی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو بے سند تحلیل و تحریم تھی جس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہوئے تھے۔

اس حدیث سے یہ بات صاف طور پہ معلوم ہوئی کہ جو بھی شخص یا ادارہ اور جماعت خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھے گا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام سمجھے گا اسلام کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

فقہاء اسلام کا فیصلہ قرآن وحدیث کے ان واضح احکامات کی روشنی میں فقہاء اسلام نے بھی اس بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو قرآن وحدیث کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "شرح العقائد" میں لکھا ہے کہ استحلال المعصية كفر اذا ثبت كونها معصية بدليل قطعي "گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ اس کا گناہ ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو" آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:۔

وعلى هذا تفرع ما ذكر في الفتاوى من انه اذا اعتقد الحرام حلالًا فان كانت

حرمته لعينه وقد ثبت بدليل قطعي يكفر والا فلا بان تكون حرمته لغيره او ثبت بدليل ظني۔ وبعضهم لم يفرق بين الحرام لعينه ولغيره وقال من استحل حراما قد علم في دين النبيؐ صلى الله عليه وسلم تحريمه كنكاح المحارم كافر۔

(بحوالہ شامی ج ۲ ص ۳۱۵، ص ۳۱۶)

(ترجمہ) اسی قاعدے پر وہ مسئلہ مبنی ہے جو کتب فتاویٰ میں ذکر ہے کہ جب کوئی شخص حرام کو حلال جانے تو اگر وہ حرام لذاتہ ہو اور اس کی حرمت دلیلِ قطعی سے ثابت ہو تو یہ شخص کافر ہوگا، اور اگر اس کی حرمت لغیرہٖ ہو یا وہ دلیلِ قطعی سے ثابت نہ ہوئی ہو تو کافر نہ ہوگا، اور بعض علماء نے حرام لعینہٖ اور لغیرہٖ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ مطلقاً یہ کہا ہے کہ دونوں کا مستحل کافر ہوگا بشرطیکہ دینِ نبویؐ میں اس کی حرمت کا ثبوت معلوم ہو جیسے نکاحِ محارم"۔

علامہ ابن عابدینؒ نے مندرجہ بالا دونوں مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

وحاصله ان مشروط الكفر على القول الاول شيئان قطعية الدليل وكونه حراما لعينه وعلى الثاني يشترط الشرط الاول فقط وقد علمت ترجيحه۔ اھ

(ترجمہ) "اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ کفر کی شرط بنا بر قول اوّل دو چیزیں ہیں۔ ایک۱ دلیل کا قطعی ہونا اور دوسرے۲ اس کا حرام لعینہٖ ہونا۔ اور بنا بر قول ثانی کفر کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ حرمت کی دلیل قطعی ہو اور بس ا اس قول کا راجح ہونا معلوم ہے"۔

اسی کے قریب قریب وہ مضمون ہے جو تفتازانیؒ نے "شرح العقائد العضدیہ" میں ذکر کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

واستحلال المحرمات كفر ولا بد من التقييد بكون تحريمه مجمعاً عليه دون تكون حرمته من ضروريات الدين، وبدون القيد الثاني ان كان الاجماع مستنداً الى الظن لا يثبت ايضاً وكذا ان كان مستنداً الى دليل قطعي ولم يكن مشتهراً بحيث يكون من ضروريات الدين۔

(شرح العقائد العضدية ص ۱۰۵)

(ترجمہ) "محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ ان کی حرمت اتفاقی ہو، نیز ان کی حرمت ضروریاتِ دین میں سے ہو، اور اگر ان کی حرمت اتفاقی نہ ہو بلکہ اختلافی ہو تو کفر ثابت اصلاً نہ ہوگا اور اگر ان کی

حرمت ضروریات دین میں سے نہ ہو مگر اتفاقی ہو تو اگر یہ اجماع مبنی بر ظن ہو تو پھر بھی کفر ثابت نہ ہوگا، اسی طرح اگر وہ مبنی بر دلیل قطعی ہو مگر دین میں اس کی حرمت اس قدر مشہور نہ ہو چکی ہو کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتے کے قابل ہو تو اس وقت بھی کفر ثابت نہ ہوگا۔

مندرجہ بالا تصریحات کا ماحصل فقہاء اسلام کی مذکورہ بالا تصریحات سے جو امور بطور ماحصل ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) کسی چیز کی حرمت اگر قطعی ہو اور لذاتہ بھی ہو، نیز دینِ نبوی ؐ میں اس کی حرمت اس قدر مشہور ہوئی ہو کہ وہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتی ہو، تو ایسی حرام چیز کو حلال سمجھنا بالاجماع کفر ہے اور کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) لیکن اگر اس کی حرمت قطعی تو ہو مگر لذاتہ نہ ہو یا لذاتہ بھی ہو مگر ضروریات دین میں سے نہ ہو تو ایسی چیز کو حلال سمجھنے والے آدمی کا کفر مختلف فیہ ہے، جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کا قطعی ہونا فقط کافی ہے، لذاتہ ہونا اور ضروریات دین میں سے ہونا ان کے نزدیک شرط نہیں ہے ان کے نزدیک تو کافر ہے کیونکہ حرمت کی قطعیت دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ اور جن کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کی قطعیت اور اس کا لذاتہ ہونا دونوں ضروری ہیں، ان کے نزدیک پہلی صورت میں کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف حرمت کی قطعیت ہے، اور لذاتہ حرمت نہیں ہے، اور دوسری صورت میں کفر ہے کیونکہ اس میں حرمتِ قطعیہ کے ساتھ اس کا لذاتہ ہونا بھی موجود ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے یہ ضروری ہے کہ حرمت مشہور اور ضروریاتِ دین میں سے ہو ان کے نزدیک ۲ میں کفر اصلاً نہیں ہے کیونکہ یہ حرمت ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات کی روشنی میں جب ہم زنا کی حرمت پر غور کرتے ہیں تو وہ حرمتِ قطعی بھی ہے اور لذاتہ بھی اور اس قدر مشہور بھی ہو چکی ہے کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہو چکی ہے لہٰذا اس کو حلال سمجھنا بالاجماع موجبِ کفر ہوگا —— اس اجماعی فیصلہ کے تحت آپ خود غور فرمائیں کہ جو لوگ محرماتِ شرعیہ کو حلال سمجھ رہے ہیں قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے ان واضح فیصلوں کی روشنی میں ان کا انجام کیا ہوگا؟

ہم اور تکفیر لیکن ہم بذاتِ خود کسی شخص یا ادارہ پر کفر کا فتویٰ دینے سے اس بناء پر معذور اور قاصر ہیں کہ فتویٰ تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ مفتی کو اس بات کے متعلق یقینی علم

حاصل ہو کہ جس شخص یا ادارہ پر وہ کفر کا فتویٰ دے رہا ہے اس کے دل میں قطعیات اور ضروریات دین سے قطعی طور پر انکار پایا جاتا ہے اور یہ علم ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اور نہ حاصل ہو سکتا ہے، اس کے بغیر کفر کا فتویٰ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان ممبران اسمبلی کے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کو راہ راست اور راہ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جنہوں نے زنا بالاختیار کو شرعی سزاؤں سے مستثنیٰ قرار دینے کا غلط اقدام کیا ہے، اور ان سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ خدارا اپنے اس فیصلہ پر جلد از جلد نظر ثانی فرما کر خدا و رسولؐ کی ناراضگی اور دنیا و آخرت کی رسوائی کا خطرہ مول نہ لیں۔ امید ہے جملہ ممبران اسمبلی ہماری اس اپیل کو صدا بصحرا ثابت نہ ہونے دیں گے۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ (آمین)

قرائن اور شہرت کی وجہ سے عدالت کا کسی کو سزا دینا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام ذیل کے مسئلہ کے بارے میں کہ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے ایک شخص پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اسلحہ کی نوک پر زبردستی میرے ساتھ بدفعلی کی ہے، لڑکے نے اس واقعہ کی تھانہ میں رپورٹ بھی درج کرائی ہے اور معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، ملزم اس فعل بد سے انکاری ہے جبکہ لڑکے کے پاس اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ بھی نہیں البتہ میڈیکل رپورٹ لڑکے کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے اور مذکورہ شخص اس عمل بد کی وجہ سے مشہور و معروف اور کافی بدنام ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عدالت اس شخص کو اس فعل بد میں شہرت اور میڈیکل رپورٹ کی بنا پر سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی جرم کے اثبات کے لیے محض دعویٰ کرنا کافی نہیں جب تک شریعت کے مطابق شہادت موجود نہ ہو، البتہ قرائن اور شہرت کی وجہ سے جب قاضی (جج) کو اس شخص کے متہم بالفعل ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر محض سیاسۃً سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ کے مطابق اگر میڈیکل رپورٹ اور اس فعل بد میں مذکورہ شخص کی شہرت کے بارے میں عدالت کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے مدعی کے ساتھ بدفعلی کی ہے تو عدالت اسے تعزیراً سزا دے سکتی ہے اور اس قسم کے واقعات میں عدالت اطمینان کر لینے کے بعد مجرم کو سیاسۃً

سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ومن یتہم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس یحبسہ ویخلدہ فی السجن حتی یتوب لأن شر ھذا علی الناس وشر الاول علی النّاس۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۶۷ کتاب الحدود باب التعزیر مطلب فی تعزیر المتہم) ؎

* * *

؎ لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) محض عورت کے کہنے سے مرد پر سیاستۃً تعزیر نہیں ہوسکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن اخریٰ سے وہ متہم کے درجہ میں ہو جائے تو تعزیراً کچھ سزا دی جا سکتی ہے مگر قاضی آجکل کہاں؟ البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا زور ہوتا ہے، تو پنچایت اس بارہ میں بمنزلہ قاضی کے ہے اگر وہ مسائل شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرتے ہوں۔ واللہ اعلم
(امداد الاحکام ج ۳ ص ۱۲۸ کتاب الحدود)

كتاب
الاشربة

كل مسكر خمر
وكل مسكر حرام

کتاب الاشربة

(اشربہ نشہ آور اشیاء کے احکام ومسائل)

نسوار کی شکل میں تمباکو کے استعمال کا حکم

سوال:- نسوار کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- نسوار چونکہ تمباکو سے ہی بنتی ہے لہٰذا اس کا استعمال تمباکو کی طرح فی نفسہٖ مباح اور جائز ہے کیونکہ اس میں نہ نشہ ہے اور نہ مستی ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: فانه لم يثبت اسكاره ولا تفتيره ولا اضراره بل ثبت لهٗ منافع فهو داخل تحت قاعدة الاصل فى الاشياء الاباحة وان فرض اضراره للبعض لايلزم منه تحريمه على كل واحد۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۶ كتاب الاشربة)

البتہ نسوار کی بدبو کی وجہ سے مسجد میں نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے نیز اس میں اسراف اور تبذیر کے علاوہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی مضر صحت ہے اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: اذا شرب الماء وغيره من المباحات بلهو وطرب على هيئة الفسقة حرمٌ۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ كتاب الاشربة)[1]

گنے کے رس سے کشید کی گئی شراب حرام ہے

سوال:- جو شراب گنے کے رس سے بنائی گئی ہو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

---

[1] قال الشيخ محمد الكامل الطرابلسيؒ: وقد حقق المتأخرون من اهل مذهبنا الحنفية انهٗ ليس بحرام وانما فى تعاطيه الكراهية وقد قدمنا ان احسن ما قيل فيه قول الامير رحمه الله فاختلف فيه الدخان والورع تركه۔

(الفتاوى الكاملية ص۲۸۶ كتاب الحظر والاباحة
مطلب فى حكم شرب الدخان فى مجلس قراءة القران)

الجواب:۔ انگور اور کھجور سے بنائی گئی شراب تو بالاتفاق حرام ہے، ان دو چیزوں کے علاوہ جن اشیاء سے شراب بنائی جاتی ہے تو ایسی شراب امام محمد رحمہ اللہ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق حرام ہے کیونکہ یہ نشہ آور شراب ہے، ظاہر حدیث سے ہر مسکر شراب کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔

لما اخرجہ الامام مسلمؒ: کل مسکر حرام۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۱۶۷ باب بیان ان کل مسکر حرام)

قال العلامۃ الحصکفیؒ: والکل حرام عند محمدؒ و بہ یفتی ۔(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ) [1]

اضطراری حالت میں افیون کا استعمال جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص افیون کھانے کا عادی ہے حتیٰ کہ زندگی افیون کھانے میں گذر گئی، اب بوڑھا ہو گیا ہے، ایسے آدمی کا افیون کھانا اور اس کو کھلانا یا اس بارے میں اس سے تعاون کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص افیون کھانے کا ایسا عادی ہے کہ افیون چھڑانے کی صورت میں اس کی موت واقع ہونے کا خدشہ ہو تو افیون کھانا اس کے لیے جائز ہے اور اس کی اعانت کرنا بھی جائز ہے، اور اگر ایسی حالت نہیں تو کھانا اور کھلانا دونوں طرح ناجائز ہے بشرطیکہ ایسا شخص تدریجاً افیون چھوڑنے کی کوشش اپنے اوپر لازم کرلے ورنہ سخت گنہگار رہوگا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: سئل ابن حجر عمن ابتلی بأکل نحو الافیون وصار ان لم یأکل منہ ھلک اجاب ان علم ذٰلک قطعاً حل لہ بل وجب لاضطرارہٖ الیٰ ابقاء روحہ کالمیتۃ للمضطر ویجب علیہ التدریج فی تنقیصہ شیئاً فشیئاً۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۰۸ کتاب الاشربۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ: کل شراب اسکر فھو حرام۔ رواہ البخاری (تبیین الحقائق ج۶ ص۴۷ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۹۸ کتاب الاشربۃ۔

[2] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: فاقتضیٰ ذٰلک وجود الاباحۃ بوجود الضرورۃ فی کل حال وجدت الضرورۃ فیھا۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۲۶ باب ذکر الضرورۃ المبیحۃ لاکل المیتۃ)

الکحل ملی خوشبو کے استعمال کا حکم

سوال:۔ یورپی ممالک سے درآمد شدہ خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل شامل ہوتی ہے، تو کیا بدن اور کپڑوں پر ان کی اسپرے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسی حالت میں نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جن خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل ملی ہوتی ہے اگر یہ الکحل انگور یا کھجور کی ہو تو بالاتفاق ایسی خوشبو کا استعمال ناجائز ہے کیونکہ خوشبو میں الکحل کا استعمال بلاضرورت ہے اور بلا عذر شرعی شراب کا استعمال خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وحرم الانتفاع بها ولو لسقي دواب او لطين او قطر للتلهي او في دواء او دهن او طعام او غير ذلك۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص۲۸۹ کتاب الاشربة)

اگر یہ الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ کسی اور چیز سے بنی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ بھی حرام ہے، اگرچہ متقدمین علماء نے امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے لیکن متاخرین محققین نے عمومِ بلویٰ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو توسع کی خاطر قابلِ عمل قرار دیا ہے کہ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسرے الکحل ملے پرفیومز کا استعمال حرام نہیں۔

قال العلامة محمد تقي العثماني: ان معظم الكحول التي تستعمل اليوم في الادوية والعطور وغيرها لا تتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغيره كما ذكرنا في باب بيع الخمر من كتاب البيوع وحينئذٍ هناك فسحة في الاخذ بقول ابي حنيفةؒ عند عموم البلوى۔

{تکملة فتح الملهم ج ۳ ص۶۰۸ کتاب الاشربة
حکم الكحول المسكرة}

تاہم اگر استعمال نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

منشیات ہر قسم کی ممنوع ہیں

سوال:۔ ایک شخص افیون، بھنگ، چرس کے استعمال کا عادی ہے اور ان اشیاء کے استعمال سے اس شخص پر

کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوتا، اگر یہ شخص ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور ترک نہ کرے تو کیا شرعاً اس کے لیے گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:- ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشۃ والافیون لانہٗ مفسد للعقل ویصد عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ۔ (رد المحتار ج ۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربۃ)

لہٰذا ان کا استعمال حرام ہے، ان مضر اشیاء کے استعمال کی اجازت نہ عادی کو ہے نہ غیر عادی کو، بلکہ عادی پر واجب ہے کہ ان کے استعمال میں آہستہ آہستہ کمی کرتا جائے تاکہ ایک وقت آئے اور جان چھوٹ جائے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ویجب علیہ التدریج فی تنقیصہ شیئًا فشیئًا۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۰۸ کتاب الاشربۃ)[1]

نیگونہ پودے کی جڑوں کے شربت کی تحقیق

سوال:- فیجی آئرلینڈ میں نیگونہ (NAGONA) نامی ایک پودا پایا جاتا ہے جس کی جڑیں خشک کرکے اس میں پانی ملا کر لوگ پیتے ہیں جس سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں: ۱۔ پینے کے بعد آدمی خاموش رہتا ہے ۲۔ زیادہ استعمال کرنے سے جوان بوڑھا نظر آتا ہے ۳۔ زیادہ استعمال سے جسم پر سفید لکیریں نکل آتی ہیں۔ ۴۔ ہاتھ سخت اور بدن خشک ہو جاتا ہے ۵۔ بدن میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۶۔ اکثر ممالک میں اس کو نشہ آور سمجھ کر اس کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس پودے کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:- سوال میں ذکر کردہ مضر اثرات کی وجہ سے نیگونہ (Nagona) پودے کی جڑوں کا شربت استعمال کرنا ناجائز ہے، اس لیے کہ بدن پر اس کے بُرے اثرات پڑتے ہیں جبکہ یہ نشہ آور بھی ہے، شریعتِ مقدسہ نے کسی بھی مضر صحت و بدن چیز کے استعمال سے

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر بن الحدادالیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشۃ والافیون وذٰلک کلہ حرام۔ (الجوهرۃ النیرۃ ج ۲ ص۲۷۰ کتاب الاشربۃ)

ومِثلُہٗ فی فتاویٰ الکاملیۃ ص۲۷۰ کتاب الاشربۃ۔

منع کیا ہے، جیسے زہر میں نشہ تو نہیں مگر پاک ہے لیکن اس کا استعمال حرام ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: كالسم القاتل فانه حرام مع انه طاهر۔
(رد المحتار ج۵ ص۲۹۳ كتاب الاشربة)

اور اس پودے زنگوزہ) میں تو نشہ بھی ہے لہٰذا اس کا استعمال حرام ہے اگرچہ اس پودے کا ذکر فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: وهكذا يقال في غيرها من الاشياء الجامدة المضرة في العقل او غيره يحرم تناول القدر المضر دون القليل۔ اگر نشہ آور کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔ وقال محمدؒ ما اسكر كثيره فقليله حرامٌ۔
(رد المحتار ج۵ ص۲۹۳ كتاب الاشربة) [۱]

بطور دوائی شراب کے استعمال کا حکم

سوال:۔ ایک قریب المرگ مریض جس پر ہر قسم کا علاج آزمایا گیا لیکن کارگر نہ ہوا، اس کے لیے ڈاکٹر نے آخری علاج کے طور پر شراب تجویز کی ہے، کیا ایسے مریض کے لیے بقدر ضرورت شراب پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی مسلمان ڈاکٹر کو تجربات سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ شراب سے مریض کو شفا مل جائے گی تو ضرورتاً اس کا پینا جائز ہے بشرطیکہ شراب کے علاوہ دوسری دوا نہ ہو اسلئے کہ بحالتِ اضطرار میں حرام چیز کا استعمال بقدر ضرورت جائز ہے۔

لما في الهندية: ولو ان مريضاً اشار اليه الطبيب بشرب الخمر روي عن جماعة ائمة بلخ انه ينظر ان كان يعلم يقيناً انه يصح حل له التناول۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات) [۲]

---

[۱] قال العلامة الزيلعيؒ: وعن ابن عمر انه عليه الصلوٰة والسلام قال ما اسكر كثيره فقليله حرام۔ (تبيين الحقائق ج۶ ص۴۷ كتاب الاشربة)
ومثله في البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ كتاب الاشربة

[۲] قال العلامة الكاسانيؒ: انه يحرم شرب قليلها وكثيرها الا عند الضرورة۔
(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱۲ كتاب الاشربة)
ومثله في رد المحتار ج۴ ص۲۱۵ كتاب الاشربة۔

بطورِ دوا شراب کے خارجی استعمال کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کی قوتِ سامعہ خراب ہے، ڈاکٹروں نے بطورِ علاج شراب کے چند قطرے خارجی طور پر استعمال کرنے کی تجویز دی ہے، کیا یہ طریقہ علاج شرعاً جائز ہے؟

الجواب :۔ متقدمین فقہاء کے نزدیک شراب کا داخلی وخارجی استعمال اور اس سے نفع لینا حرام ہے۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ، ویکرہ الاحتقان بالخمر واقطارھا فی الاحلیل لانہ الانتفاع بالمحرم۔ (الھدایة ج۴ ص۵۰۰ کتاب الاشربة)

لیکن متاخرین نے جب بطورِ تداوی کے شراب کے داخلی استعمال کی اجازت دی ہے تو خارجی استعمال کے مرخص ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لما فی الھندیة : یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح ما یقوم مقامہ۔ (الفتاویٰ الھندیة ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)[1]

الکحل ملی ادویات کے استعمال کا حکم

سوال :۔ جن دوائیوں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اُن کا استعمال ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ انگریزی ادویات کے استعمال کے بارے میں متاخرین فقہاء کرام کا قول یہ ہے کہ اگر ان ادویات میں شراب یا کسی اور حرام شئے کا اختلاط یقینی یا ظنِ غالب کے طور پر معلوم ہو تو ان کا استعمال شرعاً جائز ہے جبکہ اس میں شفاء کا امکان ہو، اگر ان دوائیوں میں الکحل کا صرف احتمال (شک) ہو تو پھر ایسی دوائیوں کے استعمال کرنے میں مزید گنجائش نکلتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : فی النھایة عن الذخیرة یجوز ان

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : اما اذا علم ولیس لہٗ دواء غیرہ یجوز۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۱۵ باب المتفرقات، مطلب فی التداوی) وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربة۔

علم فیہ شفاء ولم یعلم دواء اٰخر۔ (رد المحتار ج۱ ص۱۴ مطلب فی التداوی فی المحرم) [1]

افیون بطور دوائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ بطور دوائی افیون کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر حرام اشیاء کا بوقت ضرورت بطور دوائی استعمال جائز ہے اسی طرح افیون کا استعمال بھی دوائی کے طور پر جائز ہے بشرطیکہ حد سکر کو نہ پہنچے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: من غاب عقلہ بالبنج والافیون یقع طلاقہ اذا استعملہ للھو و ادخال الآفات قصدا لکونہ معصیۃ وان کان للتداوی فلا لعدمھا کذا فی فتح القدیر وھو صریح فی حرمۃ البنج والافیون لا للدواء۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربۃ) [2]

سیون اپ اور کوکا کولا پینے کا حکم

سوال:۔ سیون اپ اور کوکا کولا مشروبات کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں الکحل ملا ہوتا ہے، اس لحاظ سے ان مشروبات کا پینا جائز ہے یا نہیں

الجواب:۔ سیون اپ اور کوکا کولا کے بارے میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ان میں الکحل کی ملاوٹ نہیں ہوتی، صرف شک کی بناء پر یہ بات کی گئی ہے، ایسے شک سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، البتہ محض شک کی بناء پر اگر کوئی احتیاطاً مذکورہ مشروبات نہ پیئے تو ٹھیک ہے لیکن ان کا پینا حرام نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: وھذا بناء علی ان الشک یورث الاحتیاط دون الحرمۃ لان الیقین لا یزول بالشک۔ (شرح المجلۃ الاحکام، المادۃ ۴ ص۲) [3]

---

[1] و [2] لما فی الھندیۃ: یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح ما یقوم مقامہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربۃ۔

[3] قال العلامۃ الشیخ الزرقاء: ومعناھا ان ما کان ثابتاً متیقناً لا یرتفع بمجرد طرو الشک علیہ لان الامر الیقینی لا یعقل ان یزیلہ ما ھو اضعف منہ بل ما کان مثلہ او اقوی۔
(شرح القواعد الفقھیہ ص۳ القاعدۃ الثالثۃ الیقین لا یزول بالشک)

فتاویٰ رشیدیہ کی ایک عبارت پر پیدا ہونے والے سوال کا جواب

سوال ۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے فتاویٰ رشیدیہ میں حقہ کشی کو مباح قرار دیا ہے ۔ تو کیا ان کے اس قول کا فقہ حنفی میں کچھ ثبوت ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو حدیث شریف کے ان الفاظ کل دخان حرام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں ۔

الجواب ۔ ذوی العقول اہلِ اسلام پر مخفی نہ ہو کہ حقہ کشی کا حدوث سن ایک ہزار ہجری (سنہ ۱۰۰۰ھ) کے بعد ہوا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک علماء مذاہب اربعہ کے اس کے بارے میں نظریات رہے ہیں ، بعض نے حرمت کا حکم دیا ہے ، بعض کراہتِ تحریمیہ کی طرف مائل ہیں اور بعض دوسرے کراہتِ تنزیہیہ کے قائل ہیں اور بعض نے اباحتِ مطلقہ کا حکم لگایا ہے ۔

اس مسئلہ کی پوری وضاحت عبارات مع مالہا وما علیہا کو حضرت مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی نے اپنے ایک رسالہ "ترویح الجنان بتشریح حکم شرب الدخان" میں کی ہے ، مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری اور انتہائی مفید ہے اور پوری تشفی کی امید اس کے ساتھ وابستہ ہے ۔ پھر بھی آپ کے سوال کے حوالے سے یہاں چند ضروری باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے ۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں : اضطربت آراء العلماء فیه فبعضهم قال بکراهته وبعضهم قال بحرمته وبعضهم باباحته وافردوه بالتالیف وفی شرح الوهبانیة للشرنبلالی ؂

ویمنع من بیع الدخان وشربه
وشاربه فی الصوم لاشك یفطر

وللعلامة الشیخ علی الاجهوری رسالة نقل فیها انه افتی بحله من یعتمد علیه من ائمة المذاهب الاربعة قلت والف فی حله سیدنا العارف عبد الغنی النابلسی الحنفیؒ رسالة سماها الصلح بین الاخوان فی اباحة شرب الدخان واقامة الطامة الکبری علی القائل بالحرمة او بالکراهة فانهما حکمان

شرعیان لا بد لہما للبعض لا یلزم منہ تحریمہٗ علی کل احد۔ انتہی۔ یہ تمام عبارات "شامی ج۵ کتاب الاشربۃ" میں موجود ہیں۔

اور عبدالغنی نابلسیؒ "حدیقہ ندیہ شرح طریقہ محمدیہ" میں لکھتے ہیں، من البدع العادیۃ استعمال التتن والقہوۃ۔ انتہی

اور شیخ عبدالخالق زجاجی زبیدی حنفیؒ اپنے بعض فتاوی میں لکھتے ہیں، قد تکلم العلماء المتأخرون فی ذلک لانہٗ لم یکن فی القرون السابقۃ فمن مفرط فی ذمہ حتی جزم بالحرمۃ ومن مفرط فی مدحہ ومنہم من توسط وقال انہٗ مکروہ تحریمًا وہذا عندی احسن الاقوال واعدلہا اذ لا قاطع بتحریمہ ولیس کل موذٍ ومنتن حرامًا والا لکان اکل الثوم والبصل والفجل والکراث حرامًا ہذا کلہ فی شرب دخانہ واما اکلہ وشمہٗ فہو مکروہ تنزیہًا عندی لانہا دون شرب دخانہ۔ انتہی ملخصًا۔
(یہ عبارات مجموعۃ الفتاوی ج۲ ص۹۶ سے نقل کی گئی ہیں)

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ علماء کے اس اختلاف کا منشا کیا ہے؟ تو ہمارے نزدیک اس اختلاف کا منشا وہی ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ حقہ قریب تین سو برس ہوئے کہ کفار نے نکالا ہے، پھر سب لوگوں میں شائع ہوا، اور اصل میں یہ ایک دوا ہے، بعض امراض کو نافع بھی ہے اور کثرت اس کی مضر ہے جیسا کہ کتب طب سے معلوم ہوتا ہے۔ اب پینے والوں کی مختلف غرضیں ہیں، مختلف مزاج ہیں، مختلف طور ہیں اور مختلف خیال اور مختلف عادتیں ہیں۔ کوئی مرض کے لیے پیتا ہے، کوئی شوقیہ پیتا ہے، کسی کو کچھ نافع ہے کسی کو مضر ہے، کوئی پی کر منہ صاف کرتا ہے، کوئی سڑا لیتا ہے، کوئی احتیاط سے پیتا ہے، کوئی بے احتیاطی سے، کوئی برا سمجھ کر پیتا ہے، کوئی اچھا جان کر پیتا ہے، یہاں تک کہ بعض روزہ میں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، کوئی بہت کثرت سے پیتا ہے، کوئی کبھی کبھی پی لیتا ہے، بعض کو اگر ایک گھنٹہ نہ ملے بے چین ہو جاتے ہیں، بعض کو کئی کئی روز تک خیال نہیں ہوتا۔ پھر تمباکو میں بھی بعض اقسام بہت تیز اور مضر ہیں، بعض کم درجے میں ہیں، کسی میں بو زیادہ ہے کسی میں کم ہے، کسی میں نوبت نشہ یا فتور کی ہے کسی میں نہیں، کوئی ایسی چیز کے ساتھ مرکب ہے جس سے اس کی خباثت کم ہو جاتی ہے کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح حقہ اور نیچہ میں بھی، بعض نیچہ کے کپڑے پاک ہوتے ہیں کسی کے ناپاک؛ اور کسی کے مشتبہ، کوئی نیچوان ہے اس میں اثر قلیل آتا ہے کسی میں زیادہ آتا ہے۔ کوئی

جلد جلد تازہ کیا جاتا ہے، کوئی کئی کئی دن تک سڑتا رہتا ہے، کوئی عام ہے کہ سب کا منہ لگتا ہے جیسے تکیوں کے حقے، کوئی خاص ہے بغرض نہ سب پینے والے برابر، نہ سب تمباکو ایک طرح کے، نہ سب حقے و نیچہ ایک طرح کے، سب متفاوت اور مختلف، ہر ایک کا حکم الگ ہوا۔ پس اگر کسی نے ضرورت شدیدہ میں کسی مرض و شواد کے علاج کے لیے احتیاط سے بطور دوا کے کبھی کبھی ایک آدھ بار پی لیا تو چنداں جرم نہیں ہے، اور جو بعد ازالۂ مرض بغیر ضرورت کے شوقیہ پیوے جیسا آجکل شائع ہے کہ یہی محفل کی زیب و زینت ہوگئی ہے اور اسی کی خاطر و تواضع رہ گئی اس کے نہ ملنے کی شکایتیں ہوتی ہیں کہ فلانے نے حقہ تک بھی نہیں پلایا اور زبان سے چاہے برا کہتے ہوں اور شاید دل میں بھی برا جانتے ہوں مگر ظاہر میں بے باکانہ اس کو پیتے ہیں اور ذرا بھی محجوب و منقبض نہیں ہوتے، اور آخر میں مضر بھی ہوتا ہے اور منہ میں برابر بدبو آتی ہے، اور ہر دم منہ میں گھسا رہتا ہے اور حواس میں بھی کدورت آجاتی ہے اور تشبہ اہلِ نار کے ساتھ ہے کہ منہ اور ناک میں سے دھواں نکلتا ہے، اور خود دھواں اور آگ بھی آلہ عذاب کا ہے اس کے ساتھ متلبس رہتے ہیں، اس طور پر اس کا عادی ہوجانا بسبب اجتماع ان امور کے بیشک برا اور سخت مکروہ ہے، پھر امور مذکورہ سابق کے تفاوت سے کراہت میں بھی تفاوت ہوگا۔ اور بعض پینے والے جو بد احتیاط ہیں اور سڑے ہوئے حقے اور ناپاک نیچے، تیز تمباکو پیتے پیتے نشہ ہوجاتا ہے اور شراب کی سی مدہوشی ہوتی ہے، اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ حاصل یہ کہ کوئی حقہ زیادہ مکروہ کوئی کم مکروہ، کوئی حرام کوئی ضرورت شدیدہ میں بطور دوا کے ایک آدھ بار مباح۔ اس تقریر پر درمیان اقوال علماء و فقہاء کے۔ جو اس کی اباحت، کراہت و حرمت میں مختلف ہیں تطبیق بھی ممکن ہے، پس جیسا موقعہ کسی نے دیکھا ہوگا ویسا کہدیا ہوگا۔ بہر حال پینے والا اس کا اکثر حالتوں میں نہ کل حالتوں میں، گناہ سے خالی نہیں"۔ انتہیٰ

حضرت تھانویؒ کی اس تقریر سے اختلاف علماء و فقہاء کا منشاء اور ان کے اقوال کی تطبیق پر روشنی پڑ گئی۔ دلائل کے اعتبار سے جب علماء و فقہاء کے اختلاف پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بعد تنقیح دلائل طرفین یہ واضح ہوتا ہے کہ حرمت کا قول تو لا یعبأ بہ ہے کیونکہ حرمت قطعی دلیل تحریم پر موقوف ہوتی ہے جن علماء نے حرمت کا حکم دیا ہے انہوں نے کوئی قطعی دلیل اس پر قائم نہیں کی ہے بلکہ ان کے تمام ظنی دلائل بھی مخدوش ہیں، جیسا کہ مولانا عبد الحی صاحب رحمہ اللہ نے "ترویح الجنان" میں اس کی وضاحت کردی ہے۔ اور قول اباحت بلا کراہت بھی خدشات سے خالی نہیں ہے البتہ قول کراہت قابلِ اعتبار

ہو۔ اور بالفرض اگر اس کی حرمت ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس کے مختلف فیہ ہونے میں شک نہیں ہے جیساکہ عباراتِ سابق سے معلوم ہوا کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی حرمت سے انکار کیا ہے اور انہوں نے کراہت یا اباحت کا فتویٰ دیا ہے اور کراہت میں بھی بعض نے تحریمی کا قول کیا ہے اور بعض نے تنزیہی کا۔ علامہ ابو السعودؒ کے نزدیک کراہت تنزیہی ہے اور کراہتِ تنزیہی اباحت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے ـــــ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال ابو السعود فتكون الكراهة تنزيهية والمكروه تنزيهاً يجامع الاباحة ـــــ اگر حضرت گنگوہیؒ نے جن کو حضرت مولانا شاہ انور شاہ کشمیریؒ نے فقیہ النفس کا موزوں خطاب عطا فرمایا تھا، اس کی اباحت کا قول کر کے فتویٰ دے دیا تو کون سے گناہ کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ فقیہ النفس حضرت گنگوہیؒ نے ان علماء و فقہاء کے اقوال و آراء اور دلائل کو ترجیح دی ہو جو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ اور خود حضرت گنگوہیؒ بھی بہت بڑے درجے کے عالم ہیں اور تمام علوم اسلامیہ میں منصبِ امامت آپؒ کو حاصل تھا مگر جو خصوصی مناسبت آپ کو فقہ اور حدیث سے تھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوم آپؒ کی سرشت میں داخل ہو چکے تھے، وہ مشکل مسائل جن کے حل کرنے میں علماء عصر حیران و پریشان رہتے تھے حضرت گنگوہیؒ ان کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرتؒ نے اپنی تحقیق کی ہو اور ان کی تحقیق میں اس کی اباحت کسی درجہ میں ثابت ہو چکی ہو۔ اس کے علاوہ اگر انہوں نے اباحت کا قول کر کے فتویٰ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی وقت اور حالت اور موقعہ میں بھی یہ کراہت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، نیز اگر کوئی اس کی اباحت کا قائل ہو جائے تو یہ کفر تو نہیں کیونکہ اس کی اباحت، کراہت اور حرمت میں اختلاف تو ہے۔ اور "شرح عقائد نسفی" اور اسی طرح "فتاویٰ بزازیہ" میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ حرام مختلف فیہ کے محلل کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور کل دخان حرام یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اصل حدیث اس طرح وارد ہے: كل مسكر خمر وكل مسكر حرام۔ (رواہ مسلم) یا یہ حدیث ہے: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل مسكر ومفتر۔ (رواہ احمد عن ام سلمةؓ) جب یہ "کل دخان حرام" حدیث کے الفاظ ہی نہیں ہیں تو ان پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مسئلہ فی نفسہ بقدر ضرورت واضح ہو گیا۔

فقط واللہ اعلم

كتاب القصاص والدية

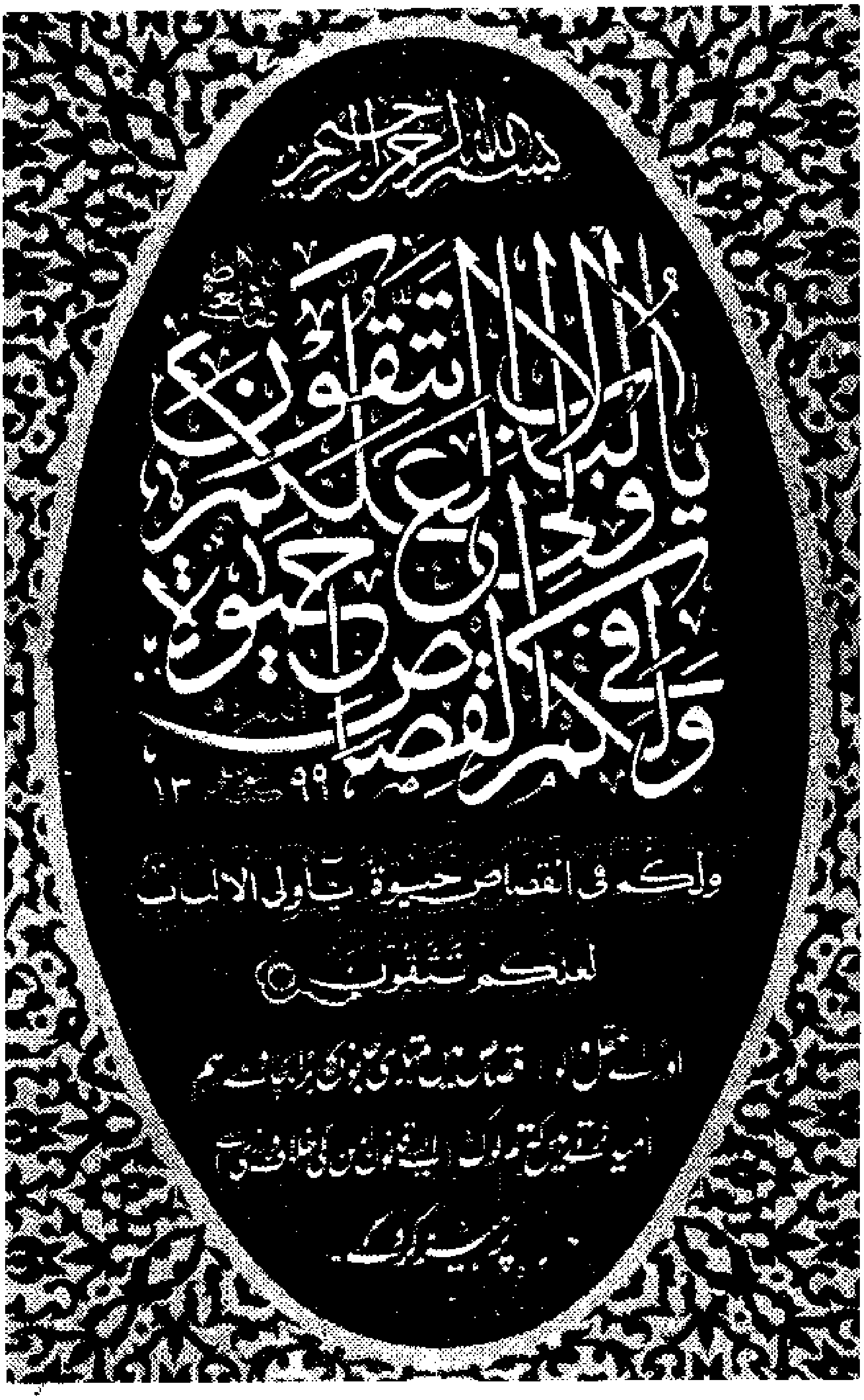

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالباب لعلکم تتقون

١٣٩٩

ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالبٰب

لعلکم تتقون ۞

اے عقل والو! قصاص میں تمہاری زندگی ہے تاکہ تم

امید ہے کہ تم [illegible]

پرہیز کرو۔

کتاب القصاص والدیة

(قصاص اور دیت کے احکام و مسائل)

قاتل کو معاف کر دینے کے بعد قصاص کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

سوال:- ایک شخص نے دوسرے آدمی پر قتلِ عمد کا دعویٰ دائر کیا، اب اگر مقتول کے ورثاء گواہوں کے سامنے قاتل کو معاف کر دیں تو بعد میں کسی وجہ سے دوبارہ قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- ورثاء کا قاتل کو باقاعدہ معاف کر دینے کے بعد حقِ قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کو دوبارہ مطالبۂ قصاص کا حق باقی نہیں رہتا، بلکہ کسی ایک وارث کے معاف کر دینے سے بھی بقیہ ورثاء کو قصاص لینے کا حق نہیں رہتا۔

وفی الهندیة: ومن عفا عن ورثة المقتول فلا سبیل الی القصاص۔

(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۲۲ الباب السادس فی الصلح والعفو) [1]

صلح ہو جانے کے بعد عدالت کا قاتل کو سزا دینا

سوال:- ایک آدمی مثلاً زید نے کسی کو عمداً قتل کیا جس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا کہ مقتول کے ورثاء نے دیت لے کر مقدمہ کی پیروی چھوڑ دی جس کی وجہ سے زید پھانسی کی سزا سے بچ گیا لیکن عدالت نے اس کو عمر قید کی سزا سنادی ہے کیا یہ سزا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- قتلِ عمد میں قصاص لینا ورثاء کا شرعی حق ہے جبکہ ورثاء قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں اور دیت لے کر صلح بھی کر سکتے ہیں، صورتِ مسئولہ کے مطابق ورثاءؔ

---

[1] قال العلامة الجصاص الرازی رحمہ اللہ:- قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العمد قود الا ان یعفو ولی المقتول۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۵۱ بحث تنازع اهل العلم فی معنی قولہ تعالیٰ: فمن عفی لہ من اخیه شئ۔ الآیة)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۶ بیان ما یسقط القصاص بعد وجوبه، کتاب الجنایات۔

نے جب دیت لے کر قاتل کو معاف کر دیا تو حکومت کو مزید سزا دینے کا کوئی حق نہیں، اس لیے اب عدالت کا اسے عمر قید کی سزا سنانا مروجہ قانونی سزا تو ہو سکتی ہے شرعی نہیں۔

لما قال اللہ تعالیٰ: فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ...... فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸)

قال العلامۃ المرغینانیؒ: انها نزلت فی الصلح۔ (الهدایۃ ج ۳ ص ۲۴۶ کتاب الصلح) [1]

بدلِ صلح صرف قاتل پر ہے

سوال:۔ ایک آدمی کے باپ کو کسی نے قتل کیا ہے، بیٹا اب صلح کرنا چاہتا ہے تو کیا قاتل کے ورثاء دیت ادا کرنے کے پابند ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صلح کی صورت میں بدل صرف قاتل پر واجب ہے دیگر رشتہ دار صرف بطورِ احسان تعاون کر سکتے ہیں۔

کما فی الهندیۃ: وکل ارش وجب بالصلح فهو فی مال القاتل۔

(الفتاویٰ الهندیۃ ج ۴ ص ۲۳ کتاب الصلح) [2]

قتل بالسبب کی دیت کا حکم

سوال:۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کی روٹی میں زہر ملایا لیکن اتفاق سے وہ روٹی کسی دوسرے شخص نے کھائی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی، جب عورت کو پتہ چلا تو وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی، پکڑے جانے پر سسر نے اس عورت کو قتل کر دیا، زہریلی روٹی کھانے سے مرنے والے کے ورثاء اب اس عورت کے ورثاء سے دیت طلب کرتے ہیں، جب کہ اس واقعہ کو کافی عرصہ گذر چکا ہے، اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: من قتل بعد اخذ الدیۃ فعلیہ القتل لا یقبل منہ الدیۃ۔ (الاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۵۱ بحث تنازع اهل العلم فی معنی قولہ فمن عفی لہ من اخیہ شیءٌ)

[2] قال العلامۃ ابوبکر الجصاص الرازیؒ: دلالۃ الدیۃ ظاهرۃ علی ان الصلح دم العمد وسقوط القود بعفو بعض الاولیاء یوجب الدیۃ فی مال الجانی۔

(الاحکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۵۸ بحث تنازع اهل العلم الخ)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۵۵ بیان من تجب علیہ الدیۃ، کتاب الجنایات۔

الجواب:۔ زہریلی روٹی کھانے سے موت کا واقع ہونا قتل بالسبب ہے، صورت مسئولہ میں جس عورت نے روٹی میں زہر ملایا ہے اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہے اور عورت پر کفارہ نہیں، اگرچہ عورت مرگئی ہے لیکن اس کے عاقلہ تو موجود ہیں اُن سے دیت وصول کر کے مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: لو زلق بماء صبه رجل فوقع في البئر فالضمان على الصاب۔ (ردالمحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنايات)[1]

مریض کو دوائی کھلانے سے موت واقع ہونے پر دیت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی مریض کو کوئی ایسی دوائی کھلا دی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، تو کیا دوائی کھلانے والے پر دیت یا ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مریض کو دوائی کسی ماہر و تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق کھلانے سے اس کی موت واقع ہو جائے تو کوئی دیت و ضمان نہیں، اور اگر دوائی کھلانے والا نہ ڈاکٹر ہے اور نہ ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق دوائی کھلائی یا تجویز کردہ نسخہ کی مقدار سے زیادہ کھلا دی جس سے مریض کی موت واقع ہوگئی تو اب کھلانے والا ضامن ہے اس پر دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوں گے۔

لما ورد في الحديث: قال النبي صلى الله عليه وسلم من تطبب ولا يعلم منه طب فهو ضامن۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۸۲ کتاب الديات)[2]

---

[1] قال العلامة الزيلعيؒ: موجب القتل بسبب الدية على العاقلة لا الكفارة۔
(تبيين الحقائق ج۶ ص۱۰۲ کتاب الجنايات)

ومثله في الهداية ج۴ ص۵۷۱ کتاب الجنايات۔

[2] قال العلامة خليل احمد السهارنفوريؒ: قال الخطابي لا اعلم خلافاً ان المعالج اذا تعدى فتلف المريض ضمن اى الدية ـــــــ وفيه ايضاً: لا ضمان على حجام ولا ختان ولا متطبب بشرطين احدهما ان يكونوا ذوي حذق وبصارة في صناعتهم فان لم يكن كذلك لم يحل له مباشرة القطع۔ (حاشية بذل المجهود ج۸ ص۱۰ کتاب الديات)

مقتول کی دیت کے مستحقین

سوال:۔ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہونے والے کے لیے گاڑی کے ڈرائیور کی طرف سے بطورِ تاوان ملنے والی رقم میت کی بیوہ کو دی جائے گی یا اس کے بھائیوں کو؟ جبکہ بیوہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب:۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہلاک ہونے والے کی دیت ڈرائیور اور اس کے عاقلہ پر واجب ہے اور یہ دیت میت کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ مذکورہ صورت میں میت کی بیوی بھی اس کی وارث ہے اگرچہ وہ کسی اور سے نکاح کرلے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: إن القصاص حق جميع الورثة وكذا الدية۔ (الهداية ج۴ ص۵۷۲ کتاب القصاص فی ما دون النفس)[1]

نیند کی حالت میں ماں کے نیچے دب کر بچہ مرجائے تو کفّارہ اور دیت کا حکم

سوال: بچہ ماں کے پہلو میں سویا ہوا تھا کہ اچانک ماں کے نیچے دب کر مرگیا، اب والدہ کے لیے دیت اور کفارہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں بچے کا مرجانا جاری مجریٰ خطا کی قسم میں آتا ہے جس میں عاقلہ پر دیت اور قاتل پر کفّارہ لازم ہوتا ہے۔ آجکل عاقلہ سے دیت کی وصولی اسلامی قانون کے اجراء نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں ماں فراغتِ ذمہ کے لیے کفّارہ ادا کرے گی، نیز بچہ مرتے وقت اگر کسی جائیداد کا مالک ہو تو ماں اس قتل کی وجہ سے بچے کی جائیداد سے محروم ہوگی۔

لما قال الله تبارك وتعالى: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ۔ (سورة النساء آیت ۹۲)

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: والرابع ما جرى مجراه مجرى الخطاء كنائم انقلب على رجل فقتله لانه معذور كالمخطئ وموجبه الكفارة

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: والورثة في ذلك كلهم سواء۔ (البحر الرائق ج۵ ص۳۱۰ فصل فی الصلح علی المال)
وَمِثْلُهُ فی التفسیرات احمدیة ص۱۹۶۔

الدّیۃ علی العاقلۃ۔ (الدرالمختار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات)[1]

نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر بچہ کے مرنے پر پیدا ہونے والے اشکال کا جواب

سوال:۔ نیند کی حالت میں بچہ ماں کے پہلو میں دب کر مر جائے تو وجوبِ دیت اور کفارہ پر آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کنا ئم انقلب علیٰ رجل فقتلہ، کیا یہ قتلِ خطا ریا اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟ کیا بیداری اور نیند میں فرق نہیں ہے؟ اگر فرق نہیں تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ رفع القلم عن ثلث النائم حتیٰ استیقظ۔ آپ کی دلیل کنا ئم انقلب میں لفظ ام موجود نہیں، نیز آیتِ کریمہ وَلَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا اگرچہ رضاعت کے بارے میں ہے لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہے، آپ نے اسقاطِ حمل کی دلیل بھی دی ہے لیکن اس میں عورت کا ارادہ ہوتا ہے جبکہ نیند میں ایسا نہیں ہوتا، روزہ کی حالت میں مرد کو احتلام ہو جائے تو روزے کا کفارہ یا قضا نہیں اس لیے کہ روزہ دار مجبور ہے۔ ازراہ کرم میرے ان اشکالات کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ (۱) رفع القلم عن ثلث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں پکڑ نہ ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ضمان نہ ہوگا ورنہ قتلِ خطا دیت وجوبِ دیت پر، نماز میں ترکِ واجب پر سجدۂ سہو، مجنون اور بچہ اگر کسی کا مال ضائع کر دے تو اس پر وجوبِ ضمان کا حکم کیونکر لگتا، بچہ اور مجنون اگر کسی کے ساتھ مل کر کسی کو قتل کریں تو ان کے عاقلہ پر دیت ہے۔

قال العلامۃ ابو بکر الکاسانیؒ: فتجب الدیۃ ثم ما یجب علی الصبی والمجنون والخاطئ تتحملہ العاقلۃ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۳۶ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللّٰہ: النائم ینقلب علی انسان فیقتلہ فهٰذا القتل فی معنی القتل الخطاء من کل وجہ لوجودہ لا عن قصد لانہ ماتٌ بثقلہ فترتب علیہ احکامہ من وجوب الکفارۃ والدیۃ وحرمان المیراث۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُہٗ فی الهدایۃ ج۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات۔

(٢) فقہاء نے جو مثال دی ہے کنائم انقلب علیٰ رجلٍ یہ عام قاعدہ ہے اس میں ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ سب داخل ہیں، اس سے مراد شخص کلی ہے ماں باپ وغیرہ اس کے افراد ہیں، اس سے ماں کو مستثنیٰ کر کے اوروں کو داخل کرنا غلط ہے۔

(٣) ماں پر وجوبِ دیت اور کفارہ اس کو ضرر دینا نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں، اس طرح نو باپ کے باپ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ بچے کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ دو۔ ولا مولود له بولده لیکن باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس پر دیت واجب ہے، نیز دیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت اگر بچے کو دودھ دینے سے بالکل معذور ہو تو خاوند اس کو ضرر نہ دے، یہاں عورت بالکل مجبور ہے لیکن نیند میں اگر ماں کے نیچے بچہ دب کر مرجائے تو اس میں اس کی بے احتیاطی کا دخل ضرور ہے، اس لیے علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فان النائم لیس من اھل القصد اصلاً وانما وجبت الکفارۃ لترک التحرز عن نومه موضع یتوھم قاتلاً والکفارۃ فی قتل الخطاء انما یجب لترک التحرز۔ (رد المحتار ج٥ ص٣٣٢ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)۔

(٤) چونکہ اسقاطِ حمل نہ قتلِ عمد ہے نہ شبہ عمد اور نہ فعل سببی ہے لعدم التوریث اسقاطِ حمل کے لیے دوائی کھانا اور ماں کا بچے کے ساتھ سونا اختیاری ہے لیکن قتل دونوں صورتوں میں غیر اختیاری ہے[1]

روپے کی شکل میں دیت کی مقدار

سوال: قتلِ خطا کی دیت آجکل رائج کرنسی کے حساب سے کتنے روپے بنتی ہے؟

الجواب: قتلِ خطا کی دیت سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے۔ کما فی الھندیۃ: ومن العین الف دینار ومن الورق عشرۃ الاف درھم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج٦ ص٢٥ کتاب الدیات)۔

ایک درہم تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ (اوزانِ شرعیہ از مفتی محمد شفیع ص١٥)

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: کنائم انقلب علی رجل بیان لما جری مجری الخطاء لان ھذا لیس بخطاء حقیقۃ لعدم قصد النائم الی شیء حتی یصیر مخطاء لمقصود ولما وجد فعله حقیقۃ وجب علیه ما اتلفه کفعل الطفل۔ (تبیین الحقائق ج٥ ص١٠١ کتاب الجنایات)

اِس حساب سے چاندی کی مقدار ۳۶ سیر ۷ چھٹانک ایک تولہ ۸ ماشے بنتی ہے، اس مقدار چاندی کی مارکیٹ ریٹ میں جو قیمت بنتی ہے وہ قتلِ خطا کی دیت ہوگی۔[1]

دوش (کاندھے) کی ہڈی توڑنے پر حکومت عدل کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کو تین آدمیوں نے خوب مارا جس کی وجہ سے اس کی دوش (کاندھے) کی ہڈی ٹوٹ گئی، مضروب نے ان آدمیوں پر دعوٰی کیا کہ مجھے ضمان دیا جائے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں جس مضروب کے کاندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اس کے لیے تینوں ضاربین (مارنے والے) ضامن ہیں، مساوات کی رعایت ممکن نہ ہونے کی وجہ سے اس میں حکومتِ عدل ہے یعنی مضروب جب علاج معالجہ کرانے کے بعد اچھا ہوجائے تو اس کے علاج معالجہ (یعنی ڈاکٹر کی فیس، ادویات وغیرہ) کا جتنا خرچہ بنتا ہو وہ ان تینوں ضاربین سے مضروب کو دلایا جائے گا۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فنقول فی کسر العظام کلها حکومت عدل الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص۳۲۵ فصل یجب فیه أرش غیر مقدر)۔[2]

صلح کے بعد اگر زخمی مرجائے تو دیت کا حکم

سوال:۔ دو فریقین میں لڑائی کے بعد صلح ہوگئی، مضروب کے ورثاء نے کہا کہ چونکہ مضروب اس لڑائی میں زخمی ہوا تھا لہٰذا اس کی موت اِسی زخم کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اور واقعی وہ اسی زخم کی وجہ سے فوت ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ زخمی کرنے والے

---

[1] قال العلامة ابوبکر الجصاص الرازیؒ: فمن الدراهم عشرة آلاف درهم ومن الدنانیر الف دینار۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص۲۳۳)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۵۴ فصل فی وجوب الدیة والکلام فیها۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: ولا قصاص فی عظم لقوله علیه الصلوٰة والسلام لاقصاص فی العظم وقال عمر وابن مسعودؓ لاقصاص فی عظم الا فی السن۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۳۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج ۵ ص۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

شرعاً دیت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ صلح اور معافی صرف جنایت اور زخم کی ہے اور زخمی اس جنایت سے پیدا ہونے والے اثرات سے خاموش ہے اور اس زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو زخمی کرنے والے اور جانی پر دیت لازم ہے اور اگر صلح زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں ہو تو اس کے (صلح کے) بعد اگر زخمی مر جائے تو زخم لگانے والے پر کوئی دیت نہیں۔

لما قال الامام المرغینانیؒ: ومن قطع یدہ رجل فعفا المقطوعۃ یدہ عن القطع ثم مات من ذٰلک فعلی القاطع الدیۃ فی مالہ وان عفا عن القطع وما یحدث منہ ثم مات من ذٰلک فھو عفو عن النفس۔ (الہدایۃ ج۴ ص۵۲۶ کتاب الجنایات) [1]

رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے

سوال:۔ نیند کی حالت میں ماں سے اگر بچہ ہلاک ہو جائے تو عند البعض ماں پر کفارہ نہیں اس لیے کہ الدر المختار میں ہے: والقتل الموجب للقود اوللکفارۃ وان سقطا بحرمۃ الابوۃ علی ما مر۔ (ج۵ ص۴۸۹ کتاب الفرائض) یعنی ایسا قتل جو موجب کفارہ یا قصاص ہو تو رشتہ ولادت سے دونوں ساقط ہو جاتے ہیں۔ مہربانی فرما کر الدر المختار کی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ ماں سے اگر نیند کی حالت میں بچہ ہلاک ہو جائے تو موجب کفارہ و دیت ہے کیونکہ یہ قتلِ خطاء ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: والرابع ماجری مجراہ مجری الخطاء کنائم انقلب علی رجل فقتلہ لانہ معذور کالمخطئ وموجبہ ای موجب ھٰذا النوع من الفعل وما جری مجراہ الکفارۃ والدیۃ علی العاقلۃ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ومن قطع فعفا عن قطعہ فمات منہ ضمن قاطعہ الدیۃ ولو عفا عن الجنایۃ او عن القطع وما یحدث منہ فھو عفو عن النفس۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۳۶۱ فصل فی الفعلین) ومِثلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۶ ص۱۱۱ فصل ومن قطع ید رجل۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دیت اور کفارہ دونوں کا وجوب ہے۔

الدر المختار کی مذکورہ بالا جس عبارت سے عدم قصاص اور کفارہ معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے کفارہ ساقط نہیں ہوتا، اس لیے کہ علیٰ ما مر سے مراد کتاب الجنایات کی طرف اشارہ ہے اور کتاب الجنایات سے صرف سقوطِ قصاص معلوم ہوتا ہے اور دیت اور کفارہ کا وجوب، کتاب الفرائض کی عبارت سہوِ کاتب ہے، وجوبِ کفارہ کی تائید "درمختار" کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: شربت دواءً تسقطه عمداً فان كان اولد حياً فمات فعليها الدية والكفارة (رد المحتار ج۶ ص۳۷ فصل فی الجنین کتاب الجنایات) حالانکہ یہ نہ قتلِ عمد ہے اور نہ شبہ عمد۔ قتلِ خطاء اور شبہِ عمد کے حکم میں فرق نہیں ہے [1]

جسم کی کسی ہڈی کو توڑنے پر حکومتِ عدل ہوگی

سوال:- ایک بچے کو ٹرک پر حبیب نے ٹکر ماری جس سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور بدن پر زخم بھی آئے، بچہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے، تو کیا ڈرائیور پر تاوان ہے یا نہیں؟

الجواب:- جس جنایت میں قصاص نہ ہو اور مقرر دیت بھی نہ ہو تو وہاں پر حکومتِ عدل ہوتی ہے یعنی حاکم، قاضی یا تجربہ کار ڈاکٹر متاثرہ حصے کے ٹھیک ہونے کے بعد علاج معالجہ پر ہونے والے اخراجات کا حساب لگا کر زخمی کرنے والے سے وصول کرکے زخمی کو دلوائے جائیں گے۔ بدن کے کسی بھی حصے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں حکومتِ عدل ہوتی ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے میں حکومتِ عدل ہوگی۔

لما قال العلامة ابوبكر الكاساني رحمه الله: فنقول في كسر العظام كلها

---

[1] لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: النائم فينقلب على انسان فيقتله فهو القتل في معنى قتل الخطاء من كل وجه لوجوده لا من قصد لانه مات بثقله فترتب عليه احكامه من وجوب الكفارة والدية وحرمان الميراث والوصية - (بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۷۱ مطلب في معنى القتل الخطاء)

ومثله في الهداية ج۴ ص۵۶۱ كتاب الجنايات -

حکومۃ عدل الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص ۳۲۳ فصل یجب فیہ أرش غیر مقدر)[1]

والدین کی عدم حفاظت کی وجہ سے بچہ مرجائے تو موجب ضمان نہیں

سوال:۔ ماں نے بچے کو چولہے کے پاس بٹھا رکھا تھا کہ بچہ اچانک چولہے کی آگ کے ساتھ جل کر مرگیا، تو کیا بچے کی والدہ پر ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر بچے کی حفاظت سے غافل ہوگئے ہوں یا سرے سے حفاظت ہی نہیں کی ہو جس کی وجہ سے بچہ آگ میں جل کر مرگیا یا کسی اور طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی تو والدین پر یا ان میں سے کسی ایک پر کوئی ضمان نہیں، ہاں ان دونوں کو اللہ سے توبہ استغفار کرنا چاہیئے۔

كما فی الهندية: وعن ابی القاسم فی الوالدين اذا لم يتعاهد الصبی حتی سقط من سطح ومات او احترق بالنار لا شیٔ عليهما الّا التوبة والاستغفار واختيار الفقيه ابی الليث علی انه لا كفارة عليهما ولا علی احدهما۔

(الفتاوى الهندية ج ۶ ص ۳۳ باب الامر بالجناية ومسائل الصبيان)[2]

کسی کے ہاتھ سے اچانک کوئی چیز گرنے سے کوئی ہلاک ہوجائے تو موجب ضمان ہے

سوال:۔ ایک بچہ چارپائی پر سویا ہوا تھا اس کی والدہ نے اس کے قریب ہی دیوار کے طاق میں گرم دودھ یا پانی رکھا تھا، جب وہ اس کو اٹھانے لگی تو وہ گرم دودھ یا پانی

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله: ولا قصاص فی عظم لقوله عليه الصلوٰة والسلام لا قصاص فی عظم وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الّا فی السن۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۳۰۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

ومثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

[2] قال الامام قاضی خان رحمه الله: وقال بعضهم ليس علی الوالدين شیٔ الّا الاستغفار وهو الصحيح۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج ۳ ص ۴۴۴ فصل فی اثلاث الجنين)

بچے کے اوپر گرا جس کی وجہ سے بچے کی موت واقع ہوگئی، تو کیا بچے کی ماں پر دیت اور ضمان ہے یا نہیں ؟

الجواب: ۔ والدین سے اس طرح اگر کوئی بچہ ہلاک ہو جائے تو یہ قتل بالسبب کے حکم میں ہے، اس قتل سے قاتل کے عاقلہ پر دیت ہے اور خود اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ بچہ اس کی غلطی سے ہلاک ہوا اسلئے کہ قاتل کے ہاتھ سے گری ہوئی چیز بچے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: وکذلک اذا کان یمشی فی الطریق حاملاً سیفاً او حجراً او لبنة او خشبة فسقط من یدہ فقتله لوجود معنی الخطاء فیه وحصوله علی سبیل المباشرة لوصول الآلة بشرة المقتول۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب قتل الذی فی معنی القتل الخطاء)[1]

سرکاری ملازم کو دورانِ ڈیوٹی کوئی نقصان پہنچے تو حکومت پر کوئی ضمان نہیں

سوال: ۔ ایک آدمی سرکاری ملازم تھا، کام کی زیادتی کی وجہ سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گیا جبکہ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کردی ہے جس پر اُسے قبل از وقت نوکری سے نکال دیا گیا، کیا حکومت پر اس ملازم کی وجہ سے کوئی ضمان ہے یا نہیں ؟

الجواب: ۔ اس آدمی نے بخوشی یہ ملازمت اختیار کی تھی، اسے معلوم تھا کہ کام زیادہ ہے یا کم، اب اگر زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کو کوئی دماغی نقصان پہنچا ہے، تو یہ اس کا اپنا ذاتی فعل ہے، اب اس آدمی کا دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جانے سے حکومت نہ مباشر ہے نہ سبب ہے، اس لیے حکومت پر کسی قسم کا ضمان نہیں۔ حکومت کا

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ: ومن حمل شیئاً فی الطریق فسقط علی انسان ضمن سواء تلف بالوقوع او بالعثرة به بعد الوقوع لان حمل المتاع فی الطریق علی رأسه او علی ظهره مباح له لکنه مقید بشرط السلامة بمنزلة الرمی الی الهدف او الصید۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۴۶ باب ما یحدث الرجل فی الطریق)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۳۵۱ باب ما یحدث الرجل فی الطریق ۔

یہ قانون بھی ہے کہ وہ سرکاری ملازم جس کا ریٹائرمنٹ سے قبل میڈیکل بورڈ ہو جائے تو حکومت اس کو یکمشت کچھ رقم ادا کر دیتی ہے یہ حکومت کی اچھی پالیسی ہے۔

فقہاء نے یہاں ایک مثال دی ہے کہ دو آدمی رسہ کشی کر رہے ہوں اور رسی ٹوٹنے کی وجہ سے دونوں پیچھے کی جانب گر کر ہلاک ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے کے ضامن نہیں کیونکہ دونوں کی ہلاکت ان کے اپنے فعل (زور) سے واقع ہوئی ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فلما سقط علی قفاہ علم انہ سقط بفعل نفسہ وهو مدہ فقد مات کل واحد منهما من فعل نفسہ فلا ضمان علی احد۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۷۳ مطلب فی المعنی القتل الخطاء) [1]

قتل کی نیت سے تلوار اٹھانے والے کے قتل کا حکم

سوال: اگر ایک شخص اپنی جماعت میں سے کسی ایک فرد یا تمام جماعت والوں کو قتل کرنے کے لیے تلوار سونت لے تو کیا اس تلوار سونتنے والے کو وہ شخص یا جماعت اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: شاہر کا خون مباح ہے اس کو قتل کر دینے سے کوئی ضمان لازم نہیں آتا۔

وفی الهندیة: ومن شهر علی المسلمین سیفا وجب قتله ولا شئ بقتله وکذلك اذا شهر علی رجل سلاحا فقتله او قتل غیرہ دفعا عنه فلا یجب بقتله شئ الخ

(الفتاوی الهندیة ج ۶ ص ۷ الباب الثانی فیمن یقتل قصاصا ومن لا یقتل) [2]

---

[1] قال العلامة الزیلعی رحمه اللّٰه: فان وقعا علی القفا لا تجب لهما دیة لان کل واحد منهما مات بقوة نفسه۔ (تبیین الحقائق ج ۶ ص ۱۵۱ باب جنایة البهیمة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۶ ص ۳ کتاب الجنایات

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: (ویجب قتل من شهر سیفا علی المسلمین) یعنی فی الحال کما نص علیه ابن الکمال الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۹۱ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۴ ص ۵۶۷ باب ما یوجب القصاص وَمَا لا یوجب۔

کسی کی ٹانگ کی دیت

سوال:- سڑک پر ایک بچہ جا رہا تھا کہ اچانک زید نے گاڑی سے اُسے ٹکر ماردی جس کی وجہ سے بچے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، تو کیا زید پر کچھ ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:- گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں دیت واجب ہوتی ہے اور جب ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو آدھی دیت واجب ہوتی ہے تاہم یہ دیت حالاً نہیں دی جائے گی بلکہ ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ یہ دیت عاقلہ سے وصول کی جائے گی جو مسلمان حاکم اور قاضی کے بغیر کوئی اور ادا نہیں کر سکتا، موجودہ وقت میں عاقلہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپس میں صلح کر لینا بہتر ہے۔

وفی الهندية: وان كان صاحب الدابة راكباً على الدابة والدابة تسير ان وطئت بيدها أو برجلها يضمن وعلى عاقلته الدية وتلزمه الكفارة ويحرم عن الميراث۔

وقال فی الهندية (ج۶ ص۲۷ الباب السابع فی اعتبار حالة القتل) وفی الرجلين كمال الدية فی الخطاء وفی احداهما نصف الدية كذا فی المحيط۔ (الفتاوى الهندية ج۶ ص۵ الباب الثانی عشر فی جناية البهائم والجناية عليها) ؎

دیت کی شرعی مقدار

سوال:- جناب مفتی صاحب! شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کتنی مقرر فرمائی گئی ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کی مقدار اونٹوں کے اعتبار سے سو اونٹ ہے اور سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار ہے اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار درہم ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: والدية فی الخطاء مائة من الابل اخماساً عشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون ابن مخاض

؎ قال الشيخ علاء الدين الحصكفیؒ: (ضمن الراكب فی طريق العامة) وطئت دابة وما اصابت بيدها أو رجلها أو رأسها۔ والرجلان ففيهما الدية وفی أحدهما نصفها۔

(تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۵ ص۳۸۶ كتاب الجنايات)

ومثلهٗ فی كنز الدقائق ص۴۶۵، وفيها ايضاً ص۴۵۹ كتاب الجنايات۔

وعشرون حقة وعشرون جذعة وقال ومن العين الف دينار ومن الورق عشرة آلاف درهم۔ (الهداية ج۴ ص۵۸۴ کتاب الجنايات)[1]

قتل موجب کفر نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر قتل کو حرام سمجھتے ہوئے کرے تو قاتل کافر نہیں ہوتا اگرچہ قتل عمداً ہو اور ایسے قاتل کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، تاہم قتل کو حلال سمجھتے ہوئے کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

قال العلامة بدر الدين العينیؒ: وعندنا ان المؤمن اذا قتل مؤمناً لايكفر بفعله ولايخرج به من الايمان الا ان يقتله استحلالاً۔ (عمدة القاری جلد ۱۸ ص۱۸۳)[2]

---

[1] قال الامام علاؤ الدين ابی بكر بن مسعود الكاسانی رحمه الله: فان كان (المقتول) ذكراً خلاف فی ان الواجب بقتله من الابل مائة۔ لقوله عليه الصلوٰة والسلام فی النفس المؤمنة مائة من الابل ولاخلاف ايضاً فی اَنَّ الواجب من الذهب الف ديناراً لما روی انه عليه الصلوٰة والسلام جعل دية كل ذی عهد فی عهده الف دينار (وقال بعده) واما الواجب من الفضة فقد اختلف فيه قال اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ عشرة آلاف درهم وزناً وزن سبعة۔ (بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع ج۷ ص۲۵۴ كتاب الجنايات)

وَمِثْلُهُ فی تبيين الحقائق ج۶ ص۱۲۶ كتاب الديات۔

[2] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: واعلم ان قتل النفس بغير حق من اكبر الكبائر بعد الكفر بالله تعالیٰ وتقبل التوبة منه فان قتل مسلماً ثم مات قبل التوبة منه لايتحتم دخوله النار بل هو فی مشيئة الله تعالیٰ كسائر اصحاب الكبائر فان دخلها لم يخلد فيها الخ أما الآية فمؤولة بقتله لايمانه أو بالاستحلال أو بان يراد بالخلود المكث الطويل۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۴ كتاب الجنايات)

وَمِثْلُهُ فی التفسيرات الاحمدية ص۵ سورة البقرة۔

کسی کو زخمی کرنے پر قصاص کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر حملہ کرکے اس کو زخمی کردے اور زخم سے خون نکل آئے تو اس کے قصاص کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:- اگر زخم ایسا ہو کہ جس میں مماثلت ہو سکے تو اس میں قصاص واجب ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: وفی کل شجة تتحقق فیها المماثلة القصاص انتهی وفی العنایة لقوله تعالیٰ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔ (الهدایة ج۴ ص۲۶۹ باب القصاص فیما دون النفس) [1]

دانت توڑنے کا قصاص

سوال:- اگر کوئی شخص ضرب لگا کر کسی کا دانت توڑ دے تو ضارب سے قصاص اور دیت کا معاملہ کیسے طے کیا جائے گا؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں اس ضارب پر قصاص واجب ہے البتہ مصالحت کے طور پر رقم کا لین دین بھی جائز ہے خواہ ہر دانت کے بدلے میں پانچ سو درہم دیا جائے یا کم و بیش دیا جائے۔

لما فی الهندیة: وفی السن القصاص وان کان سن من یقتص منه اکبر من سن الاٰخر ولا قصاص فی عظم الا السن کذا فی الهدایة۔ ایضاً: وان شاء ضمنه اُرش سنه خمسمائة۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۱۲،۱۱ الباب الرابع فی القصاص فیما دون النفس) [2]

---

[1] قال ابو البرکات عبد الله بن احمد النسفیؒ: ویقتص کلُّ شجةٍ یتحقق فیها المماثلة۔
(کنز الدقائق ص۳۹۳ باب القصاص)
وَمِثْلُهٗ فی مختصر القدوری ص۱۷۷ کتاب الجنایات۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الا فی السن۔ البحر الرائق ج ص۳۰۶ وفیه ایضاً ص۳۰۵۔ وفی السراجیة فی السن الرجل خمسمائة وفی السن المرأة نصف ذٰلك۔
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۵۳،۳۵۴ باب القود فیما دون النفس۔

متسبب اور مباشر پر دیت

سوال:۔ (۱) ایک شخص وینش کا ڈرائیور ہے اور وینش وہ مشین ہے جس کے ذریعے کنوئیں سے پتھر وغیرہ نکالے جاتے ہیں، عام معمول کے مطابق جس کنوئیں میں کام شروع تھا اس پر تین آدمی کام کر رہے تھے کہ وینش کی رسی ٹوٹ گئی اور اس کا ڈول ان تینوں آدمیوں پر گر پڑا جس سے دو آدمی زخمی اور ایک ہلاک ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ اس ڈرائیور کے ذمہ شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) دوسرا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس ہلاک ہونے والے شخص کا صرف ایک رشتہ دار موقع پر موجود تھا جبکہ اصل ورثاء پاکستان میں تھے اور یہ واقعہ سعودی عرب میں پیش آیا تھا اور ہلاک ہونے والے شخص کے اس دور کے رشتہ دار کے پاس اسناد موجود نہیں تھے اس لیے اس کو پاکستان میں تصور کر کے اسناد (کاغذات) پاکستان میں بنا کر بھیجے گئے۔ تو ہلاک ہونے والے شخص کے اس رشتہ دار اور ایک شریک شخص نے جس کے ساتھ سعودی عرب کے اسناد موجود تھے ان دونوں نے سعودی عدالت میں اس ڈرائیور کو معاف کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے کے اس رشتہ دار اور شریک کا ڈرائیور کو معاف کر دینے کے بعد اس کے اصل ورثاء یعنی والد اور بھائیوں کو دعوے کا شرعاً حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور ڈرائیور کو ان دونوں کی طرف سے معاف کر دینے سے اصل ورثاء کا حقِ دعوٰے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہلاک ہونے والا شخص اس کام کا ٹھیکیدار اور وینش کا مالک بھی خود تھا اور یہ اندوہناک واقعہ وینش کی رسّی کمزور ہونے کی وجہ سے پیش آیا جبکہ وینش کا مالک رسّی کی اس کمزوری سے آگاہ بھی تھا اور اس نے اس کمزوری کو دُور نہ کیا۔

الجواب:۔ (۱) صورتِ مسئولہ میں یہ قتل (ہلاکت) اقسامِ قتل میں سے ایک قسم جار مجری خطاء میں داخل ہے شرعاً اس قسم کے قتل میں دیت لازم ہوتی ہے جو قاتل ادا کرے گا۔ چونکہ بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول نے خود کمزور رسّی ڈرائیور کو مہیا کی تھی اور بار بار اس کمزوری سے مطلع کرنے کے باوجود لیت ولعل سے کام لیتا رہا اور اس کمزور رسّی کو تبدیل نہ کیا کہ اچانک یہ حادثہ پیش آ گیا۔ تو گویا مقتول خود ہی ایک گونہ اس حادثے کا ذمہ دار ہے اس لیے دیت دونوں (قاتل و مقتول) کے مابین مشترک ہو گا اور مقتول چونکہ فوت ہو چکا ہے لہٰذا اس کا حصۂ دیت ساقط ہُوا، باقی قاتل (ڈرائیور) کے

کے ذمے مقتول کے ورثاء کو نصف دیت یعنی پانچ ہزار دراہم چاندی کے یا پانچ سو دینار سونے کے یا اس کی مروّجہ قیمت ادا کرنا لازم ہے، مروّجہ کرنسی کا حساب کسی ماہر سُنار سے لگوایا جائے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: یضمن المتسبب مع المباشر اذا کان للسبب تاثیر یعمل بانفرادہ فی الاتلاف متی انفرد عن المباشر ای اذا تعادلت قوۃ السبب والمباشر او اعتدل السبب والمباشر بان تساوی اثرھما فی الفعل کان المتسبب والمباشر مسئولین معاً عن القتل کان اجتمع علی قیادۃ دابۃ سائق وراکب علیھا فما احدثتہ من تلف کان الضمان علیھما لان سوق الدابۃ وحدہ یؤدی الی التلف وان لم یکن ھناک شخص راکب علیھا وکذلک اذا نخس رجل الدابۃ بأمر راکبھا یکون الضمان علی الاثنین لأن الناخس بمنزلۃ السائق۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۲۴۸ ثالثاً تضمین المتسبب والمباشر معاً)۔

(۲) کسی قاتل کو دیت وغیرہ معاف کرنا شرعاً مقتول کے ان ورثاء کا حق ہے جو اس کی میراث میں حقۂ شرعی کے حقدار ہوں کوئی دُوسرا شخص ان کے اس حق میں تصرّف کا اختیار نہیں رکھتا۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ڈرائیور کو معاف کرنے والے دونوں حضرات چونکہ مقتول کے حقیقی وارث نہیں تھے ایک تو مقتول کا دُور کا رشتہ دار تھا اور دُوسرے کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا جبکہ مقتول کے اصل وارث یعنی اس کا باپ زندہ تھا اسلئے ان ہر دو حضرات کی معافی بلا اذنِ باپ صحیح نہیں اور نہ اس سے ڈرائیور کے ذمّے سے دیت ساقط ہوتی ہے لہٰذا قاتل اپنا حصۂ دیت مقتول کے باپ یا اسکے دیگر شرعی ورثاء کو ادا کرے گا تاہم اگر وہ دیت معاف کریں تو پھر اس صورت میں ڈرائیور کے ذمّے سے دیت ساقط ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا اذنہ ولا ولایتہ إلّا فی مسائل الخ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۰ کتاب الغصب)

وقال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: ومن لا حق لہ فی العفو ھو الاجنبی غیر الوارث عند الجمھور وغیر العصبۃ عند المالکیۃ وکذا الاب والجد فی قصاص وجب للصغیر عند المالکیۃ والحنفیۃ لان الصغیر ھو صاحب الحق وللاب والجد ولایۃ الاستیفاء فقط۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد ۶ ص ۲۹۸ شروط العفو)

اُجرتی قاتل سے قصاص لینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حکومتِ پاکستان کے قانون کے متعلق کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی شخص کو پیسوں کے ذریعے یعنی اجرتی قاتل سے قتل کرایا ہے تو اس کی سزا بھی قاتل کے برابر ہے یعنی اس کو بھی قصاصاً قتل کیا جاوے گا۔ شریعتِ مقدسہ میں اجرت پر کسی کو قتل کروانے والے کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں ضابطہ کے مطابق قصاص اجیر پر آتا ہے مستأجر پر نہیں آتا، البتہ مستأجر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: ولو قال اقتل ابی فقتله کان علی القاتل دیة لابنه۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۴۱ کتاب الجنایات۔ فصل فیمن یقتل قصاصاً وفیمن لا یقتل) [1]

مقتول کے ورثاء کے ذریعے قصاص کے اجراء کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! امارتِ اسلامی افغانستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے جب قصاص لیا جاتا ہے تو بعض اوقات قاضی مقتول کے وارث کو اسلحہ دے کر اپنی موجودگی میں قصاص کا اجراء کراتا ہے، کیا شرعاً یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- حدود و قصاص کا اجراء حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہے، البتہ ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ حدود کا اجراء صرف حاکمِ وقت بلاواسطہ کرے گا۔ بخلاف قصاص کے کہ حاکم کی موجودگی میں اس کی اجازت پر مقتول کے وارث سے بھی اس کا اجراء کرایا

---

[1] وفی الهندیة: وفی جنایات المنتقی قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ قال ابو حنیفة رحمه الله تعالیٰ فی رجل قمط رجلاً فطرحه قدام سبع فقتله السبع لم یکن علی الذی فعل ذلك قود ولا دیة لکنه یعزر و یضرب و یحبس حتی یموت الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۶ کتاب الجنایات۔ الفصل الثانی فیمن یقتل قصاصاً وفیمن لا یقتل)

ومثلهٗ فی درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۱ ص۹۰،۹۱ المادة ۸۹،۹۰۔

جا سکتا ہے، اور اگر اس طرح قصاص کا اجراء کرنے سے بعد میں فریقین میں فتنہ و فساد کا خطرہ ہو تو اس کا اجراء بھی قاضی خود کرائے تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: استیفاء الحدود یکون بواسطۃ الامام الحاکم واما القصاص فیجوز لولی الدم استیفاؤہ بشرط وجود الامام۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۶۳ الفرق بین القصاص والحدود الاخری)

قصاص کے اجراء سے گناہ کے ختم ہونے کا حکم

سوال: اگر کسی قاتل سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے تو کیا اس سے قاتل کا یہ گناہ معاف ہو جائے گا یا نہیں؟ یا توبہ و استغفار کرنا بھی لازمی ہے کہ بدون اس کے معاف نہ ہوگا؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں۔

الجواب: کسی شخص کو قتل کرنے سے دو قسم کے حق قاتل کے ذمے ہوتے ہیں ایک حق العبد یعنی مقتول کے ورثاء کا حق جو کہ قصاص لینے سے پورا ہو جاتا ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا حق۔ تو حنفیہ کثر اللہ سوادہم کی اس بارے میں رائے یہ ہے کہ قصاص لینے یا مقتول کے ورثاء کے معاف کر دینے سے اگرچہ حق العبد ادا ہوا لیکن اللہ کے حق کی ادائیگی کا کفارہ نہ ہو سکا بلکہ اس کے لیے توبہ و استغفار ضروری ہے، اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک حدود زواجر ہیں جوابر نہیں، البتہ جمہور علماء کے نزدیک حدود چونکہ جوابر (کفارات) ہیں اسلئے ان کے ہاں قصاص اور عفو سے بھی یہ گناہ ختم ہو جاتا ہے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: اختلف العلماء فی امرہ کما اختلفوا فی الحدود ھل ھی زواجر ام جوابر؟ قال الجمھور: القصاص من القاتل او العفو منہ یکفر اثم القتل لان الحدود کفارات لاھلھا وھذا عام لم یخص قتلا من غیرہ۔ قال النوویؒ: ظواھر الشرع تقتضی سقوط المطالبۃ بالعقوبۃ فی الآخرۃ۔ قال الحنفیۃ: القصاص او العفو لا یکفر اثم القتل لان المقتول المظلوم لا منفعۃ لہ فی القصاص وانما القصاص منفعۃ للاحیاء لیتناھی الناس عن القتل وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ (الآیۃ) (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۶۱ ھل القصاص یکفر اثم القتل)

قاضی کا اپنے علم پر قصاص کے اجراء کا حکم دینا

سوال: ہمارے علاقے میں ایک شخص بڑا ظالم اور بدمعاش ہے، لوگوں کے

عزت وآبرو اور جان ومال کو ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے، اور اس نے علی الاعلان کئی قتل بھی کیے ہیں جس کا جج (قاضی) صاحب کو بھی خوب علم ہے جبکہ لوگ اس کے ڈر اور خوف کے مارے اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کو بھی تیار نہیں۔ تو کیا جج اپنی معلومات کے حوالے سے اس کو قصاصاً قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے ہاں اس مسئلہ میں دو قسم کی آراء ہیں۔ (۱) متقدمین احناف کے نزدیک قاضی یا جج اپنے علم کے مطابق قصاص لے سکتا ہے (۲) جبکہ متاخرین احناف عدم اجازت کے قائل ہیں کہ قاضی اپنی معلومات کے مطابق قصاص جاری نہیں کر سکتا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: يجوز القضاء بعلمه في القصاص دون الحدود۔

قال ابن عابدينؒ، تحته مبني على ان القاضي يقضي بعلمه في غير الحدود والفتوى اليوم على عدم جواز القضاء بعلمه مطلقاً۔ (رد المحتار والدر المختار ج ۶ ص ۵۹۵ كتاب الجنايات)[1]

حالتِ نشہ میں قتل کرنے والے سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی آدمی نشے کی حالت میں زمین وآسمان کا فرق نہ کر سکتا ہو اور نہ ہی اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی تمیز رہتی ہو، اب اگر وہ اسی حالت میں غیر اختیاری طور پر کسی کو قتل کر دیتا ہے تو کیا شرعاً اس سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ قاتل سے قصاص لینا مقتول کے ورثاء کا شرعی حق ہے اور وہ بالاتفاق مذاہب اربعہ سکران (نشہ والے) سے ساقط نہیں ہوتا، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ قرآن وسنت کے حکم کا مخاطب ہونے کیلئے نشہ مانع شرعی نہیں۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: القصاص من السكران ويقتص من السكران

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلي: يجوز للقاضي القضاء بعلمه الشخصي في القصاص دون الحدود وهذا عند متقدمي الحنفية وافتى المتاخرون بعدم القضاء بالعلم مطلقاً سداً للذريعة اما قضاء السوء سواء في القصاص والحدود وفي الاموال وغيرها۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج ۶ ص ۲۶۴ الفرق بين القصاص والحدود الاخرى)

بشراب محرم باتفاق مذاهب الاربعة لأن السكر لاينافى الخطاب الشرعى اى التكليف فتلزمه كل احكام الشرع وتصح عباراته كلها فى العقود كالبيع۔ الخ

(الفقه الاسلامى وادلته ج۶ ص۲۶۵ شروط القاتل)[1]

مقدارِ دیت سے کم مال پر صلح کرنا

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم چند ساتھی مل کر قتل کے سلسلے میں دو گروپوں کی آپس کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور فریقین بھی صلح پر آمادہ ہیں، اب اگر ہم مقدارِ دیت سے کم مال پر فیصلہ کریں اور مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہو جائیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: قتلِ عمد سے صلح کرنے کی صورت میں دیت کی مقدار کی پابندی ضروری نہیں ہے بلکہ جتنی مقدار مال پر فریقین راضی ہو جائیں اور صلح کریں تو قاتل پر مقتول کے ورثاء کو اتنی مقدار میں مال ادا کرنا لازم ہوگا چاہے وہ مال مقدارِ دیت سے کم ہو یا زیادہ۔

قال العلامة الحصكفىؒ: وصح فى الجناية العمد مطلقاً ولو فى نفس مع اقرار بأكثر من الدية والأرش أو بأقل لعدم الربو۔ وقال العلامة ابن عابدينؒ: تحت (قوله لعدم الربو) لان الواجب فيه القصاص وهو ليس بمال۔

(ردالمحتار على الدر المختار ج۶ ص۵۳۰ كتاب الديات)[2]

* * *

---

[1] لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفى رحمه الله: يجب القود اى القصاص بقتل كلّ محقون الدم بالنظر لقاتله درر .... بشرط كون القاتل مكلفا لما تقرر أنه ليس لصبى ومجنون عمد۔

{الدر المختار على صدر ردالمحتار ج۶ ص۵۳۲
كتاب الجنايات فصل فيما يوجب القود الخ}

[2] لما قال العلامة وهبة الزحيلى: يجوز الاعتياض فى القصاص بخلاف الحدود ومنها حد القذف واجاز الشافعية المعاوضة فيه۔

{الفقه الاسلامى وادلته ج۶ ص۲۶۴
الفرق بين القصاص والحدود الاخرى}

مسودہ آرڈیننس نفاذ قصاص ودیت

مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات وترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲۱) (۲۲) / ۸۰ آر س، آئی آئی مجریہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء کے تحت جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص ودیت آرڈیننس) ۱۹۸۰ء کا مسودۂ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دارالعلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر از روئے فقہ و شریعت نظر ثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کر کے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ قصاص ودیت میں کل ۹ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے مرسلہ مسودہ آرڈیننس جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص ودیت آرڈیننس ۱۹۸۰ء) پر تفصیلی غور کیا گیا، چونکہ بعض دفعات ایسی تھیں جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً تھا اور ان کا تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے، تعزیرات پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے

اور ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے فی الوقت جواب دینے سے قاصر ہیں، جیسا کہ دفعہ ۲، ۱۲۱ (۱)، (۱)(۲)، ۱۱۱، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱ (۱۰۶)، (ج)، (ب)، (الف) (۱۰۵) تعزیراتِ پاکستان سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دفعات کے متعلق تجاویز اور ترامیم پیشِ خدمت ہیں :۔

(۱) اس مسودہ میں تقریباً ۳۰ مقامات ایسے ہیں جہاں قیدِ محض یا قیدِ بامشقت کو مختلف مدتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یا بعض مقامات پر مختلف تعداد میں کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے، تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ یہ تمام سزائیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے ساتھ ساتھ یہ تصریح ضروری کرنی چاہیئے کہ یہ سزائیں محض تعزیرات ہیں۔ جو حکومت کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہیں ورنہ یہ سزائیں شرعی نہیں ہیں جو کسی خاص نص کے تحت آتی ہوں، البتہ کوڑوں کی سزا کا جن مقامات پر ذکر ہے تو چونکہ یہ غیر منصوص سزاؤں میں ایک شدید ترین سزا ہے لہٰذا اس کے نفاذ میں نہایت احتیاط چاہیئے اور بصورتِ تعزیر دفعِ فساد کیلئے بعض مواقع پر اس کا اجرا کرنا چاہیئے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت بنے لیکن اس کو کلیہ نہ بنایا جائے۔ مسودہ کے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ سزائیں مذکور ہیں۔ دفعہ (۵) شق ب، ج۔ دفعہ ۱۶، دفعہ ۲۱ ب، دفعہ ۲۳ ب، دفعہ ۳۵ الف، ب، دفعہ ۳۷ الف، ب۔ دفعہ ۳۹، دفعہ ۴۳ ب، ج۔ دفعہ ۴۵ ب، دفعہ ۴۷ ب، دفعہ ۴۸، دفعہ ۵۱ ب، دفعہ ۳۵ ب، دفعہ ۵۸، دفعہ ۶۰، دفعہ ۶۲، دفعہ ۶۳، ۶۶، ۶۸، ۷۰ (ا)، دفعہ ۷۱ ب ۸۱—۸۲ الف ۹۰—۹۱—۹۴ ج، دفعہ ۹۵، ۹۷ الف ب، دفعہ ۹۸—۱۰۹—۱۱۱۔

(۲) چونکہ یہ آرڈیننس نفاذِ قصاص و دیت سے تعلق رکھتا ہے اور شریعت میں قصاص و دیت کے قانون کو حفاظتِ نفس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس میں حفاظتِ نفس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے تاکہ مبادا کسی طریقہ سے مظلوم ورثاء کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ لہٰذا قاتلوں کا پورا پورا محاسبہ ہونا چاہیئے، اور جو لوگ قاتلوں کی حمایت کرتے ہیں یا ان کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں اُن کے لیے بھی ازروئے مصلحت کوئی تعزیری قانون مقرر کیا جائے، اگرچہ پناہ دینے والے ایک قوم، ایک قبیلہ یا ایک خاص علاقہ یا حکومت کے بعض افراد ہی کیوں نہ ہوں، اور نیز اُن علاقوں میں بھی قاتلوں کو گرفتار کرنا چاہیئے جو علاقے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیرِ نگرانی ہوں جہاں قاتل مفرور ہو کر پناہ لے لیتا ہے۔

(۳) اس مسودہ کے صفحہ ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (ج) میں جہاں بالغ[1] کی تعریف کی گئی ہے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے اور یہ تعریف یوں ہونی چاہیئے کہ:۔

"بالغ سے مراد ہر وہ مرد و زن ہے جس پر علامات بلوغ ظاہر ہوتی ہوں مثلاً احبال، حمل یا موئے زیر ناف کا ہونا۔ اور یا عورت سترہ سال اور مرد اٹھارہ[2] سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو۔"

مذکورہ دونوں صورتوں میں سے ہر اس صورت کو اعتبار دیا جائے گا جو صورت پہلے وقوع پذیر ہو۔

(۴) صفحہ ۴ دفعہ ۱۲ کی تشریح میں جہاں گلا گھونٹنے کی صورت کو قتل عمد کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے وہاں یہ تصریح کرنی ضروری ہے کہ اس گلا گھونٹنے کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا عمداً[3] نہیں ہوگا بلکہ سیاسۃً ہوگا۔

ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص ۵ کتاب الجنایات' الباب الثالث)[4]

(ترجمہ) "اور اگر کسی کا گلا گھونٹا گیا تو اس قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر قاتل مشہور گلا گھونٹنے والا ہو جس نے اس کے علاوہ اور لوگوں کے گلے بھی گھونٹے ہوں تو پھر اس کو از روئے مصلحت سیاسۃً قتل کیا جائے گا۔

---

[1] سرکاری مسودہ میں بالغ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص ۱۸ سال یا بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہو الخ۔

[2] یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، صاحبین رح کے نزدیک ہر دونوں کے لیے پندرہ سال تک پہنچنا عمر بلوغت ہے۔

[3] یعنی گلا گھونٹنے اور مطلق زہر پلانے کو قتل عمد کہنا صحیح نہیں ہے، البتہ بعض صورتوں میں ایسے شخص کو تعزیراً قتل کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شرعی اصطلاحات حد اور تعزیر کو بدلنا اور مخلوط کرنا مستقبل میں بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

[4] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (فتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص ۴۴۰ کتاب الجنایات، باب القتل)

(۵) مذکورہ بالا صفحہ ۴ دفعہ ۴ کی مذکورہ شق میں زہر دلانے کی صورت میں جو قتلِ عمد میں شمار کیا گیا ہے، اس کے متعلق یہ واضح کرنا چاہیئے:-

"کہ اس سے زہر دلانا مراد ہے جسے پلانے والے نے زور اور جبر کر کے بالاکراہ پلایا ہو تو پھر اس میں قصاص اور دیت دونوں نہیں ہیں، البتہ حکومت اس صورت میں بھی دفع فساد کے لیے از روئے مصلحت سیاستہً تعزیر دے سکتی ہے۔"

جیسا کہ عالمگیری میں اس کی تصریح موجود ہے:-

واذا ناولہ فشرب من غیر ان اکرھہ علیہ لم یکن علیہ قصاص ولا دیۃ سواء علم الشارب بکونہ سما او لم یعلم۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۶ ص ۶ کتاب الجنایات الباب الثانی)

(ترجمہ) "اور جب کسی کو زہر دے کر بغیر کسی زور اور جبر کے پلایا ہو تو اس صورت میں اس پر قصاص اور دیت دونوں واجب نہیں ہیں اگرچہ پینے والے کو اس کے زہر ہونے کا علم ہو یا نہ ہو۔"

صفحہ ۱۲ دفعہ ۱۲ میں قاتل کو بصورت عفو یا صلح کے بعد تعزیراً قتل کرنے میں نہایت ہی احتیاط کرنی چاہیئے تاکہ غیر اسلامی قوانین بالخصوص یہودیت سے امتیاز ہو۔

(۶) صفحہ ۱۷ دفعہ ۲۸ میں قتل کی صورت میں قاتل کو وراثت سے محرومی کا جو حکم بیان کیا گیا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ یہ قتلِ عمد، شبہ عمد، خطاء، جاری مجریٰ خطا کی صورت میں ہے یعنی ان چار صورتوں کے قتل کی صورت میں قاتل مقتول کی وصیت یا حقِ وراثت سے محروم رہے گا اور قتل بسبب کی صورت میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں رہے گا، جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ کسی دوسرے کی جگہ میں کنواں کھودا اور کوئی شخص اس کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گیا تو اس کو قتل بسبب کہا جائے گا جس میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ الہندیہ)

واما القتل بسبب فمثل حفر البئر ووضع الحجر فی غیر ملکہ وموجبہ اذا تلف بہ آدمی الدیۃ علی العاقلۃ ولا یتعلق بہ الکفارۃ ولا حرمان المیراث عندنا۔

(الفتاوی الهندیۃ ج ۶ ص ۳ کتاب الجنایات۔ الباب الاول)

(ترجمہ) "اور قتل بسبب جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ میں کنواں کھودا یا کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ کوئی پتھر رکھا اور اس کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک،

ہوگیا تو اس میں بصورت ہلاکتِ انسان قاتل کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی اور ہمارے مذہب میں اس میں کفارہ اور وراثت سے محرومی نہیں ہے۔"

(۷) صفحہ ۴۶ دفعہ ۱۱۳ میں سزائے موت کی توثیق کا اختیار جس عدالتِ مرافعہ کو دیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ضرور کرنی چاہیئے کہ "بشرطیکہ اس عدالتِ مرافعہ کا فیصلہ بھی شرعی ہو۔"

(۸) صفحہ ۴۸ دفعہ ۱۲۳ کے آخر میں یہ اضافہ کرنا چاہیئے: "نیز خاص اور معتمد علیہ اداروں اور اہلِ حل و عقد سے بھی رائے طلب کرنی چاہیئے۔"

(۹) مذکورہ دفعات میں جہاں جرمانہ کا ذکر آیا ہے وہاں جرمانے سے مراد تعزیر بالضرب یا بالحبس مراد ہو نہ کہ تعزیر بالمال، یہ موجودہ مروجہ جرمانہ ایک غیر شرعی امر ہے۔

مسودہ قانون دیت وقصاص کے بعض زیر بحث نکات

ویسے تو ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں کہ جن کو دین میں جدّت پسندی کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ہر مسئلے میں چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی ایک جدت پیدا کرنے کی نام نہاد کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دنیاوی امور میں تو ایسا کرنا ممکن ہے مگر دینی امور اور ان کے مسائل میں اپنی ذہنی ساخت کو داخل کر کے اسلام کے مسلمہ اصولوں کو پامال کرنا کسی بھی دور کے علماء حق اور مفتیانِ کرام نے گوارا نہیں کیا اور جب بھی کسی مغرب زدہ اور مفسد خیال شخص نے اسلامی قوانین پر قلم اٹھا کر بزعم خود ان میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی تو ان محافظین دین نے ایسے لوگوں کا بھرپور تعاقب کیا اور ان کے ہر ایک نقطے کا دندان شکن جواب دیا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جب دیت وقصاص آرڈیننس نافذ ہوا تو اسی "روشن خیال" طبقے نے اس آرڈیننس کے مسلّمہ نکات کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے رسائل و جرائد اور اخبارات میں مشقِ سخن بنایا۔ روزنامہ "مشرق" میں نام نہاد "محقق" اور "سکالر" نے ان مسلّمہ اور طے شدہ نکات پر سوالات اٹھائے۔ جامعہ حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے اس "محقق" کا بھرپور تعاقب کیا اور قرآن و سُنت کی روشنی میں اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دیا جو اُس وقت دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ہے اب افادۂ عام کے لئے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)۔

مسوّدۂ قانون دیّت وقصاص کے بعض زیر بحث نکات

عورت، غیر مسلم اور نابالغ کی شہادت

روزنامہ مشرق مؤرخہ میں کسی ایڈووکیٹ کا مضمون بعنوان "دیت اور قصاص کے مسودۂ قانون کا جائزہ، قصاص سے مستثنیٰ 'قاتل'" نظر سے گذرا، مضمون کے عنوان سے بظاہر مضمون نگار کا اخلاص مترشح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک خالی اور بے معنی بلکہ مفسد اخلاص ہے، مضمون نگار کی اکثر باتیں قرآن وحدیث سے لاتعلقی پر مبنی ہیں کیونکہ صاحب مضمون ہر جگہ اپنی رائے سے قرآن وحدیث کو متصادم کر کے اپنی عقلی توجیہات کو ترجیح دیتے ہیں، مثلاً صاحب مضمون لکھتے ہیں:۔

ـــــ"اسلامی قانون کی بنیاد قرآن وسنت ہے، تمام قوانین حالات کو سامنے رکھ کر اجتہاد کے ذریعہ قرآن وسنت کی روشنی میں تشکیل دیئے جانے ضروری ہیں، اجتہاد ہی کے ذریعہ سابقہ فقہاء کی رائے سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ سابقہ فقہاء نے اپنے وقت اور حالات کے تحت قرآن وسنت کی روشنی میں کسی مسئلہ پر رائے دی تھی، چونکہ وہ حالات اب نہیں رہے اس لیے ان حالات کے تحت قائم شدہ رائے بھی بدلی جا سکتی ہے، موجودہ مجوزہ مسودۂ قصاص ودیت میں سابقہ فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن حالات کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے ہیں ـــــ"

صاحب مضمون کے مذکورہ جملے اس بات پر دال ہیں کہ ائمہ کرام جو اپنے اپنے زمانوں میں محنت ومشقت کر کے لاکھوں مسائل مستنبط کر گئے ہیں، یہ مسائل موجودہ حالات کے تقاضوں کے موافق نہیں ہیں، چند امور چھوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر کوئی نئے طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ معلوم نہیں کہ مضمون نگار کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، اگر ائمہ اربعہؒ میں سے کسی ایک مسلک سے وابستہ ہوں تو پھر ان کا یہ نظریہ اور رائے غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو پھر ائمہ مجتہدین کے ان تمام مسائل کو پسِ پشت ڈالنا ہوگا جن کے لیے ائمہ کرام نے سالہا سال تک رات دن ایک کر کے محنت کی ہے اور پھر بھی احادیث اور نصوصِ قرآنیہ سے مسائل کا استنباط کرنا بھی کارے دارد، جو عوام کو تو درکنار خواص کو بھی حاصل نہیں ہے، لہٰذا اس فساد وشر کے دور میں ائمہ کرام کی تقلید کے علاوہ کامیابی کا

اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے بلکہ ہم جیسے لاعلموں کے لیے تقلیدِ شخصی واجب ہے، چونکہ تقلید کا موضوع خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف سیدالطائفہ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ایک دو ارشاد تقلید سے متعلق نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

الامة اجتمعت على ان يعتمدوا على السلف فى معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا فى ذلك على الصحابة وتبع التابعين وهكذا فى كل طبقة اعتمد العلماء على من قبلهم والعقل يدل على حسن ذلك لان الشريعة لا يعرف الا بالنقل والاستنباط والنقل لا يستقيم الا بان يأخذ كل طبقة عمن قبلها بالاتصال -

(عقد الجيد فى الاجتهاد والتقليد ص ۳۶ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "بیشک تمام امت اس بات پر متفق ہے کہ شریعت کے سمجھنے میں اسلاف ہی پر اعتماد کرنا ہوگا، تابعین نے صحابہ پر اعتماد کرکے دین کو لیا ہے اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ہے اور ایسا ہی ہر دور کے علماء نے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر دین پر عمل کیا ہے، اور عقلاً بھی یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ شریعت کا دارومدار نقل پر ہے اور نقل سوائے اس اتباعِ اسلاف (تقلید) کے اور کسی طریقہ پر ممکن نہیں۔"

اور چند صفحات آگے چل کر حضرت شاہ صاحبؒ مزید فرماتے ہیں :-

وبما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجاً عن السواد الاعظم۔ (عقد الجيد فى الاجتهاد والتقليد ص ۳۸ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "اور جب چوتھی صدی (ہجری) میں ماسوائے ان مذاہب اربعہ کے اور کوئی حق مذہب نہ رہا تو ان مذاہب کی تقلید اجماعِ اُمت اور تقلید نہ کرنا مخالفِ اجماعِ اُمت ہے۔"

لہٰذا ائمہ کرام نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ آج بھی حالات کے موافق اور مناسب ہیں، اگر کوئی حکم بظاہر ناموافق معلوم ہوتا ہو تو یہ ہمارے ہی فہم کا قصور ہوگا نفس الامر میں یوں نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا حکم فقہ کی کسی کتاب میں موجود نہ ہو تو پھر مستند علماء اور با اعتماد صاحب علم حضرات ایسے جزئیات کا حکم باہم مشورہ کرکے قرآن و حدیث اور فقہ کے ان اصولوں کے مطابق نکال سکتے ہیں جن اصولوں پر فقہ کا دارومدار ہے، لیکن ان حضرات کے لیے بھی خاص شروط ہیں جو کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ "خون کا مسئلہ اور آنکھ کی تبدیلی" پر "مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ" کا بحث و تحقیق کے بعد "انسانی اعضاء کی پیوندکاری" کے نام سے رسالہ جاری کرنا اس کا بیّن ثبوت ہے۔

لیکن قصاص و دیت یا اس کے علاوہ اور اس جیسے مسائل جن کا حکم صرف ایک کتاب میں نہیں بلکہ تمام کتب فقہ میں موجود ہیں تو پھر اس کے باوجود ان کو چھوڑ کر نئے راستے تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے بلکہ ماسوائے تضیع اوقات اور باعثِ اضلال وتضلیل کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے ـــــ

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مذکورہ نام نہاد دانشور صاحب اپنے خود ساختہ نظریۂ اجتہاد کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ :۔

ـــــ "مثلاً مجوزہ آرڈیننس میں قتل عمد کے ثبوت کے لیے عورت کی گواہی اور معصوم بچے کی گواہی کو قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا ہے، دفعہ نـ۱ میں قتلِ عمد کے ثبوت کے لیے دو بالغ مردوں کی گواہی کو ہی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب فقہاء کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا قرآن و سنت میں عورت اور نابالغ کی گواہی کی ممانعت کر دی گئی ہے، قرآن و حدیث میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے"ـــــ

صاحبِ مضمون کی یہ تجویز نفاذِ شریعت کے لیے معاون نہیں بلکہ مبطل ضرور ہے کیونکہ یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے بلکہ حقیقت میں اسلام کی بیخ کنی ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شاید صاحبِ مضمون کو اس حدیث اور آیتِ کریمہ کا علم نہیں جو حدود اور قصاص میں صرف بالغ مردوں کی گواہی کے متعلق وارد ہے، لیکن ان کے عدم علم کی وجہ سے آیت اور حدیث کا عدم وجود لازم نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں یہ پابندی ہے کہ قتل کے امور میں صرف اور صرف ۲ بالغ مردوں ہی کی گواہی قابلِ قبول ہے عورتوں کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

لحديث الزهري مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ان لا شهادة للنساء في الحدود والقصاص۔ وقال الله تعالى واستشهدوا شهيدين من رجالكم۔ (تبيين الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ كتاب الشهادة)

(ترجمہ) "حضرت زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر خلفائے راشدینؓ میں سے شیخینؓ کے دور تک کسی نے حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ تم دو مردوں کو گواہی کے لیے پیش کرو۔"

اور آگے چل کر مزید فرماتے ہیں :۔

ولان شهادة النساء فيها شبهة البدلية لان كل اثنين منهن قائمة مقام رجل فلا يقبل فيما يندرئ بالشبهة۔ (تبيين الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ كتاب الشهادة)

(ترجمہ) "اور چونکہ دو عورتوں کا ایک مرد کے قائم مقام ہو کر گواہی دینے کی وجہ سے شُبہ بدلیت ہے لہٰذا حدود قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہوگی"۔

اب صاحب مضمون خود غور کریں کہ کیا عورت کی گواہی پر شریعتِ مقدسہ میں کوئی پابندی ہے یا نہیں؟ موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

—— "اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی قتل کو ایک بچہ نے جو کہ سمجھ بوجھ رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے خود دیکھتا ہے وہی اکیلا اس قتل کا گواہ ہے باقی گواہ چشم دید نہیں ہیں بلکہ بچہ ہی واقعاتی گواہ ہے تو اس بچے کی گواہی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، جبکہ فطرتاً ایک بچہ جھوٹ بھی کم بولتا ہے، اسے جھوٹ پڑھایا بھی نہیں جا سکتا، وہ قاتل کو بھی پہچانتا ہے اور آلہٴ قتل کو بھی پہچانتا ہے، اپنی زبان سے پورا واقعۂ قتل بتا سکتا ہے، تو پھر اس کی گواہی کو نظر انداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے"۔

واضح ہو کہ ایسے واقعات میں بچے کی گواہی کو اعتبار دینا عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ نقلاً تو اس لیے کہ قرآنِ مجید نے گواہی دینے کے لیے رَجُلَیْن کا لفظ استعمال کیا ہے اور قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت سے بچے کی گواہی کا ناقابلِ قبول ہونا صریح ہے کیونکہ بچے کو رجل نہیں کہا جا سکتا اور نہ اُردو زبان میں بچے کو مرد کہا جاتا ہے، اور عقلاً بھی باطل ہے۔

(۱) فقہاء نے بالاتفاق گواہی کی ادائیگی کے وقت گواہ کا بالغ ہونا شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ولا تقبل شهادة المملوك والصبي لانهما من الولاية ولا ولاية لهما على انفسهما فالاولى ان لا يكون لهما على غيرها ولاية۔ (البحر الرائق ج۶ ص۵۵ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "غلام اور نابالغ کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ گواہی ایک طاقت کا استعمال ہے یہ دونوں عاجز ہو کر غیر پہ کیا طاقت استعمال کریں گے"۔

(۲) یہ مسلّمات میں سے ہے کہ گواہی کے لیے عقلِ کامل کا ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاگل کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے، لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا نابالغ بچے کی گواہی درست ہے یا نہیں؟ تو یہ ظاہر ہے کہ بچہ کم عقل اور کم ہوشیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ نابالغی کی عمر میں اپنے مستقبل کی کامیابی کو نہیں سمجھتا، بلکہ ایسے بچے کو والدین یا کسی دوسرے سرپرست کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایک بچہ اس حیثیت سے کسی ایسے واقعہ کو کہاں من وعن یاد رکھ سکتا ہے اور پھر

ان حالات میں گواہی کا مکمل اظہار بھی نہیں کر سکتا، اس لیے بچے کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض ایک نابالغ لڑکا کسی گواہی کو زبانی یاد کر بھی لے تو عدالت یا کسی مجاز افسر کے سامنے اس کے رعب و جلال اور ہیبت کی وجہ سے مکمل گواہی نہیں سنا سکتا۔

(۴) نابالغ کی قوتِ ارادی مضبوط نہیں ہوتی اس لیے ڈرانے دھمکانے پر بچہ آسانی سے اپنی گواہی سے منحرف بھی ہو سکتا ہے، حقیقت کو غیر حقیقت اور غیر حقیقت کو حقیقت میں تبدیل کر سکتا ہے، بخلاف بالغ آدمی کے جو اپنی قوتِ ارادی پر مضبوطی سے ڈٹ سکتا ہے، گواہی درست اور صحیح نقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر ایک نابالغ کی گواہی پر عمل کیا جائے تو واللہ اعلم کتنے مفاسد کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صاحبِ مضمون آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

—— "غیر مسلم کی گواہی کو نظر انداز کر دینا بھی اسلام کی روح کے خلاف ہے"——

تو واضح ہو کہ غیر مسلم کی گواہی غیر مسلم پر درست ہے، جیسا کہ خود مذکورہ مسودۂ آئین کی دفعہ ۱ کی شق (ب) میں کہا گیا ہے۔ اس لیے غیر مسلم کی گواہی مسلمان پر درست نہیں ہے اور یہ اسلام کی روحِ انصاف کے مخالف نہیں بلکہ عین موافق ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقید بقولہ علی مثلہ لانہا لا تقبل علی مسلم ولایۃ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۹۴ کتاب الشہادۃ)

(ترجمہ) "یعنی غیر مسلم کی غیر مسلم پر گواہی درست ہے لیکن غیر مسلم کی مسلمان پر گواہی درست نہیں ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا"۔

اور نیز کفار چونکہ فطرتاً اسلام سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور وہ اپنے اسی بغض و عناد کی وجہ سے اسلام کے ماننے والوں پر نہ جانے کیا کیا جھوٹی گواہی دیں گے جو حقیقت میں اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک تباہ کن چیز بن جائے گی۔

صاحبِ مضمون مزید لکھتے ہیں:۔

—— "دس سال کی عمر سے اوپر کے قاتل قصاص سے مستثنیٰ نہ ہونے چاہئیں"——

یہ تجویز بھی مذکورہ بالا تجاویز کی طرح ایک مضحکہ خیز تجویز ہے، کیونکہ شریعت میں مرد کے بلوغ کے لیے کم از کم دس سال کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ کم از کم بارہ سال ہیں لہٰذا دس سال کے

قاتل کو قصاص سے مستثنیٰ نہ کرنا خلافِ شریعت ہے، کیونکہ شریعت میں نابالغ کے فعل پر عدم عقل کی وجہ وجہ سے قصاص نہیں ہے، البتہ عاقلہ سے دیت لینا واجب ہے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے نابالغ بچوں کا خیال رکھے۔

مضمون نگار آگے چل کر لکھتے ہیں۔

ــــ "اولاد کے قاتل کا معاملہ بھی عجیب ہے۔۔۔۔۔ کوئی شخص کسی جنسی ترغیب پر اپنی اولاد کو قتل کر دے یا جب چاہے دوسرے لڑکوں کی ترغیب پر وراثت سے محروم کرنے کے لیے اپنے لڑکے کو قتل کر دے، مستوجب قصاص نہیں، یہ استثنیٰ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے"ــــ

(۱) والد کو اولاد کے قتل پر قصاص میں قتل نہ کرنا اہلِ اسلام کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

لا یقاد الولد بولدہ۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۲۵۱ ابواب الدیات) ــــ (ترجمہ) "باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

(۲) والد کی ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد سے نہایت ہی محبت اور شفقت ہوتی ہے اور بتقاضائے شفقتِ پدری کوئی سلیم العقل شخص اپنے بیٹے کو قتل نہیں کرتا، لہٰذا اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں۔

ولان الوالد لایقتل ولدہ غالباً لوفور شفقتہ فیکون ذٰلک شبہۃ فی سقوط القصاص۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ عموماً اپنے بیٹے سے شفقتِ پدری کی وجہ سے بیٹے کو قتل نہیں کرتا تو اس شُبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔"

(۳) باپ چونکہ بیٹے کے احیاء اور زندگی کے لیے بظاہر ایک سبب ہے لہٰذا بیٹے کو اب باپ کے خاتمہ کے لیے سبب نہیں بننا چاہیئے۔

ولان الاب لایستحق العقوبۃ بولدہ لانہٗ سبب لاحیائہ فمن المحال ان یکون الولد سببا لافنائہ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ بیٹے کے قتل پر مستحق قصاص نہیں ہے کیونکہ باپ بیٹے کی زندگی کے لیے ایک سبب تھا تو اب بیٹے کا باپ کے فناء کے لیے سبب نہیں ہونا چاہیئے۔"

(۴) باپ اگر مشرک ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو باوجود مشرک ہونے کے بیٹا باپ کو قتل نہیں کر سکتا تو

قصاص میں کیسے قتل ہوگا۔

ولہذا لا یقتلہ اذا وجد فی صف المشرکین مقاتلتہ۔ (البحرالرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)
(ترجمہ) "اور بیٹا مشرک باپ کو جہاد کے دوران بھی قتل نہیں کر سکتا۔"

علاوہ ازیں اگر ایک باپ باوجود اس قدر احترام کے اپنے کسی لختِ جگر کی زندگی کا چراغ گل کردے تو پھر اس پر دیت واجب ہوگی جو کہ خود اس کے اپنے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی، اور بصورتِ مصلحت عدالت کی استصوابِ رائے سے تعزیر کا بھی مستحق ہے، لیکن ازروئے شرع والد پر قصاص نہیں ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:۔

وھذہ الدیات کلھا علی العاقلۃ الا فی قتل الاب ابنہ عمدا فانھا فی مالہ فی ثلاث سنین ولا تجب علی العاقلہ۔ (الفتاوی الھندیہ ج ۶ ص ۲۸ کتاب الدیات)
(ترجمہ) "دیگر تمام دیات قاتل کے عاقلہ سے لیے جائیں گے البتہ اگر باپ بیٹے کو قتل کردے تو اس کی دیت باپ کے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی عاقلہ پر واجب نہیں ہے۔"

میں آخر میں لاعلم محبانِ دین سے عرض کروں گا کہ دینِ اسلام کا دارومدار نقل پر ہے عقل پر نہیں لہٰذا خدارا اس میں ذاتی رائے نہ دیجئے، مستند علماء سے بات پوچھ کر سپرد قرطاس کیا کریں تاکہ کسی کی گمراہی کا ذریعہ نہ بنے، اور اگر کوئی خواہ مخواہ بغض و عناد سے کام لے تو پھر اربابِ اقتدار پر لازم ہے کہ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر اس کا مواخذہ کریں۔

عورت کی دیت نصف ہونے کا مسئلہ

وفاقی کونسل میں کی گئی تقریر

مسودہ قصاص و دیت پر ۲۵ رجولائی ۱۹۸۴ء کو وفاقی کونسل میں مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی دس منٹ کے محدود وقت میں کی گئی تقریر وفاقی کونسل سیکریٹریٹ کے ضبط شدہ ریکارڈ سے نقل کر کے "ماہنامہ الحق" نے شائع کیا تھا۔ قانون قصاص و دیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے افادۂ عام کے لیے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

مولانا سمیع الحق نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب چیئرمین! یہ موضوع مختلف پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے اس لیے دس منٹ میں تو اس کو سمیٹنا بڑا مشکل ہے، میں صرف دو چار اصولی باتیں عرض کروں گا اس لیے کہ جو اختلافی نوٹ ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں زیادہ تر انہی باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

حدیث کا تشریعی مقام

سب سے پہلی چیز جو سارے نظریاتی انتشار کی اساس بن جاتی ہے اور جس کی طرف میرے ایک دوست نے بھی اشارہ فرمایا کہ حدیث کی جو عظمت اور حیثیت ہے، اور جو تشریعی مقام ہے اسلام میں حدیث کا، اس پر ان دوستوں کی نظر نہیں پڑتی، قرآن کریم نے واضح طور پر بار بار حدیث کی تشریعی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کو حجت تسلیم کرنا اسلام کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝
(سورۃ النساء ۶۵)

تیرے رب کی قسم (حضور اکرم کو خطاب ہے) کہ یہ لوگ مومن نہیں بن سکتے جب تک تجھے ثالث، فیصلہ کرنے والا اور حکم تسلیم نہ کر لیں پھر ان کے دل میں بھی آپ کے فیصلوں پر کچھ بوجھ محسوس نہ ہو اور آپ کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کر لیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔	کسی مومن اور مومنہ کو (خواہ وہ مرد ہو یا خاتون) کوئی حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ کیا تو ان کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا
(سورۃ الاحزاب آیت ۳۳)	اختیار ہو۔ (بلکہ وہ لازماً تسلیم کرے گا)۔

ام المومنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک خاتون آئی اور جسم پر نقش ونگار بنانے (گوندھنے) کے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا (جیسے آجکل بھی بعض لوگ جسم پر نقش ونگار گوندھتے ہیں) تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اس خاتون نے اس وقت ہی کہا کہ میں نے تو الحمد سے وَالنَّاسُ تک سارے قرآن کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس مسئلے کا ذکر مجھے قرآن میں کہیں نہیں ملا۔ (اس خاتون کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ قرآن کریم میں جو بات ہے صرف وہی حجت ہے) تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے قرآن کریم کو غور سے پڑھا ہوتا تو تُو ضرور اس کا حکم قرآن ہی میں پالیتی، خاتون نے پھر کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں ہو سکا، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا لو قرأتیہ لوجدتیہ یعنی یہ کہ اگر تُو نے غور کیا ہوتا تو تُو معلوم کر لیتی پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ قرآن مجید میں نہیں ہے: مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (سورۃ الحشر ع۷) یعنی اللہ نے فرمایا "جو حکم تمہیں رسولؐ نے دیا اور جو کچھ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ"۔

جب قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے اور تمام وہ تفصیلات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں تو گویا وہ عین قرآن ہیں۔

تو ایک تو بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے اس سارے مسئلہ میں حدیث کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا۔ ہمارے فاضل دوست چودھری الطاف وغیرہ نے اپنے اختلافی نوٹ میں صفحہ ۱۳۴ میں یہاں تک لکھا ہے کہ احادیث جن کا زیادہ تر بلکہ ۹۹ فیصد حصہ اخبارِ احاد پر مشتمل ہے ان میں نہ تو حقانیت ہے اور نہ ہی پورا یقین شامل ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک) حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ان سب سے جو روایت الگ الگ یا ایک ایک راوی کے ذریعہ نقل ہوئیں اور جو اکیلے کسی صحابی نے سنی اور وہ اُمت کو بیان کی

ان سب کو اخبار احاد کہا جاتا ہے، اب اگر احادیث کے سارے ذخیرے کو یہ کہا جائے کہ ان میں حقانیت ہی نہیں (نعوذ باللہ) تو پھر ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا؟

عورت کی دیت نصف ہونے کی روایات

دوسری بنیادی بات جس پر سارا زور دیا جاتا ہے کہ نصف دیت کے بارے میں جو روایت ہے وہ ضعیف ہے، تو اس کے بارے میں صرف اتنی گذارش ہے کہ حدیث کا ایک سلسلہ جو ہے اس مسئلے کا اسی کو انہوں نے نشانہ بنایا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ صرف ایک حدیث میں مذکور نہیں ہوا کہ عورت کی دیت نصف ہے بلکہ حدیث کی وہ مستند کتابیں جو صحاح ستہ میں شامل ہیں ان سب میں منقول ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کو نقل کیا ہے، ان کی کتاب سنن النسائی صحاح ستہ میں شامل ہے، مؤطا امام مالک نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جبکہ امت کا ایک بڑا طبقہ امام بخاریؒ کی "صحیح" پر بھی اس کو ترجیح دیتا ہے، گو عام رائے یہی ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری۔ "یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے"۔ مگر امت کا ایک طبقہ خاص کر مغربی ممالک، الجزائر، مراکش، تیونس اور افریقہ کے کئی علاقے وہ مؤطا امام مالکؒ کو بخاری شریف پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنز العمال، نصب الرایہ، اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ ———— نے ان روایات کو نقل کیا ہے روایت بھی ایک سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے، حضرت عثمانؓ سے، حضرت علیؓ سے، حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے کبار صحابہ کی یہی رائے (نصف دیت کی) تھی۔

اور علامہ کاسانیؒ نے "بدائع الصنائع" میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورت کی نصف دیت کا جو فیصلہ دیا تھا صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں سے کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے اس کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع قرار پایا۔ اس کے بعد یعنی خلفائے راشدین کے بعد ائمہ اربعہؒ کا جب زمانہ آتا ہے تو سارے کے سارے ائمہ کرامؒ اس مسئلے پر متفق نظر آتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قدیم و جدید کسی بھی عالم کا ایک قول اس کے خلاف نہیں سنا۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کے حامل ہیں، تو گویا ان سب کی اس کے بارے میں یہی رائے تھی۔

فقہ جعفریہ بھی متفق ہے

ہمارے دوست علامہ سید محمد رضی مجتہد یہاں تشریف رکھتے ہیں میں ان کی موجودگی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فقہ جعفریہ، فقہ زیدیہ اور

شیعہ مکتب فکر کے جتنے بھی فقہاء و مجتہد ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کی دیت نصف دیت ہے۔ تو ہمارے ان دوستوں کو اس سارے ذخیرے میں سے ایک دو قول ہی ملے ہیں۔

جناب والا! یہ ضروری مسئلہ ہے لہٰذا اس کی تشریح کرنے کے لیے آپ مجھے ایک دو منٹ اور دیں کیونکہ یہ مسئلہ اس سارے ہنگامے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، تو نصف دیت کے بارے میں صرف ان دو حضرات کا قول پیش کیا گیا ہے، ایک ابوبکر اصم اور دوسرے ابن عُلیہ۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے یہ دوست ان میں سے کسی بھی نام کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے، کبھی اس کو ابن اولیاء لکھتے ہیں کبھی اس کو کیا کہتے ہیں۔

اب ابن علیہ اور ابوبکر اصم کے بارے میں ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ ہیں کون لوگ؟ تو سب سے پہلے ان کی یہ رائے امام ابن قدامہؒ نے "المغنی" میں نقل کی، ان دو حضرات کی رائے نقل کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان راویوں کے علاوہ کسی اور سے (یعنی نامعلوم راوی سے) مذکور ہے کہ ابن عُلیہ اور ابوبکر اصم یہ کہتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کے مساوی ہے، ان راویوں کا نام تک نہیں لیا گیا۔ پھر ان (عُلیہ اور اصم) کا قول ذکر کرنے کے بعد ابن قدامہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قول پوری امت کے ہاں متروک ہے کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔

اب ہم ان دونوں کو علم حدیث کے رجال اور اسماء الرجال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ یہ دونوں کون ہیں؟ اسماء الرجال کا علم اس امت کا عظیم الشان قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ ہر ہر راوی کو محدثین اور علماء جرح و تعدیل نے پرکھا ہے۔ تو اب سب سے پہلے ابوبکر اصم کو لیتے ہیں، جرح و تعدیل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ انہوں نے ایک کمزور راوی کا نام لے کر کہا کہ میں اس کو بھی ابن عُلیہ پر ترجیح دوں گا۔ امام نسائیؒ نے کہا کہ یہ شخص متروک ہے اور محدثین کے ہاں بالکل مقبول نہیں ہے۔ ابن معینؒ نے کہا کہ یہ متروک ہے۔ اسماء الرجال کی ایک مستند کتاب "لسان المیزان" میں تو ان کی پوری قلعی کھول دی ہے۔

جناب چیئرمین، مولانا قبلہ کل بھی یہ بات ہوئی جو آپ بتا رہے ہیں اور آج صبح آپ سے پہلے بھی ایک صاحب نے انہی کتابوں کے حوالے سے یہ چیزیں بتائیں، بار بار کیوں وہی باتیں آپ دہرا رہے ہیں؟

مولانا سمیع الحق: میں نے اس مسئلہ پہ یہ اختلافی نوٹ دیا تھا کہ دفعہ ۲۵ کے بارے میں جب قرآن کریم، احادیث اور فقہاء کی واضح ہدایات ہیں تو اسے ......

جناب چیئرمین : اس طرح سے دوسروں کا حق مارا جائے گا اور کوئی بات نہیں ۔

مولانا سمیع الحق : میں یہ عرض کروں گا کہ یہ (نصف دیت کا) مسئلہ اتنا واضح، قطعی اور مسلمہ ہے کہ اگر اس کو اسی ایوان میں طے شدہ قرار دیا جاتا اور اس بارے میں اللہ اور رسولؐ نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر ہم سب سر تسلیم خم کر لیتے اور اس کو سپریم کورٹ یا کسی اور ادارے کے پاس مزید تفصیل کے لیے نہ بھیجتے تو اچھا ہوتا، کیونکہ اس وقت ہزاروں ایسے کیس ہیں جو اس آرڈی ننس کے نفاذ کے منتظر ہیں، سینکڑوں لوگ جو کال کوٹھڑیوں میں بند ایک ایک لمحہ اس انتظار میں گن رہے ہیں کہ کب یہ نافذ ہوگا اور کب مصلحت کی راہ کھلے گی اور ہمیں انصاف ملے گا۔ اگر اس کو ہم اسی طرح ملتوی کرتے رہے تو اس کے نفاذ میں مزید تاخیر ہو جائے گی۔ پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے بیان کردہ مسائل و احکام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اس میں نہ تو عورتوں سے زیادتی کی گئی ہے نہ مردوں سے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور غیر مسلم سب کا خالق ہے اور آزاد اور غلام تک سب کے قصاص میں مساوات رکھی گئی ہے اسلام میں۔

صرف دیت کے ایک مسئلہ میں جو صرف قتلِ خطا کی صورت سے تعلق رکھتا ہے یہ تفصیل ہے، واضح حدود اور ہدایات ہمارے سامنے ہیں۔ تو میری رائے یہ ہے کہ ہمارے معزز ارکان اس مسئلے کو بھی جس طرح اس کی تشریح قرآن میں ہے اس طرح رکھ دیں، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں بھی اس کی تفصیل تھی کہ مقدار نصف دیت ہوگی تو اسی کو رکھا جائے ۔

جناب چیئرمین : مولانا صاحب بہت بہت شکریہ !

الابتدائیہ

جب حکومت پاکستان نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کیا تو کچھ لوگوں نے ہڑتالوں اور جلاؤ گھیراؤ کے ذریعہ اس آرڈیننس کو ختم کرنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ اس سلسلہ میں علماء کرام، مفتیانِ عظام اور دوسرے اہلِ علم حضرات نے اسلام کے اس عادلانہ قانون کی وضاحت اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی تاکہ عقلِ سلیم رکھنے والا انسان بغیر تسلیم و رضا کے رہ نہ جائے ـــــ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے بھی اس آرڈیننس کا اجمالی جائزہ لیا اور اس پر تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ پیش کیا جو دارالعلوم کے ترجمان رسالہ ماہنامہ الحق میں شائع ہوا، بعد ازاں گوجرانوالہ کے ایک عالم دین مولانا سید تصدق بخاری صاحب نے اس پر اپنا تنقیدی نکتہ نظر پیش کیا وہ بھی نذرِ قارئین ہے، پھر اس کے جواب الجواب میں حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھرپور تعاقب کیا جو کہ ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ـــــ چونکہ ان مضامین کا تعلق بھی فقہ اسلامی کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اس لیے بطور افادۂ عام دارالعلوم حقانیہ کے فتاویٰ میں شامل کیا جاتا ہے ـــــ (از مرتب) ـــــ

اسلام کا نظامِ قصاص و دیت

اجمالی جائزہ و تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب

قصاص و دیت کے اعلان کے بعد جب ڈرائیور برادری کی طرف سے اس پر ملک گیر احتجاج ہوا تو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی اہمیت سے موضوعِ بحث بنا رہا۔ موجودہ قصاص و دیت کے حکومتی اعلان میں اگر شرعی تقاضے پورے کئے گئے ہوتے تو اس کی تائید و تصویب اتنے زوردار لہجے میں ہوتی جتنے کہ اس کی مخالفت میں مقالے لکھے گئے۔ بعض اہم امور میں بے احتیاطی اور تساہل کا یہ نتیجہ نکلا کہ پوری دنیا اسلام کے نظام قصاص و دیت سے مذاق کرنے پر اتر آئی۔ خدانخواستہ اگر اسلام کی ان فوجداری دفعات میں شرعی تقاضے پورے نہ کیے گئے تو شاید آئندہ کے لیے کوئی بھی اس ملکِ خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جرأت نہ کر سکے۔

تادمِ تحریر اس مسئلہ پر جو مقالات سامنے آئے ہیں ان میں کوئی ایسا مقالہ نظر سے نہیں گذرا جس میں قصاص و دیت کے سرکاری شائع کردہ قانون میں سقم اور کمزوری کے ہوتے ہوئے شرعی نقطۂ نظر سے اس کے قابلِ عمل ہونے کو ثابت کیا گیا ہو، اربابِ علم و دانش اور نفاذِ اسلام کے مخلص اصحابِ فکر نے اصلاح کی کوشش کی، کمزوریوں اور اسقام کی نشاندہی کرنے کے بعد متبادل تجاویز پیش کیں۔

دوسری طرف بعض جدت پسندوں نے موجودہ مسودۂ قانونِ قصاص و دیت میں سقم اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کو اپنا ہدف اور دُرفشانی کا نشانہ بنایا، ایسے رکیک اور غیر معیاری اعتراضات اور شبہات کئے جو کسی مسلمان سے ناقابلِ توقع ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے اکثر اعتراضات کا منشاء مذہب اور عقیدہ سے ناواقفیت کے علاوہ مروّجہ نام نہاد آزادی اور جدت پسندی کی مذموم خواہش رہی۔

قصاص و دیت کے بارے میں اہم شبہ

قصاص و دیت آرڈیننس کے بعد قصاص و دیت کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس میں ڈرائیور کو ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے علاوہ خود اس کا فعل بھی موضوع بحث رہا، یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈرائیور کے ہاتھوں کا قتل قابل مواخذہ جرم نہیں قرار دینا چاہیئے، کسی بھی ڈرائیور کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کو شوقیہ قتل کرے، ڈرائیور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرتا ہے، موت کے منہ میں بیٹھ کر انسان کی خدمت کرتا ہے، آخر اس سے یہ توقع کیسے ممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو قتل کرے، جبکہ بسا اوقات ڈرائیور کو خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں ایکسیڈنٹ کی موت کو قابلِ مواخذہ جرم قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کا تصوّر زمانۂ قدیم میں نہیں تھا کیونکہ اس وقت گاڑیاں نہیں تھیں اس لیے اس کو خواہ مخواہ قتل کی پرانی قسموں میں شمار کرنا لایعنی کوشش ہے۔

قصاص و دیت کے بارے میں قابلِ تشریح نکات

ان شبہات کے ازالہ کے لیے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کے چند پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ایسے غیر معیاری شبہات کا موقع نہ رہے۔

(۱) ایکسیڈنٹ کی صورت میں قتل کی کیا حقیقت ہے اور یہ قتل النفس کی کون سی قسم میں آتا ہے۔

(۲) اسلامی نظامِ قصاص و دیت میں ایسی قسم کے لیے کون سی سزا مقرر ہے اور اس کے اثرات و منافع کیا ہیں؟

(۳) قصاص و دیت آرڈیننس کے مسوّدۂ قانون میں اس اعتبار سے کونسی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

تحفظِ نفس کا محیر العقول نظام

ایکسیڈنٹ کے قتل کی حقیقت بیان کرنے سے قبل یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام کی رو سے انسانی نفس کو جو عزت و عظمت اور تقدس حاصل ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں پایا جاتا۔ ایک اسٹیٹ میں انسان کے خون کو بلا امتیازِ مذہب و عقیدہ ہر لحاظ سے تحفظ حاصل ہے، یہ ممکن نہیں کہ نفسِ محترمہ کا خون رائیگاں ہو، جس صورت میں نفسِ محترمہ سے کسی غیر شرعی طریقہ سے کھیلا گیا تو اس کا حساب لیا جائے گا، اگر قصاص کی صورت میں ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت لازم ہوگی، اگر قاتل معلوم

نہ ہو تو قسامت کی رو سے اہلِ محلہ سے دیت لی جائے گی ورنہ بصورتِ دیگر حکومت ذمہ دار ہوگی اس لیے فقہاء کرام نے نفسِ محترمہ کے ضیاع کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں، جن میں ۱قتلِ عمد میں قصاص اور ۲قتل شبہ بالعمد، ۳خطاء، ۴جاری مجرای خطاء اور ۵قتل بسبب میں دیت لازمی قرار دی ہے۔ موجودہ زیرِ بحث مسئلہ کا تعلق ”قتلِ خطاء“ سے ہے اس لیے دوسری قسموں کی حقیقت بیان کرنے سے قطع نظر ہم صرف قتلِ خطاء کی حقیقت کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ایکسیڈنٹ کا قتل قتلِ خطاء کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

قتلِ خطاء کی حقیقت

”خطاء“ کے عنوان سے یہ واضح ہے کہ یہ ایسا قتل ہے جس میں قاتل کا ارادہ اور نیت شامل نہیں، گویا ”قتلِ خطاء“ کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی نیت اور ارادہ کے کسی انسان کے ہاتھ سے دوسرے انسان کی جان ضائع ہو، عموماً اس کی دو صورتیں بتائی جاتی ہیں

(۱) خطاء فی القصد (۲) خطاء فی الفعل۔

اول الذکر کی حقیقت یہ ہے کہ قاتل غلط فہمی کا شکار ہو یعنی کسی انسان کو حیوان سمجھ کر شکار کی نیت سے اسے مارے، اور مؤخر الذکر کا بیان یہ ہے کہ کسی بے احتیاطی یا فنی غلطی سے کسی انسان کی جان اس کے ہاتھ سے ضائع ہو، مثلاً شکار کو مارتے ہوئے اس کی گولی اچانک انسان کو لگے، یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن میں قاتل کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو قتل کرے بلکہ بغیر قصد و عمد سے انسان کی جان ضائع ہوئی۔

ایکسیڈنٹ کی صورت بھی کچھ اسی طرح کی ہے کیونکہ اس میں ڈرائیور کا ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی انسان کو قتل کرے، ڈرائیور تو اپنے مقصد میں مصروفِ عمل ہوتا ہے، شاید کسی بے احتیاطی یا غفلت اور لاپرواہی سے کسی انسان کی زندگی اس کے ہاتھوں سے تمام ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بسا اوقات ڈرائیور کی غلطی نہ ہو بلکہ مقتول خود عمداً یا سہواً گاڑی کے آگے آئے، لیکن ایسی صورت میں بھی ڈرائیور کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ قتل ہر صورت میں ڈرائیور کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً شکار کو مارتے ہوئے کوئی شخص قصداً شکاری کی بندوق کے سامنے کھڑا ہو جائے تو فقہاء کی رائے میں شکاری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا، بہرحال ایکسیڈنٹ کا قتل، قتلِ خطاء سے کسی صورت میں زیادہ نہیں۔

قتلِ خطاء کی سزا

دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جس میں خطاء قابلِ مواخذہ جرم نہ ہو، اگر کوئی شخص کسی کی کوئی قیمتی چیز غلطی سے توڑ دے تو کیا توڑنے والے کو معاف کر دیا جائے گا؟ کہ وہ محض یہ کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ شریعتِ مقدسہ میں خطاء اور نسیان اخروی اعتبار

قابلِ مواخذہ جرم نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"میری امت کا محاسبہ خطا اور بھول پر نہیں ہوگا۔"

لیکن دنیوی احکام کے اعتبار سے اس پر مواخذہ ہے، جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس میں خطاء اور نسیان کوئی عذر نہیں، خاص کر جب کسی چیز کے ضائع ہونے پر ضمان اور تاوان کا مسئلہ ہو۔

قتلِ خطاء بھی دنیاوی احکام کے اعتبار سے قابلِ مواخذہ جرم ہے، اس پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ تین ہیں:۔

(۱) اگر مقتول قاتل کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کی موت پر قاتل کو وراثت کا حق پہنچتا ہو تو قتل کرنے کی وجہ سے قاتل حقِ وراثت سے محروم رہے گا، کیونکہ اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ کہیں قاتل نے جائیداد ہتھیانے کے لیے قتل کا یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

(۲) دوسری سزا یہ ہے کہ انسانی جان اللہ تعالیٰ کی عظیم مقدس امانت ہے اس میں خیانت کرنے پر قاتل دو مہینے متواتر روزے رکھے گا تاکہ قاتل کو اپنے کیے ہوئے جرم پر ندامت اور افسوس کا احساس ہو۔ اس کا تعلق چونکہ فیما بینہ و بین اللہ ہے اس لیے اس میں جبر اور طاقت کے استعمال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری سزا خون بہا کی ادائیگی ہے تاکہ انسان کا خون ضائع نہ ہو، قتلِ خطا کی صورت میں خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ (۲۹۱۶ تولہ، ۸ ماشہ) چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔ خون بہا کی اتنی خطیر رقم کی تقرری میں بنیادی فلسفہ مقتول کے زخم خوردہ ورثاء کے لیے تسلی ہے، ممکن ہے کہ اس مالی تعاون سے ان کے جذبات ٹھنڈے ہوں اور انتقامی جذبہ کا جو لاوا اُن کے دلوں میں اُبل رہا تھا شاید خون بہا کی وصولی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار کون ہے؟

لیکن اتنی بڑی رقم کی ادائیگی شاید قاتل کے بس میں نہ ہو، ممکن ہے کہ تحمل کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکے جس سے دیت کی ادائیگی ناممکن ہو، اس لیے شریعت نے اس کو ممکن بنانے اور قاتل کو ہلاکت کے اس بھنور سے نکالنے کے لیے دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری "عاقلہ" کے کندھوں پر ڈالی ہے "عاقلہ" سے مراد اہلِ دیوان (دفتری ریکارڈ میں متعلقہ زمرہ) قوم، قبیلہ ہے۔ "عاقلہ" کے تعین میں بنیادی تصور یہ ہے کہ جن لوگوں سے تکلیف اور مصیبت کے وقت قاتل تعاون اور مدد کی امید رکھتا ہو وہی اس کا

عاقلہ متصور ہوگا، موجودہ وقت میں یونین، محکمہ اور کمپنی اس کے ضمن میں آسکتے ہیں۔ مثلاً سکول کا ایک استاد کہیں قتلِ خطاء کا مرتکب ہو تو اس قتل کی دیت پورے صوبہ کے اساتذہ سے لی جائے گی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک گمنام شخص کے جرم کی سزا پورے محکمہ والوں کو دی جائے، لیکن اسلامی ذہن رکھنے والا شخص ایسے لایعنی شبہات کا کبھی تصور بھی نہیں کرتا، کیونکہ تمام مسلمان بمنزلہ جسدِ واحد ہیں، ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، مشرق میں رہنے والے کی خوشی اور غم کا احساس مغرب میں رہنے والے مسلمان کو بھی ہوگا۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مصیبت میں مبتلا ہونے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اسلام میں قومی وحدت اور یگانگت بنیادی چیز ہے! لہٰذا ایسی مصیبت میں کم از کم اس کے عاقلہ کو تعاون کا ہاتھ یقیناً بڑھانا چاہیئے۔

عاقلہ پر دیت کے تعین کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی قوم جب دیت ادا کرے گی تو لازماً قاتل کو ایسے اوصاف اور باتوں سے یاد کرے گی جن کا سننا قاتل کے لیے ناگوار ہوگا۔ ایسے قبیح حالات اور مناظر سے بچنے کے لیے آئندہ ہر ایک شخص نہایت احتیاط سے کام لے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ بھی مہذب طریقہ سے قاتل کو سزا دینے کی ایک صورت ہے، ورنہ ایک معزز شخص لاکھوں روپے قربان کرکے اپنے بارے میں ایسی باتیں سننا گوارا نہیں کرتا۔

دیت کی وصولی کا طریقۂ کار

عاقلہ پر دیت کا جو بوجھ ڈالا گیا ہے یہ کوئی ایسا بوجھ نہیں جو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو، عاقلہ سے دیت مجموعی طور پر تین سالوں میں وصول کی جائے گی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی روشنی میں ایک شخص پر تین سالوں میں چار دراہم یعنی چودہ ماشہ چاندی کی قیمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا اگر چاندی کی قیمت ۸۰ روپے فی تولہ ہو تو ایک شخص سے تین سالوں میں صرف مبلغ (۷۰) روپے وصول ہوں گے جو ماہانہ طور پر دو روپے سے بھی کم بنتے ہیں، پھر اگر قریبی علاقہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو عاقلہ کا دائرہ وسیع کیا جائے گا تاکہ ایک شخص پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جاسکے۔

پھر دیت کی وصولی کے لیے آسان طریقہ متعین کیا گیا ہے کہ دیت لوگوں کے ماہانہ، ششماہی اور سالانہ وظائف سے منہا کی جائے گی۔ موجودہ دور میں اگر ہر ملازم کی تنخواہ سے ماہانہ دیت کی رقم کاٹی جائے تو شاید ہی دو روپے سے متجاوز ہو جو کہ تنخواہ دار طبقہ پر کوئی خاص بوجھ نہیں۔

اس محیر العقول نظامِ تحفظِ جان سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیئے، اسلام دینِ فطرت ہے اس میں نہ ظلم کی حوصلہ افزائی ہے اور نہ ظالم کا استیصال مقصود ہے۔ اسلام میں ظالم اور مظلوم دونوں سے تعاون

کیا جاتا ہے۔ ظالم سے تعاون کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مظلوم کی طرف ہمدردی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا جاتا ہے۔ اسلام کے نظام دیت میں اگر ایک طرف قاتل کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو دوسری طرف عاقلہ پر یہ ذمہ داری ڈال کر اس کے ساتھ سہولت اور آسانی کا رویہ رکھتا ہے، پھر دیت کی وصولی سے مقتول کے غمزدہ ورثاء کے لیے اطمینان دلانے کا ہمدردانہ رویہ اسلام کا انفرادی مقام ہے۔

موجودہ نظام قصاص و دیت کی خامیاں

نظام قصاص و دیت کا آرڈیننس کے ذریعہ نافذ کردہ مسودہ کوئی نیا نہیں، اس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بہترین کام کیا ہے، اس وقت قصاص و دیت کا سرکاری مسودہ علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو ہم دارالعلوم حقانیہ کے خدام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز حکومت کو بھیجی تھیں جو ماہنامہ الحق جلد ۱۶ شمارہ ۷ میں شائع ہوئی تھیں۔ حالیہ آرڈیننس میں اسلامی خدوخال کی رعایت نہیں رکھی گئی، قتلِ خطا کی صورت میں صرف ڈرائیور کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرانا اسلام کے عادلانہ نظام کی روح کے منافی ہے، ڈرائیور سے صرف اتنی رقم لی جائے گی جو اس کی برادری کے عام ممبر سے لی جاتی ہے اس میں عاقلہ کو بری الذمہ قرار دینا اسلامی نظام عدل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اس لیے کہ چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے، یہ قیمت تو وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے، پھر حکومت کا یہ فیصلہ بھی غیر دانشمندانہ ہے جس میں دیت کی ذمہ داری انشورنس کمپنی کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے کیونکہ انشورنس کمپنی ہر ایک کی عاقلہ نہیں اور بغیر عاقلہ ہونے کے دیت کی ادائیگی اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محکمہ، یونین اور قوم قبیلہ عاقلہ قرار دے کر ان کو دیت کی ادائیگی کا پابند قرار دیا جائے۔

علاوہ ازیں شرعی نظام شہادت کے فقدان کی وجہ سے قصاص و دیت آرڈیننس سے خاطر خواہ نتائج کی توقع بے سود ہے، موجودہ نظام شہادت کے ہوتے ہوئے اس نظام کا کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل نظر آتا ہے، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نظام قصاص و دیت کے ساتھ ساتھ نظام شہادت کا بھی شریعت کے مطابق اعلان ہو۔

ایک غلط تاثر کا دفاع

مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی مدظلہٗ

حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۴۱۱ھ کے مبارک دن ملک میں قصاص و دیت کا قانون نافذ کیا گیا تو دیندار مسلمانوں نے اسے صدر مملکت کا بہترین کارنامہ قرار دیا جو کہ حقیقت کے عین مطابق تھا۔ نئی حکومت قائم ہوئی اور معاً بس ڈرائیوروں کی عام ہڑتال کا سانحہ پیش آیا تو افواہ اڑا دی گئی کہ اسلامی قوانین کا برداشت کرنا آسان کام نہیں یہ تو ایک قانون نافذ کر دینے کا ردِ عمل ہے اور اگر شریعتِ اسلامیہ کو مکمل طور پر نافذ کر دیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس شرارت کے بین السطور دراصل موجودہ حکومت کو خوفزدہ کرنا ہے کہ وہ سینٹ اور قومی اسمبلی سے شریعت کو منظور کرانے کے وعدوں سے پھر جائے اور جس طرح وہ سابقہ حکومت، خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لے کر غرق ہوئی ہے اسی طرح یہ بھی طبعی عمر پوری کرنے سے پہلے پہلے غرق ہو جائے۔

ہڑتالیوں سے بات چیت کے بعد اخبارات میں یہ اعلان چھپا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قصاص و دیت کے قانون میں ترمیم کرے اور یہ بتایا جائے کہ ڈرائیور پر جو دیت عائد ہوگی وہ اس کا عاقلہ یعنی یونین وغیرہ برداشت کرے گی نہ کہ وہ ذاتی طور پر۔ اب شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ سے خوف زدہ لوگوں نے پینترا بدلا اور کہنے لگے کہ:۔

> "دیکھا! اسلامی قوانین جنہیں ابدی کہا جاتا ہے اس میں طاقت کے بل بوتے پر ترمیم کی جا سکتی ہے اور یہ کہ نفاذِ شریعت کا نعرہ لگانے والے ؎
>
> خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں!"

دراصل نفاذِ شریعت کے مخالفین کو موجودہ انتخابات سے جو دھچکا لگا ہے وہ اپنی خفت کو مٹانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کرنے لگے ہیں۔

اظہارِ حقیقت حقیقت یہ ہے کہ ہڑتالیوں کو جو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ اسلام کے قانونِ دیت سے نہیں بلکہ اسلام کے قانونِ دیت میں ترمیم کرنے سے پیش

آئی۔ باوثوق ذرائع کے مطابق سینیٹ میں موجود علماء کرام نے قصاص و دیت سے متعلق جو مسودہ پیش کیا تھا اور اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے متعلق جو سفارشات پیش کی تھیں اس میں پہلے ہی سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی شریعت کی رو سے قتلِ خطاء کی دیت مجرم پر نہیں بلکہ عاقلہ یونین پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ وہ تین سال تک اس کو ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن سابق حکومت کے کارندوں نے دانستہ یا نادانستہ، اسلام سے ناواقفیت کی بناء پر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے "عاقلہ" کا لفظ اڑا دیا جس سے متاثرین کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یعنی اسلامی قانونِ دیت سے سے تم نے ایک لفظ (عاقلہ) اڑا دیا تو پریشانی لاحق ہو گئی تم نے توبہ کی اور حذف شدہ لفظ کو کو واپس لا کر اس قانون کو اسلام کے مطابق کر دیا تو اطمینان ہوا۔ اس لیے ملک کے عوام کو عموماً اور حکمرانوں کو خصوصاً یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ شر اور فساد کا منبع اسلامی قوانین میں ردّ و بدل اور ان سے لاپرواہی ہے نہ کہ اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ۔

شاعرِ مشرق کا یہ پیغام ایک لمحہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے وہ فرماتے ہیں ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

⁂

اصل دیت کیا ہے

سو اونٹ یا دس ہزار دراہم؟

جواب بمضمون مفتی غلام الرحمٰن صاحب از مولانا سید تصدق بخاری

مؤقر جریدہ "الحق" دسمبر ۱۹۹۰ء موافق جمادی الاول ۱۴۱۱ھ میں حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کا مقالہ "اسلام کا نظام قصاص و دیت" نظر سے گزرا تو بڑا قلق ہوا کہ حضرت موصوف کو بھی دیت کی مقدار کے تعین میں سخت ذہول ہوا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "قتل خطاء کی صورت میں یہ خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔" (الحق ص ۳۶)۔ (ہرگز نہیں) پھر آگے جا کر یوں خامہ فرسا ہیں کہ۔

"چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے۔" (الحق ص ۳۸)

حضرت مولانا صاحب موصوف سے اس ذہول کا ارتکاب اس لیے ہوا ہے کہ وہ اصل دیت کی احادیث مبارکہ پڑھنے کے باوجود بھول گئے ہیں۔ احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا، چاندی، گائے اور بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اسی لیے ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی قیامت تک بوقتِ ضرورت ہوتی ہی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں، اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اسی لیے ان کی تعداد میں کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی، مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

"یہ قیمت تو اس وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔" (الحق ص ۳۸)

موصوف نے جب حکومت کی مقرر کردہ دیت کو غیر شرعی دیت تسلیم کیا ہے تو پھر حضرت موصوف کی تولوں اور ماشوں والی پیش کردہ دیت بدرجۂ اولیٰ و اتم غیر شرعی ہے کیونکہ جس طرح حکومت نے سونے یا چاندی کو اصل دیت تصور کر کے منزلت پذیر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اسی طرح حضرت صاحب نے دس ہزار دراہم کو اصل دیت تسلیم کر کے بہت ہی بڑی غلطی کا اظہار کیا ہے، آپ خود لکھتے ہیں:۔

"ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار (چھ سو دس) روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں لیکن

چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار لازمی ہے۔" (الحق ص ۳۸)

درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹوں کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے "دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی" مقررہ چیزوں کی صورت میں اس سے کم یا زیادہ دینے سے شرعی دیت ادا نہ ہوگی جیسا کہ عنقریب آرہا ہے۔

۲۹۱۶ تولے ۸ ماشے چاندی کی موجودہ قیمت بحساب ۵۵ روپے فی تولہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار چار سو سترہ روپے بنتی ہے جو کہ شرعی دیت نہیں ہے۔

غور فرمائیے موصوف کی مقرر کردہ دیتِ نفس حکومت کی مقرر کردہ دیتِ نفس سے دس ہزار روپے سے بھی زیادہ کم ہے جو ناقص ہی نہیں بلکہ انقص ہے۔

حکومت نے قصاص و دیت کا جو آرڈیننس ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء کو جاری کیا وہ ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء موافق ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو نافذ العمل قرار دیا گیا جس کی دفعہ ۳۲۰ غیر محتاط ڈرائیونگ کے متعلق ناقص ہی نہیں بلکہ انقص تھی اس لیے اس کے خلاف ملک بھر میں زمینی ذرائع آمدورفت کو معطل کر دینے والی ہڑتال ہوئی۔ مذکورہ آرڈیننس میں یہ مرقوم ہے کہ غیر محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوا جو ڈرائیور حادثہ کر کے کسی آدمی کو مار دے گا وہ مرنے والے کے ورثاء کو ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے بطور دیت دے گا۔ اس کے خلاف مظاہرے اور ہڑتال اس لیے ہوتے تھے کہ اس میں بھی دو نقص تھے۔ ایک تو اس میں اصل دیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرا "عاقلہ" کا تعارف نہیں کرایا گیا اور نہ ہی ان کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس ہڑتال کا مطلب یہ لینا کہ لوگ اسلامی قوانین کو برداشت نہیں کرتے، سراسر غلطی اور بے اصل ہے۔ درحقیقت یہ ہڑتال اس لیے ہوئی تھی کہ قصاص و دیت کے آرڈیننس میں ناقابلِ برداشت نقائص تھے جن کی تنقیح لازمی ہے۔ پھر انشورنس کمپنی کو دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار دینا ہر طرح سے شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہے۔

قانونِ دیت —— اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں

ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری المعافری المصری المتوفی بہا سنۃ ثمان وعشرۃ ومائتین (۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء "الرسالۃ المستطرفۃ" میں رقمطراز ہیں۔

"پہلا مقتول جس کا خون بہا (دیت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ فتح مکہ

میں ادا فرمایا وہ جنیدب بن اکوع کا ہے، اسے بنو کعب نے قتل کیا تھا، نبی علیہ السلام نے اس کے خون بہا (دیت) میں سو اونٹنیاں دی تھیں"۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۸۳ باب فتح مکہ)

عن ابن عمر قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی درجۃ الکعبۃ یوم الفتح فقال الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہٗ الا ان قتیل العمد الخطاء بالسوط والعصا مائۃ من الابل مغلّظۃ منھا اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا۔ (دار قطنی ج ۲ ص ۱۰۵ ۔ البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج ۴ ص ۲۸۲ ابن ماجۃ ج ۲ ص ۸۷۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن بیت اللہ شریف کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمائی پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندہ کو مدد دی اور اس نے تنہا دشمن کے لشکروں کو شکست دی، آگاہ ہو جاؤ خطاء کا مقتول (قتل خطاء) وہ ہے جو کوڑے اور چھڑی سے مارا جائے، اس میں دیت کے سو اونٹ ہیں، ان میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہیں"۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ قال کانت قیمۃ الدّیۃ علٰی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمان مائۃ دینارٍ او ثمانیۃ الاف درھمٍ ودیۃٌ اھل الکتاب یومئذٍ النصف من دیۃ المسلمین قال فکان ذٰلک کذٰلک حتّٰی استخلف عمرؓ فقام خطیبًا فقال ان الابل قد غلت قال ففرضھا عمرؓ علٰی اھل الذھب الف دینار وعلٰی اھل الْبَقَرَۃِ مائتیْ بقرۃ وعلٰی اھل الشاۃ اَلْفَیْ شاۃٍ وعلٰی اھل الْحُلَلِ مائتیْ حُلّۃٍ۔ قال وترک دیۃ اھل الذّمّۃ لم یرفعھا فیما رفع من الدّیۃ۔

(ابو داؤد ج ۲ ص ۲۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خون بہا کے اونٹوں کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار دراہم تھی اور اہل کتاب کا خون بہا اس زمانہ میں مسلمانوں کے خون بہا سے نصف تھا، جب حضرت عمرؓ کا زمانہ خلافت آیا تو انہوں نے فرمایا چونکہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے اسلئے سونا رکھنے والوں کیلئے ایک ہزار دینار خون بہا مقرر کیا ہے اور چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار دراہم اور گائیں رکھنے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں

رکھنے والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے رکھنے والوں پر کپڑوں کے دو سو جوڑے مقرر کئے ہیں اور ذمّی لوگوں کی دیت وہی رکھی ہے جو پہلے تھی۔"

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف درھم۔ (جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۲۴

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار دراہم خون بہا (دیت) مقرر کیا تھا۔"

علامۃ ابوالفضل جمال الدین عبداللہ بن محمد بن ابی الحسن مکرم بن احمد ابن منظور الانصاری الخزرجی الافریقی المصری ولد ۶۳۰ھ مات فی شعبان ۷۱۱ھ قال وکان اھل الدیۃ الابل ثم قوّمت بعد ذلک بالذھب والفضۃ والبقرۃ والغنم وغیرھا۔ (لسان العرب ج ۱۱ ص ۱۶۷)

(ترجمہ) صاحب لسان العربؒ فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو ۱۰۰ اونٹ ہی ہیں صرف لوگوں کی سہولت کے لیے ان اونٹوں کی قیمت کے برابر، بعد میں سونا و چاندی، گائیں اور بکریاں وغیرہا دیت مقرر کی گئی۔"

اس سے ثابت ہوا کہ دیت میں سونے چاندی کا اعتبار نہیں، اصل دیت جب اونٹ ہی ہیں تو دیت میں سو ۱۰۰ اونٹ ہی دینے ہوں گے یا پھر ان کی قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء۔ دو سو ۲۰۰ گائیوں اور دو ہزار ۲۰۰۰ بکریوں کی قیمت بھی ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے سے کہیں زیادہ بنتی ہے لہٰذا ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے کی دیت درست نہیں۔

فقال الشافعی و احمد فی روایۃ محمد بن المنذر الابل فقط فتجب قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (البنایۃ ج ۴ ص ۱۵۹

(ترجمہ) "امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ بھی جمہور کے قول فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو ۱۰۰ اونٹ ہی ہیں جو ان کی قیمت یا اسی قیمت کی دوسری مقرر کردہ اشیاء دیت میں دینا ہوں گی۔"

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا ان فی قتل العمد الخطاء بالسوط والعصاء مائۃ من الابل مغلظۃ منھا اربعون فی بطونھا اولادھا۔ وذھب قوم الی ان الدیۃ المغلظۃ اربع خمسون وعشرون بنت مخاض وخمس و عشرون بنت لبون وخمس وعشرون حقۃ وخمس وعشرون جذعۃ۔

(معالم التنزیل ج ۰ ص ۲۲۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خبردار سو بیشک قتل عمد خطا کوڑے (تازیانے) اور لاٹھی مارنے سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت سو اونٹ ہیں، ان میں چالیس حاملہ (گابھن) اونٹنیاں ہیں جن کے بطنوں میں ان کی اولاد ہو ــــ اور ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ بلاشبہ دیتِ مغلظ چار قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہے ــــ اوّلاً: ۲۵ ایسی اونٹنیاں جو ایک برس پورا کر کے دوسرے برس میں داخل ہو گئی ہوں ــــ ثانیاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو دو برس پورے کر کے تیسرے میں داخل ہو گئی ہوں ــــ ثالثاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو تین برس کی ہو کر چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں اور جفتی کے قابل ہوں ــــ رابعاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی ہوں۔ (امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک)"

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

......وانّ فی النفس الدیۃ مائۃ من الابل۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن خزیمۃ، ابن جارود، ابن حبان، مسند احمد، بلوغ المرام کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن حزم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ قتلِ نفس کی اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں۔

عن جابر بن عبد اللہ قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الدیۃ علی اہل الابل مائۃ من الابل وعلی اہل البقرۃ مائتی بقرۃ وعلی اہل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اہل الحلل مائتی حلۃ۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۸۹، ابوداؤد عن عطاء بن رباح)

(ترجمہ) "حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ والوں پر سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑوں والوں پر دو سو جوڑے کپڑے دیت مقرر فرمائی ہے۔"

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اصل دیت سو اونٹ ہیں اس لیے آجکل کپڑوں کے دو سو جوڑوں کی دیت ادا نہ ہوگی، بلکہ اگر کپڑے ہی دینے ہوں تو پھر سو اونٹوں کی قیمت کے برابر کپڑا دینا ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قال من قتل خطاءً فدیته من الابل ثلاثون بنت مخاض وثلاثون ابنة لبون وثلاثون حقة وعشر بنی لبون ــــ وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقومها علی اهل القری اربع مائة دینار او عدلها من الورق ویقومها علی اثمان الابل اذا غلت رفع فی ثمنها واذا هانت نقص من ثمنها علی نحو الزمان ما کان فبلغ قیمتها علی عهد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم مابین اربع مائة دینار الی ثمان مائة دینار او عدلها من الورق ثمانیة آلاف وقضی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ان کان عقله فی البقرة من اهل البقرة مائتی بقرة ومن کان عقله فی الشاة علی اهل الشاة الفی شاة۔ (ابن ماجه ج ۲ ص ۸۹)

(ترجمہ) ”حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خطاء سے مارا جائے اس کی دیت (۱۰۰) سو اونٹ ہیں (۳۰) تیس ایسی اونٹنیاں ہیں جو ایک سال کی ہوکر دوسرے سال میں لگی ہوں، اور (۳۰) تیس ایسی اونٹنیاں جو دو سال پورے کرکے تیسرے سال میں لگی ہوں، اور (۳۰) تیس ایسی اونٹنیاں جو تین سال کی ہوکر چوتھے سال میں لگی ہوں، اور (۱۰) دس ایسے اونٹ جو دو دو برس کے ہوکر تیسرے تیسرے برس میں لگے ہوں ــــ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گاؤں والوں پر دیت کی قیمت چار سو دینار لگاتے یا اتنی ہی قیمت کی چاندی، اور دیت کی قیمت اونٹوں کے حساب سے لگاتے، جب اونٹ گراں ہوتے تو دیت بھی گراں (زیادہ) ہو جاتی اور جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی ارزاں (کم) ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اونٹ کی قیمت چار سو دینار سے لیکر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی۔“

آجکل اونٹوں کی جگہ اگر گائے بکری دیت میں دی جائے تو ان کی قیمتیں سب سے زیادہ ہیں، بتیل بکری لی جائے تو دو ہزار بکریوں کی قیمت تقریباً چالیس لاکھ روپے بنتی ہے، دودھیل تیل بکری دو ہزار روپے کی کم از کم ۲۰۰۰ × ۲۰۰۰ = ۴۰,۰۰,۰۰۰ ــــ چالیس لاکھ روپے۔

میں بازار سے عام بکری کی قیمت معلوم کی تو دو ہزار بکریاں دس لاکھ روپے کی بنتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) اگر ایک بکری کی قیمت پانچسو روپے ہو تو دو ہزار بکریوں کی قیمت کیا ہوگی؟

۵۰۰ × ۲۰۰۰ = ۱۰,۰۰,۰۰۰ ــــ دس لاکھ روپے۔

غور فرمائیے! سو اونٹوں کے بدلے دیت میں اگر دو ہزار بکریاں دی جائیں تو کم از کم دیت دس لاکھ روپے بنتی ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ سو اونٹوں کی جگہ گائیں رکھنے والوں سے دو سو گائیں دیت میں دلائی جائیں۔

میں نے مویشی منڈی سے قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک عام گائے کم از کم بتیس سو روپے کی ملتی ہے۔

۶۴۰۰۰۰ = ۲۰۰ × ۳۲۰۰ ــ چھ لاکھ چالیس ہزار۔

علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ولد ۷۶۲ھ متوفی ۸۵۵ھ) رقمطراز ہیں کہ:۔

قال الامام الاستيجابيؒ قيمة كل حُلّة خمسون درهما وقيمة كل بقرة خمسون درهما وقيمة كل شاة خمسة دراهم۔

(البناية في شرح الهداية ج۴ ص۸۵۴)

(ترجمہ) علامہ استیجابیؒ فرماتے ہیں کہ ایک جوڑا کپڑے کی قیمت پچاس درہم اور ایک گائے کی قیمت پچاس دراہم اور ایک بکری کی قیمت پانچ درہم تھی۔

آٹھ سو دینار، دس ہزار درہم، سو گائیں، ہزار بکریاں، دو سو جوڑے کپڑوں کی قیمتیں سو اونٹوں کی قیمت کے برابر نہ تھیں۔ اس لیے سیدنا عمر فاروقؓ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اب اونٹوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں لہٰذا سو اونٹوں کے بدلے ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار دراہم یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں دیت میں دلائی جائیں گی۔

یاد رہے کہ دراہم و دنانیر اور گائیں اور بکریوں وغیرہا کی تعداد اس لیے بڑھتی گھٹتی رہتی ہے کہ وہ اصل دیت نہیں، اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ہر زمانہ میں اونٹوں کی اصل قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء کی تعداد بھی بڑھتی گھٹتی رہی ہے اور رہے گی۔

خیر القرون میں جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی کم ہو جاتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصل دیت کی قیمت چار سو دینار سے لے کر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی، چاندی کے آٹھ ہزار دراہم اس کے مساوی ہوتے تھے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بھی

ارشاد فرمایا کہ گائے والوں اور بیل والوں سے دیت میں دو سو گائیں اور بکریوں والوں سے دو ہزار بکریاں لی جائیں ۔

ملحوظہ : یہ بات ذہن نشین رہے کہ قتلِ نفس کی اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے سنتِ قائمہ کے مطابق ہر زمانہ میں اونٹوں کی قیمت کے نرخ کے حساب سے ہی دیت ادا کی جائے گی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ۔

کما مر۔ ویقوّمھا علی اثمان الابل فاذا غلت رفع قیمتھا واذا ھاجت رخص نقص من قیمتھا۔ الخ (ابو داؤد، نسائی، مظاہر حق جلد ۳، ص ۲۶۶، مشکوٰۃ ص ۳۰۴)

(ترجمہ" اور قیمت ٹھہراتے (نبی کریمؐ) دیت خطا کی اوپر مول اونٹوں کے پھر جس وقت مہنگے ہوتے اونٹ تو زیادہ کرتے قیمت دیت کی اور جب ظاہر ہوتی ارزانی اونٹوں کی تو قیمت کم کرتے دیت سے" (مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶)

اس حدیث کے تحت شاہ عبد العزیز[1] محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور نواسہ مولانا مخدومنا و مکرمنا حاجی محمد[2] اسحاق روح اللہ روحہ کے شاگرد رشید مولانا قطب[3] الدین ابن محمد محی الدین احراری الدہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ :-

> "کہا طیبیؒ نے یہ دلالت کرتی ہے کہ اصل دیت میں اونٹ ہیں پس اگر نہ ملیں (اونٹ) تو واجب ہوتی ہے قیمت ان کی جس قدر کہ ہو۔"

(ملاحظہ ہو مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۴ طبع اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ایک اور جگہ قتلِ عمد کی دیت کی بابت ارشاد ہو رہا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من قتل متعمدًا دفع الی اولیاء المقتول فان

---

[1] ولادت: ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء۔ وفات ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء

[2] ولادت: ۱۱۹۷ھ ذی الحجہ ۔ وفات ۲۵ رجب ۱۲۶۲ھ۔ محدث لاہوری ثم الدہلوی۔

[3] ولادت: ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۷۹ھ

شاؤا قتلوا، وان شاؤا اخذوا الدية وهي ثلاثون حقة وثلاثون جذعة واربعون خلفة وما صالحوا عليه فهو لهم۔ (جامع الترمذی جلد ۱ ص ۴۲۱)
(لسان العرب جلد ۱۵ ص ۳۱۳)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی جان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے گا، وہ اگر چاہیں تو قاتل کو اپنے مقتول کے بدلے قتل کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو دیت لے لیں اور وہ دیت سو اونٹنیاں ہیں، ان میں سے تیس ۳۰ ایسی اونٹنیاں ہیں جو کہ تین برس پورے کر کے چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں، اور تیس ۳۰ وہ جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی، اور چالیس اونٹنیاں گابھن (حاملہ) ہوں گی اور مقتول کے وارث جس بات پر صلح کر کے فیصلہ کر لیں وہی قاتل پر واجب ہو گی۔"

ایک اور جگہ قتلِ خطاء کی اصل دیت بھی سو اونٹ ہی مقرر فرمائے گئے ہیں، ارشادِ نبوی ؐ ہے:۔

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في دية الخطاء عشرون حقة وعشرون جذعة وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بني مخاض۔ (ابن ماجہ ج ۲ ص ۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (متوفی ۳۲/۳۳ ھ) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتلِ خطاء کی اصل دیت میں بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں داخل ہو گئی ہوں، اور بیس ۲۰ اونٹنیاں ایسی ہوں جو چار سال پورے کر کے پانچویں سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو دو برس کی ہو کر تیسرے برس میں داخل ہو چکی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹ وہ جو ایک ایک سال کے ہو کر دوسرے سال میں لگے ہوتے ہوں۔"

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ و عشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔

(ابوداؤد ج ۲ ص ۲۶۷ ، ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۹۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ ابن کثیر ۱/۵۳۶، نسائی ، ترمذی ، مظہری ج ۲ ص ۱۸۷ ، موطا امام مالک ص ۲۹۳ باب الدیۃ ، کتاب العقول)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا خطاء کی اصل دیت (سو۱۰۰ اونٹ ہیں) بیس۲۰ اونٹنیاں وہ جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور بیس۲۰ اونٹنیاں وہ ہیں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور بیس۲۰ اونٹنیاں وہ ہیں جو دوسرے برس میں لگی ہوں۔

ھٰذا عند امام احمد وامام اعظم رحمہما اللہ

وان قتیل الخطاء شبہ العمد قتیل السوط والعصاء دیۃ مغلظۃ منھا اربعون فی بطونہا اولادھا یعنی مائۃ من الابل۔ (دارقطنی ج ۳ ص ۱۰۵، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۸۷۷)

(ترجمہ) "اور قتل خطاء عمد وہ ہے جو کوڑے اور لاٹھی سے مار دیا جائے اس کی اصل دیت مغلظہ سو۱۰۰ اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

اجمعت الصحابۃ علی المائۃ لکنہم اختلفوا فی سنہا۔

(البنایۃ فی شرح الہدایۃ ج۱۰ ص ۳۸۲)

(ترجمہ) "تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالٰے علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں لیکن ان کی عمروں میں ان کا اختلاف ہے۔"

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا دیۃ الخطاء شبہ العمد ماکان بالسوط والعصاء مائۃ من الابل منھا اربعون فی بطونہا اولادھا۔ (نسائی ، ابن ماجہ ، دارمی ، ابوداؤد، مشکوٰۃ باب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مارا جائے وہ خطاء شبہ عمد ہے اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمقدار الدیۃ وانہا مائۃ من الابل ضمنہا حدیث سہل بن ابی حثمۃ فی القتیل الموجود بخیبر وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وداہ بمائۃ من الابل۔ وروی سفیان بن عیینۃ عن علی بن زید بن جدعان عن القاسم بن ربیعۃ عن ابن عمر قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقال الا ان قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا فیہ الدیۃ مغلظۃ مائۃ من الابل اربعون خلفۃ فی بطونہا اولادہا وفی کتاب عمرو بن حزم الذی کتبہ لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی النفس مائۃ من الابل۔ وروی عمرو بن دینار عن طاؤس قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیۃ الخطاء مائۃ من الابل۔

{ احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۳۲ باب مبلغ الدیۃ من الابل
و باب شبہ العمد ج ۲ ص ۲۲۹ }

ترجمہ "ارشادِ نبویؐ ہے کہ دیت کی مقدار سو اونٹ ہیں حضرت سہلؓ کی حدیث اس پر گواہ ہے کہ خیبر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سو اونٹ دیت میں دیئے تھے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتل خطاء العمد وہ ہے جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مار دیا جائے اس کی دیت مغلظ سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن اونٹنیاں ہوں گی۔ اور عمرو بن حزم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی یہی تحریر فرمایا تھا کہ قتلِ خطاء کی دیت سو اونٹ ہے ـــ حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سو اونٹ ہی مقرر فرمائی ہے۔"

پھر یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام جصاصؒ فرماتے ہیں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ دیت بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم ہے اور نہ یہ فرمایا گیا کہ دیت ایک ہزار دینار ہے بلکہ ہر زمانہ میں سو اونٹوں کی قیمت کو دیکھا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۳۵)

بلاشبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں اصل دیت سو اونٹ ہی بتائی ہے پھر کسی صحابی نے اس سے انکار نہیں کیا اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

(البنایۃ ج ۴ ص ۲۸۴)

اور دیت آزاد مسلم کی سو اونٹ ہے جب اونٹ نہ مل سکیں تو ان کی قیمت واجب ہے جیسا کہ

حضرت عمرؓ نے سو اونٹوں کی قیمت کے برابر سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم دیت کے مقرر کئے تھے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ ذمّی اور معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہے۔ (معالم التنزیل ص۲۴۵)

صاحب البنایہ لکھتے ہیں:۔

"یعنی دیت سوائے اونٹوں کے اور کسی چیز کی ثابت نہیں"

حضرت ثوری اور حضرت حسن بن صالح رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دیت میں دراہم و دنانیر دیتے وقت اونٹوں کی قیمتوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے، دراہم و دنانیر کی قیمتیں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں اور ہم نے کتاب میں اسی کو بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ دیت اونٹوں ہی میں موقوف رہی ہے وہ کسی اور چیز سے ثابت نہیں، کیونکہ توقت اسی میں ہے کہ (دیت سو اونٹوں ہی کی) شرع شریعت میں وارد ہے اور اسی پر اجماع ہے، اصل دیت کی اونٹوں کے سوا کوئی اور مقدار ہمارے علم میں نہیں، اگر کوئی قاضی اس کا حکم دے تو اس کے اس حکم کا نفاذ ہی نہ ہوگا کیونکہ دیت میں سو اونٹوں کے سوا کسی اور چیز کا حکم نافذ ہی نہیں ہو سکتا، اصل دیت میں سو اونٹوں کی مقدار پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اُن کا اختلاف صرف اُن کی عمروں کے بارے میں ہے۔ (البنایۃ ج۴ ص۲۸۳)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہ جعل الدیۃ من الورق قیمۃ الابل لا انہ اصل فی الدیۃ۔ (احکام القرآن للجصاص ج۲ ص۲۳۷)

چاندی سے دیت اونٹوں کی قیمت کے حساب سے دی گئی ہے کیونکہ چاندی اصل دیت نہیں ہے۔

⁂

اُونٹ کی طرح سونا چاندی بھی اصل دیت ہے

جواب الجواب از مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ

ماہنامہ "الحق" مارچ ۱۹۹۱ء موافق شعبان ۱۴۱۱ھ کے حوالے سے حضرت مولانا سید تصدق بخاری صاحب زید مجدہم نے "اصل دیت کیا ہے، سو اونٹ یا ہزار درہم؟" کے عنوان سے دیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، یہ احقر کے اُس مقالہ کا مواخذہ تھا جو دسمبر ۱۹۹۰ء کے "الحق" میں "اسلام کا نظام قصاص و دیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اختلافی نقطہ نظر

موصوف کو احقر کے مقالہ میں جس بات سے قلق ہوا ہے وہ دیت کی تقرری میں دس ہزار درہم کے تعین کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دیت کے تعین کا دارومدار اونٹوں پر ہے یعنی اصل دیت سو اُونٹ ہیں، دراہم و دنانیر یا دوسری چیزوں کا ذاتی طور پر کوئی اعتبار نہیں؛ جہاں کہیں دیت کے فیصلے ہوئے ہیں اُن میں اونٹ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے (حالانکہ ایسا نہیں) موصوف فرماتے ہیں:۔

> "احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا چاندی، گائے، بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اس لیے ہوتی رہی اور آئندہ بھی قیامت تک بوقت ضرورت ہوتی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں اصل دیت سو اُونٹ ہی ہیں اس لیے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔" (الحق ص ۱۲)

موصوف کے دلائل کا تجزیہ

موصوف نے گیارہ صفحات پر مشتمل مضمون میں جن روایات کا سہارا لیا ہے وہ کل پانچ ہیں:۔

(۱) پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، موصوف نے یہ روایت تین دفعہ ذکر کی ہے، پہلی دفعہ سیرت ابن ہشام کے حوالے سے الحق ص ۱۳ پر، دوسری دفعہ معالم التنزیل کے حوالے سے الحق ص ۱۵ پر اور تیسری دفعہ احکام القرآن کے حوالے سے الحق ص ۲۱ پر ہے۔ اس روایت میں کسی دراہم و

دنانیر سے انکار نہیں، صرف یہ آیا ہے کہ قتلِ خطا کا خون بہا سو اونٹ ہے جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں گی۔

(۲) دوسری اہم روایت جس کے بارے میں موصوف اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس سے اُن کا مؤقف صراحتہً ثابت ہے، یہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کی روایت ہے۔ موصوف نے یہ روایت پہلی دفعہ بحوالہ ابو داؤد (الحق ص۱۳ پر) دوسری بار بحوالہ ابن ماجہ (الحق ص۱۶ پر) تیسری بار بحوالہ ترمذی (الحق ص۱۸ پر) ذکر کی ہے۔ اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ قتلِ خطا کی دیت سو اونٹنیاں ہیں جن میں تیس دوسرے سال والی، تیس تیسرے سال والی، تیس چوتھے سال والی اور دس اونٹ دوسرے سال والے ہیں۔ البتہ مؤخرالذکر روایت میں تیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، تیس اونٹنیاں پانچویں سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) کی ادائیگی وارد ہے، مزید برآں دراہم و دنانیر اور دوسری چیزوں کا اندازے سے ادائیگی کا حکم بھی وارد ہے ـــــ ایسا ہی موصوف نے یہ روایت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ کی دوسری سند سے مشکوٰۃ کے حوالے سے الحق ص۲۱ پر نقل کی ہے جس سے سو اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جو موصوف نے ترمذی کے حوالے سے الحق ص۱۴ پر نقل کی ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف دراھم۔

(الجامع الترمذی ج۱ ص۲۵۸ باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

اس روایت کی رُو سے دیت میں اونٹ کی تقرری کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ اس سے موصوف کے عندیہ کی تردید ہو رہی ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک اصل دیت سو اونٹ ہیں جبکہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے اعتبار سے قطع نظر بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

یہ الگ بات ہے کہ احناف نے بارہ ہزار کی جگہ دس ہزار دراہم کو اعتبار کیوں دیا؟ اس کی تحقیق کے لیے احناف کے فقہی ذخائر کی طرف مراجع کرنا ہوگا تاہم درہم کی قیمت میں تفاوت کی وجہ سے بعض روایات سے دس ہزار اور بعض سے بارہ ہزار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہنا روایات سے ناواقفیت کی دلیل ہے کہ یہ تفاوت اونٹ کی قیمت کے اعتبار پر مبنی ہے۔ دراہم کا اعتبار صرف اس روایت سے نہیں بلکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ (کما سیأتی ان شاء اللہ) لیکن موصوف کے موقف

کی تردید کے لیے یہ ایک روایت ہی کافی ہے، معلوم نہیں کہ آپ کو یہ روایت نقل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟

(۴) چوتھی روایت حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی ہے جو موصوف نے تفسیر مظہری کے حوالہ سے الحق ص[16] پر نقل کی ہے۔ اس روایت کی رو سے دیت میں اونٹ کے علاوہ گائیں والوں پر دو سو گائیں، بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے کپڑوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵) پانچویں روایت حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کی ہے جو موصوف نے ابن ماجہ کے حوالے سے الحق ص[19] پر اور ابو داؤد کے حوالے سے الحق ص[20] پر نقل کی ہے، اس روایت سے بھی اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان روایات کے علاوہ حضرت طاؤسؒ کی مرسل روایت احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ص[21] پر ہے جس سے اونٹ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ، طبیؒ، امام اعظمؒ، ثوریؒ اور حسن بن صالحؒ کی طرف آپ نے منسوب اقوال پیش کیے ہیں۔

اونٹ کی اصالت کے باوجود تمام روایات پر عمل ممکن نہیں

مولانا موصوف کا عندیہ درج ذیل ہے :-

> ”درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹ کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ بحساب سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی“ (الحق ص[22])

موصوف کے ارشاد کے مطابق اگر ہم سو اونٹ دیت کے لیے اصل مان لیں تو پھر بھی تمام روایات پر عمل ممکن نہیں کیونکہ اونٹ کے بارے میں بھی حدیث کے دیگر ذخائر کی طرف مراجعت سے قطع نظر صرف موصوف نے جو روایات نقل کی ہیں ان میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ کسی ایک نوع کے اختیار کرنے سے دوسری روایات چھوٹ جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی روایت کی رو سے جب سو اونٹ دیئے جائیں گے تو ان میں چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں گی، لیکن اس کے مقابلہ میں عمرو بن شعیب بن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت موصوف نے نقل کی ہے اس میں ابو داؤد کی روایت میں سو اونٹ کی جگہ قیمت کی ادائیگی وارد ہے، لیکن ابن ماجہ کی روایت میں سو اونٹ کی ادائیگی میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ان میں تیس ایسی اونٹنیاں ہوں جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہوں،

تیس ایسی اونٹنیاں جو تیسرے سال میں جا رہی ہوں اور تیس ایسی اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگی ہوں اور دس ایسے اونٹ جو تیسرے برس میں داخل ہو چکے ہوں۔ گویا اس روایت میں سو اونٹ میں چار قسم کا اعتبار ہے، لیکن ترمذی کی روایت میں سو اونٹ میں تثلیث کا اعتبار ہے کہ تیس اونٹنیاں چار سال والی، تیس اونٹنیاں پانچ سال والی، اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بحوالہ ابو داؤد سو اونٹ کی تقسیم میں تخمیس کا اعتبار دیا گیا ہے۔ بیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، بیس اونٹنیاں پانچویں سال والی، بیس اونٹنیاں دو سال والی، بیس اونٹنیاں تین سال والی اور بیس اونٹ تین سال والے ہوں۔

صرف ان الفاظ کو دیکھ کر کسی ایک نوع کے تعین سے دوسری روایات پر عمل ممکن نہیں، لہٰذا محض اونٹ کی اصالت پر قول کر کے روایات کو قابلِ عمل بنانے کی راہ کامیاب نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں قتل کی قسموں کا اعتبار کر کے دیتِ مغلظہ اور دیتِ مخففہ کی صورت نکالنی ہو گی۔

دراہم ودنانیر کو دیت کی قیمت کہنا درست نہیں

دیت کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں معاوضہ کی ماہیت چھپی ہوئی ہے کیونکہ لغوی اعتبار سے دیت مالی معاوضہ کو کہا جاتا ہے۔ اور از روئے شرع دیت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کی جان کو ختم کرنے یا کسی شخص کے جسمانی اعضاء کو ناقص کرنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے۔ (مظاہر الحق جدید از علامہ قطب الدین، جلد ۳ ص ۵۲۳ کتاب الدیات)

گویا دیت حقیقت میں انسان کی قیمت ہے، کیونکہ انسان کی حقیقت میں حیوانیت میں بھی ایک جزء ہے اور حیوان جب ہلاک ہو جائے تو یہ مضمون بالقیمت ہوتا ہے اور قیمت کے تعین کے لیے ایسی چیز کی تقرری ضروری ہوتی ہے جس میں خود تعین ہو تفاوت نہ ہو، مزید برآں ممکن الوصول ہو۔ کسی حیوان کے عوض میں ایسی چیز کو واجب قرار دینا جو متفاوت ہو باہمی نزاع اور فتنہ وفساد کے لیے مواقع فراہم کرنے کے مترادف ہے جبکہ ممکن الوصول نہ ہونے کی صورت میں تعجیز کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں۔ اس وجہ سے عقلاً تو اونٹ کا اعتبار ذاتی طور پر دیت میں بالکل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کے باطنی معانی کی وجہ سے ان میں یکسانیت ممکن نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ اونٹ مل سکیں، مثلاً ہمارے ملک میں اگر موصوف کے مشورے سے اونٹ کو ہی اعتبار دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کے نفاذ کو مشکل سے مشکل تر بناتا ہے کیونکہ ملک میں ہر جگہ اونٹوں کا ملنا مشکل ہے اور اگر مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ ہی دیئے جائیں تو یہ ان کو الٹا مشقت میں ڈالنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ مقتول کے ورثاء

اونٹ اپنے پاس رکھ سکیں اور اگر فروخت کریں تو ملکی رواج نہ ہونے کی وجہ سے ایسی حالت میں اس کو کم سے کم قیمت دی جائے گی۔ لیکن چونکہ حدیث میں سو اونٹ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا عقلی وجوہات سے قطع نظر تثلیث، تربیع یا تخمیس کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا دینا جائز ہے، پھر بھی اونٹوں کی ادائیگی ایسے ملک میں ہونی چاہیئے جہاں ان کا رواج ہو تاکہ ان کو یعنی ورثاء کو آسانی رہے۔ اس کے علاوہ دراہم و دنانیر اپنی جگہ بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت کے دیت کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیونکہ دراہم و دنانیر خلقی طور پر ثمنیت سے متصف ہیں، اس کی مقدار معلوم ہے اور ہر جگہ آسانی سے میسر ہیں بلکہ دنیا کے ہر کونے میں ان کا اعتبار پایا جاتا ہے کیونکہ دنانیر سونے اور دراہم چاندی کے ہوتے ہیں اور سونا چاندی بین الاقوامی لین دین کا ذریعہ ہے اس لیے دیت میں اس کی تقرری سے کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنے میں ایک دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ اگر ہم اصل دیت اونٹ کو مان کر دراہم و دنانیر اس کا بدل تسلیم کرلیں تو ایسی حالت میں اونٹ یکمشت نہیں لیے جاتے یہ قاتل کے ذمے محض واجب الادا ہوتے ہیں، اگر دراہم و دنانیر اس کا بدل ہوا اور اس کے عوض میں دیئے جائیں تو دراہم و دنانیر کے بارے میں قاضی تین سال کی مدت ادائیگی کے لیے مقرر کرسکتا ہے، لہٰذا پھر ایسی حالت میں بھی یہ قاتل کے ذمہ محض واجب الادا رہیں گے تو یہ ”دیناً بدینٍ“ ”نسیئۃ بنسیئۃ“ کی صورت لازم آئے گی جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ (المبسوط للسرخسیؒ ج۲۶ ص۶۵ کتاب الدیات)

دیت کے تعین میں ائمہ مجتہدین کے مذاہب

یہاں تک تو موصوف کے مضمون کا اجمالی جائزہ تھا اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دراہم و دنانیر کا تعین راقم الحروف کی کوئی خود ساختہ رائے نہیں بلکہ یہ محققین و مجتہدین کی تحقیقات کی روشنی میں مستقل مکاتب فکر کی مستند رائے ہے، بدقسمتی سے مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں سو اونٹ کی اصالت ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کی طرف منسوب کرنے کی زحمت نہیں کی، موصوف نے انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ شاید اپنی صوابدید پر وہ احادیث سے بالذات مسائل مستنبط کر رہے ہیں، آپ نے ”الحق ص۱۵“ پہ ”الغایۃ“ کے حوالے سے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ایسے پیرایہ میں نقل کیا ہے جیسا کہ ان حضرات کے اقوال آپ کی رائے کے لیے محض تائیدی حیثیت رکھتے ہوں، جبکہ بعض جگہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے غلط فائدہ لیا ہے اور ایسی توجیہ کی ہے جو ما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے مترادف ہے۔

کاش اگر موصوف ابتداء ہی سے اپنا مذہبی رشتہ ظاہر کر دیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ آپ کس کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں؟ اس لیے دیت کے بارے میں جملہ مذاہب نقل کرنے کے بعد شاید موصوف کے بارے میں یہ واضح ہو سکے کہ وہ کس مسلک سے وابستہ ہیں تاہم طوالت سے بچنے کی خاطر عربی عبارات کے بجائے باحوالہ اردو تراجم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے

امام شافعیؒ سے دیت کے بارے میں دو اقوال مروی ہیں، پہلے قول (جس کی نسبت آپؒ کی طرف عراق کے حوالے سے کی جاتی ہے) کی رُو سے چاندی والوں سے بارہ ہزار دراہم اور سونے والوں سے ایک ہزار دینار لیے جائیں گے جیسا کہ اونٹ والوں سے سو اونٹ لیے جاتے ہیں البتہ مصر میں آپؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ دراہم و دنانیر کے تعین کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اصل دیت سو اونٹ ہے، جہاں کہیں دوسری چیزیں مثلاً سونا چاندی لیے جائیں گے تو اس میں اونٹوں کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

قال الشافعی بمصر لا یؤخذ من اهل الذهب ولا من اهل الورق الا قیمة الابل بالغة ما بلغت۔ (بدایة المجتهد ج ۲ ص ۳۰۴ کتاب الدیات فی النفوس اختلفوا فی الدراہم والدنانیر)

(ترجمہ) "امام شافعیؒ کا قول مصر میں یہ ہے کہ سونا اور چاندی والوں سے سو اونٹ کی قیمت کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جائے گی خواہ قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔"

لیکن شوافعؒ کے ہاں مفتیٰ بہ قول مصر کا ہے گویا ابھی شوافع کے ہاں دیت کی اصل سو اونٹ ہے، سونا اور چاندی یعنی دراہم و دنانیر اگر دیئے جائیں تو اس میں سو اونٹ کی قیمت کا اعتبار ہوگا بذات ان کا دیت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے سوا دوسری چیزیں دیت نہیں۔"

(الام - دار المعرفة بیروت ج ۶ ص ۱۰۵)

امام مالکؒ کی رائے

امام مالکؒ کے نزدیک سو اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی دیت میں بطورِ اصالت اعتبار ہے۔ علامہ ابنِ رشد فرماتے ہیں:۔

وعمدة مالك تقويم عمر بن الخطاب المائة من الابل على اهل الذهب بالف دينار وعلى اهل الورق اثنى عشر الف درهم۔ (بدایة المجتهد ج ۲ ص ۳۰۴ کتاب الدیات فی النفوس)

(ترجمہ) "امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سونے والوں پر (دیت) ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم ہیں۔"

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ سے بھی دو روایات مروی ہیں، ایک روایت میں آپ بھی امام شافعیؒ کی طرح صرف اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں اونٹ کے علاوہ سونے اور چاندی کے بھی قائل ہیں۔ محدثِ اعظم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "جان لیں کہ دیت کی اصالت میں علماء کا اختلاف ہے پس امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت کی رُو سے اور ابن المنذرؒ کے نزدیک صرف (سو) اونٹ ہیں لہٰذا اُن کی قیمت واجب ہوگی جتنی بھی ہو، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اونٹ کے علاوہ سونا اور چاندی بھی ہے یہ امام احمد بن حنبلؒ کا قول اور امام شافعیؒ کی قدیم رائے ہے۔" (مرقاۃ المصابیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۷ صفحہ ۹۳ ابواب الدیات)

ابن حزم ظاہریؒ کی رائے

دیت کے بارے میں سب سے سخت ترین لہجہ ابو محمد علی بن حزم ظاہریؒ کا ہے، جن سے دراہم و دنانیر کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں جبکہ دوسرے ائمہ سے کسی نہ کسی درجہ میں دراہم اور دنانیر کے بارے میں کچھ نہ کچھ مروی ہے لیکن آپؒ دوٹوک فیصلہ کر کے فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "(قتلِ) عمد اور خطا کی دیت سو اونٹ ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر ان کی قیمت واجب ہوگی۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص ۱۴۱)

مزید لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) "ہماری طرح جن سے اونٹ کے علاوہ دوسرا کوئی قول نقل نہیں یہ ایک عظیم جماعت ہے جن میں زید بن ثابتؓ، علی بن ابی طالبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ہیں، ان تمام کی رائے یہ ہے کہ دیت میں سو اونٹ ہیں۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص ۱۴۳)

ان متعدد اقوال پر نظر ڈالتے ہوئے قارئین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ موصوف مسلک کے اعتبار سے کن کے قریب ہیں اگرچہ آپ نے کسی جگہ اپنے مذہبی رشتہ کے اظہار کی جرأت نہیں کی بلکہ مجتہدانہ اندازِ بیان اختیار کر کے احادیث سے بالذات احکام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیت کے بارے میں احناف کثرہم اللہ کا مؤقف

احناف بھی دیگر فقہی مکاتبِ فکر کی طرح دیت میں الابل کی اصالت کے قائل ہیں لیکن احناف نے اپنا زاویۂ فکر صرف چند روایات تک محدود نہیں رکھا بلکہ

پوری روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اونٹ کے علاوہ سونے (دینار) اور چاندی (دراہم) کے تعین پر بھی قول کیا۔ گویا احناف کے نزدیک سو اونٹ کی طرح ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم بھی دیت کے لیے اصل ہیں۔ اگر کسی علاقہ میں اونٹ ہوں تو وہاں پر دیت میں اونٹ وصول کیے جائیں گے اور اگر کہیں اونٹ نہ ہوں تو پھر علاقہ کی حالت اور عرف کو دیکھ کر سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار دراہم وصول کئے جائیں گے۔

پاکستان میں اونٹوں کا رواج بعض خاص علاقوں تک محدود ہے اس لیے مَیں نے اپنے مقالہ میں اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کا حساب لگایا تھا، زکوٰۃ اور دوسرے نصابوں میں چاندی کا اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور عام عرف میں بھی دراہم کا حساب آسان تھا اس لیے احقر نے دس ہزار دراہم کا حساب تولہ اور ماشہ میں بحساب ۳½ ماشہ چاندی فی درہم کے حساب سے دو ہزار نو سو تولہ آٹھ ماشہ چاندی کی قیمت کا مشورہ تھا کیونکہ اس کی قیمت کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا، لیکن مَیں نے اس سے انکار کب کیا ہے کہ دیت میں اونٹ نہ دیئے جائیں؟ اور نہ احقر اس کی جرأت کر سکتا ہے، ہماری کتابوں میں ان تینوں چیزوں کے بارے میں صراحتہً لکھا ہے، چنانچہ علی بن ابی بکر المرغیتانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "قتلِ خطا میں دیت سو اونٹ ہے ...... سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے حساب سے دس ہزار دراہم ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان تین چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں سے دیت ثابت نہیں۔" (ھدایہ جلد ۴ ص۵۹۹ کتاب الدیات)

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں اور مقلد ہونے کی حیثیت سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقتدا اور پیشوا سیدنا امام ابوحنیفہؒ نے جو فرمایا ہے وہ کسی نہ کسی حدیث سے لازماً ثابت ہے، ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ نے کوئی بات اپنی طرف سے کہہ کر کسی حدیث کی مخالفت کی ہوگی اور نہ ہم بالذات کسی حدیث یا آیت سے مسائل کے استنباط کی قوت اور طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیتے وقت کسی حدیث یا آیت کے حوالہ کی جگہ کسی مستند فقہی کتاب کے حوالہ پر اکتفاء کرتے ہیں، ہمارے فقہاء کرام نے دراہم و دنانیر کی اصالت کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کر کے فرمایا ہے:۔

قال العلامۃ السرخسیؒ، واختلفوا فی ان الدراہم والدنانیر فی الدیۃ اصل ام باعتبار قیمۃ الابل فالمذہب عندنا انہما اصل۔ (المبسوط ج۲۶ کتاب الدیات، اختلفوا فی الدراہم والدنانیر)

(ترجمہ) علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دراہم و دنانیر دیت میں بطور اصالت معتبر ہیں یا قیمت

کے اعتبار سے، تو ہمارے نزدیک (اونٹ کی طرح) یہ دونوں (دراہم و دنانیر بھی) دیت میں اصل ہیں۔"

بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ سیدنا امام ابو یوسفؒ اور سیدنا امام محمدؒ کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی رو سے گائے، بکری اور کپڑوں سے بھی ثابت ہے، گویا صاحبینؒ کے نزدیک دیت کے چھ اصول ہیں، یعنی جس علاقہ میں لوگوں کو اس میں سہولت ہو اُن سے وہی وصول کیا جائے، چنانچہ بعض علماء کے نزدیک صاحبینؒ کی یہ رائے امام ابوحنیفہؒ سے دوسری روایت ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) "میرے نزدیک حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول صاحبین کا مذہب ہے۔" (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۳ کتاب الدیات)

جبکہ عام کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف اول الذکر تین انواع کی نسبت ہوتی ہے اور مؤخر الذکر تینوں کا ثبوت صرف صاحبینؒ کی رائے تک محدود ہے، پھر اونٹ کی دیت میں بسا اوقات سختی اور شدت بھی پائی جاتی ہے جبکہ دراہم اور دنانیر میں خاص مقدار مقرر ہونے کی وجہ سے سختی کا امکان نہیں، اس لیے جہاں کہیں قتل کی نوعیت سخت ہو تو دیتِ مغلظہ ادا کی جائے گی، پھر یہ شدت دراہم اور دنانیر میں نہیں پائی جاتی ہے اس لیے اونٹ ہی سے ادا کی جائے گی۔ چنانچہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "اونٹ کے علاوہ کسی دوسری نوع میں تغلیظ ثابت نہیں کیونکہ شرع صرف اسی میں وارد ہے۔" (الہدایہ جلد ۴ ص ۴۹۹ کتاب الدیات)

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جب دیتِ مغلظہ کی ادائیگی کی ضرورت پڑے تو اونٹ سے چار قسم ادا کیے جائیں گے جن میں پچیس ۲۵ بنت مخاض (دوسرے سال والے) پچیس ۲۵ بنت لبون (تیسرے سال والے) پچیس ۲۵ حقہ (چوتھے سال والے) اور پچیس ۲۵ جذعہ (پانچویں سال والے) شامل ہیں، جبکہ دیتِ مخففہ دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار ہے، اور اگر اونٹوں سے ادا کرنا پڑے تو پھر پانچ قسموں سے ادا کی جائے گی جس میں قیمت کے اعتبار سے یقیناً آسانی رہے گی۔

دراہم اور دنانیر کی اصالت احادیث کی رو سے

مقالہ نگار کا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم اور دنانیر کا اعتبار

بطور اصالت دیت میں ثابت نہیں، یہ روایات کے ذخیرہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہر وہ روایت جس سے بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار کا ثبوت ملتا ہو تو وہ آپ کی رائے کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ دراہم میں بارہ ہزار یا دس ہزار کا تفاوت مروجہ سکّہ کی قیمت میں کمی وبیشی پر مبنی ہے۔ ذیل میں چند روایات اس کے بارے میں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) امام ترمذیؒ نے "جمع بین البابین" کی عادت اپناتے ہوئے پہلے جب "باب ماجاء فی الدیۃ کم ھی من الابل" کا تذکرہ کیا تو اس سے فارغ ہو کر دوسرا باب "مَا جَآءَ فِی الدّیۃ کم ھی من الدراھم" لایا، آپ نے اس میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت دو سندوں سے لائی ہے کہ:۔

(۱) عن ابن عباسؓ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ جعل الدیۃ اثنیٰ عشر

(جامع ترمذی ج ۱ ص۲۵۹ باب ماجاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) "حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

حضرت ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت امام ترمذیؒ کے علاوہ امام ابوداؤدؒ، سنن النسائی، اور دارمی نے بھی نقل کی ہے، یہی وہ روایت ہے جو حضرت مولانا نے الحق ص۱۴ پر نقل کی۔ بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ:۔

(۲) ان رجل من بنی عدی قتل فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم دیتہ اثنیٰ عشر الفا۔ (مرقاۃ ج ۷ ص۸۳ باب الدیات)

(ترجمہ) "بنی عدی کا ایک آدمی قتل ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

(۲) حضرت عمر بن خطابؓ سے امام ابوحنیفہؒ کی سند سے روایت نقل کرتے ہوئے امام محمدؒ فرماتے ہیں:۔

اخبرنا ابوحنیفۃؒ عن الھیثم عن عامر الشعبی عن عبیدۃ السلمانی عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال علیٰ اھل الورق من الدّیۃ عشرۃ الاف درھم وعلیٰ اھل الذھب الف دینار۔ (کتاب الآثار ص۱۹۶ کتاب الدیات)

یہ روایت عبیدہ السلمانی سے اس طریقہ پر بھی مروی ہے کہ:۔

بلغنا عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ جعل الدیۃ علیٰ اَھلِ الْاِبلِ مائۃ اِبِلٍ وعلیٰ اھل الورق عشرۃ الاف درھم۔ (المبسوط ج ۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(ترجمہ) ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب نظامِ زندگی کے لیے رجسٹر تیار ہوئے تو آپ نے اونٹ والوں پر سو اونٹ، سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر دس ہزار دراہم مقرر کیے۔“

ظاہر بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نظامِ زندگی کا دستور مرتب فرما رہے تھے تو اس میں بڑے بڑے صحابہؓ بھی شریک تھے اور آپ کے اس اقدام پر کسی صحابی کا اعتراض منقول نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ نے آپ کی اس رائے کی تصویب کی، گویا اس پر صحابہؓ کا اجماع ہوا کہ سو اونٹ کی طرح ہزار دینار اور دس ہزار درہم بھی دیت میں دیئے جا سکتے ہیں، ہمارے لیے یہی اجماعِ صحابہؓ بڑی سند ہے۔

(۳) حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع الدیۃ علی الناس فی اموالہم علی اھل الابل مائۃ بعیر واھل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اھل البقر مائتی بقرۃ وعلی اھل البروہ مائتی حلۃ۔ (کتاب الخراج ص۱۵۵ الحدود علی اھل الجنایات)

(ترجمہ) ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر ان کے اموال میں دیت مقرر فرمائی، پس اونٹ والوں پر سو اونٹ، بکری والوں پر دو ہزار بکریاں، گائے والوں پر دو سو گائیں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے۔“

اس روایت میں اگرچہ دراہم و دنانیر کا تذکرہ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کو بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت سے اعتبار دیا جبکہ ہمارے بعض ائمہ سے یہ دوسری چیزیں بھی مروی ہیں، اور بقولِ بعض امام ابوحنیفہؒ سے بھی دراہم و دنانیر کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں روایت آئی ہے۔

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقولہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی اعتبار ہے، آپ فرماتے ہیں:-

ان النبی علیہ السلام قال من سبح فی کلِ یوم ولیلۃ مثل دیۃ اثنی عشر الف تسبیحۃ فکانما حرر رقبۃ من ولد اسمٰعیل۔ (المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دن رات میں اپنی دیت کی طرح بارہ ہزار دفعہ تسبیحات پڑھیں گویا اس نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک غلام آزاد کیا۔“

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

”حضرت ابوہریرہؓ رات و دن میں بارہ ہزار تسبیح پڑھتے اور فرماتے کہ میں اپنی دیت کے

اندازہ سے تسبیحات پڑھتا ہوں“ (دفاع ابوہریرہؓ ص۳۸)

جبکہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے دس ہزار دراہم کے بارے میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۸ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۵) عمرو بن حزمؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل الدیۃ من الدراھم اثنی عشر الفا۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۶) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دیۃ کل ذی عمد فی عمدہ الف دینار۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۷) حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے ایک ہزار دینار دیت مقرر فرمائی۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۸) ایسے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی دس ہزار دراہم دیت کی روایت منقول ہے۔
(اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

ان تمام روایات کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اونٹ کی طرح دراہم اور دنانیر بھی دیت میں بطور اصالت ثابت ہیں، لہٰذا دس ہزار دراہم کے حساب سے چاندی کی مروجہ قیمت بطور دیت ادا کرنا روایات سے ذہول نہیں بلکہ روایات کے مطابق عمل کرنے کی ایک آسان صورت ہے۔

كتاب الجهاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

[التوبة: ٤١]

ترجمہ: اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو

باب شرائط الجہاد وآدابہ

(جہاد کے شرائط وآداب کا بیان)

جہاد کے شرائط

سوال :۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ وقت میں تبلیغی جماعت والے حد سے بڑھ گئے ہیں لہٰذا ان پر بجائے تبلیغ کے جہاد فرض ہوتا ہے تو کیا ان لوگوں کا یہ کہنا درست ہے ؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے جہاد کی فرضیت کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ اہلِ اقتدار کے علاوہ عوام الناس میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے تبلیغی حضرات پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا ہے ، اور وہ شرائط یہ ہیں :۔

لما فی الہندیۃ : واما شرائط فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعھد بیننا وبینھم والثانی ان یرجوا لشوکۃ واھل للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التہلکۃ ۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ شرعاً وشرطہ وحکمہ) لہ

جہاد کی قسمیں

سوال :۔ کیا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ ؟

الجواب :۔ جہاد کی دو قسمیں ہیں (۱) فرض عین (۲) فرض کفایہ ۔ اگر نفیرِ عام کی صورت میں پیش آئے یعنی دشمن اتنا زیادہ طاقتور ہو کہ قریب والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس صورت میں جہاد فرضِ عین ہے ، اور اگر بعض لوگ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں تو دوسروں پر جہاد فرض کفایہ ہے یعنی بعض افراد کا جہاد کرنا دوسروں سے اس

لہ وقال العلامۃ التمرتاشیؒ : ولا بد لفرضیتہ من قید اخر وھو الاستطاعۃ ۔ وقال العلامۃ الحصکفیؒ تحتہ وفی السراج وشرط لوجوبہ القدرۃ علی السلاح لا امن الطریق فان علم انہ اذا حارب قتل وان لم یحارب اسر لم یلزمہ القتال ۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجہاد ، مطلب طاعۃ الوالدین)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۷۲ کتاب السیر ۔

ذمہ داری ساقط کر دیتا ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: کل ما فرض لغیرہ فہو فرض کفایۃ اذا حصل المقصود بالبعض والا ففرض عین۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۱۸ کتاب الجہاد) [1]

جہاد کے دوران امیر کی اہمیت

سوال: جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب ونظم ونسق برابر کرنے کے لیے امیر بنانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب اور نظم ونسق درست کرنے کیلئے ایک ماہر جنگ کے اصول اور طریقۂ کار سے باخبر، نیک اور متبع سنت امیر کی تقرری سنتِ نبویؐ ہے، اس لیے جنگ سے پہلے امیر مقرر کرنا اچھا اقدام ہے تاکہ مجاہدین کے نظم ونسق کو برقرار رکھا جا سکے۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومنہا ان یؤمر علیہم امیرًا لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما بعث جیشًا الا وأمر علیہم امیرًا ولان الحاجۃ الی الامیر ماسۃ لانہ لابد من تنفیذ الاحکام وسیاسۃ الرعیۃ ولا یقوی ذلک الا بالامیر لتعذر الرجوع فی کل حادثۃ الی الامام۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۹۹ فصل فی بیان ما یندب الیہ الامام... الخ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: واما بیان کیفیۃ فرضیۃ الجہاد فالامر فیہ لا یخلو من احد وجہین اما ان کان النفیر عامًا وأما ان لم یکن النفیر عامًا فہو فرض کفایۃ ومعناہ ان یفترض علی جمیع من ہو اہل للجہاد لکن اذا قام بہ البعض سقط عن الباقین فاما اذا عم النفیر بان ہجم العدو علی بلد فہو فرض عین یفترض علی کل واحد من آحاد المسلمین ممن ہو قادر علیہ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر)

ومثلہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۹ کتاب السیر۔

[2] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: قال فی الملتقی وینبغی الامام ان یعرض الجیش عند دخول دار الحرب لیعلم الفارس من الراجل قال فی شرحہ وان یکتب اسماءہم وان یؤمر علیہم من کان بصیرًا بامور الحرب وتدبیرہا ولو من الموالی وعلیہم طاعتہ لان مخالفۃ الامیر حرام الا اذا اتفق الاکثر انہ ضرر فیتبع۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۳۴ کتاب الجہاد۔ فصل فی کیفیۃ القسمۃ)

ومثلہٗ فی الہندیۃ ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ

جہاد کی ذمہ داری کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک شخص کی منگنی ہو چکی ہے لیکن تاحال شادی نہیں ہوئی جبکہ اُسے جہاد پر جانے کا شوق ہے اور والدین کی طرف سے اجازت بھی مل چکی ہے۔ تو کیا اس شخص کا جہاد کے لیے جانا موجبِ مواخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ جہاد کی فرضیت کے لیے استطاعت یعنی آلاتِ حرب اور قدرت علی الجہاد شرط ہے اس لیے یہ جہاد عوام پر فرضِ عین نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا مذکورہ شخص کا جہاد کے لیے جانا یا نہ جانا موجبِ مواخذہ نہیں ہے البتہ جانے سے اجر ضرور ملتا ہے جبکہ نیت صحیح ہو۔

لما قال الشیخ التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا بد لفرضیتہ من قید آخر ھو الاستطاعۃ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ تحتہ وفی السراج وشرط لوجوبہ القدرۃ علی السلاح لا امن الطریق فان علم انہ اذا حارب قتل وان لم یحارب أسر لم یلزمہ القتال۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجہاد)[1]

نفیرِ عام کی تعریف

سوال:۔ نفیرِ عام کا معنیٰ اور تعریف کیا ہے؟ اور کون سی حالت میں نفیرِ عام کا حکم لگایا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے نفیرِ عام کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ جب کفار بلادِ اسلام میں داخل ہو جائیں تو اس وقت ہر ذی قدرت جو اُن بلاد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: (تحت قولہ وان ھجم العدو) ای دخل بلدۃ بغتۃ وھٰذہ الحالۃ تسمّٰی النفیر العام قال فی الاختیار والنفیر العام

---

[1] وفی الھندیۃ: واما شرائطہ فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعھد بیننا وبینھم والثانی ان یرجو الشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)
ومِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر۔

ان يحتاج الى جميع المسلمين ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۱ کتاب الجهاد ۔ مطلب طاعة الوالدين فرض كفاية)[1]

افغانستان کا جہاد کن لوگوں پر فرض ہے

سوال :- کیا افغانستان کا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ اگر فرضِ عین ہے تو کن لوگوں پر فرض ہوتا ہے؟ اور کیا پاکستان کے لوگوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- افغانستان کا جہاد نفیرِ عام ہونے کی وجہ سے فرضِ عین ہے تاہم کمزور اور قدرت نہ رکھنے والے افراد پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری اہلِ اقتدار اور سربراہوں کی ہے، اس لیے اگرچہ عوام الناس اور رعیت پر یہ جہاد فرض نہیں ہوتا لیکن ان کے لیے مجاہدین کی اعانت اور ہمدردی کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله : واما بيان من يفترض عليه فنقول انه لا يفترض الا على القادر عليه فمن لا قدرة له لا جهاد عليه لان الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطاقة بالقتال او المبالغة في عمل القتال ومن لا وسع له كيف يبذل الوسع ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ كتاب السير)[2]

جہادِ کشمیر کی فرضیت کا حکم

سوال :- مسلمانانِ مقبوضہ کشمیر جو کہ عرصۂ دراز سے ایک جابر اور ظالم حکومت کے زیرِ تسلط ہیں، وہاں ان

---

[1] وفي الهندية : ومعنى النفير العام ان يخبر اهل مدينة ان العدو قد جاء يريد انفسكم وذراريكم واموالكم فاذا اخبروا على هذا الوجه افترض على كل من قدر على الجهاد من اهل تلك البلدة ان يخرج للجهاد ۔

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره)

وَمِثْلُهُ في بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ كتاب السير)

[2] وفي الهندية، واما شرائط اباحته فشيئان احدهما امتناع العدو عن قبول ما دعي اليه من الدين الحق وعدم الامان والعهد بيننا وبينهم والثاني ان يرجو الشوكة والقوة لاهل الاسلام باجتهاده لما فيه من القاء نفسه في التهلكة ۔

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره)

وَمِثْلُهُ في رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ كتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدين ۔

ظالموں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر رکھا ہے، ان کے گھر اور جائیداد وغیرہ کو تباہ کیا جا رہا ہے، پردہ نشین مسلم عورتوں کی آبرو ریزی ہو رہی ہے، تو کیا ایسی حالت میں اس ظالم اور جابر حکومت کے خلاف جہاد فرضِ عین ہے یا نہیں؟ اور ان مظلوم مسلمانوں کی اعانت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ حالات کے پیشِ نظر اس جابر اور ظالم حکومت کے خلاف جہاد فرضِ عین ہے کیونکہ مسلمانانِ کشمیر پر بھارتی حکومت نے جبر و ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے اور ان کی عزت و عصمت کو پائمال کیا جا رہا ہے لیکن عوام اور رعیت کا ان کافروں سے مقابلہ دشوار ہے اس لیے تمام تر ذمہ داری اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے اگر ان کے قریب کی مملکتِ اسلامیہ کفار کا مقابلہ نہ کر سکے تو الاقرب فالاقرب پر حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رح: ونقل صاحب النهایة عن الذخیرة ان الجهاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض کفایة علیهم حتی یسعهم ترکه اذا لم یحتج الیهم فان احتیج الیهم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم یعجزوا عنها لکنهم تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین کالصلوٰة والصوم لا یسعهم ترکه ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً علی هذا التدریج۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد مطلب فی الفرق بین فرض العین وفرض الکفایة)[1]

---

[1] وفی الهندیة: وانما یفرض فرض عین علی من کان یقرب من العدو وهم یقدرون علی الجهاد واما علی من وراءهم ممن یبعد من العدو فانه یفترض فرض کفایة لا فرض عین حتی یسعهم ترکه فاذا احتیج بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الارض شرقاً وغرباً علی هذا الترتیب۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

ومثلهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۹۱ کتاب السیر۔

برما کے مظلوم مسلمانوں پر جہاد کا حکم

سوال:۔ سرزمین برما میں مسلمان بہت عرصہ سے آباد ہیں جبکہ وہاں پر تا حال غیر مسلموں کی حکومت ہے اور گذشتہ کئی سالوں سے حکومت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کا سلسلہ جاری ہے تو کیا مسلمانانِ برما پر جہاد فرضِ عین ہے یا نہیں ؟ اور طاقت نہ رکھنے کی صورت میں ان کے لیے کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ جب مسلمانوں پر ظلم و تشدد میں اضافہ ہو جائے تو ان پر وہاں کے کافروں اور ظالموں کے خلاف جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے، صورتِ مسئولہ میں برما کے مسلمانوں کی کمزوری اور جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے پڑوسی اسلامی ممالک پر ان کی امداد کے لیے جہاد باقاعدہ فرض ہے، لہٰذا الاقرب فالاقرب شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النہایۃ عن الذخیرۃ ان الجہاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فاما من وراءھم یبعد من العدو فہو فرض کفایۃ علیہم حتی یسعہم ترکہ اذا لم یحتج الیہم فان احتیج الیہم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ مع العدو او لم یعجزوا عنہا لکنہم تکاسلوا ولم یجاہدوا فانہ یفترض علی من یلیہم فرض عین کالصلوٰۃ والصوم لا یسعہم ترکہ ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اہل الاسلام شرقاً وغرباً علی ہذا الترتیب۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجہاد مطلب فی الفرق بین فرض العین وفرض الکفایۃ)[1]

---

[1] وفی الہندیۃ: ثم بعد مجیء النفیر العام لا یفترض الجہاد علی جمیع اہل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عین وان بلغہم النفیر وانما یفترض فرض عین علی من کان یقرب من العدو ویقدرون علی الجہاد .... الی ان قال فانہ یفترض علی من یلیہم فرض عین ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اہل الارض شرقاً وغرباً علی ہذا الترتیب۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ۔

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۹۱ کتاب السیر۔

بوسنیا میں جہاد کا شرعی حکم

سوال:۔ بوسنیا ہرزیگوینا میں جو جنگ مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے اور ان کا قتلِ عام ہو رہا ہے، ان کی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی ہو رہی ہے، مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو پائمال کی جا رہی ہے لیکن وہاں کے مسلمان کمزور وناتواں ہونے کی وجہ سے کفار کے مقابلہ سے قاصر ہیں، تو کیا ان کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان کے فساد کو دفع کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کرنا تمام ممالکِ اسلامیہ پر فرض ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار جب مسلمانوں کے کسی ملک میں داخل ہو جائیں اور وہاں کے مسلمان کفار کا مقابلہ نہ کر سکیں تو ایسی صورت میں جہاد الاقرب فالاقرب پر باقاعدہ فرض ہو جاتا ہے حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، لہٰذا بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کی ہر ممکن طریقہ سے اعانت کرنا اور ان کفار کے فساد کو دفع کرنا تمام اسلامی ممالک کی ذمہ داری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهایة عن الذخیرة ان الجهاد اذا جاء النفیر انما یسیر فرض عین علیٰ من یقرب من العدو فاما من وراءهم یبعد من العدو فهو فرض کفایة علیهم حتیٰ یسعهم ترکه اذا لم یحتج الیهم فان احتیج الیهم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم یعجزوا عنها لکنهم تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه یفترض علیٰ من یلیهم فرض عین کالصلوٰة والصوم لا یسعهم ترکه ثم وثم الیٰ ان یفترض علیٰ جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً علیٰ هٰذا الترتیب۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد۔ مطلب فی الفرق بین فرض العین وفرض الکفایة)[1]

---

[1] وفی الهندیة: ثم بعد مجیٔ النفیر العام لا یفترض الجهاد علیٰ جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عین وان بلغهم النفیر وانما یفرض فرض عین علیٰ من کان یقرب من العدو وهم یقدرون علی الجهاد۔۔۔۔۔ الیٰ ان قال فانه یفترض علیٰ من یلیهم فرض عین ثم وثم الیٰ ان یفرض علیٰ جمیع اهل الارض شرقاً وغرباً علیٰ هٰذا الترتیب۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر۔ الباب الاوّل فی تفسیره)

ومثلهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۹۱ کتاب السیر۔

مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد کا حکم

سوال:۔ پاکستان جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے اور اس کے بیشتر قوانین غیر شرعی ہیں تو اس کے حکمرانوں کے ساتھ مسلح جہاد کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمان فاسق حکمران کے ساتھ جہاد بالسیف اور قتل و قتال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیث نبویہ اور فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد اور قتل و مقاتلہ بالاجماع جائز نہیں، البتہ بغیر قتال کے اس کے خلاف آواز اٹھانا اور منکرات سے روکنا خواہ جلسے جلوس سے ہو یا ہڑتال وغیرہ سے ہو ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن ام سلمةؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ستکون امراء فتعرفون وتنکرون فمن عرف برئ ومن انکر سلم ولکن من رضی وتابع قالوا افلا نقاتلہم قال لا ما صلوا۔ (مسلم شریف ج۲ ص۱۲۸ کتاب الامارة۔ باب وجوب الانکار الخ)[1]

جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت

سوال:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کمیونسٹوں کے خلاف ہو رہی ہے کیا یہ شرعی جہاد ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کہ کمیونسٹوں اور روسیوں کے خلاف جاری ہے بلا شک و شبہ شرعی جہاد ہے کیونکہ کمیونسٹوں اور روسیوں نے افغانستان پر جبراً قبضہ کر کے وہاں ظلم و زیادتی اور بربریت و درندگی کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کی جان و مال

---

[1] وقال العلامة ملا علی القاریؒ: والمراد بالکفر ھنا المعاصی والمعنی لا تنازعوا ولاة الامور فی ولایتھم ولا تعترضوا علیھم الا ان تروا منھم منکراً محققاً تعلمونہ من قواعد الاسلام فاذا رأیتم ذلک فانکروہ علیھم وقوموا بالحق حیثما کنتم واما الخروج علیھم وقتالھم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقة ظالمین واجمع اھل السنة علی ان السلطان لا ینعزل بالفسق لتھییج الفتن فی عزلہ واراقة الدماء وتفریق ذات البین فتکون المفسدة فی عزلہ اکثر منھا فی بقائہ۔

(مرقاة شرح مشکوٰة ج۷ ص۲۳۰ کتاب الامارة والقضاء۔ الفصل الاول)

ومثلہ فی شرح المسلم للنووی ج۲ ص۱۲۸ کتاب الامارة۔ باب وجوب الانکار علی الامراء۔

اور عزت و آبرو کو پامال کیا ہوا ہے اور دینِ اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اس لیے ان غاصبین کے خلاف جنگ کرنا اور ان کے فساد کو رفع کرنا عین جہاد ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ: اوردالجهاد عقيب الحدود لانه بعد ان ناسبها بوجهين باتحاد المقصود من كل منهما ومن مضمون هذا الكتاب وهو اخلاء العالم من الفساد ويكون كل منهما حسنًا لحسن لغيره وذلك الغير هو اعلاء كلمة الله تعالى يتأدى بفعل نفس المامور به فهو القتال۔ (فتح القدير ج ۵ ص۱۸۷ كتاب السير)[۱]

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دینے کا حکم

سوال: کفار کے ساتھ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کیا ان کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی علاقہ کے رہنے والوں کو اسلام کی دعوت بالکل نہیں پہنچی ہو تو ان کے ساتھ اعلانِ جہاد سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے، ہاں اگر انہیں پہلے سے اسلام کی دعوت پہنچی ہو تو پھر ان کو دوبارہ دعوت دینا مستحب ہے ضروری نہیں، لیکن دعوت نہ دینے کی صورت میں جہاد کرنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: فان كانت الدعوة لم تبلغهم فعليهم الافتتاح بالدعوة الى الاسلام باللسان لقوله تعالى: ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (الآية) ولا يجوز لهم القتال قبل الدعوة ..... الى ان قال فان كانت قد بلغتهم جاز لهم ان يفتتحوا القتال من غير تجديد الدعوة لما بينا ان الحجة لازمة والعذر في الحقيقة منقطع وشبهة العذر انقطعت بالتبليغ مرة لكن مع هذا الافضل ان لا يفتتحوا القتال الا بعد

---

[۱] وقال العلامة ابن نجيمؒ: مناسبة الحدود من حيث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد فكان كل منهما حسنًا لمعنى في غيره وقال لانه ما فرض لعينه اذ هو افساد في نفسه وانما فرض لاعزاز دين الله ودفع الشر عن العباد۔

(البحر الرائق ج ۵ ص۷۶ كتاب السير)

وَمِثْلُهُ في الهندية ج ۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره۔

تجدید الدعوة لرجاء الاجابة فی الجملة ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر [1]

کفار کے خلاف مدافعانہ اور اقدامی دونوں قسم کے جہاد مشروع ہیں

سوال :- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جہاد مشروع ہے اور اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے کیونکہ اقدامی جہاد اگر کفار کے خلاف شروع ہو جائے تو اسلام ایک خونخوار مذہب شمار ہوگا اور اس سے اسلام کی بدنامی ہوگی، کیا واقعی اسلام میں اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے ؟

الجواب :- اسلام درحقیقت ایک امن پسند دین ہے وہ خونریزی نہیں چاہتا تاہم بوقتِ ضرورت جب دین کو غیر مسلموں سے خطرہ ہو یا اعلاء کلمة اللہ مقصود ہو تو اسلام اقدامی اور دفاعی دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دیتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی ظلم وجبر کا قائل نہیں ہے ۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمه الله : مناسبته للحدود من حیث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد فکان کل منهما حسنٌ لمعنی فی غیره وقال لانه ما فرض لعینه اذ هو افساد فی نفسه وانما فرض لاعزاز دین الله تعالیٰ ودفع الشر عن العباد ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۷ کتاب السیر) [2]

---

[1] وقال العلامة التمرتاشی رحمه الله : ولا نقاتل من لا تبلغهم الدعوة الی الاسلام ۔ وقال الحصکفی رحمه الله : وهو وان استشهد فی زماننا شرقاً وغرباً لکن لا شك ان فی بلاد الله تعالیٰ من لا شعور له بذلك ونَدَع ندباً من بلغتهم الا اذا تضمن ذلك ضرراً ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجهاد ۔ مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له الخ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۵ کتاب السیر ۔

[2] وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله : (قوله لاتحاد المقصود) وهو اخلاء الارض عن الفساد (وقوله غیر خفی) لان الحدود اخلاء عن الفسق والجهاد اخلاء عن الکفر ۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۱۷ کتاب الجهاد)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۷ کتاب السیر ۔

مغلوب ہونے کا یقین ہو تو کمانڈر کا حکم ماننا مناسب نہیں

سوال:- مجاہدین کو لڑائی کے دوران اگر مغلوب ہونے کا یقین ہو اور کمانڈر (امیر) مجاہدین کو حملہ کرنے پر مجبور کرے تو کیا اس صورت میں کمانڈر کا حکم ماننا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مجاہدین کا اس بات پر یقین ہو کہ کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرنے میں مجاہدین کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے اور ان کے حملے سے کفار کو نقصان اور ضرر کا احتمال بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں کمانڈر (امیر) کے حکم کی تعمیل کرنا مناسب نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فاما اذا علم ان لا ینکی فیهم فانه لا یحل له ان یحمل علیهم لانه لا یحصل بحملته شیء من اعزاز الدین۔
(رد المحتار ج۴ ص۱۲۷ کتاب الجهاد۔ مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له ان یقاتل)[1]

والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جانا

سوال:- ایک شخص جہاد میں شرکت کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کی والدہ اس کو اجازت نہیں دیتی، تو کیا یہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاد فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا کیونکہ والدین کی اطاعت فرضِ عین ہے اور فرضِ عین کا مرتبہ فرضِ کفایہ پر مقدم ہے ہاں اجازت کی صورت میں جا سکتا ہے، تاہم اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: وکذا الولد لا یخرج الا باذن والدیه او احدهما اذا کان الآخر میتاً لان بر الوالدین فرض عین فکان مقدما علی

---

[1] وفی الهندیة: وان علموا انهم لا ینتفعون به بیقین بل یتفرقون لا یطیعونه فی ذلک۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)
ومثله فی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۶ کتاب السیر الفصل العاشر۔

بقیہ صلہ فرض الکفایۃ الا ان کل سفر لا یؤمن فیہ الهلاك ویشتد فیہ الخطر لا یحل للولد ان یخرج الیہ بغیر اذن والدیہ لانهما یشفقان علی ولدهما فیتضرران بذلک وکل سفر لا یشتد فیہ الخطر یحل لہ ان یخرج الیہ بغیر اذنهما۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر) [1]

والدین کے علاوہ دوسرے محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جانا

سوال: اگر ایک شخص کو اس کے والدین جہاد پر جانے کی اجازت دے دیں اور دوسرے محارم مثلاً بھائی وغیرہ اجازت نہیں دیتے ہوں تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص ان محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر والدین کے علاوہ دوسرے محارم کسی کو جہاد کیلئے جانے کی اجازت نہیں دیتے ہوں اور جہاد فرضِ عین نہ ہو اور ان محارم کے ضیاع کا خطرہ بھی نہ ہو تو بغیر ان کی اجازت کے بھی جانا مرخص ہے، البتہ اگر اُن کا نفقہ اِس پر واجب ہو اور جہاد کے لیے جانے میں ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واما غیر هؤلاء کالزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانه یخرج بلا اذنهم الا اذا کانت نفقتهم واجبة علیه وخاف علیهم الضیعة اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۳۰ کتاب الجهاد۔ مطلب طاعة الوالدین فرض عین) [2]

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: لا یفرض علی صبی وبالغ له ابوان او احدهما لان طاعتهما فرض عین۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۳۰ کتاب الجهاد مطلب طاعة الوالدین فرض عین)

وَمِثْلُهُ فی الهندیة ج ۲ ص ۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره۔

[2] وقال العلامة ابن نجیمؒ: وفی الذخیرة ان من سوی الاصول اذا کرهوا خروجه للجهاد فان کان یخاف علیهم الضیاع فانه لا یخرج بغیر اذنهم والا یخرج وکذا امرأته۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۵۲ کتاب السیر)

وَمِثْلُهُ فی الهندیة ج ۲ ص ۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره۔

اہل وعیال کیلئے نان ونفقہ کا متبادل انتظام نہ ہونے کی صورت میں جہاد کے لیے جانا

سوال:- ایک آدمی کا جہاد میں جانے کا ارادہ ہے لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویاں ہیں اور ان کے لیے اس شخص کے علاوہ اور کوئی کمانے والا (کفیل) نہیں، تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ یہ شخص اپنے اہل وعیال کا اکیلا ضامن ہے اور ان کا نان ونفقہ اس پر واجب ہے اس لیے اگر ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ شخص جہاد کے لیے نہیں جا سکتا، تاہم اگر ان کے ضائع ہونے یا انہیں ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کے لیے جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ، واما غیرھما کالزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنھم الا اذا کانت نفقتھم واجبۃ علیہ وخاف علیھم الضیعۃ اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج٣ ص٢٣٠ کتاب الجہاد مطلب طاعۃ الوالدین فرض کفایۃ)[1]

جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں سے مشورہ کرنا

سوال:- ایک شخص کو جہاد پر جانے کا شوق ہے، والدین بھی اجازت دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ بھائیوں سے بھی مشورہ کر لو، تو کیا اس صورت میں اس شخص کے لیے بھائیوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور بغیر بھائیوں کے مشورہ کے جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جہاد کے لیے جانے میں والدین کے علاوہ کسی دوسرے محارم سے اجازت لینا ضروری نہیں، البتہ اگر ان (دیگر رشتہ داروں) کا نان ونفقہ جہاد میں جانے والے پر ہو اور اس کا متبادل انتظام نہ ہو اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہو تو پھر بغیر ان کی

---

[1] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ، وفی الذخیرۃ ان من سوی الاصول اذا کرہ خروجہ للجہاد فان کان یخاف علیھم الضیاع فانہ لا یخرج بغیر اذنھم والا یخرج وکذا امرأتہ۔
(البحر الرائق ج٥ ص٧٢ کتاب السیر)
ومثلہ فی الہندیۃ ج٢ ص١٨٩ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ۔

اجازت کے جہاد میں جانا مرخص نہیں تاہم اجازت کی صورت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما غیرھما کزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبۃ علیہ وخاف علیہم الضیعۃ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۳ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) [1]

عالم دین کے لیے جہاد میں جانے کا حکم

سوال:- علماء کرام اور مدرسین حضرات جہاد کے دوران بھی اپنے مخصوص مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، کیا ان پر جہاد فرض نہیں ہوتا؟

الجواب:- چونکہ جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور درس و تدریس سے بھی ثبات دین اور قیام دین مقصود ہے اس لیے فقیہ و عالم کے لیے فرض عین نہ ہونے کی صورت میں جہاد کو جانا ضیاع دین کا خطرہ ہے لہٰذا علماء کے لیے جہاد میں جانا مناسب نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وعالم لیس فی البلدۃ افقہ منہ فلیس لہ الغزو لخوف ضیاعہم سراجیۃ۔ وعمم فی البزازیۃ السفر ولا یخفی ان المقید یقید غیرہ بالاولی وفرض عین ان ہجم العدو فیخرج الکل ولو بلا اذن۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) [2]

---

[1] وفی الہندیۃ: واما من سواہم من ذوی الرحم المحرم کبناتہ وبنیہ واخواتہ وعماتہ واخوالہ وخالاتہ وکل ذی رحم محرم منہم اذا کرہوا خروجہ للجہاد وکان یشق ذلک علیہم فان کان یخاف علیہم الضیعۃ بان کانت نفقتہم علیہ بان لم یکن لہم مال وکانوا صغاراً او صغائر وکن کبائر الا انہ لا ازواج لہن او کانوا کباراً زمنی لا حرفۃ لہم فانہ لا یخرج بغیر اذنہم وان کان لا یخاف علیہم الضیع …… الی ان قال کان لہ ان یخرج بلا اذنہم۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۷۲ کتاب السیر۔

[2] وفی الہندیۃ: عالم لیس فی البلدۃ احد افقہ منہ لیس لہ ان یغزو لما یدخل علیہم من الضیاعۃ کذا فی السراجیۃ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۹۰ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی السراجیۃ ص ۲۲ کتاب السیر باب الجہاد فرض کفایۃ۔

جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں عالم اسلام کی ذمّہ داریاں

سوال:۔ اگر کفار مسلمانوں کے ملک پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیں جیسا کہ روس نے جارحیت کرتے ہوئے افغانستان پر قبضہ کرلیا اور وہاں ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، تو کیا افغانستان کی عوام کے علاوہ ہمسایہ اسلامی ممالک پاکستان وغیرہ کی عوام پر روس کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان پر روسی جارحیت سے جہاد کا حکم نفیر عام ہے لیکن جہاد کی فرضیت کے لیے یہ شرط ہے کہ قدرت علی الجہاد ہو لہٰذا افغانستان کی عوام اور پاکستان کی عوام کی عدم قدرت کی وجہ سے روسی فوجوں سے مقابلہ دشوار معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ فرضیت اہلِ اقتدار اور دونوں ممالک کے سربراہانِ حکومت پر عائد ہوتی ہے اور علی الترتیب الاقرب فالاقرب کی بناء پر حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر روسی جارحیت کے خلاف جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهایة عن الذخیرة ان الجهاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض کفایة علیهم حتی یسعهم ترکه اذا لم یحتج الیهم فان احتیج الیهم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم یعجزوا منها لکنهم تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین کالصلوٰة والصوم لا یسعهم ترکه ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً علی هذا الترتیب۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد، مطلب فی الفرق بین فرض عین وفرض کفایة) [1]

---

[1] وفی الهندیة: ثم یجب مجیء النفیر لا یفترض الجهاد علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عین وان بلغهم النفیر وانما یفترض فرض عین علی من کان یقرب من العدو وهم یقدرون علی الجهاد الی ان قال فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الارض شرقاً وغرباً علی هذا الترتیب۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۹۱ کتاب السیر۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت مسلم اربابِ اقتدار کی ذمہ داری ہے

سوال:- موجودہ دور میں مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کافروں نے بزعم خود منصوبے بنا رکھے ہیں جن کے تحت ہر جگہ کافروں کی طرف سے مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، تو کیا ایسی حالت میں عالم اسلام کے اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی امداد و نصرت لازم آتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- تمام ممالکِ اسلامیہ اور اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت ضروری ہے اور جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو اُن کے ساتھ قریب کی اسلامی حکومت پر ان کی اعانت اور یہود و ہنود کے ساتھ جہاد فرض ہو جاتا ہے، اور قدرت نہ رکھنے کی صورت میں شرقاً و غرباً تمام اہلِ اسلام اور اہلِ اقتدار پر جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من ورائهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو ولم يعجزوا لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليه فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هٰذا التدريج۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۳۸ کتاب الجهاد، مطلب فی الفرق بین فرض عین وفرض کفایة)[1]

---

[1] وفی الهندية: وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هٰذا الترتيب۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير- الباب الاول فی تفسيره)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدير ج ۵ ص ۱۹۱ كتاب السير۔

لفظ فی سبیل اللہ کی تحقیق

سوال: تبلیغی حضرات لفظ فی سبیل اللہ کو صرف تبلیغ ہی میں منحصر کرتے ہیں اور جہاد کو اس میں شامل نہیں کرتے، کیا ان حضرات کا یہ انحصار درست ہے یا نہیں؟

الجواب: لفظ فی سبیل اللہ ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے، دین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو محنت و مشقت کی جائے وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لہٰذا دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے افراد اس کا مصداق ہیں، دین کے کسی خاص شعبہ کو متعین طور پر اس کا مصداق ٹھہرا کر دوسرے شعبوں کو اس سے خارج کر دینا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وقد قال فی البدائع فی سبیل اللہ جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعیٰ فی طاعۃ اللہ تعالیٰ وسبیل الخیرات اذا کان محتاجاً۔

(رد المحتار ج۳ ص۶۷) [1]

دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم

سوال: جو شخص کافر حکومت کا جاسوس بن کر مسلمانوں کے خفیہ حالات اس تک پہنچائے یا کافر حکومت کے تعاون سے وہاں کے مسلمانوں کو ستائے تو یہ شخص اگر پکڑا جائے تو اسے قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر بدون قتل کے کوئی تدبیر اس کی فہمائش کے لیے کارگر نہ ہو تو اسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اس صورت میں ہے کہ پکڑا جانے والا جاسوس مسلمان ہو اور اگر حربی ہو تو اس کو قتل کرنے میں کوئی کلام نہیں، اگرچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ سے مسلمان جاسوس کو قتل نہ کرنے کے اقوال مروی ہیں۔

لما قال العلامۃ الامام القرطبیؒ: فان کان الجاسوس کافراً فقال الاوزاعیؒ یکون نقضاً لعھدہٖ وقال اصبغ: الجاسوس الحربی یقتل والجاسوس المسلم والذمی یعاقبان الا ان تظاھرا علی الاسلام فیقتلان۔ (الجامع احکام القرآن ج۸ ص۵۳ سورۃ الممتحنۃ)

---

[1] لما فی الحدیث: وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع۔ رواہ الترمذی والدارمی۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۳۴ کتاب العلم)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۳۲ کتاب السیر۔

وقال الحافظ العيني رح وقال القدوري: الجاسوس يقتل وانما نفى القتل عن حاطب لما علم النبي صلى الله عليه وسلم منه ولكن مذهب الشافعي وطائفة ان الجاسوس المسلم يعزر ولا يجوز قتله وان كان ذا هيئة عفي عنه بهذا الحديث وعن ابي حنيفة والاوزاعي يوجع عقوبته ويطال حبسه وقال ابن وهب من المالكية يقتل الا ان يتوب وعن بعضهم انه يقتل اذا كانت عادته ذلك وبه قال ابن الماجشون وقال ابن القاسم يضرب عنقه لانه لا تعرف توبته وبه قال سحنون ومن قال بقتله فقد خالف الحديث واقوال المتقدمين وقال الاوزاعي رح فان كان كافرا يكون ناقضا للعهد وقال اصبغ الجاسوس الحربي يقتل والمسلم والذمي يعاقبان الا ان يتظاهرا على الاسلام فيقتلان -

(عمدة القاري ج ۱۴ صـ ۲۵۶ باب الجاسوس كتاب الجهاد) له

له وقال العلامة الحصكفي رح: وفي المجتبى: الاصل ان كل شخص رأى مسلما يزني ان يحل له قتله وانما يمتنع خوفا من ان لا يصدق انه زنى وعلى هذا القياس المكابر بالظلم وقطاع الطريق وصاحب المكس وجميع الظلمة بادنى شيء له قيمة وجميع الكبائر والاعونة والسعاة يباح قتل الكل ويثاب قاتلهم انتهى وافتى الناصحي بوجوب قتل كل مؤذ ________ وقال العلامة ابن عابدين رح: (قوله وجميع الكبائر) اي اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدي ضررها الى الغير فيكون قوله والاعونة والسعاة عطف تفسير او عطف خاص على عام فيشمل كل من كان من اهل الفساد كالساحر وقاطع الطريق واللص واللوطي والخناق ونحوهم ممن عم ضرره ولا ينزجر بغير القتل (قوله والاعونة) كانه جمع معين او عوان بمعناه والمراد به الساعي الى الحكام بالافساد فعطف السعاة عليه عطف تفسير وفي رسالة احكام السياسة عن جمع النسفي سئل شيخ الاسلام عن قتل الاعونة والظلمة والسعاة في ايام الفترة قال يباح قتلهم لانهم ساعون في الارض بالفساد فقيل انهم يمتنعون عن ذلك في ايام الفترة ويختفون قال ذلك امتناع ضرورة ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه" كما نشاهد وسئلنا الشيخ ابا شجاع عنه فقال يباح قتله ويثاب قاتله (قوله وافتى الناصحي) لعل الوجوب بالنظر للامام ونوابه والاباحة بالنظر لغيرهم -

(رد المحتار ج ۳ صـ ۱۹۷، ۱۹۸ باب التعزير، مطلب يكون التعزير بالقتل)

ومثله في البحر الرائق ج ۵ صـ ۴۲ فصل في التعزير -

دشمنوں کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مقصود اس سے ان کی شان وشوکت کو ختم کرنا اور ان پر غصے کا اظہار کرنا ہے اس لیے ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے، اور یہ بھی جہاد میں سے ہے۔

وقال العلامة الکاسانیؒ: ولا بأس باحراق حصونهم بالنار واغراقها بالماء وتخریبها وهدمها ونصب المجانیق علیها لقوله تعالیٰ: یخربون بیوتهم بایدیهم وایدی المؤمنین ولان کل شیء من باب القتال لما فیه من قهر العدو وکبتهم وغیظهم۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۱ کتاب السیر)

اہل حرب کے باغات اور فصلوں کو برباد کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران اُن کے باغات اور فصلوں کو تباہ کرنا اور قطع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کے ساتھ جنگ کی حالت میں ان کے باغات اور فصلوں کو کاٹنے اور برباد کرنے میں چونکہ ان کی شان وشوکت اور غرور وتکبّر کو توڑنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا دورانِ جہاد اُن کے باغات اور فصلوں وغیرہ کو تباہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم بلاوجہ مال مویشی اور باغات کو تباہ نہ کیا جائے۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: قال وارسلوا علیهم الماء وقطعوا اشجارهم وافسدوا زروعهم لان فی جمیع ذلک الحاق الکبت والغیظ بهم وکسر شوکتهم وتفریق

لہ وقال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله وحرقهم) ای احرق دورهم وامتعتهم قاله عینی والظاهر ان المراد حرق ذاتهم بالمجانیق واذا جازت محاربتهم بحرقهم فمالهم اولیٰ۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجهاد)

ومثلهٗ فی الهندیة ج۲ ص۱۹۴ کتاب السیر۔ الباب الثانی فی کیفیة القتال۔

جمعهم فيكون مشروعاً۔ (الهداية ج ٢ ص ٢٥٥ كتاب السير باب كيفية القتال) [1]

جنگ کے دوران کافر اگر کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں

سوال :۔ ایک کافر اور منکرِ خدا اگر دورانِ جنگ مجاہدین کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور کلمۂ توحید پڑھ لے تو کیا اسلام لانے کے بعد اس کا قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ حالتِ جنگ میں اگر کسی غیر مسلم نے مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر وحدانیتِ باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا تو شریعتِ مطہرہ میں ایسے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں صرف اس کے اقرارِ ایمان پر ہی اکتفا کر لینا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: والکفار اقسام قسم یجحدون الباری جل وعلا واسلامهم اقرارهم بوجوده وقسم یقرون به ولکن ینکرون وحدانیته واسلامهم اقرارهم بوحدانیته۔ (البحر الرائق ج ٥ ص ٧٣ کتاب السیر) [2]

جنگ کے دوران کافر باپ کے قتل کا حکم

سوال :۔ اگر کسی کا باپ کمیونسٹوں کی طرف سے مجاہدینِ اسلام کے خلاف لڑ رہا ہو تو اس کو قتل کرنا بیٹے کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ چونکہ اسلام میں والدین کے اپنی اولاد پہ بہت زیادہ حقوق ہیں

---

[1] وفی الهندیة: ونصبوا علیهم المجانیق وحرقوهم وارسلوا علیهم الماء وقطعوا شجرهم وافسدوا زرعهم۔ (الفتاوى الهندية ج ٢ ص ١٩٣ کتاب السیر، الباب الثانی فی کیفیة القتال)

ومثلهٗ فی البحر الرائق ج ٥ ص ٧٦ کتاب السیر۔

[2] وفی الهندیة: قال القدوری فی کتابه الکفار علی نوعین فمن یجحد الباری عزوجل ومنهم من یقر به الا انه ینکر وحدانیته کعبدة الاوثان فمن انکره اذا اقر به یحکم باسلامه ومن اقر وجحد وحدانیته اذا اقر بوحدانیته بان قال لا اله الا الله یحکم بالاسلام۔

(الفتاوى الهندية ج ٢ ص ١٩٥ کتاب السیر الباب الثانی فی کیفیة القتال)

ومثلهٗ فی التاتارخانیة ج ٥ ص ٢٣٣ کتاب السیر الفصل الرابع فی بیان ما ینتهی به الامر بالقتال۔

اس لیے کسی کے والدین اگرچہ کافر ہی ہوں پھر بھی اسلام دنیاوی امور میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے، اس بنا پر باپ جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو بیٹے کے لیے باپ پر اقدام علی القتل مرخص نہیں البتہ اگر اُسے قتل کیے بغیر کوئی اور تدبیر مناسب ممکن نہ ہو یا باپ سے قتل ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کے پیشِ نظر باپ کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ویکرہ ان یبتدء الرجل اباہ من المشرکین فیقتله لقوله تعالیٰ: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (الآیۃ) ولانه یجب احیاءه بالانفاق فیناقضه الاطلاق فی افنائه فان ادرکه امتنع علیه حتیٰ یقتله غیرہ لان المقصود یحصل بغیرہ من غیر اقتحامه المأثم وان قصد الاب قتله بحیث لایمکنه دفعه الا بقتله لا بأس به لان مقصودہ الدفع الا تریٰ انه لو شهر الاب سیفه علی ابنه ولا یمکنه دفعه الا بقتله یقتله لما بینا فهٰذا اولیٰ۔

(الهدایة ج ۲ ص۲۵۷ کتاب السیر، باب کیفیة القتال) ـ [1]

کمیونسٹوں کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کے احکام

سوال :- افغانستان پر رُوسی قبضہ کے بعد اکثر لوگوں نے ہجرت کر لی لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی اور کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں رہ رہے ہیں، تو کیا ایسے لوگوں کا قتل کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورتِ مذکورہ میں جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور وہاں کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں زندگی بسر کر رہے ہوں اور مجاہدین کے خلاف کمیونسٹوں کی اعانت نہیں کرتے ہوں تو اگرچہ وہ لوگ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

---

[1] وفی الهندیة: ولا بأس بان یقتل الرجل من المسلمین کل ذی رحم محرم من المشرکین یبتدأ به الا الوالد والوالدة والاجداد من قبل الرجال والنساء والجدات۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۱۹۴ کتاب السیر الباب الثانی فی کیفیة القتال)

وَمِثْلُهُ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر۔

لیکن شریعتِ مقدسہ ان کو قصداً وارادۃً قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی، البتہ اُن کے اموال کو ضبط کرنا جبکہ اس سے کفار کو فائدہ ہو رہا ہو درست ہے۔

لما قال العلامة محمد كامل الطرابلسيؒ: ومنه تعلم من يدخل تحت جوارهم وامانهم من غير اعانة لهم بنفسه وبماله ولا يكون عينا لهم علينا ولا ردءًا دونهم لا يباح قتله وانما هو عاص معصيةً لا تبيح ما عصمه الاسلام من دمه وماله وانما ابيح اخذ اموالهم ايضاً لكونهم يعينون به العدو على مقاتل الاسلام ومقاومته ومناواته ومناهضته فابيح اخذه لذلك۔

(الفتاویٰ الکاملیۃ ص۲۵۱ کتاب الجنایات)[1]

کمیونسٹوں کے معاونین کا حکم

سوال: کمیونسٹوں کے معاونین اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا قتل جائز ہے؟

الجواب: کمیونسٹ چونکہ اپنے عقائد اور نظریات کی بنا پر اہلِ حرب قرار دیئے گئے ہیں لہٰذا واقعی طور پر جو لوگ کمیونسٹوں کے حامی ہوں اور ان کے ساتھ امداد و تعاون کرتے ہوں تو یہ بھی انہی لوگوں کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کو بھی قتل کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة محمد كامل الطرابلسيؒ: سئلت عن بلدة استولى عليها الكفار وتمكنوا منها فانضم اليهم بعض القبائل والعشائر وصاروا يقاتلون معهم المسلمين وينهبون مالهم وينصحون الكفار ويعينونهم على اذى المسلمين فكانوا اشدّ ضررًا على المسلمين من الكفار فما حكم فيهم وهذا حالهم۔ فالجواب اني لم اقف على حكم هٰؤلاءِ في كتب مذهبنا معاشر الحنفية ولٰكن وقفت من حكمهم

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: قولهٗ بالمجانيق اي يرمى النار بها عليهم لكن جواز التحريق والتغريق مقيد كما في شرح السير بما اذا لم يتمكنوا من الظفر بهم بدون ذلك بلا مشقة عظيمة فان تمكنوا بدونها فلا يجوز لان فيه اهلاك اطفالهم ونسائهم ومن عندهم من المسلمين۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۲۹ کتاب الجہاد۔ مطلب في ان الكفار مخاطبون بها)

وَمِثْلُهٗ في الهداية ج۲ ص۲۵۶ کتاب السیر۔

فی کتب بعض السادة المالکیة الی ان قال والظاهر ان حکم هؤلاء حکم اهل الحرب فی قتلهم واخذ اموالهم واما اولادهم فلا یقتلون ولا یکون فیئاً وانما أُبیح قتل البالغین منهم لکونهم ردءاً العدو والحرب ومعینون له بانفسهم و حکم الردء اذا لم یقاتل مع العدو حکم المقاتل فاحری اذا قاتل۔

(الفتاوی الکاملیة ص۲۵ کتاب الجنایات) [1]

کمیونسٹوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا

سوال:۔ کمیونسٹوں کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ کمیونسٹوں کے بچوں اور عورتوں کو قصداً و ارادۃً قتل کرنا جائز نہیں البتہ اگر کمیونسٹوں کو اور ان کے گھروں کو تباہ کرنا مقصود ہو تو ان میں جو بچے اور عورتیں غیرارادی طور پر قتل ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، نیز اگر ان میں سے کوئی ذی رائے ہو یا جنگ کرنے والا ہو یا ان کی سربراہ عورت ہو تو قصداً و ارادۃً بھی قتل کئے جا سکتے ہیں تاکہ شر و فساد کا خاتمہ ہو جائے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یقتلوا امرأۃ ولا صبیاً ولا شیخاً فانیاً ولا مقعداً ولا اعمی لان المبیح للقتل عندنا هو الحراب ولا یتحقق منهم ..... الا ان یکون احد هؤلاء ممن له رأی فی الحراب او تکون المرأۃ ملکة لتعدی ضررها الی العباد وکذا یقتل من قاتل من هؤلاء دفعاً للشر ولان القتال مبیح حقیقته۔ (الهدایة ج۲ ص۲۵۶ کتاب السیر باب کیفیة القتال) [2]

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: وجمیع الکبائر واللوطی والخنقة والسعاة یباح قتل الکل ویثاب قاتلهم انتهی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ۔ وقال ابن عابدینؒ بعد قوله وجمیع الکبائر ای اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدی ضررها ای الغیر الی ان قال فیشمل کل من کان من اهل الفساد۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

[2] وقال العلامة الکاسانیؒ: اما حال القتال فلا یحل فیها قتل امرأۃ ولا صبی ولا شیخ فان۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۷۷ کتاب السیر۔

دشمن سے اسلحہ لیکر اُسے مجاہدین کے خفیہ راز بتانیوالے کو قتل کرنے کا حکم

سوال، پاکستان یا افغانستان کے بعض قبائلی علاقوں میں کچھ لوگ مجاہدین کو نقصان پہنچانے اور ان کے عسکری راستوں کو قطع کرنے کے لیے روسی کمیونسٹ حکومت سے اسلحہ لیتے ہیں اور مجاہدین کے خفیہ حالات اور مراکز کی اطلاع بھی دشمن کو کرتے ہیں، توکیا ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے یانہیں؟

الجواب:- جو لوگ مجاہدینِ اسلام کے خلاف کمیونسٹوں یا دیگر مخالفینِ اسلام کے ساتھ کسی بھی قسم کی معاونت کرتے ہوں اور مجاہدینِ اسلام کے خفیہ راز اور عسکری مراکز کی نشاندہی دشمنوں کو کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے، ان کا حکم زنادقہ کا حکم ہے۔

لما قال العلامة محمد كامل الطرابلسيؒ: ومنهم من لجأ للمسلمين وصار يقاتل العدو معهم وهو مع ذلك يعين العدو خفية ويعلمه باحوال عساكر المسلمين ويطلعه على عوراتهم ويتربص بهم الدوائر وقد اطلع لهم على كتب كتبها في ذلك الوقت كثير من مشائخهم المعروفين بالاجواد..... الى ان قال وحكم اولئك حكم الزنادقة ان اطلع عليهم قتلوا وان لا فامرهم الى الله۔ (الفتاوى الكاملية ص۲۵۱ كتاب الجنايات)[1]

جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا

سوال:- کیا مجاہدین کے لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا جائز ہے یانہیں؟

الجواب:- جہاد کے دوران ہر مناسب طریقے سے دشمن پر رُعب اور دباؤ ڈالنا

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وجميع الكبائر والاعونة والسعاة يباح قتل الكل ويثاب قاتلهم انتهى وافتى الناصحي بوجوب قتل كل موذٍ۔ وقال ابن عابدينؒ: (تحت قوله وجميع الكبائر) اى اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدى ضررها الى الغير فيكون قوله والاعونة والسعاة عطف تفسير او عطف خاص على عام فيشمل كل من كان من اهل الفساد كالساحر وقاطع الطريق واللص واللوطي والخناق ونحوهم ممن عم ضرره ولا ينزجر بغير القتل قوله والاعونة كانه جمع معين او عوان بمعناه والمراد به الساعي الى الحكام بالافساد فعطف السعاة عطف تفسير۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزير)

اور اس کی شان و شوکت کو ٹھیس پہنچانا مشروع ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے، مونچھیں بڑھانے کی صورت میں چونکہ دشمن پر رعب پڑنے کا امکان ہوتا ہے اس لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا ایک اچھا قدم ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: ویندب للمجاهد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه باظافیره وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارزه والحاصل ان ما یعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین۔

(البحر الرائق ج۵ ص۷۶ کتاب السیر) [1]

دشمن سے تحفظِ دین کی خاطر توریہ کا بروئے کار لانا

سوال:۔ جہاد میں کفار کو ہلاک کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے جھوٹ بولنا اور انہیں دھوکہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنا کسی بھی آسمانی مذہب میں جائز نہیں اس لیے اس کا کسی بھی وقت جائز اور حلال متصور نہیں تاہم بعض مواضع ایسے ہیں جن میں اگر دین کو نقصان پہنچتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے ظاہری دھوکہ اور جھوٹ کے علاوہ کوئی تلافی ممکن نہ ہو تو ایسے مواضع پر جھوٹ کا سہارا لیا جا سکتا ہے تو چونکہ درحقیقت یہ جھوٹ نہیں اس لیے دشمن سے حفاظتِ دین کی خاطر ظاہری دھوکہ اور جھوٹ میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: روی عن علیؓ انه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الحرب خدعة فیه دلیل علی انه لا بأس بالخداع فی الحرب ولیس المراد الکذب المحض وانما المراد استعمال المعاریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۰ کتاب السیر، الفصل التاسع فی الخدعة فی الحرب) [2]

---

[1] وفی الهندیة: قالوا لا بأس بطول الشارب للغزاة لیکون اهیب فی عین العدو وکذا فی الغیاثیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۹ کتاب الکراهیة)

[2] قال العلامة العثمانیؒ: بعد ذکر الحدیث ما نصه وفیه علی انه لا بأس للمجاهد ان یخادع قرنه فی حال القتال۔ (اعلاء السنن ج۱۲ ص۴۵ کتاب السیر)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴ کتاب الکراهیة، الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی۔

جنگ کے دوران مسلمان افواج کا پیچھے ہٹ جانے کا حکم

سوال: کفار کے سامنے جنگ کے دوران مسلمانوں کی فوج اپنے مورچوں پر آخری دم تک ثابت قدم رہے گی یا کسی موقعہ پر پیچھے ہٹ جانے کی بھی اجازت موجود ہے؟

الجواب: کفار کے مقابلہ میں مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت قدمی پر مامور ہیں اور ان کا میدان چھوڑنا جرم ہے، لیکن کفار کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہو یا تعداد کے لحاظ سے اگرچہ کم ہوں لیکن مسلمان فوج کا غالب خیال یہ ہو کہ کفار کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو ایسی حالت میں دوبارہ تیاری کے لیے پیچھے ہٹ جانا شرعاً جرم نہیں۔

كما قال الله تعالىٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۔ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۱۵)[1]

* * *

---

[1] وقال العلامة الكاسانیؒ: وعلى هذا الغزوات إذا جاءهم جمع من المشركين ما لا طاقة لهم به وخافوهم ان يقتلوهم فلا بأس لهم ان ينحازوا إلى بعض امصار المسلمين او الى بعض جيوشهم والحكم في هذا الباب لغالب الرأي واكبر الظن دون العدد فان غلب على ظن الغزاة انهم يقاومونهم يلزمهم الثبات وان كانوا اقل عدداً منهم وان كان غالب ظنهم انهم يغلبون فلا بأس ان ينحازوا الى المسلمين ليستعينوا بهم وان كانوا اكثر عدداً من الكفرة ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۹ کتاب السیر فصل بیان من یفترض)

باب الغنائم وقسمتها

(مالِ غنیمت کے احکام ومسائل)

مالِ غنیمت غانمین کا حق ہے نہ کہ حکومت کا

سوال:۔ کفار کے ساتھ جنگ کے دوران جب اسلامی فوج کافروں کی افواج کو مغلوب کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کرے تو کیا یہ مالِ غنیمت فوج کا حق ہے یا حکومت کا حق ہے؟

الجواب:۔ شرعی اعتبار سے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے ان میں سے ۱/۵ حصہ بیت المال میں داخل کر کے باقی ۴/۵ حصہ خاص اس فوج پر تقسیم کیا جائے گا جس نے دورانِ جنگ اس مالِ غنیمت پر قبضہ کیا ہو اور اس کے برعکس حکومت کا یہ قانون کہ سارا مالِ غنیمت حکومت کا ہوگا دیگر قوانین کی طرح ایک غیر اسلامی اور غیر شرعی قانون ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کے بھی خلاف ہے۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ویقسم الامام الغنیمة فیخرج خمسها لقوله تعالیٰ: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ۔ استثنی الخمس ویقسم اربعة اخماس بین الغانمین لان النبی علیه السلام قسمها بین الغانمین۔ (الهدایة ج۲ ص۲۶ باب الغنائم وقسمتها)[1]

مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ سرمایہ ہے

سوال:۔ جب امیرِ لشکر میدانِ جنگ میں دشمن کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے مجاہدین کو چار جماعتوں پر تقسیم کر کے بھیجدے اور ان چار جماعتوں میں سے ایک جماعت اس علاقہ پر قبضہ کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کر لے تو کیا اس مالِ غنیمت میں تمام جماعتیں شریک ہوں گی یا یہ صرف قابض جماعت کا حق ہوگا۔

---

[1] وقال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: فی المغرب الغنیمة ما نیل من الکفار عنوة والحربـــة فتخمس وباقیها للغانمین۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۱۳۴ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۳۲ کتاب الغنائم وقسمتها، فصل فی کیفیة القسمة

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں یہ مالِ غنیمت مجاہدین کی تمام جماعتوں کا مشترکہ حق ہے خواہ کسی ایک جماعت نے ہی اس مال پر قبضہ کیا ہو، البتہ اگر امیرِ لشکر کسی خاص مصلحت کی بناء پر یہ مالِ غنیمت کسی خاص جماعت پر تقسیم کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: قال الردء والمقاتل فی العسکر سواء لاستوائھم فی السبب وھو المجاوزۃ او شھود الوقعۃ علیٰ ما عرف وکذلک اذا لم یقاتل لمرض او لغیرہٖ لما ذکرنا۔ (الھدایۃ ج۲ ص٢٦٣ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتھا) لہ

تنفیل (انعام) نہ ہونے کی صورت میں مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ ہوگا

سوال: جہادِ افغانستان میں ایک مجاہد نے ایک روسی کافر کو ہلاک کر کے اس کی کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا، اب دیگر مجاہدین اس کو یہ کہتے ہیں کہ یہ کلاشنکوف آپ اکیلے کا حق نہیں بلکہ تمام مجاہدین کا اس میں حق ہے اور یہ مالِ غنیمت ہے جبکہ وہ مجاہد یہ کہتا کہ اس کلاشنکوف پر صرف میرا حق ہے کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے، تو اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہوگا؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کے درمیان مشترکہ ہوتا ہے کسی ایک مجاہد کا بغیر تقسیم کے مالِ غنیمت میں سے کچھ لینا جائز نہیں، تاہم اگر امیرِ جہاد نے تنفیل (انعام) کا اعلان کیا ہو یعنی جو مجاہد جس حربی کو قتل کرے گا تو مقتول سے جو اسلحہ اُسے حاصل ہوگا وہ اسی کا ہوگا۔ تو ایسی صورت میں اگر کسی مجاہد نے کسی حربی کو قتل کر کے اس کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا تو وہ اسلحہ اسی مجاہد کا حق ہوگا کوئی اور اس کے ساتھ اس اسلحہ میں شریک نہیں ہوگا، اس کے علاوہ جملہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ مال ہے۔

لما فی الھندیۃ: قال محمدؒ ولا یستحق القاتل سلب المقتول بنفس القتل ما لم

لہ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تنبیہ) قال فی البحر وافاد المصنف ان المقاتل وغیرہ سواء حتی یستحق الجندی الذی لم یقاتل لمرض وغیرہٖ وانہ لا یتمیز واحد علی آخر بشیء حتی امیر العسکر وھذا بلا خلاف کذا فی الفتح وفی المحیط والمتطوع فی الغزو وصاحب الدیوان سواء۔

(رد المحتار ج۴ ص١٤٣ کتاب الجہاد، باب المغنم وقسمتہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر ج۵ ص٨٥ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتھا۔

ینفل الامام قبل القتال فیقول من قتل قتیلاً فلہٗ سلبہ وھذا مذھب علمائنا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۱۷ کتاب السیر، الباب الرابع، الفصل الثالث فی التنفیل) [1]

دارالحرب سے مالِ غنیمت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مسلمان کفار کے بہت سارے مال واسباب پر قبضہ کریں اور اس میں بعض ایسی اشیاء بھی شامل ہوں کہ اُن کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو مثلاً حیوانات اور دوسری بھاری اشیاء، تو ایسی اشیاء کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر مقبوضہ اشیاء ایسی ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو (جیسا کہ حیوانات اور بھاری اسلحہ وغیرہ)، تو شریعت کی رُو سے حیوانات کو پہلے ذبح کرکے بعد میں دارالحرب میں چھوڑا جائے تاکہ کفار ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اسلحہ وغیرہ کو کسی ایسی خفیہ جگہ دفن کیا جائے کہ کفار کو اس کا پتہ نہ چل سکے، بچوں اور عورتوں کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جائے کہ وہاں بھوک اور پیاس سے دم توڑ جائیں تاکہ کفار کو ان سے تقویت نہ پہنچے اور برتن وغیرہ توڑ دیئے جائیں ۔

کما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: وحرم عقر دابۃ شق نقلها فتذبح وتحرق کما تحرق اسلحۃ وامتعۃ تعذر نقلها وما لا یحرق منها یدفن بموضع خفی وتکسر اوانیهم وتراق ادهانهم مغایظۃ لهم ویترک صبیان ونساء منهم شق اخراجها بارض خربۃ حتی یموتوا جوعاً۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۱۴۰ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمتہ) [2]

---

[1] وقال العلامۃ الکاسانیؒ: هذا اذا نفل الامام فان لم ینفل شیئاً وقتل رجل من الغزاۃ قتیلاً لم یختص بسلبہ عندنا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۵ کتاب السیر) ومثلہٗ فی الهدایۃ ج۲ ص۲۶۳ کتاب السیر۔ باب الغنائم وقسمتها

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: وان لم یقدر المسلمون علی حمل هٰؤلاء ونقلهم الی دار الاسلام لا یحل قتلهم ویترکون فی دار الحرب لان الشرع نهی عن قتلهم ولا قدرۃ علی نقلهم فیترکون ضرورۃ واما الحیوان والسلاح اذا لم یقدروا علی الاخراج الی دار الاسلام اما الحیوان فیذبح ثم یحرق بالنار لئلا یمکنهم الانتفاع بہ اما السلاح فما امکن احراقہ بالنار یحرق وما لا یحتمل الاحراق کالحدید ونحوہ یدفن بالتراب لئلا یجدوہ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۲ کتاب السیر)

ومثلہٗ فی الهندیۃ ج۲ ص۲۰۸ کتاب السیر، الباب الرابع فی الغنائم وقسمتها۔ الفصل الاول فی الغنائم۔

دارالحرب میں مسلمان تاجر کے مال کا حکم

سوال:۔ بعض مسلمان تاجر دارالحرب میں سامانِ تجارت وغیرہ لاتے ہیں اور وہاں خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، اگر مجاہدین ان کے سامان اور مال پر قبضہ کر لیں تو کیا یہ مال وغیرہ مالِ غنیمت شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب کو مالِ تجارت مہیا کرنا مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں کیونکہ اس سے کفار کو تقویت ملتی ہے جو کہ اعانت علی المعصیت کے مترادف ہے، اور مجاہدین کا مسلمانوں کے مالِ تجارت پر قبضہ کرنے سے وہ مال مالِ غنیمت شمار نہیں ہوتا بلکہ مالِ غنیمت وہ ہے جو کفار سے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: الغنیمۃ اسمٌ لما یؤخذ من اموال الکفرۃ بقوۃ الغزاۃ وقھر الکفرۃ۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۷ کتاب الجھاد والمغنم)[1]

مالِ غنیمت میں خیانت کرنا حرام ہے

سوال:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں اس کا کوئی ذکر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً حرام ہے، یہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے کیونکہ اس کی حرمت پر قرآنی نصوص اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) دال ہیں۔

لقولہٖ تعالیٰ: وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ آلِ عمران آیت ۱۶۱)[2]

---

[1] وقال العلامۃ الکاسانیؒ: فالغنیمۃ عندنا اسم للماخوذ من اھل الحرب علیٰ سبیل القھر والغلبۃ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۷ کتاب السیر)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۰۳ کتاب السیر، الباب الرابع فی الغنائم ثم الفصل الاول فی الغنائم۔

[2] وفی الحدیث: عن ابن عباسؓ یقول حدثنی عمر بن الخطابؓ قال قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فلاناً قد استشھد قال کلا قد رأیتہٗ فی النار بعباءۃ قد غلّھا قال قُم یا عمر فنادِ انہٗ لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون ثلاثاً۔ ھٰذا حدیث حسن صحیح غریب۔ (ترمذی ج۱ ص۱۹۱ باب ما جاء فی الغلول)

ومثلہٗ فی ابی داؤد ج۲ ص۱۲ باب فی تعظیم الغلول۔ کتاب الجھاد۔

مالِ غنیمت کی نیت سے جہاد کرنے کا حکم

سوال:- مالِ غنیمت کے حصول کی نیت سے جہاد میں حصہ لینے سے ثواب کی اُمید کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- کسی آدمی کا جہاد کو جانے سے اگر مقصودِ اصلی مالِ غنیمت ہو تو اُس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں اگر مقصودِ اصلی جہاد اور رضائے الٰہی کا حصول ہو لیکن اس کے ساتھ مالِ غنیمت کا بھی ارادہ ہو تو ثواب ملنے کی اُمید ہے۔

لما فی الحدیث: عن ابی هریرةؓ ان رجلاً قال یا رسول الله رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی غرضاً من غرض الدنیا فقال علیه السلام لا اجر له فاعظم ذلك علی الناس وقال للرجل عد لرسول الله صلی الله علیه وسلم فلعلك تم تفهمه فقال یا رسول الله رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی غرضاً من غرض الدنیا قال لا اجر له فقالوا للرجل عد لرسول الله فقال له الثالثة فقال لا اجر له۔

(سنن ابی داؤد ج۱ ص۳۳۸ کتاب الجهاد باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا)[1]

شہید کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں حصہ دینے کا حکم

سوال:- اگر کوئی مجاہد کفار کے ساتھ جنگ کے دوران شہید ہو جائے تو کیا اس کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- مجاہدین جب مالِ غنیمت پر قبضہ کرکے دارالاسلام میں لے آئیں یا تقسیم کرلیں اور اس کے بعد کوئی شہید ہو جائے تو ایسی حالت میں اس کا حصہ اس کے

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: ثم تأویله من وجهین احدهما ان یری انه یرید الجهاد ومراده فی الحقیقة المال فهذا کان حال المنافقین ولا اجر له او یکون معظم مقصوده المال وفی مثله قال علیه السلام للذی استوجر علی الجهاد بدینارین انما لك دینارك فی الدنیا والآخرة واما اذا کان معظم مقصوده الجهاد یرغب معه الغنیمة فهو داخل فی قوله تعالی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ - یعنی التجارة فی الحج فکما انه لا یحرم ثواب الحج فکذا الجهاد - (رد المحتار ج۴ ص۱۳۰ کتاب الجهاد مطلب فیمن یرید الجهاد مع الغنیمة).

ورثاء کو دیا جائے گا، اور اگر کوئی دار الحرب میں شہید ہو گیا یا تقسیمِ غنیمت سے پہلے شہید ہو گیا تو ایسی صورت میں اس کے ورثاء کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ومن مات من الغانمين في دار الحرب فلا حق له في الغنيمة ومن مات منهم بعد اخراجها الى دار الاسلام فنصيبه لورثته لان الارث يجري في الملك ولا ملك قبل الاحراز وانما الملك بعده۔

(الهداية ج۲ ص۳۶۴ کتاب السير باب الغنائم وقسمتها) [1]

مالِ غنیمت میں عورتوں کے حصہ کا حکم

سوال:۔ اگر جہاد میں عورتیں بھی شریک ہوں یعنی وہ زخمیوں کو پانی وغیرہ پلاتی ہوں یا ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں تو مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملے گا یا نہیں جبکہ وہ مردوں کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہیں؟

الجواب:۔ یہ مسئلہ علماء امت کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض حضرات عورتوں کو بھی مردوں کے برابر مالِ غنیمت میں حصہ دینے کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ اور دوسرے علماء ان کیلئے مردوں کے برابر حصہ کے قائل نہیں، تاہم یہ حاکمِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ (سہم) مردوں کے حصے سے کم جتنا مناسب سمجھے عورتوں کو مالِ غنیمت سے کچھ مال دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: قال في الهداية والكفاية ولا يسهم لمملوك ولا امرأة ولا صبي ولا ذمي ولكن يرضخ لهم اي يعطون قليلاً من كثير فان الرضخة هي الاعطاء كذلك فالرضخ لا يبلغ السهم ولكن دونه على حسب ما يراه الامام۔ (اعلاء السنن ج۱۲ ص۱۹ باب لا يسهم لمملوك ولا امرأة الخ)

---

[1] وقال العلامة التمرتاشي رحمه الله: وكلا من مات ثمة قبل قسمة او بيع ولو مات بعد احدهما ثمة او بعد الاحراز بدارنا يورث نصيبه لتأكد ملكه۔

(تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۱۴۲ کتاب الجهاد باب المغنم)

ومثله في الهندية ج۲ ص۲۰۸ کتاب السير الباب الرابع في الغنائم، الفصل الاول في الغنائم۔

باب المستامن

(دارالاسلام میں رہنے والے کفار کے احکام و مسائل)

دارالاسلام بننے کے لیے شرائط

سوال:۔ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے کون سی شرائط ہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ احکام میں اسلام کا ظہور ہو جائے تو وہ دارالاسلام شمار ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفی رح: ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام اهل الاسلام فیها کجمعة وعید۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۷۷ کتاب الجهاد قبل باب العشر والخراج والجزیة) له

دارالحرب بننے کے لیے شرائط

سوال:۔ دارالاسلام سے دارالحرب بننے کے لیے کیا شرائط ہیں؟

الجواب:۔ دارالاسلام سے دارالحرب بننے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک تین شرائط کا ہونا ضروری ہے (۱) احکام کفر اس میں ظاہر ہو جائیں (۲) دارالکفر کے ساتھ متصل ہو جائے (۳) مسلمان اور ذمی اپنے امن میں نہ رہ جائے بلکہ کفار کے امن میں داخل ہو جائیں، اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک دارالحرب بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ کفر کے احکام کا ظہور ہو جائے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله:۔ قال ابو حنیفة رح انها لا تصیر دار الکفر إلا بثلث شرائط احدها ظهور احکام الکفر فیها والثانی ان تکون متاخمة دار الکفر

له وقال العلامة الکاسانی رح: لاخلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظهور احکام الاسلام فیها۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۰ کتاب السیر)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب السیر الباب الخامس فی استیلاء الکفار۔

والثالث ان لایبقی فیہا مسلمٌ ولا ذمیٌّ امنًا بالامان الاول وھو امان المسلمین وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ انہا تصیر دار الکفر بظہور احکام الکفر فیہا ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۰ فصل الاحکام تختلف باختلاف الدارین) [1]

سمندر کا دار الحرب میں داخل ہونا

سوال :- آجکل جغرافیائی تقسیم میں سمندر کا کچھ کچھ حصہ قریبی ممالک کے قبضے میں ہوتا ہے جس میں کسی دوسرے ملک کا بغیر اجازت کے داخل ہونا سمندری حدود کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا کافر ممالک کے ساتھ سمندر بھی دار الحرب کے حکم میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- جب کفار مسلمانوں کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سمندری حدود پر بھی قبضہ کرلیں اور بلادِ اسلام سے اس علاقہ کا تعلق ختم ہو جائے تو اس کی سمندری حدود بھی حکماً دار الحرب میں شامل ہو جاتی ہیں ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : قولہ واحرزوھا دارھم ویلحق بہا البحر الملح ونحوہ کمفازۃ لیس وراءہا بلاد الاسلام نقلہ بعضہم عن الحمویؒ فی حاشیۃ ابی السعود عن شرح النظم الہاملی سطح البحر لہ حکم دار الحرب ۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۶۶ کتاب الجہاد باب استیلاء الکفار)

کسی حربی کی دار الاسلام میں قیام امن کی مدت

سوال :- ایک غیر مسلم شخص کسی اسلامی حکومت میں کتنی مدت تک

---

[1] وفی الہندیۃ : قال محمد فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط ثلثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتہار وان لایحکم فیہا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لایتخلل بینہما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لایبقی فیہا مومنٌ ولا ذمیٌّ امنًا بامانہ الاول الذی کان ثابتًا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی بعقد الذمۃ وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ بشرط واحد لا غیر وھو اظہار احکام الکفر وھو القیاس ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب السیر الباب الخامس فی استیلاء الکفار) ومثلہ فی تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ص ۲۷۲ کتاب الجہاد، قبل باب العشر والخراج والجزیۃ ۔

اجازت حاصل کرکے قیام کرسکتا ہے؟

الجواب:- غیر مسلموں کی عادات واخلاق کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اُن سے اسلامی معاشرہ کو خطرہ ہوتا ہے، اس لیے ان کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک دارالاسلام میں قیام کی اجازت دینا جائز نہیں تاہم اگر حاکم وقت بہتر سمجھے تو زیادہ عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لایمکن حربی مستأمن فینا سنة لئلا یصیر عینا لهم وعونا علینا وقیل له ان اقمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکثت سنة فهو ذمی۔

(الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۳ ص۲۴۳ کتاب الجهاد- فصل فی استئمان الکافر) [1]

غیر مسلم قیدیوں کے معاملہ کا حکم

سوال:- جہاد کے دوران اگر مجاہدین کچھ کافروں کو قیدی بنالیں اور اسی طرح کافروں نے بھی کچھ مسلمانوں کو قیدی بنالیا ہو تو ان غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ شرعاً کیا معاملہ کرنا چاہیئے؟ کیا انہیں قتل کیا جائے یا ان کے بدلے میں مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے؟

الجواب:- جہاد کے دوران جب کفار قیدی بنالئے جائیں تو حاکم وقت کی مرضی ہے کہ چاہے تو ان کو قتل کردے یا ان کو غلام بنالے یا اُن پر ذمّی کے احکام لگاکر چھوڑ دے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دشمن کی قید میں مسلمان قیدیوں کے بدلے میں غیر مسلم قیدیوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ان سے فدیہ لینے کے بجائے مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وهو فی الاساری بالخیار ان شاء قتلهم ...... وان شاء استرقهم وان شاء ترکهم احرارا ذمة

---

[1] وقال العلامة المرغینانی رحمه الله: واذا دخل الحربی الینا مستأمنا لم یمکن ان یقیم فی دارنا سنة ویقول له الامام ان اقمت تمام السنة وضعت علیك الجزیة۔

(الهدایة ج۲ ص۵۶۸ کتاب السیر، باب المستأمن)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱ فصل من یسع ترکه فی دار الحرب۔

للمسلمین...... الی ان قال ولا یفادی بالاساری عند ابی حنیفةؒ وقالا یفادی بهم اساری المسلمین۔ (الهدایة ج٢ ص٢٦١ کتاب السیر، باب الغنائم)[1]

حربی کا بغیر اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونے کا حکم

سوال:- کیا اجازت نامہ (قانونی دستاویزات) کے بغیر اگر کوئی حربی دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس کو کوئی سزا دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جب کسی ملک میں دارالاسلام کی شرائط پوری ہوں اور وہاں اسلامی حکومت ہو تو کسی حربی کا اس ملک میں حکام کی اجازت کے بغیر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کفار کا جاسوس بن کر آیا ہے، ایسی حالت میں اس کو بطور سزا کے غلام بنالیا جائے، اس لیے کسی حربی کا بغیر حاکم وقت کی اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قید بالمستأمن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان وما معه فیأ ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔ (ردالمحتار ج۴ ص٢٤٢، کتاب الجهاد، فصل فی استئمان الکافر)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وقتل الاساری ان شاء ان لم یسلموا واسترقهم او ترکهم احرارًا ذمة لنا الا مشرکی العرب والمرتدین کما سیجئ وحرم منهم ای اطلاقهم مجانًا ولو بعد اسلامهم ابن کمال لتعلق حق الغانمین وجوزه الشافعی لقوله تعالیٰ: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا قلنا نسخ بقوله: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔ شرح مجمع وحرم فداءهم بعد تمام الحرب واما قبله فیجوز بالمال لا بالاسیر المسلم درر وصدر الشریعة وقالا یجوز وهو اظهر الروایتین عن الامام شمنی۔

(ردالمحتار ج٣ ص٢٥١ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)

[2] وقال العلامة ابن نجیمؒ: لانه لو دخل دارنا بلا امان فهو وما معه فیٔ فان قال دخلت بامان لم یصدق واخذ۔ (البحر الرائق ج٥ ص١٠١ باب المستأمن)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج٥ ص٢٧١ کتاب السیر، باب المستأمن۔

افغانستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جہاد افغانستان کے وقت افغانستان دارالحرب تھا یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی ملک کے دارالحرب بننے کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ جہاد کے وقت افغانستان میں مکمل طور پر نہیں پائی جاتی تھیں اس لیے افغانستان کا دارالحرب ہونا فقہی نقطۂ نظر سے درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

لما قال العلامة بدر الدین محمود بن اسمٰعیل رحمه الله: لا تصیر دار حرب الا باجراء احکام الشرک واتصالها بدار الحرب بان لا یکون بینها وبین دار الحرب مصر للمسلمین وان لا یبقی فیها مسلم او ذمی آمنا علی نفسه بالامان الاول لا یبقی آمنا الا بامان المشرکین وعندهما باجراء احکام الشرک تصیر دار حرب اتصلت او لا و بقی احد بالامان الاول او لا

(جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۳ کتاب السیر) [2]

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی مملکت میں جب غیر مسلم رہائش پذیر ہوں تو کیا ان کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیر مسلموں کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جا سکتی، البتہ ان کی سابقہ عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

---

[1] وقال العلامة التمرتاشی رحمه الله: لا تصیر دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلاثة باجراء احکام اهل الشرک وباتصالها بدار الحرب وبان لا یبقی فیها مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۲۷۷ کتاب الجهاد، فصل استئمان الکافر)

ومثله فی الهندیة علی هامش الهندیة ج ۲ ص ۳۱۲ کتاب السیر باب الرابع فی المرتد وما یصیر الکافر به مسلماً۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ولا یحدث بیعةٌ ولا کنیسةٌ ولا صومعةٌ ولا بیت نار ولا مقبرةٌ فی دار الاسلام ولو قریة فی المختار۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۲۹۶ کتاب الجهاد، فصل فی الجزیة)[1]

دارالاسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا حکم

سوال:۔ آجکل مملکتِ خداداد پاکستان میں عیسائی کھلے عام بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مسلم دارالاسلام میں اپنے مذہب کی آزادی سے تبلیغ کرتے پھریں؟

الجواب:۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر مسلم آزادی سے مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے بلکہ مسلمان حاکمِ وقت پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں اس عمل سے باز رکھے، جہاں تک دارالاسلام میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا تعلق ہے تو وہ صرف ان کے ہم مذہبوں تک محدود ہے یہاں تک کہ وہ بلند آواز سے اپنی مذہبی کتاب کی تلاوت بھی نہیں کرسکتے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: وقد حکی ابن تیمیةؒ اجماع الفقهاء وسائر الائمة رحمهم الله علی مراعاة تلک الشروط قال ولولا شهرتها عند الفقهاء لذکرنا الفاظ کل طائفة فیها..... ومن جملة الشروط ما یعود باخفاء منکرات دینهم وترک اظهارها کمنعهم من اظهار الخمر والناقوس والنیران والاعیاد ونحو ذٰلک ومنها ما یعود باخفاء شعائر دینهم کاصواتهم بکتابهم۔

{اعلاء السنن ج۱۲ ص۴۸۸ باب شروط اهل الذمة
وما یجوز لهم فی دارنا وما لا یجوز لهم}

---

[1] وقال العلامة الکاسانی رحمه الله: واما الکنائس والبیع القدیمة فلا یتعرض لها ولا یهدم شیءٌ منها واما احداث کنیسة أُخری یمنعون عنه فیما صار مصراً من امصار المسلمین لقوله علیه السلام لا کنیسة فی الاسلام الا فی دار الاسلام۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۴ کتاب السیر)

وَمِثلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۴۷ کتاب السیر، الباب الثامن فی الجزیة۔

باب معاملات مع الکفار

(غیرمسلموں کے ساتھ معاملات کے احکام و مسائل)

غیرمسلم کو سلام کرنا

سوال: میں ایک غیرمسلم کمپنی میں ملازم ہوں وہاں میرے کچھ عیسائی اور ہندو دوست ہیں، کیا میں اُن کو سلام کرسکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب: کسی بھی غیرمسلم پر سلام کی ابتداء ممنوع ہے کیونکہ کسی کو سلام میں پہل کرنے سے درحقیقت اس شخص کی عظمت پیش نظر ہوتی ہے جبکہ مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کسی غیرمسلم کی عزت و عظمت اس پر غالب رہے، تاہم بوقتِ ضرورت اسے مناسب الفاظ سے سلام کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: و یحرم تعظیمه وتکره مصافحة ولا یبداء بالسلام الّا لحاجة۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۸۲ کتاب الجہاد) [1]

غیرمسلم کے سلام کا جواب دینا

سوال: غیرمسلم کے سلام کا جواب دینے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کو سلام کا جواب دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: غیرمسلم کے سلام کے جواب میں صرف وعلیك کہنا کافی ہے، تاہم اگر کسی غیرمسلم کے سلام کے جواب میں اللہ سے اس کی ہدایت کا طالب ہوکر یوں جواب دیا جائے السلام علیٰ من اتّبع الهدیٰ تو بہتر ہے۔

لما فی الهندیة: واذا کان له حاجة فلا بأس بردّ سلام علیٰ اهل الذمة

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: وفی السیر لا بأس بردّ سلام اهل الذمة والنهی عن البدأة الا اذا کان محتاجًا الیه فلا بأس بها ایضًا ولکن یکره مصافحهم۔ (الفتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۵۵ کتاب الکراهیة۔ فصل نوع فی السلام)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۱۳ کتاب الجهاد۔ فصل فی الجزیة۔ فروع فی الجزیة۔

ولکن لایزاد علیٰ قوله وعلیکم۔ قال الفقیه ابواللیثؒ ان مررت بقوم وفیهم کفار فانت بالخیار انهٔ شئت قلتُ السلام علیکم وتریدبه المسلمین وان شئت قلت السلام علیٰ من اتبع الهدیٰ کذا فی الذخیرة۔ (الفتاوی الہندیة ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراہیة۔ الباب السابع فی السلام الخ) [1]

غیرمسلموں کو عبادت خانے کی طرف راہبری کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیرمسلم کسی مسلمان سے اپنی عبادت کی جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس بارے میں غیرمسلم کی رہبری کرے؟

الجواب:۔ چونکہ ایسے امور میں کسی غیرمسلم کی رہبری کرنے سے اس کی اصلاح کے جگہ بے دینی اور کفر کو تقویت ملنے کا امکان ہے، اس لیے کسی غیرمسلم کے ساتھ ایسے معاملات میں تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے۔

قال الله تبارك وتعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (سورة المائدة آیت ۲)

وقال العلامة قاضی خانؒ: ذمّی سأل مسلماً عن طریق البیعة لاینبغی للمسلم ان یدله علیٰ ذٰلك لانهٗ اعانة علی المعصیة۔ (فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۵۹۱ الباب الثالث فی الوکالة بالبیع۔ کتاب الوکالة) [2]

غیرمسلم کی عزّت وتوقیر کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیرمسلم کسی مسلمان کے پاس مہمان بن کر آئے تو مسلمان کا اس کی عزت واحترام کے لیے

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: اذا سلم الیهودی أو النصرانی أو المجوسی علیٰ مسلم۔ قال محمد رحمه الله: یقول المسلم وعلیك ینوی بذٰلك السلام لحدیث مرفوع الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال اذ سلموا علیکم فردوا علیهم۔ (فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۳ کتاب الکراہیة)
ومِثلُهٗ فی الدرالمختار علیٰ هامش ردّالمحتار ج۳ ص۲۸۳ کتاب الجهاد۔

[2] وفی الهندیة: ذمی سأل مسلما عن طریق البیعة لاینبغی للمسلم ان یدله علیٰ ذٰلك لانهٗ اعانة علی المعصیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۲۵۰ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیة)
ومِثلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۵۹ کتاب الکراهیة الثالث فیما یتعلق بالمناهی۔

محفل میں کھڑے ہو جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلموں سے مدارات یعنی معاشرتی تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر یہ اٹھنا بیٹھنا معاشرہ میں بلا امتیاز مذہب وعقیدہ کسی مہمان کا حق سمجھا جاتا ہو تو ایسی حالت میں یہ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، نیز کسی غیر مسلم کے شر وفساد سے بچنے کے لیے بھی اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرنا جائز ہے بلکہ ایسے تعلقات سے اگر یہ توقع ہو کہ وہ (غیر مسلم) اسلام قبول کرلے گا تو پھر اسے فرائض منصبی کا تقاضا سمجھے، تاہم اگر اس سے غیر مسلم کے مذہب وعقیدہ یا اس کے کسی غیر اسلامی شعار کی عزت وتوقیر مقصود ہو تو پھر ایک مسلمان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وجب علی المسلم عدم تعظیم الکی قال فی الذخیرة اذا دخل یهودی الحمام ان خدمه المسلم طمعًا فی فلوسه فلا بأس به وان تعظیمًا له فان کان لیمیل الی الاسلام فکذلك وان لم ینوِ شیئًا کره وان قام تعظیمًا لذاته وما هو علیه کفر لان رضا بالکفر کفر فکیف بتعظیم الکفر قلت وبه علم انه لو قام له خوفًا من شره فلا بأس بل اذا تحقق الضرورة فقد یجب وقد یستحب علی حسب حال ما یتوقعه۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۸۳ کتاب الجهاد)[1]

غیر مسلموں کے برتنوں میں کھانا پینا

سوال:۔ ایک مسلمان کے لیے کفار اور مشرکین کے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دھو لیا جائے دھونے سے پہلے ایسے برتنوں میں کھانا پینا مکروہ ہے تاہم اگر دھوئے بغیر ان میں کھا پی لیا جائے تو جائز مع الکراہۃ ہے اور ایسا کرنے والا حرام کھانے پینے والوں میں شمار نہ ہوگا بشرطیکہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو، اور اگر علم ہو تو دھونے سے پہلے ان برتنوں میں

---

[1] وفی الهندیة: اذا دخل ذمی علی مسلم فقام له ان قام طمعًا فی میله الی الاسلام فلا بأس به وان فعل ذلك تعظیمًا له من غیر ان ینوی شیئًا مما ذکرنا او قام طمعًا لغناه کره له ذلك۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحکام الخ)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۱۴ کتاب الجهاد۔

کھانا پینا جائز نہیں۔

لقوله علیه الصلوٰة والسلام: تأکل فی اٰنیتهم فان وجدتم غیر اٰنیتهم فلا تأکلوا فیها فان لم تجدوا فاغسلوها ثم کلوا فیها۔ (صحیح بخاری ج ٢ ص ٨٢٥ کتاب الذبائح۔ باب ما جاء فی الصید) [1]

غیر مسلموں کے ساتھ کھانا پینا

سوال:۔ غیر مسلموں کے ساتھ ایک برتن میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلموں میں جب تک کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو ان کے ساتھ ایک برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اعتقادی اختلاف باعثِ کراہت ہے۔

وفی الهندیة: ولم یذکر محمدؒ الاکل مع المجوس ومع غیره من اهل الشرک انه هل یحل ام لا وحکی عن الحاکم الامام عبد الرحمٰن الکاتب انه ان ابتلی به مسلم مرة او مرتین لا بأس به واما الدوام علیه فیکره کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج٥ ص٣٤٧ کتاب الکراهیة۔ الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحکام التی تعود الیهم) [2]

غیر مسلم کی ملازمت کرنا

سوال:۔ پاکستان سے کئی لوگ امریکہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں روزگار کے سلسلہ میں جاتے ہیں اور وہاں غیر مسلموں کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، تو کیا غیر مسلموں کے ہاں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم کی ملازمت کرنا اس طور پر کرنا کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں

---

[1] قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ: والاکل والشرب فی اوانی المشرکین یکره والاکل مع الکفار لو ابتلی به المسلم لا بأس لو مرة او مرتین اما الدوام علیه یکره۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ٦ ص ٣٥٩ کتاب الکراهیة۔ الثالث فیما یتعلق بالمناهی)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ٥ ص ٣٤٧ کتاب الکراهیة۔ الباب الرابع عشر فی اهل الذمة۔

[2] قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ: والاکل مع الکفار لو ابتلی به المسلم لا بأس لو مرة او مرتین اما الدوام علیه یکره۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ٦ ص ٣٥٩ کتاب الکراهیة۔ الثالث فیما یتعلق بالمناهی)

کی توہین نہ ہوتی ہو جائز ہے اور اگر اس میں اسلام یا مسلمانوں کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو پھر ایسی ملازمت کرنا جائز نہیں۔

لما فی الحدیث: لان خباب بن الارثؓ عمل لعاص بن وائلؓ باجرة ولم ینکر علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۳۰۲ باب الاجارۃ)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کا حکم

سوال: غیر مسلموں مثلاً ہندوؤں وغیرہ کے متروکہ مال کا صحیح مصرف کیا ہے؟ علاوہ ازیں جو غیر مسلم ایک جگہ سے چلے جائیں اور ان کے املاک وہاں رہ جائیں تو از روئے شریعت اس کا صحیح مصرف کیا ہے؟

الجواب: غیر مسلموں کا متروکہ مال بیت المال میں جمع کرنا چاہیئے، اسی طرح جو مال بلا جنگ کے کفار سے حاصل ہو یا جو مال مسلم عاشر لیتا ہے اس کا صحیح مصرف مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کرنا ہے، مثلاً سرحدوں کی حفاظت پر خرچ کرنا، دریاؤں اور نہروں پر پل بنانا، علماء، طلباء اور قاضیوں کے وظائف، اسلامی فوج کی تنخواہیں اور ان کے اہل و عیال کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنا وغیرہ۔

قال العلامة محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومصرف الجزیة والخراج ومال التغلبی وهدیتهم للامام وانما یقبلها اذا وقع عندهم ان قتالنا للدین لا الدنیا جوهرة وما اخذ منهم بلا حرب ومنه ترکة ذمی وما اخذه عاشر منهم ظهیریة مصالحنا۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۰۶ باب العشر والخراج والجزیۃ)[2]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: المسلم اذا اجر نفسه من الکافر لیخدمه جاز ویکره قال الفضلؒ لایجوز فی خدمته ومافیه اضلال بخلاف الزراعة والسقی۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارۃ) — ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۵ ص۱۲۵ کتاب الاجارۃ۔

[2] وقال الامام عبد اللہ بن احمد حافظ الدین النسفیؒ: وما اخذ منهم بلا قتال یصرف فی مصالحنا کسد الثغور وبناء القناطیر والجسور۔

(کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۱۷ کتاب الجهاد)

ومثله فی الهدایة ج۲ ص۵۹۹ کتاب الجهاد۔

اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ کسی ایسے ملک میں جہاں شرعی طریقہ سے جانور ذبح نہ ہوتے ہوں مسلمانوں کے لیے وہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا کیسا ہے؟

الجواب: اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے چاہے ذبح کرنے والا ہندو ہو یا سکھ، مجوسی ہو یا پارسی، کسی حال میں بھی ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

قال العلامة ابو بكر الحداد اليمنيؒ: ولا توكل ذبيحة المجوسي والمرتد والوثني لان المرتد لا ملة له والوثني مثله واما المجوس فلقوله عليه السلام سنوا بهم سنة اهل الكتاب غير ناكحي نساءهم ولا آكلي ذبائحهم الحديث۔

(الجوهرة النيرة ج۲ ص۲۴۶ كتاب الذبائح)[1]

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو کہاں تک مذہبی حقوق حاصل ہیں؟ کیا وہ دارالاسلام اپنی مذہبی عبادت و رسومات ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: کسی بھی اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ حاصل ہے لیکن اگر وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقریر و تحریر کا طریقہ اختیار کریں تو انہیں اس سے منع کیا جائے گا۔

لما فى الهندية: وليس للنصارى ان يضرب فى منزله بالناقوس فى مصر المسلمين ولان يجمع فيه بهم انما له أن يصلي فيه ولا ان يخرجوا الصليب او غير ذٰلك من كنائسهم ولو رفعوا اصواتهم بقراءة الزبور والانجيل ان كان فيه اظهار الشرك منعوا عن ذٰلك وان لم يقع بذٰلك اظهار الشرك لا يمنعون ويمنعون عن قراءة ذٰلك

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: لا مجوسي ووثني ومُرتد ومحرم وتارك التسمية عمدًا يعني لا تحل ذبيحة هٰؤلاء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۶۸ كتاب الذبائح)
وَمِثلُهٗ فى الهداية ج۴ ص۴۳۳ كتاب الذبائح۔

فی اسواق المسلمین۔ (الفتاوی الهندية ج ٢ ص ٢٥١ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزية)

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم ممالک سے گوشت، ذبح شدہ مرغی، گھی اور دودھ وغیرہ سے بنی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں درآمد کی جاتی ہیں جبکہ گوشت کے ڈبے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اُس کو اسلامی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہے"۔ کیا ایک مسلمان کے لیے ان چیزوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گوشت کے علاوہ جو حلال چیزیں غیر مسلم ممالک سے آتی ہوں اور ان میں حرام چیزیں مثلاً شراب یا سُور (خنزیر) کے اجزاء شامل نہ ہوں تو ان چیزوں کا کھانا پینا جائز ہے، البتہ اگر گوشت کے ڈبے پر اسلامی طریقہ سے ذبح ہونے کے لکھے ہوئے الفاظ صحیح ہوں تو پھر اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور اگر دوسرے قرائن اور ذرائع سے ان الفاظ کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو پھر ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں۔

وفی الهندية: من ارسل اجیرا له مجوسیا او خادما فاشتری لحما فقال اشتریته من یهودی او نصرانی او مسلم وسعه اکله ...... رجل اشتری لحما فلما قبضه فاخبره مسلم ثقة انه قد خالطه لحم الخنزیر لم یسعه ان یاکله۔[2]
(الفتاوی الهندية ج٥ ص٣٠٨، ٣٠٩ کتاب الکراهية، الباب الاول)

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: ولیس للنصرانی انه یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر من امصار المسلمین۔
(الفتاوی التاتارخانية ج ٥ ص٢٥١ کتاب الخراج)
ومثله فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج٣ ص٥٨٩ کتاب السیر، فصل فی اهل الذمة۔

[2] وقال العلامة فخر الدین حسن بن منصور رحمه الله: مسلم اشتری لحما وقبضه فاخبره مسلم ثقة انه ذبیحة المجوس فانه لا ینبغی للمشتری ان یاکل ولا یطعم غیره لان المخبر اخبر بحرمة العین وبطلان الملک۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندية ج٣ ص٤٠٦ الباب السادس والعشرون)
ومثله فی رد المحتار ج٥ ص٢٢٣ کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء۔

اسلامی ملک میں غیر مسلموں کا نئی عبادت گاہ بنانا

سوال:۔ دار الاسلام میں غیر مسلم اپنے لیے نئی عبادت گاہ تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ دار الاسلام میں غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تاہم پرانی عبادت گاہیں باقی رکھ سکتے ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ بھی کر سکتے ہیں لیکن کسی بھی قدیم عبادت گاہ میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی شہر میں غیر مسلموں کی کوئی عبادت گاہ ویران ہو جائے تو اسے از سر نو آباد کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

كما في الهندية: ان اراد اهل الذمة احداث البيع والكنائس او المجوس احداث بيت النار ان ارادوا ذلك في امصار المسلمين وفيما كان من فناء المصر منعوا عن ذلك عند الكل۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۴۷ كتاب السير، الباب الثامن في الجزية) [1]

غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا

سوال:۔ چند دن قبل برطانیہ کی شہزادی پاکستان آئی تو اس کو حکومت کی سرپرستی میں لاہور کی بادشاہی مسجد میں لایا گیا، تو کیا کوئی غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کافر حالتِ جنابت میں نہ ہو اور اس کے بدن پر کوئی ایسی ظاہری نجاست بھی نہ ہو جو مسجد کے آداب کے خلاف ہو تو پھر اس کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

كما في الهندية: لا بأس بدخول اهل الذمة المسجد الحرام وسائر المساجد وهو الصحيح كذا في المحيط السرخسيؒ۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۴۶ كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر) [2]

---

[1] قال العلامة التمرتاشيؒ: ولا يجوز ان يحدث بيعة ولا كنيسة ولا صومعة ولا بيت نار ولا مقبرة۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۲ كتاب السير)
وَمثلهٗ في فتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج۳ ص۵۹۰ كتاب السير فصل في اهل الذمة ما يؤخذ منه الخ

[2] قال العلامة ابن عابدينؒ: ان الامام السرخسيؒ ذكر في شرح السير الكبير ان ابا سفيان جاء الى المدينة ودخل المسجد ولذلك قصة قال فهذا دليل لنا على مالكؒ بمنعه المشرك من ان يدخل شيئا من المساجد ثم قال ان الشافعيؒ قال يمنعونه من دخول المسجد الحرام خاصة للآية اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فاما عندنا لا يمنعون كما لا يمنعون عن دخول سائر المساجد ويستوي في ذلك الحربي والذمي۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۰۱ كتاب الجهاد، باب العشر والخراج والجزية) — وَمثلهٗ في البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۷۱ كتاب الكراهية۔

مساجد میں غیر مسلم کا چندہ استعمال کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر اور مرمت کے لیے چندہ دے تو کیا وہ چندہ مسجد میں لگایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کافروں کا چندہ دینے میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا احتمال نہ ہو اور ان کے مذہب میں اس کی حیثیت قربت اور ثواب کی ہو اور وہ بھی ثواب کی نیت سے دیں تو پھر قبول کرنا اور مسجد کی تعمیر و مرمت پر خرچ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ حنفیہ کے مذہب میں کافر کے وقف کی صحت میں یہ شرط ہے کہ وہ ہمارے اور ان کے نزدیک قربت کا ذریعہ ہو پس ظاہر ہے کہ کفار کا چندہ مسجد میں صرف کرنا اہل اسلام کے نزدیک تو قربت ہے، کفار و ہنود مساجد میں جو کچھ دیتے ہیں وہ اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں، لیکن عصر حاضر میں غیر مسلموں کی امداد برائے مساجد عموماً مسلمانوں کو کسی نہ کسی مخمصہ سے دوچار کرنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: ان شرط وقف الذمي ان يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء او على مسجد القدس بخلاف الوقف على بيعة فانه قربة عندهم فقط او على حج او عمرة فانه قربة عندنا فقط فافاد ان هذا شرط لوقف الذمي فقط لان وقف المسلم لا يشترط كونه قربة عندهم بل عندنا كوقفنا على حج وعمرة بخلافه على بيعة فانه غير قربة عندنا بل عندهم۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۳۹۴ کتاب الوقف)[1]

ہندوؤں کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد میں ایک مندر بھی ہے بعض مسلمانوں کا ارادہ ہے کہ اس کی جگہ مسجد بنا دی جائے، تو کیا ہندوؤں کی متروکہ عبادت گاہ

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: واما الاسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم كما وقف على اولاده او على الفقراء۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۹ کتاب الوقف)
ومثله في الهندية ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف۔

کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ مسلمانوں کی عبادت کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں، کرۂ ارض پر کسی جگہ بھی نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن ہندوؤں کے عبادت خانے کو جوں کا توں رکھ کر اس کو بطور مسجد کے استعمال کرنے سے چونکہ ان کے عبادت خانے کی عظمت و برتری قائم رہنے کا شبہ ہے لہٰذا اسے بطور مسجد استعمال کرنا جائز نہیں تاہم اگر اس کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حدیث میں ہے، عن طلق بن علیؓ قال خرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معه واخبرناہ انّ بارضنا بیعة لنا فاستوهبناہ من فضل طهورہٖ فدعا بماء فتوضأ وتمضمض ثم صبّه لنا فی اداوة وامرنا فقال اُخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانها بهذا الماء واتخذوها مسجدا قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مُدّوه من الماء فانه لا یزیدہٗ الا طیبا، رواه النسائی ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۶۹ باب المساجد) [1]

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی خوشی وغیرہ کے موقعہ پر مسلمانوں کو دعوت دے اور اس کے ساتھ خوراک کے حلال ہونے کی یقین دہانی بھی کرا دے تو کیا مسلمانوں کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اس دعوت کی وجہ سے اسلام متاثر نہ ہوتا ہو تو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، خاص کر اس دعوت میں جہاں پر خوراک کی حلت کی یقین دہانی بھی ہو۔

لما فی الهندیة: ولا بأس بالذهاب الی ضیافة اهل الذمة هکذا ذکر محمدؒ

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن طلق بن علی قال خرجنا وفدا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معه واخبرناہ ان بارضنا بیعة لنا فاستوهبناہ من فضل طهورہٖ الحدیث۔
(سنن النسائی ج ۱ ص ۷۲ کتاب المساجد)
ومثلهٗ فی مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ) ج ۱ ص ۶۹ کتاب الصلوٰۃ ۔ ابواب المساجد۔

وفی اُضحیة النوازل المجوس او النصرانی اذا دعا رجل الی طعامه تکره الاجابة وان قال اشتریت اللحم من السوق فان کان الداعی نصرانیاً فلا بأس به۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۴۷ کتاب الکراهیة، الباب الرابع عشر)[1]

مسلمانوں کا غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا

سوال:- کیا مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے لیکن یہ مکروہ اس لیے نہیں کہ مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں بلکہ اسلئے نہیں کہ یہ عبادت گاہیں شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہیں۔

کما فی الهندیة: یکره للمسلم الدخول فی البیعة والکنیسة وانما یکره من حیث انهٗ مجمع الشیاطین لامن حیث انهٗ لیس لهٗ حق الدخول۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة۔ الباب الرابع عشر)[2]

قادیانیوں سے لین دین کرنے کا حکم

سوال: مسلمانوں کے لیے قادیانیوں کے ساتھ لین دین یعنی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ غیر مسلموں سے دنیاوی معاملات کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بسا اوقات ان کے کفریہ عقائد مخفی رہ جاتے ہیں، اس لیے یہ مرتدین کے حکم میں ہو کر ان سے کسی قسم کی تجارت کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ویزیل ملك المرتد عن امواله بردته

---

[1] قال الامام ابن البزاز الکردریؒ: وان اجابة الدعوة ولو لاهل الذمة سنة۔
(البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص۳۳۳ السادس فی التشبیه)

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: ویکره للمسلم الدخول فی البیعة والکنیسة۔
(رد المحتار ج ۶ ص۳۸۷ کتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی البیع)

زوالا مراعی فان اسلم عادت الی حالہا۔ (الہدایۃ ج۲ ص۶۰۱ کتاب السیر)[1]

مُرتد کے ساتھ تعلقات قائم کرنا

سوال:۔ جو شخص اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے تو اس سے دوستی اور محبت رکھنا اور خندہ پیشانی سے ملنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وہ شخص جو دینِ اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے مرتد ہے، اس سے تعلقات اور میل جول رکھنا صحیح نہیں، اسی طرح اس سے خندہ پیشانی سے پیش آنا، مصافحہ کرنا، ملنا جلنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا، رشتۂ عقد و مناکحت قائم کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

کما قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیہ الاسلام استحبابا..... وتکشف شبہتہ ویحبس وجوبا ثلاثۃ ایام فان اسلم فبہا والا قتل لحدیث من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب العشر والخراج والجزیۃ)[2]

قادیانی کا چندہ مسجد میں لگانا

سوال:۔ اگر کوئی قادیانی مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں وغیرہ دے تو کیا ان اینٹوں کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قادیانی چونکہ مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور مُرتد کے حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے تصرفات موقوف ہوتے ہیں، اگر وہ دوبارہ مسلمان ہو جائے تو حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے اس کے تصرفات صحیح ہو جائیں گے اور اگر وہ حالتِ ارتداد

---

[1] قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: ویزول ملك المرتد عن مالہ زوالا موقوفاً فان اسلم عاد ملکہ۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۱۲ کتاب الجہاد۔ احکام المرتدین۔

[2] وقال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبہتہ ویحبس ثلاثۃ ایام فان اسلم والا قتل۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی الہندیۃ ج۲ ص۲۵۳ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیۃ۔

یں ہی مر جائے یا قتل کر دیا جائے یا دارالحرب چلا جائے تو حالتِ ارتداد کے تصرفات باطل ہو جائیں گے۔ لہٰذا کسی بھی قادیانی مُرتد کی طرف سے دی ہوئی اینٹیں اور دوسرا تعمیراتی سامان مسجد میں لگانا جائز نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: وما باعه او اشتراه او اعتقه او وهبه او رهنه او تصرف فیه من امواله فی حال ردته فهو موقوف فان اسلم صحت عقوده وان مات او قتل او لحق بدارالحرب بطلت۔

(الهداية ج۲ ص۶۰۳ کتاب الجهاد، باب المرتد)[1]

قادیانی کی نماز جنازہ کا حکم

سوال:- میرے رشتہ داروں میں ایک شخص قادیانی ہے، اس کے مرنے کے بعد میرے لیے اس کے جنازہ میں شرکت کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ قادیانی مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں، اس بنا پر ان میں سے کسی کی بھی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہی قادیانیوں کے مذہب کے مطابق موت کی رسومات میں ان کے ساتھ شامل ہونا جائز ہے، اور اگر ایسے رشتہ دار کی تدفین کے لیے اس کا ہم مذہب کوئی آدمی نہ ہو تو تدفین کے شرعی طریقہ سے ہٹ کر صرف زمین میں گڑھا کھود کر اسے دفن کیا جائے گا۔

کما قال العلامة علاؤالدین الحصکفیؒ: اما المرتد فیلقی فی حفرة کالکلب۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۱ ص۶۵۷ باب صلوٰة الجنازة)[2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ رحمہ اللہ: وتوقف مبایعته وعتقه وهبته فان آمن نفذ وان هلك بطل بیان لتصرف حال ردته بعد بیان حکم املاکه قبل ردته

(البحر الرائق ج۵ ص۱۳۳ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۲ باب احکام المرتدین۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفیرة کالکلب ولا یدفع الیٰ من انتقل الیٰ دینهم۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل السلطان احق بصلوٰته)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۱۹۵ کتاب الجنائز۔

قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا حکم

سوال:۔ قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قادیانی ضروریاتِ دین سے انکار کی بنا پر کافر اور مرتد ہیں اُن کو اہلِ اسلام کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔

کما قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفیرۃ کالکلب ولا یدفع الی من انتقل الی دینھم۔
(البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل فی السلطان احق بصلاتہ)[1]

قادیانی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا

سوال:۔ اگر کوئی شخص قادیانی ہو اور اس کا بیٹا مسلمان ہو تو بیٹے کے فوت ہو جانے کے بعد باپ اس کے مال میں میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قادیانی اور مسلمان ایک دوسرے کی میراث کے حقدار نہیں بن سکتے مذکورہ بالا صورت میں قادیانی مرتد کی میراث بیت المال میں داخل کی جائے گی، اسی طرح کوئی قادیانی کسی مسلمان کی میراث میں حقدار نہیں بن سکتا بلکہ مسلمان کی میراث اس کے مسلمان ورثاء میں قاعدہ شرعی کے مطابق تقسیم ہوگی۔

لما قال الشیخ سراج الدین السجاوندیؒ: واما المرتد فلا یرث من احد لا من مسلم ولا من مرتد مثلہ۔ (السراجی ص ۷۵ فصل فی المرتد)[2]

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: اما المرتد فیلقی فی حفرۃ کالکلب۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۷ باب صلوٰۃ الجنازۃ)
ومثلہ فی فتح القدیر ج ۲ ص ۹۴ کتاب الجنائز۔

[2] قال فی الهندیۃ: المرتد لا یرث من مسلم ولا من مرتد مثلہ کذا فی المحیط۔ (الفتاویٰ الهندیۃ ج ۶ ص ۴۵۵ الباب السادس فی میراث اهل الکفر)
ومثلہ فی الخانیۃ علیٰ هامش الهندیۃ ج ۳ ص ۵۸۱ کتاب الفرائض۔

مرتد کی میراث کا حکم

سوال:- اگر مرتد دار الاسلام میں مرجائے تو اس کا ترکہ مسلمان ورثاء کو ملے گا یا مرتد ورثاء کو؟ اور اگر دار الحرب میں مرجائے تو پھر ترکہ کس کو ملے گا؟

الجواب:- اگر مرتد دار الاسلام میں مرجائے یا قتل ہوجائے تو حالتِ اسلام کا کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد میں کمایا ہوا مال مالِ فئے میں شمار ہوکر بیت المال میں داخل کیا جائے گا، اور اگر دار الحرب میں مرجائے تو حالتِ اسلام میں کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد کا کمایا ہوا مال مرتد ورثاء کے مابین تقسیم ہوگا۔

قال العلامة المرغینانیؒ: وان مات او قتل علی ردته انتقل ما اکتسبه فی اسلامه الی ورثته المسلمین وکان ما اکتسبه فی حال ردته فیئا۔ (الهدایة ج۲ ص۶۰۱ باب احکام المرتد)[1]

مرزائی کی دعوتِ طعام قبول کرنا

سوال:- ہمارے محلے میں چند مرزائی رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی کسی خوشی کے موقع پر دعوت کرتے ہیں اور اس میں ہم مسلمانوں کو بھی بلاتے ہیں، کیا مرزائیوں کی دعوت کو قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مرزائی مرتد ہوکر واجب القتل ہیں، اس لیے مرتد سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا یا اس کے ہاں دعوت کھانا جائز نہیں۔

لما قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبهته ویحبس ثلاثة ایام فان اسلم والا قتل۔ (کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)[2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ وابن عابدینؒ: وان مات او قتل علی ردته او حکم بلحاقه ورث کسب اسلامه وارثه المسلم ولو زوجته بشرط العدة (زیلعی) بعد قضاء دین اسلامه وکسب ردته فیء بعد قضاء دین ردته الخ اما ما اکتسبه فی دار الحرب فهو لابنه الذی ارتد ولحق معه اذا مات مرتدا لانه اکتسبه وهو من اهل الحرب وهم یتوارثون فیما بینهم۔ (الدر المختار ورد المحتار ج۳ ص۳۲۸، ۳۲۹ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰، ۱۳۱ باب احکام المرتدین۔

[2] قال العلامة محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیه الاسلام استحبابا ...... وتکشف شبهته ...... ویحبس وجوبا ثلاثة ایام فان اسلم فیها والا قتل لحدیث من بدل دینه فاقتلوه۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۵۳ الباب الثامن فی الجزیة۔

شیعہ کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا حکم

سوال:- جو شخص حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہو، حضرت جبرئیل کی غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا قائل ہونے کے علاوہ امام مہدی کے خروج تک تمام اسلامی احکام کو معطل سمجھتا ہو ایسے شخص کا حکم کیا ہے، کیا ایسے شخص کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جو شخص الوہیتِ علیؓ کا عقیدہ رکھتا ہو اور حضرتِ جبرائیلؑ کو غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا معتقد ہو اور تمام اسلامی احکام کو خروجِ امام تک معطل سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور ایسے شخص کا حکم مرتد کی طرح ہے۔

كما في الهندية: ويجب اكفار الروافض في قولهم برجعة الاموات الى الدنيا وبتناسخ الارواح وبانتقال روح الاله الى الائمة وبقولهم في خروج امام باطن وبتعطيلهم الامر والنهي الى ان يخرج الامام الباطن وبقولهم ان جبرائيلؑ غلط في الوحي الى محمد صلى الله عليه وسلم دون علي بن ابي طالبؓ وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين. كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۶۴ كتاب السير الباب التاسع)

اور مرتد کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا مذبوحہ کھانا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات رکھنا ہرگز جائز نہیں۔

قال العلامة المرغيناني رح: ويزيل ملك المرتد عن امواله بردته زوالا مراعى فان اسلم عادت الى حالها..... وباطل بالاتفاق كالنكاح والذبيحة لانه يعتمد الملة ولا ملة له. (الهداية ج۲ ص۶۰۲ تا ۶۰۳ باب احكام المرتد، كتاب الجهاد)[1]

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاري رح: ويجب اكفار الروافض في قولهم يرجع الاموات الى الدنيا وبانتقال الاموات وتناسخ الارواح وانتقال روح الاله الى الائمة وان الائمة الهة وقولهم في خروج امام باطن وبتعطيلهم الأمر والنهي الى ان يخرج الامام الباطن ..... وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين. (الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۵۳۸ كتاب احكام المرتدين)

وَمِثْلُهٗ في فتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج۲ ص۳۱۸ كتاب الفاظ تكون اسلاما او كفرا الخ

شیعہ کا مال جبراً لینے کا حکم

سوال:۔ شیعوں کے اموال جبراً یا چوری کر کے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ شیعہ کے بعض فرقے غیر مسلموں کے حکم میں ہیں لیکن حربی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اموال محفوظ رہیں گے، ان کے اموال کی چوری کرنا یا جبراً لینا جائز ہے یا نہیں؟

قال العلامة الحصکفیؒ: اذا صار ذمیا یجری القصاص بینه وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمرة وخنزیره اذا تلفه وتجب الدیة علیه اذا قتله خطاء ویجب کف الاذی عنه۔ وقال ابن عابدینؒ۔ قید بالمستأمن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان هو وما معه فیأ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۷۲ باب المستأمن۔ کتاب الجهاد)[1]

شیعہ پر نماز جنازہ پڑھنا

سوال:۔ جو شیعہ ضروریات دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا اہل سنت والجماعت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعوں میں سے جو شخص ضروریات دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں البتہ جس کے عقائد کفریہ نہ ہوں اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة: ولو قذف عائشة رضی الله عنها بالزنی کفر بالله ...... من انکر امامة ابی بکر الصدیق رضی الله عنه فهو کافر۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۲۶۴ کتاب السیر الباب التاسع فی احکام المرتدین)[2]

---

[1] وفی الهندیة: وتثبت احکام الذمی فی حقه من منع الخروج الی دار الحرب وجریان القصاص بینه وبین المسلم وضمان المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا تلفه ووجوب الدیة اذا قتل خطاء ووجوب کف الاذی عنه۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۲۳۵ کتاب السیر الباب الثامن فی المستأمن)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۱ کتاب السیر۔ باب احکام المرتد۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وبقذف عائشة رضی الله عنها من نسائه صلی الله علیه وسلم فقط وبانکاره صحبة ابی بکر رضی الله عنه الخ

(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۱ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۳ ص ۳۲۱ کتاب الجهاد، باب احکام المرتد۔

مسلمان کو کافر کی میراث نہیں مل سکتی

سوال :۔ مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے میراث لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ چونکہ اختلافِ دین وعقیدہ مانعِ ارث ہے، اس لیے کافر مسلمان کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی مسلمان کو کافر کی میراث دی جا سکتی ہے ۔

لما قال شیخ الاسلام محمد بن عبد اللّٰہ التمرتاشیؒ : وموانعه الرق والقتل واختلاف الدین ۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج٥ ص٥٤٢ کتاب الفرائض)[1]

کفار کے لیے دعائیں کرنا

سوال :۔ اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دعا کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اے اللّٰہ مسلمانوں پر رحم فرما اور کفار کو نیست و نابود فرما۔ تو کیا اس قسم کی دعائیں کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اس قسم کی دعاؤں کی صحت میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ مسلمانوں کی طرح کفار بھی رحم کے مستحق ہیں ان کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرنی چاہیئے۔ ہمارے اکابرین کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے وہ اپنی دعاؤں میں کفار کے لیے بھی رحم کی دعاء کیا کرتے تھے ۔

وذکر العلامة مسلم بن الحجاج القشیریؒ، عن ابی کثیر قال حدثنی ابو هریرةؓ قال کنت ادعو أمی الی الاسلام وهی مشرکة فدعوتها یوماً فاسمعتنی فی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ما اکرہ فاتیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وانا ابکی قلتُ یا رسول اللّٰہ انی کنت ادعوا أمی الی الاسلام فتابی علیّ فدعوتها الیوم فاسمعتنی فیك ما اکرہ فادع اللّٰہ ان یهدی أمّ ابی هریرة فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اللّٰهم اهد أمّ ابی هریرة ۔۔الخ (الجامع الصحیح المسلم ج ٢ ص٣٠٠ کتاب الفضائل باب فضائل ابی هریرة)[2]

---

[1] قال العلامة السجاوندی رحمه اللّٰہ : المانع من الارث اربعة الرقّ والقتل ۔۔۔۔ واختلاف الدین۔ (السراجی ص٥ فصل فی موانع الارث)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج٨ ص٣ کتاب الفرائض ۔

[2] وذکر العلامة ابو عیسی الترمذیؒ : عن جابرٍ قالوا یا رسول اللّٰہ احرقتنا نبال ثقیف فادع اللّٰہ علیهم فقال اللّٰهم اهد ثقیفا۔ (الجامع الترمذی ج ٢ ص٢٣١ ابواب المناقب۔ باب فی ثقیف وحنیفة)

غیر مسلموں سے امداد لینے کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل ڈائریکٹر کرسچین ہسپتال ٹیکسلا نے اس بات کے پیش نظر کر دیر کے غریب عوام علاج معالجہ کے لیے اُن کے قائم کردہ کرسچین ہسپتال ٹیکسلا میں آرہے ہیں، دیر ہی کے ایک گاؤں اخگرام میں ایک ہسپتال بنانے کی منظوری دی ہے اور وہاں پر بائندہ خیل قبیلے کے ایک جرگے نے ۲۱ ایکڑ مشترکہ زمین اس ہسپتال کی تعمیر کے لیے دی ہے۔ جبکہ مقامی طور پر کچھ لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ ہسپتال کی آڑ میں عیسائیت پھیلانے کے لیے تبلیغ کریں گے، پمفلٹ تقسیم کریں گے، مریضوں اور اُن کے تیمارداروں کو عیسائیت کی دعوت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خدشات جب مجوزہ ہسپتال کی انتظامیہ کے سربراہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوگی، آپ لوگ جو شرط لگانا چاہتے ہیں لگا لیں ہم ان کی پابندی کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مذکورہ کے سامنے چند شرائط پیش کی گئیں جو کہ اس نے تسلیم کریں اور سرکاری سٹامپ پیپر پر بیان حلفی کی صورت میں لکھ کر سٹیمپ (مُہر) لگا کر دستخط کر دیئے ہیں، یہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں :-

۱- اخگرام ہسپتال میں کوئی مسیحی تبلیغ نہ ہوگی۔

۲- مذکورہ ہسپتال میں کوئی مسیحی لٹریچر تقسیم نہ ہوگا۔

۳- اخگرام ہسپتال میں کوئی گرجا گھر تعمیر نہ ہوگا۔

۴- اخگرام ہسپتال میں کوئی صلیب کا نشان نہیں لگایا جائے گا۔

۵- ہسپتال کے بیت الخلاء اسلامی اقدار کے مطابق شمالاً جنوباً بنائے جائیں گے۔

۶- اخگرام ہسپتال کا نام مسیحی نام سے مبّرا ہوگا۔

۷- سٹیشنری پر کسی قسم کی بائیبل مقدس کی آیات طبع نہ ہوں گی۔

۸- اخگرام ہسپتال کی بلڈنگ سادہ اور مضبوط بنائی جائے گی جو کسی بھی سرکاری ہسپتال کی بلڈنگ سے اچھی ہوگی۔

۹- یہ ہسپتال خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرے گا نیز ہسپتال میں جو کوئی مریض آئے گا اس کا علاج کم خرچ اور رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر کیا جائے گا۔

۱۰- ہسپتال کے احاطے کے اندر ایک طرف مسجد کے لیے جگہ مخصوص کی جائے گی لیکن

مریضوں کی تکلیف کے پیشِ نظر لاؤڈ سپیکر لگانے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس تمام صورت حال کے پیشِ نظر اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل جو کہ عیسائی ہے، کے تعاون سے اس ہسپتال کی تعمیر شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کے مطابق کرسچین ہسپتال بنانے والوں نے جرگے کی طرف سے مقرر کردہ جن شرائط کی ہر لحاظ سے پابندی کرنے کا معاہدہ کیا ہے اُن تمام شرائط کا لحاظ اور پابندی کرنے کی صورت میں اس ادارہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ہسپتال بنانا جائز ہے، اگر ہسپتال بنانے والوں کی طرف سے کسی بھی مرحلہ پر ان شرائط کی خلاف ورزی کی گئی تو مسلمانوں کو اس کے بند کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اصولاً تعلیم، صحت، سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر دُنیاوی امور و معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک دوسرے سے افادہ اور استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ اسلام اور اسلامی اقدار اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام کہ ایک اسلامی ملک کسی دوسرے اسلامی ملک کے خلاف کسی کافر ملک کی امداد و تعاون کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ ملک خالص اسلامی ہے، اس میں کُلی طور پر اسلامی قوانین رائج ہیں اور کافر ملک صرف اسلامی قوانین جاری کرنے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا ہے اور اس پر ظلم و زیادتی کرنے کے لیے بے بنیاد اور من گھڑت الزامات لگا رہا ہے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے مطلع فرمائیں؟

الجواب: کسی مسلمان ملک کے خلاف کسی بھی کافر ملک سے محض دنیاوی مفادات کی خاطر تعاون کرنا یا اس کا آلۂ کار بننا شرعی نقطۂ نظر سے حرام و ناجائز ہے۔ کسی بھی مسلمان ملک کا سربراہ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا اور ایسی لادین قیادت کو ختم کرکے صالح اور دیندار شخص کو حاکم مقرر کرنا مسلمان رعایا پر لازم اور ضروری ہے، اسلیے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ تو خود اس پر ظلم کرے گا اور نہ بے بنیاد الزامات کی بنا پر اسے کسی کافر کے حوالے کرنے کا شرعاً مجاز ہے۔

لقوله علیه السلام: المؤمن اخو المؤمن لا یظلمه ویسلمه۔ (الحدیث)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

امریکہ سی ٹی بی ٹی (CTBT) یعنی ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے جامع معاہدہ کے نام سے پاکستان کو اس معاہدہ پر دستخط کرا کے پابند بنانا چاہتا ہے جس سے بظاہر پاکستان کو حاصل ایٹمی توانائی کے استعمال یا اس کی مزید ترقی کو روکنا مقصود ہے۔ کیا شرعاً کسی مسلمان ملک کے حکمرانوں کو اپنی جہادی قوت، آلات و وسائل اور حربی تکنیک کو کفار کے دباؤ یا کسی لالچ کے نتیجے میں اسے محدود اور معطل یا منجمد و مفلوج کرنے کی اجازت ہے؟ اس مسئلہ کی ازروئے قرآن و سنت شرعی حیثیت واضح کرنے کے لیے ملک اور عالم اسلام کے معروف، معتمد اور ممتاز دینی ادارہ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء نے مدلل روشنی ڈالی ہے جو اعیانِ حکومت، ممبران پارلیمنٹ، سیاستدانوں، سائنسدانوں، فوجی اداروں، علماء، دانشوروں، صحافیوں اور عام مسلمانوں کے غور و فکر کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی خدمت کو ملک و ملت کے بہتر مستقبل اور فلاح و بہبود کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

(مولانا) سمیع الحق
مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)
۱۰ ستمبر ۱۹۹۶ء

استفتاء

سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی یعنی ایٹمی پروگرام، اس کی توسیع اور ٹیسٹ پر پابندی کا جامع معاہدہ

مملکتِ اسلامیہ پاکستان جو کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمرہ ہے، اس کی تقسیم کا مقصد ہی یہاں پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت کا قیام تھا، الحمدللہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی قربانیوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا اور اس نے عالم اسلام کے لیے ہر دور میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یہود و ہنود اور مغربی ممالک پاکستان کے قیام کے روز اول ہی سے اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مختلف سازشوں سے اس کو آئے دن کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنا ہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں جبکہ پاکستان کے قیام کا ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس پر جنگ مسلط کر دی گئی، اس کے بعد ۶۵ء اور ۷۱ء میں جنگیں ہوئیں اور ہمارے خلاف بدترین جارحیت کی گئی۔ اب جبکہ مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کے مجاہدین ہندوؤں کے خلاف جہاد میں سرگرم عمل ہیں اور پاکستان نے بھی ہر سطح پر خصوصاً بین الاقوامی فورم میں مسئلہ کشمیر اجاگر کیا ہے۔ تو ہندوستان نے تحریکِ آزادی کشمیر کو ختم کرنے اور پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے ۱۱ اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کئے، یہ دھماکے ہندوستان میں واجپائی حکومت نے کئے جس کا بنیادی منشور ہی اسلام اور پاکستان دشمنی پر مبنی ہے، یاد رہے کہ ہندوستان ۱۹۷۴ء میں ایٹمی قوت بن چکا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو یہ حق مکمل طور پر حاصل تھا کہ وہ بھی اپنے دفاع کے لئے قرآنی نص کے مطابق ہر ممکن صلاحیت خواہ وہ عسکری ہو یا حربی، حاصل کرے اور ہر لحاظ سے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ - (سورۃ الانفال آیت ۶۰)

اس وقت حکومتِ پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام یہود و ہنود کے مکروہ عزائم کو بھانپتے ہوئے شروع کیا تھا اور اس عظیم مقصد کے لیے اپنے ذرائع و وسائل اور حیثیت سے بڑھ کر ملک و ملت اور قابلِ فخر سائنسدانوں نے طویل اور صبر آزما ایثار کا مظاہرہ کیا اور اس پر اربوں روپے خرچ ہوئے اور بمشکل تمام اس کو عالمِ کفر کی خونخوار نظروں سے بچائے رکھا، گویا پوری قوم نے خونِ جگر سے اس پروگرام کی آبیاری کی اور اپنے ملک و ملت و عالمِ اسلام کو ایک ناقابلِ تسخیر ایٹمی قوت بنا کر عالمِ کفر اور بھارت کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملا دیا جس سے تمام پاکستانی قوم اور پورے عالمِ اسلام کا سر فخر سے بلند ہوا، قوم کو نئی راہ اور نئی سمت مل گئی اور ہم جو اکیسویں صدی میں عالمِ اسلام اور پاکستان کو ایٹمی قوت کی حیثیت سے (جو کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری طاقت کی معراج سمجھی جاتی ہے) داخل ہو رہے ہیں تو موجودہ حکومت جس نے سی ٹی بی ٹی کے معاہدے پر دستخطوں کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے جو ہمارے قومی و فوجی دفاع کی شہ رگ کو کاٹنے کے مترادف ہے۔ حکومت اس معاہدہ (TBT) پر دستخط کر کے ہمیں ایک بے غیرت، بے حمیت، بزدل اور رسوا قوم بنانا چاہتی ہے اور معاہدے کے بعد ہمیں ہندوستان و اسرائیل کے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے بے دست و پا پھینکنے کی کوشش کر رہی ہے خاص کر ایسے حالات میں کہ جب ہندوستان جس کو ایٹمی پروگرام کو منجمد کرنے کے جامع معاہدے پر دستخط کرنے میں اب تک انکار و تردد ہے اور اگر اس نے دستخط کر بھی دیئے تو اس کی فوجی اور دفاعی ساز و سامان کی صلاحیت، جنگی ٹیکنالوجی اور افرادی قوت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے جس کا مقابلہ ہماری ایٹمی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا، حالانکہ خود یہود و نصاریٰ اور عالمی کفر و استعمار کے پانچ بدمعاشوں اور دہشت گردوں نے بھی ابھی تک اس معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے اور نہ ان کا کوئی ارادہ ہے۔ اس معاہدے پر دستخط کر دینے کے بعد پاکستان اور عالمِ اسلام کا ناقابلِ تصور نقصان ہوگا، چند نقصانات درج ذیل ہیں:۔

(۱) کشمیر کی تحریکِ آزادی پر ہر لحاظ سے براہِ راست برا اثر پڑے گا۔

(۲) ہندوستان اور عالمِ کفر کے ایٹمی پروگرام روز بروز جاری و ساری اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے اور اس کے برعکس ہمارا ایٹمی پروگرام اس معاہدہ کی پابندی کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) بھارت کے مقابلے میں ہماری پوزیشن عسکری، حربی اور سیاسی لحاظ سے کمزور تر ہو جائے گی۔

(۴) معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد عالم کفر کی طرف سے ہم سے نت نئے مطالبات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کا مشاہدہ ہم عراق، لیبیا وغیرہ ملکوں میں کر رہے ہیں۔

(۵) ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد عالم اسلام خصوصاً عالم عرب کو ایک ولولۂ تازہ عطا ہوا تھا اور اسرائیل اور دوسری استعماری کفری طاقتیں مرعوب ہو گئی تھیں، معاہدے کے بعد ہماری حیثیت محض ایک سوداگر قوم کی سی ہو جائے گی۔

(۶) اگر مستقبل میں عالم اسلام اور عالم کفر کے درمیان کوئی بڑی جنگ شروع ہوتی (جس کی ابتدا امریکہ عراق، لیبیا، سوڈان اور افغانستان سے کر چکا ہے) تو اس میں پاکستان اس معاہدے کے بعد کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے گا بلکہ پاکستان امریکہ کی ایک کالونی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

(۷) اس کے نتیجے میں عالم اسلام اور دوسرے مقامات میں جہادی قوتوں کو شدید دھچکا لگے گا اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

(۸) پاکستان عالم اسلام کو کبھی بھی ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل نہیں کر سکے گا۔

اس خطرناک صورتحال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء کرام و مفتیان دینِ متین کیا فرماتے ہیں کہ:-

(الف) ملک و ملت کے ان عظیم نقصانات. جو کہ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد یقینی اور حتمی ہیں کیا موجودہ حکومت کو اس بات کا حق اور اختیار پہنچتا ہے کہ وہ ایک ارب مسلمانوں کے متفقہ فیصلے کے برعکس ذلت و رسوائی کے اس محضر نامے اور اپنی موت و قتل کے پروانے پر دستخط کر دے؟ (اور اس کے صلے میں ہمیں جو موہوم امداد بلکہ خیرات اور بھیک ملے گی کیا وہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی جیبوں میں نہیں جائے گی؟) ان نقصانات اور خطرناک حقائق کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کرنے کیلئے مہم چلانا یا اس کی حمایت کرنا اور اس پر دستخط کرنا دین و شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ اور یہ معاہدہ شرعی اعتبار سے جائز ہے یا ناجائز؟

(ب) اور وہ لوگ جو اس پر دستخط کرتے ہیں یا اس کی حمایت کرتے ہیں یا اس پر دستخط کے لیے مہم چلاتے ہیں خواہ وہ حزبِ اقتدار سے ہوں یا حزبِ اختلاف سے، سیاستدان ہوں یا بیوروکریٹس اور حکومتی مشنری، ان کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(ج) اور آیا یہ لوگ ملک و ملت اور اپنے حلف سے انحراف کا ارتکاب کرنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

اعداد آلات حرب قرآن کریم کی روشنی میں

اعداد (تیاری) آلات جہاد کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے، وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَلَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۶۰) "اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا، جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کے راستے میں وہ پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔" (ترجمہ از معارف القرآن) اس کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "وھذہ الآیۃ تدل علی ان الاستعداد للجہاد بالنبل والسلاح وتعلیم الفروسیۃ فریضۃ۔" (تفسیر کبیر ج ۱۵ ص ۱۸۵ سورۃ الانفال) (یہ آیت کریمہ جہاد کے لیے تیاری اسلحہ، تیر اندازی اور شہسواری کی تعلیم کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اسی آیت کے ضمن میں فوائد عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

—— "مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سامانِ جہاد فراہم کریں، نبی اکرم ؐ کے عہدِ مبارکہ میں گھوڑوں کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی کی مشق کرنا سامانِ جہاد تھا۔ آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنونِ حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب جہاد ہے اسی طرح آئندہ جو اسلحہ و آلاتِ حرب و ضرب تیار ہوں وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں۔" (تفسیر عثمانی ص ۲۴۲ سورۃ الانفال)

لہٰذا اس آیت کے عموم میں موجودہ وقت میں جو آلاتِ حرب و ضرب اور سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت جو بم اور میزائل وغیرہ تیار کئے گئے ہیں مثلاً کروز میزائل، سکڈ میزائل، نیپام بم، ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار، یہ تمام ما استطعتم کے عموم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی اپنی تفسیر معارف القرآن جلد ۳ ص ۲۵۵ سورۃ الانفال پر لکھتے ہیں: لہٰذا اس آیت کی رُو سے

مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور اس کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے کہ اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کئے ہیں ہم مسلمانوں پر بھی اسی قسم کے بلکہ ان سے بھی زیادہ تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر اور شرک کا مقابلہ کر سکیں۔

اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے اقوال

اسی طرح احادیث کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعداد آلاتِ حرب کی تاکید اور ترغیب فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو علی المنبر یقول واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃٍ الا ان القوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی"۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فضل الرمی والحث علیہ۔ کتاب الجہاد)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس حال میں کہ آپؐ منبر پر تشریف فرما تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: اور تیار کرو کافروں کے ساتھ جنگ کے واسطے وہ چیزیں جو تم قوت سے کر سکو، خبردار! بیشک قوت تیراندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیراندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیراندازی ہے۔"

اس حدیث کی تفسیر میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ومعنی قولہ الا ان القوۃ الرمی انہ من معظم ما یجب اعدادہ للقوۃ علی قتال العدو ولم ینفت بہ ان یکون غیرہ من القوۃ بل عموم اللفظ شامل لجمیع ما یستعان بہ علی العدو من سائر انواع السلاح وآلات الحرب۔ (احکام القرآن جلد ۲ ص ۸۵ سورۃ الانفال)

دوسری روایت ہے: عن عقبۃ بن عامرؓ قال سمعت رسول اللہ یقول ان اللہ یدخل بالسہم الواحد ثلاثۃ نفر الجنۃ صانعہ یحتسب فی صنعتہ الخیر والرامی بہ ومنبلہ۔

(رواہ ابوداؤد بذل المجہود ج ۱۱ ص ۴۲۸ کتاب الجہاد۔ باب الرمی)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، اس کا بنانے والا جس کے بنانے سے اس کی نیت خیر کی ہو، اور اس کا پھینکنے والا، تیسرا تیر دینے والا تیرانداز کے ہاتھ میں۔"

اس حدیث کے متعلق شارح ابوداؤد مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:۔

ولم یکون فی زمن رسول اللّٰہ الا رمی السهام فیدخل بل یعوض عنه فیه مایرمی به من الرصاص بالبندوقیه والمدافع وغیر ذلك من آلات الحرب الجدیدة فی هذا الزمان فانها اغنت عن رمی السهام بالقوس وعطلته ۔ (بذل المجهود جلد ۱۱ ص۳۲۸ باب فی الرمی. کتاب الجهاد)

فقہائے کرام میں فقہ حنفی کی مشہور ومعروف شخصیت علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں :۔

یندب للمجاهد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه بالاظافیر وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارز ۔ فالحاصل ان مایعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۷۶ کتاب الجهاد)

(ترجمہ) "یعنی دار الحرب میں مجاہد کے لیے ناخن بڑھانا باوجودیکہ ناخنوں کا کٹوانا ایک فطری امر ہے، مندوب اور مستحب ہے کیونکہ دورانِ جنگ وجہاد اگر اس کے پاس اسلحہ نہ ہو اور دشمن اس کے بالکل قریب ہو تو ناخنوں کے ذریعہ بھی وہ اپنے دشمن کو دفع کر سکتا ہے، اور اس کی نظیر مونچھوں کو ترشوانا ہے کیونکہ یہ سنت ہے، پھر غازی کے لیے دار الحرب میں مونچھوں کا بڑھانا مستحب ہے تاکہ اس سے اُس کے مقابل دشمن پر رُعب اور دھاک بیٹھ جائے ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کہ مجاہد وغازی کے لیے جہاد میں ممد ومعاون ثابت ہو تو وہ مندوب اور مستحب ہے اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کا وقار اور مشرکین کی تذلیل وتوہین ہے۔"

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا اسلحہ اور جنگی ساز وسامان دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رکھنا فرض اور ضروری ہے تاکہ جہاد کے وقت ان کی توجہ اسلحہ کی تیاری پر نہ ہو۔

آلاتِ حرب یا عسکری قوت کو ضائع کرنے یا ان کو منجمد کرنے پر وعیدیں

جس مسلمان ملک کے پاس یہ آلاتِ حرب (اور وہ بھی جدید ترین شکل میں) ہوں، ان آلات کو ضائع کرنے یا استعمال میں نہ لانے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے : عن عقبه بن عامر قال سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول من علم الرمی ثم ترکه فلیس منا اوقد عصی ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۱۴۳ باب فضل الرمی والحث. کتاب الجهاد)

(ترجمہ) "حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

آپ نے فرمایا کہ جس کسی نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں یا وہ گنہگار ہوا۔“

مندرجہ بالا حدیث کے ذیل میں شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

”ھٰذا تشدید عظیم فی نسیان الرمی“ بعد علمه ومکروه کراھة شدیدة من ترکه بلا عذر۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فصل الرمی والحث۔ کتاب الجهاد)

اور اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں، گویا اُس نے اس میں کوئی نقص دیکھا اور اس کے ساتھ استہزا کیا اور یہ صورتیں کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتی ہیں، شراحِ حدیث نے اس نعمت کو نعمتِ خطیرہ سے تعبیر کیا ہے۔“ (مرقاۃ ج ۷ ص ۳۱۴ باب اعداد آلة الجهاد)

اور یہی حدیث ایک اور روایت میں یوں بیان کی گئی ہے ”من تعلم الرمی ثم نسیه فهی نعمة جحدها“ (مجموعة الفتاوی لابن تیمیة ج ۲۸ ص ۹ الجهاد)

مختصراً ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح اعداد آلاتِ حرب مسلمانوں کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح فن عسکری کو سیکھ کر اس کو ترک کرنا، اسے بھول جانا انتہائی لائقِ ملامت امر ہے جس کی طرف امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے بصراحت تنبیہ کی ہے۔ موجودہ حالات اور زمانے کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک مسلمان ملک کے پاس جو قوت اور طاقت ہو جس سے دشمنانِ اسلام مرعوب ہوتے ہوں اُس طاقت اور قوت کو ختم کرنا یا اس کو استعمال میں نہ لانا یا اس کو منجمد کرنا اسی وعید کے ضمن میں آتے ہیں۔

علامہ برہان الدین المرغینانیؒ نے حرمت اکل لحم فرس (یعنی گھوڑے کے گوشت کی حرمت) کی ایک علت یہ بھی لکھی ہے کہ: ویکره لحم الفرس عند ابی حنیفةؒ .... ولانه آلة ارهاب العدو فیکره اکله احتراماً له ولهذا یضرب له بسهم فی الغنیمة ولانه فی اباحته تقلیل آلة الجهاد“ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج ۸ ص ۴۲۰، ۴۲۱ کتاب الجهاد)

یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے (اس کی ایک علت یہ ہے کہ دشمن کے ڈرانے دھمکانے اور مرعوب کرنے کا آلہ ہے اس لیے اس کے احترام کی وجہ سے اس کا کھانا مکروہ (تحریمی) ہے اور اسی احترام و عظمت کی بناء پر مالِ غنیمت میں گھوڑے کا مستقل حصہ ہے۔ (اور دوسری علت یہ ہے) کہ اس کی اباحت کی صورت میں آلۂ جہاد کی

تقلیل ہوتی ہے۔"

کفار اور غیر مسلموں کے دباؤ میں آکر ایٹمی صلاحیت اور عسکری قوت کو منجمد یا اس میں تخفیف کرنے کے متعلق کسی بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے کے بارے میں ان نصوصِ قطعیہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:۔

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۔ (سورۃ الفرقان آیت ۵۲)

(ترجمہ) "سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کے ساتھ بڑے زور کا۔"

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں: وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (سورۃ ہود ۱۱۳)

(ترجمہ) "اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا پھر تم کو لگے گی آگ۔"

ایک اور فرمانِ ربانی ہے کہ: وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً۔ (سورۃ النساء آیت ۱۰۲)

(ترجمہ) "کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بے خبر ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی۔"

ان نصوص میں تدبر کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری شد و مد کے ساتھ مسلمانوں کو ہر وقت کفار کے مقابلے میں تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور کفار کی طرف معمولی میلان کو بھی موجب دخولِ نار ٹھہرایا ہے۔ اب اگر ہمارے مسلم حکمران یہود و ہنود اور نصاریٰ کے دباؤ میں آکر اس رسوائے زمانہ معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرتے ہیں تو لازمی طور پر ان نصوصِ قطعیہ اور ارشاداتِ ربانیہ کی خلاف ورزی ہوگی۔

وہ معاہدہ جو مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہو اس کی پابندی ضروری نہیں

اگر تخفیفِ اسلحہ کے متعلق کوئی بین الاقوامی معاہدہ موجود ہو اور اس کا کنٹرول بھی کفار کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس صورت میں مسلمان اس معاہدے کے پابند ہیں؟ سو اس بارے میں سب سے پہلے جب ہم قرآنِ کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل آیات سامنے آتی ہیں: (۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۴)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام۔" (۲) وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۵۸)۔ (ترجمہ) "اور اگر تم کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دو ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز"۔ یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ان کا عہد ان کی طرف اسی صورت میں واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۲۶۱ سورۃ الانفال)

یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے، یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ امرمن عندہ فیصبحوا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۵۱، ۵۲) ـــــ (ترجمہ) "اے ایمان والو مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست، وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہیں میں ہے، اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو۔ اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی، سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی امر اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے"۔

علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ: "ان آیات میں اللہ تعالےٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے ازلال سے منع فرمایا اور ان کی اہانت اور اذلال کا حکم فرمایا اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۳)

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخط کرنے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے اور اس سلسلے میں تعاون کرنے کی صورت میں جو لوگ کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کا جو مظاہرہ کرتے ہیں ان کا حشر کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ اس معاہدہ پر دستخط کی صورت میں عقل و ہوش سے کام لے اور اس انجام بد سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیز سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے حامیوں کا یہ کہنا کہ دستخط نہ کرنے کی صورت میں یہ

یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، اس کو ان آیات میں عذرِ لنگ قرار دیا گیا ہے۔

دستخط کرنے کی صورت میں کفار کی طرف سے امداد کے وعدے

تخفیفِ اسلحہ کے اس معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے کی صورت میں کفار کی طرف سے مالی امداد و تحفظات کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے برعکس اعدادِ آلاتِ حرب کے متعلق جو آیتِ کریمہ ہم نے ذکر کی ہے کہ "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ" تو اس آیت کے آخر میں فرمانِ ربانی ہے: "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یُوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ"۔ اس میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جہادی سامان پر جتنا بھی خرچ کریں گے اس کے متعلق خدائی وعدہ ہے کہ "یوف الیکم" یعنی وہ خرچ تم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورا پورا دیا جائے گا بغیر کسی کمی کے۔ گویا یہ آیتِ کریمہ تصریح ہے اس بات پر کہ اگر اعدادِ آلاتِ حرب پر آپ کا کچھ خرچ ہوا ہو اور ضرور ہوتا ہے تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اب اقتصادی پابندیوں کے خوف سے سی ٹی بی ٹی یا این پی ٹی پر دستخط کرنا گویا اللہ کے وعدے سے انحراف ہے۔ اسی طرح دیگر بھی کئی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی عزت و وقار کو مجروح کر کے کفار سے استعانت لینا صحیح نہیں، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

(١) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ (آلِ عمران ١١٨)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔"

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وفی ھذہ الآیة دلالة علی انه لا تجوز الاستعانة باھل الذمة فی امور المسلمین من العمالات والکتبة"۔ (احکام القرآن جلد ٢ صفحہ ٣٢ سورۃ آلِ عمران)

اسی آیت یعنی لا تتخذوا بطانة میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہلِ ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں ہے۔

(٢) اسی طرح دوسری آیتِ کریمہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ۔ (سورۃ النساء آیت ٥١) میں بھی اس چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ فرماتے ہیں کہ "ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے

اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اسی میں ان کی عزت اور برتری ہے۔" (احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۲۳ سورۃ النساء)

ارشادِ ربانی ہے: الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعًا۔ (سورۃ النساء آیت ۱۳۹)۔ (ترجمہ) "جو لوگ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں کیا وہ ان کے ذریعے قوت وعزت چاہتے ہیں (وہ یاد رکھیں کہ) قوت وعزت تو ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے، یعنی قوت وعزت اللہ تعالیٰ کے قوانین میں عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے"۔

مندرجہ بالا تصریحات اور نصوص کی رو سے کفار سے امداد طلب کرنا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس خاطر سے کہ اس میں ہماری عزت ہے بالکل صحیح نہیں، اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسلمان ممالک نے جن کافر ملکوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کئے ہیں انہوں نے ایفائے عہد کا خیال نہیں رکھا، پاکستان اور عربوں کے کافروں کے ساتھ ہونے والے معاہدے ہمارے سامنے ہیں جن سوائے خسارے کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

علامہ ابوبکر الجصاص رازیؒ مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: "وھذا یدل علی انہ غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علی غیرھم من الکفار اذا کان متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب وبذلک قال اصحابنا"۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۳۵۲ سورۃ النساء)

فتوای کا خلاصہ اور حاصل

مذکورہ بالا دلائل جو قرآن کریم کی صریح آیات، سنتِ نبویؐ کی واضح ہدایات، مفسرین، محدثین اور فقہاء امت کی تشریحات پر مشتمل ہیں اور جن پر تمام فقہی مکاتب کا اجماع ہے، سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:-

(الف) اعداء اسلام کی جارحیت اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دفاع کیلئے ہر قسم کا فوجی سازوسامان، آلاتِ حرب کی تیاری اور اس میں شب و روز ترقی اور دشمن کے ارعاب کے لیے اعداد آلاتِ جہاد فرضِ عین ہے، یہاں تک کہ اسلام کے اساسی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی فرضیت محدود اوقات اور مقدار سے وابستہ ہیں، مگر دشمن کے مقابلہ کی تیاری غیر محدود، غیر مقید، غیر موقت اور تمام ممکنہ استطاعتوں سے وابستہ ہے جسے اللہ نے وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (الآیۃ) میں بیان فرمایا ہے۔

(ب) دشمنانِ اسلام کے کسی دباؤ اور ترغیب و ترہیب میں آکر ایسا کوئی اقدام یا معاہدہ ہرگز جائز نہیں جس سے فوجی اور حربی تیاریوں میں تعطل پیدا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا تیار شدہ حربی سازوسامان کے استعمال کو منجمد کیا جا سکتا ہو یا حربی ٹریننگ، مشق اور تربیت کو نقصان پہنچ سکتا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا ان سارے امور پر کسی قسم کی قدغن لگ سکتی ہو۔

(ج) سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی کی شکل میں زیرِ بحث معاہدہ میں یہ سارے خطرات، خدشات اور گوناگوں پابندیاں موجود ہیں، اس لحاظ سے اس پر کسی بھی مسلمان ملک کیلئے بشمول پاکستان کے دستخط کرنا یا اس کی تحریری اور زبانی کسی قسم کی تائید اور اتفاق کی از روئے قرآن و سنت و اجماعِ اُمت ہرگز اجازت نہیں، اگر کسی بھی مسلم حکومت کا سربراہ، وزیرِ اعظم یا ممبرِ پارلیمنٹ یا کوئی عام شہری اس کی موافقت اور تائید کرتا ہے تو وہ قرآن و سنت اور اللہ و رسول کے واضح احکام کی صریح مخالفت اور ان احکام سے کھلی بغاوت کا مرتکب ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین، عقیدہ اور ایمان کی خیر منانی چاہیئے، جان بوجھ کر ایسا کرنے والے ملک و ملت کے غدار ہیں کہ اس طرح وہ ملک کی آزادی، سالمیت اور خود مختاری سلب کرانے جیسے قبیح جرم کے مرتکب ہوں گے۔ از روئے شرع ایسی صورت میں پوری قوم کو دینی، ملی اور قومی جرم کے مرتکب حکمرانوں کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوگی۔

كتاب
الدعوى
والقضاء

البينة على المدعي واليمين على من انكر

کتاب الدعوٰی والقضاء

(دعویٰ اور قضاء کے احکام و مسائل)

قاضی کے علم پر فیصلے کا حکم

سوال:۔ کیا قاضی اپنے علم پر کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ نے فیصلے کا جو طریقۂ کار وضع کیا ہے اور جو قواعد و ضوابط مرتب کیے ہیں قاضی فیصلے کرنے میں ان کا پابند ہے، لہٰذا قاضی یا تو مدعی کے گواہوں پر فیصلہ کرے گا اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مدعا علیہ کی قسم پر فیصلہ کرے گا، اس طریقے کے مطابق فیصلہ کرنے میں قاضی پر کوئی تہمت وغیرہ لازم نہیں آتی اور فریقین بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر قاضی کو یقینی طور پر کسی فریق کے متعلق معلومات حاصل ہوں کہ یہ حق پر ہے تو اگرچہ متقدمین علماء نے ان یقینی معلومات کے حصول پر قاضی کو فیصلے کا اختیار دیا ہے لیکن معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب چونکہ دورِ حاضر میں قاضیوں پر وہ اعتماد باقی نہیں رہا جو متقدمین کے دور میں تھا اس لیے متاخرین علماء کرام نے قاضی کو تہمت کے اندیشہ سے محفوظ رہنے اور مقضی علیہ کو اطمینان دلانے کی خاطر قاضی کے اپنے علم پر فیصلہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والفتوٰی علی عدمہ فی زماننا کما نقلہ فی الاشباہ عن جامع الفصولین وقید بزماننا لفساد القضاۃ فیہ واصل المذہب الجواز۔

ردالمحتار ج۴ ص۳۸۳ کتاب القضاء، مطلب فی حکم القاضی بعلمہ) [لہ]

قاضی کا مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا قاضی مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قضاء کا منصب چونکہ بڑا نازک اہمیت کا حامل ہے اس لیے شریعت نے

[لہ] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ورجح فی جامع الفصولین قول محمد قال وینبغی ان یفتی بہ لما علم من احوال قضاۃ زماننا ثم نقل ان محمدا قال لا یقضی القاضی بعلمہ ثم نقل عن عیون المذاہب ان بقولہ یفتی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۵۸ کتاب القضاء)

ومثلہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۲ ص۳۲۶ کتاب القضاء والشہادۃ والدعاوی۔

تفصیل کے ساتھ اس کے آداب بیان کیے ہیں، دراصل ان تمام آداب کا مقصد یہ ہے کہ قاضی تہمت سے محفوظ رہے تاکہ اس کا وقار معاشرہ میں قائم رہے، اس لیے شریعت نے قاضی کیلئے ہر اس فعل سے اجتناب کرنا لازمی قرار دیا ہے جس کے صدور سے قاضی کے وقار پر حرف آتا ہے اور فریقین کے اعتماد کے اٹھنے کا ذریعہ بنتا ہو، چونکہ مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے سے قاضی پر تہمت لازم آنے کا اندیشہ ہے جس کی وجہ سے اس پر اعتماد باقی نہیں رہے گا جو کہ قضا کے باب میں مطلوب ہے اس لیے قاضی کے لیے کسی ایک فریق کے ہاں قیام کرنا جائز نہیں۔

كما فى الهندية: فاما اذا كانت لصاحب الدعوة خصومة لا يجيب دعوته وان كانت بينهما قرابة او مباسطة قبل القضاء۔ (الفتاوى الهندية ج٣ ص٣٣١ الباب التاسع فى رزق القاضى) لہ

مدعی اور مدعیٰ علیہ کا قاضی کے تعین میں اختلاف کا حکم

سوال: مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک متنازعہ مسئلہ میں مدعی اپنے علاقے کے قاضی سے فیصلہ کرانا چاہتا ہے اور مدعیٰ علیہ اپنے علاقہ کے قاضی سے، تو اس صورت میں کون سے علاقے کے قاضی کو ترجیح دی جائے گی؟

الجواب: جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے کسی پر دعویٰ کرتا ہے تو مدعی کو حق دیتے وقت بظاہر مدعا علیہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے اس کو اطمینان دلانا بھی ضروری ہے تو شرعی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو جس قاضی کے پاس جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اس کو وہاں مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے لہٰذا اگر مدعی اور مدعا علیہ میں قاضی کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق مدعا علیہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

لما قال العلامة بدر الدين محمد بن اسماعيل الشهير بابن قاضى سماوةؒ: وان كان من المحلتين فاراد المدعى ان يخاصمه الى قاضى محلته وابٰى الآخر قال ابويوسفؒ

لہ قال العلامة الحصكفى رحمه الله: ولا يجيب دعوة خصم وغير معتاد ولو عامة للتهمة۔ (الدر المختار ج٤ ص٣٤٧ كتاب القضاء، مطلب فى حكم الهدية للمفتى) ومِثْلُهُ فى البحر الرائق ج٧ ص٢٨١ كتاب العارية۔

العبرة للمدعي قال محمد لا بل للمدعى عليه وبه يفتى۔ (جامع الفصولين ج۱ ص۲۱ الفصل التاسع والثلاثون في المتفرقات) [1]

فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنے کا حکم

سوال:۔ فریقین کے مابین فیصلہ کرتے وقت ثالث نے دونوں فریقوں سے پانچ پانچ کلاشنکوف اپنے پاس رکھیں اور شرط یہ لگائی کہ فیصلہ کا اختیار دینے کے بعد جو کوئی بھی فریق فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو اس کی کلاشنکوف بطور جرمانہ ضبط کرلی جائیں گی، دونوں فریقوں نے اس وقت یہ شرط قبول کرلی، چنانچہ فیصلے کے بعد ایک فریق نے فیصلہ ماننے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے اس کی پانچ کلاشنکوف ضبط کرلی گئیں، تو کیا اس طرح فیصلے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین نے خوشی سے ثالث کو فیصلے کا اختیار دیا تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار کرنا جائز نہیں بلکہ اس فیصلے کا ماننا فریقین پر لازم ہے اس لیے کہ ایسے فیصلے سے انکار ایک غیر شرعی امر ہے اور کسی غیر شرعی امر کے ارتکاب پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے اگرچہ اصل مذہب عدم جواز کا ہے لیکن معاشرہ میں برائیوں کے انسداد کے لیے چونکہ شرعی طریقے سے تعزیرات کا نظام مفقود ہے اور برائیوں کا انسداد ضروری ہے اس لیے اگر کوئی ایسی طاقت اور قوت موجود نہ ہو جس سے جرائم کا انسداد ہوسکے اور تعزیر بالمال سے اس کا انسداد ہوسکتا ہو تو ایسی صورت میں معاشرہ کی اصلاح کی خاطر امام ابویوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا زیادہ مناسب ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله:۔ قال المصنفؒ سمعت من ثقة ان التعزير باخذ المال ان رأى القاضي او الوالي جاز ومن جملة ذلك رجل

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز اللبنانيؒ: اذا طلب احد الخصمين في البلدة التي تعدد حكامها المرافعة في حضور حاكم وطلب الآخر المرافعة في حضور حاكم آخر ووقع الاختلاف بينهما على هذا الوجه يرجح الحاكم الذي اختاره المدعى عليه۔ (شرح مجلة الاحكام المادة ۱۸۰۳ ص۱۱۷۱ الكتاب السادس عشر في القضاء۔ الفصل الثالث في وظائف الحاكم) ومثلهٗ في تنقيح الحامدية ج۱ ص۳۱۳ كتاب القضاء۔ باب هل العبرة بتقاضي المدعي الخ

لا یحضر الجماعة یجوز تعزیرہ باخذ المال۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۳۴۴ کتاب الحدود، الفصل الاول)[1]

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ جج کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا دورِ حاضر میں حکومت کے مقرر کردہ جج یا مجسٹریٹ شرعی قاضی کا قائم مقام ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ قاضی کا تقرر دراصل لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے لیے ہوتا ہے ان تنازعات کو حل کرنے کے لیے شریعت نے باقاعدہ حدود بیان کی ہیں، اسی طرح منصبِ قضاء پر فائز ہونے کے لیے بھی کچھ شرائط عائد کی ہیں اس لیے اگر ان شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے حکومتِ وقت جس کو بھی مسلمانوں کے تنازعات ختم کرانے کے لیے جج یا مجسٹریٹ مقرر کرے تو وہ شرعی قاضی کے قائم مقام ہوگا۔ چونکہ قاضی لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے بارے میں وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حکومت کو اس بارے میں اختیار حاصل ہے کہ اس کام کے لیے جس کو بھی چاہے مقرر کر سکتی ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ جج شرعی اصول کے موافق ہو اور اس کے فیصلے شرعی قواعد کے خلاف نہ ہوں۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: الحاکم وکیلٌ من قبل السلطان فی اجراء المحاکمة والحکم۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۸۰۰ ص۱۱۶۲ الکتاب السادس عشر الفصل الثالث)

اہل بدعت کا اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا اہل بدعت جو کہ اعتقادی فاسق ہیں، میں سے کسی کو رؤیتِ ہلال کمیٹی کا چیئرمین بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اعلیٰ منصب (کلیدی اسامی) پر کسی عادل اور پابندِ شریعت شخص کو مقرر کرنا

---

[1] قال العلامة الزیلعی رحمه الله: عن ابی یوسفؒ ان التعزیر باخذ الاموال جائز للامام۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۲۰۸ باب حد القذف فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۴۱ باب حد القذف، فصل فی التعزیر۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: کل ما یخرج به الوکیل عن الوکالة یخرج به القاضی عن القضاء۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۶ کتاب آداب القاضی، فصل فی بیان ما یخرج به الوکیل)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام السلطانیة ص۶۵ فی ولایة القضاء۔

حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کیونکہ عادل اور نیک آدمی کے تقرر کے بغیر لوگوں کو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرنا دشوار ہے، اور رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے ساتھ تو دینی امور کا خاص تعلق ہے، تو جو شخص خود بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے فسق وفجور میں مبتلا ہو وہ دوسرے مسلمانوں کی عبادات کے تحفظ کا کیا لحاظ رکھے گا، اس لیے حکومت کے لیے مناسب نہیں کہ عادل اور پابندِ شریعت لوگوں کے ہوتے ہوئے اہلِ بدعت میں سے کسی کو اس منصب پر فائز کرے، تاہم جب حکومت نے اس کو مقرر کیا ہو تو دینی امور میں اس کا حکم شرعی قواعد کے تحت نافذ العمل ہوگا جیسا کہ فاسق کا حکم نافذ العمل ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: والفاسق اهل للقضاء حتى لو قلد يصح الا انه لا ينبغي ان يقلد كما في حكم الشهادة۔ (الهداية ج۳ ص۱۳۲ كتاب ادب القاضي) [1]

مدعیٰ علیہ قسم سے انکار کر دے تو فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا

سوال: جب مدعی اپنے دعویٰ پر گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آتی ہے لیکن اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: جب شرائطِ شرعی کے تحت مدعی کا دعویٰ قاضی کے ہاں سماعت کیلئے منظور ہو جائے تو مدعیٰ علیہ پر مدعی کا جواب دینا واجب ہے کہ یا تو مدعی کے حق کا اقرار کرے یا انکار، اگر مدعیٰ علیہ مدعی کے حق سے انکار کرے تو مدعی پر لازم ہے کہ گواہ پیش کرے اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آئے گی اور اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر مدعی کا حق لازم ہو جائے گا اور فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا۔

لما قال العلامة المرغينانيؒ: واذا نكل المدعیٰ عليه عن اليمين قضى عليه بالنكول والزمه ما ادعیٰ عليه۔ (الهداية ج۳ ص۲۰۲ باب اليمين، كتاب القضاء) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: والوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذو شوكة وان كان جاهلاً فاسقاً وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذ فيحكم بفتوى غيره۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۳۳ كتاب القضاء)

ومثله في جامع الفصولين ج۱ ص۱۶ الفصل التاسع والثلاثون في المتفرقات۔

[2] قال العلامة الحصكفيؒ: وقضى القاضي عليه بنكوله مرة لنكوله في مجلس القاضي حقيقةً۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۴ ص۴۲ كتاب الدعوىٰ)

ومثله في مجلة الاحكام۔ المادة ۱۷۵۱ ص۱۰۶ كتاب الدعوىٰ، الباب الثاني۔

جج کا ثالث کے فیصلے پر فیصلہ سنانے کا حکم

سوال :- فریقین نے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا، ثالث کے فیصلے کے بعد وہ مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا، جج نے چھان بین کے بعد بعینہٖ ثالث کے فیصلے کے مطابق فیصلہ سنایا، تو کیا جج کے لیے ثالث کے فیصلہ پر فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جب فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے لیے باہمی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں تو وہ جو بھی فیصلہ کرے فریقین پر نافذ ہوتا ہے، جب اس کا فیصلہ عدالت میں پیش کیا جائے تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی قواعد وضوابط کے عین مطابق ہو تو جج کے لیے یہ فیصلہ توڑنا جائز نہیں کیونکہ اس کے توڑنے میں فریقین کا فائدہ نہیں بلکہ انتشار کا سبب بن سکتا ہے البتہ اگر اس کا فیصلہ کسی مختلف فیہ امر میں ہو اور وہ جج کی رائے کے موافق ہو تو پھر جج کے لیے اس کا توڑنا مناسب نہیں اور اگر جج کی رائے کے خلاف ہو تو جج اپنی رائے کے مطابق اس میں تغیر وتبدل کا اختیار رکھتا ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اگر ثالث کا فیصلہ جج کی رائے کے موافق ہو تو جج اس فیصلے کو مدار بنا کر اس پر اپنا فیصلہ سُنا سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها انه اذا حکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی القاضی ورأیه یخالف رأی الحاکم المحکم له ان یفسخ حکمه۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب القضاء فصل فی بیان من یصلح للقضاء)[1]

دعویٰ کے اثبات کے لیے تحریری ثبوت پیش کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد سے ایک مکان اپنے بیٹے پر فروخت کیا اور مکان کا اسے قبضہ بھی دے دیا، اس کے مرنے کے بعد دوسرے ورثاء نے اس مکان میں شرکت کا دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے میت کی طرف سے باقاعدہ وصیت نامہ پیش کیا جس میں مکان ورثاء میں تقسیم کیا گیا ہے، تو کیا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: ان قضی الحکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی قاض مولی من السلطان امضاه ان وافق مذهبه لانه لا فائدة فی نقضه۔

(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۹ ص۱۱۹۹ الباب الرابع)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء۔ الفصل الرابع۔

اس تحریری وصیت نامہ کے تحت دوسرے ورثاء کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ از روئے شریعت جو دستاویزات تغیر و تبدل سے محفوظ ہوں ان کو اعتبار دے کر اس پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں چونکہ مکر و فریب نے معاشرہ میں اکثر لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے سچے اور جھوٹے کاغذات میں تمیز مشکل ہوگئی ہے اس لیے اگر تحریری معاہدہ پر باقاعدہ گواہ موجود ہوں تو اس کو اعتبار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ صورت مرقومہ میں جو لوگ مکان میں شرکت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے تحریری وصیت نامہ پیش کرتے ہیں اگر وہ اس پر گواہ پیش کرتے ہیں تو پھر اس وصیت نامہ کی شرعی حیثیت ہوسکتی ہے اور فریقین کے دعویٰ کی چھان بین کے بعد فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم بازؒ :- ولا يعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا كان سالماً من شبهة التزوير والتصنيع فيعمل به يعني انه يكون مداراً للحكم ولا يحتاج الى الثبوت بوجه آخر (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۷۳۶ ص ۱۰۹ الباب الثاني) [1]

مدعی کا مدعیٰ علیہ سے مقدمہ کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ مقدمہ جیتنے کی صورت میں مدعی عدالت کا خرچہ مدعیٰ علیہ سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے عدالت میں دعویٰ دائر کرتا ہے تو عدالت کا عملہ اس کے حق کے احیاء کیلئے مصروف عمل ہوتا ہے تو اس کا تمام تر فائدہ مدعی کو ہی پہنچتا ہے اور عدالت کی اشیاء کا استعمال اس کے فائدہ کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان اشیاء کا خرچہ مدعی پر عائد ہوتا ہے کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کو اختیار ہے اگر وہ مقدمہ کے رجسٹر وغیرہ کا خرچہ مدعی سے وصول کرنا چاہے تو وصول کرسکتا ہے، جب عدالت کا خرچہ مدعی پر آتا ہے تو مدعیٰ علیہ کو اس کا ضامن ٹھہرانا اور اس سے خرچہ وصول کرنا

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ :- فالحاصل ان المدار على انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد في دفاتر التجار في زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما عليه في دفتره الذي يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه على سبيل التجربة والهزل يعمل به - (تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۲ ص ۲۱ كتاب الدعوى) ومثله في تقريرات الرافعي ج ۲ ص ۹۲ كتاب الدعوى۔

شرعاً جائز نہیں ہے۔

کما فی الہندیۃ: وعلی ھذا الصحیفۃ التی یکتب وفیھا دعوی المدعیین وشہادتہم ان رأی القاضی ان یطلب ذٰلک من المدعی فلہ ذٰلک۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۳ ص ۳۳۰ الباب التاسع فی رزق القاضی)[1]

حاکم وقت کا مملوکہ زمین قاضی کو بطور عطیہ دینے کا حکم

سوال:۔ چار بھائیوں کی مشترکہ جائیداد ایک نواب نے کسی قاضی کو بطور عطیہ دے دی، قاضی نے اس جائیداد پر باضابطہ قبضہ کیا اور باقاعدہ نفع حاصل کرتا رہا، مذکورہ نواب کا اقتدار ختم ہوتے ہی ان بھائیوں نے حکومت سے اپنی جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا عدالت میں تقریباً سترہ (۱۷) سال مقدمہ جاری رہنے کے بعد فیصلہ دو بھائیوں کے حق میں ہوا اور باقی دو بھائیوں کو محض اس وجہ سے اپنے حق سے محروم رکھا کہ انہوں نے نواب کو دستخط کر دیئے تھے۔ اب یہ مشترکہ اور غیر منقسم جائیداد قاضی کے قبضہ میں ہے، مذکورہ بھائیوں نے قاضی سے جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ میرے قبضہ میں ہے اور مذکورہ نواب نے مجھے دی ہے اس لیے یہ میرا ہی حق ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قاضی کے لیے ایسی زمین پر قابض رہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے حاکم صرف اس جائیداد سے عطیات دینے کا حق دیا ہے جو کسی کی مملوکہ نہ ہو اور جو جائیداد پہلے ہی سے کسی کی ملکیت چلی آرہی ہو اس کا کوئی کسی کو بطور عطیہ یا انعام دینا جائز نہیں، اس لیے مذکورہ نواب نے اپنی حکومت میں جو مملوکہ زمین قاضی کو دی ہے اس پر قاضی کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور خاص کر جب مذکورہ نواب کی حکومت ختم ہونے پر حکومت نے مالکوں کے حق میں فیصلہ کیا ہو تو یہ جائیداد اصل مالکوں کو واپس کی جائے گی قاضی کے لیے اس پر بے جا قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ یہ غصب کے حکم میں ہوگا، اس لیے اگر قاضی کے تصرفات کی وجہ سے اس زمین کو نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری قاضی پر عائد ہوگی۔

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: واذا اراد القاضی ان یکتب السجل ویأخذ علی ذٰلک اجراً یأخذ منہ مقدار ما یجوز اخذہ لغیرہ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۷)

ومثلہ فی منحۃ الخالق علی ھامش البحر الرائق ج ۶ ص ۲۷۹ کتاب القضاء الفصل الثانی۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو غصب ارضاً فبنیٰ علیہا او غرس فیہا لا ینقطع ملک المالک ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردہا فارغة لان الارض بحالہا لم تتغیر ولم تصر شیئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۴۹ کتاب الغصب، فصل فی حکم الغصب)[1]

ایک بھائی کی عدم موجودگی میں مشترکہ جائیداد کے فیصلے کا طریقۂ کار

سوال: بھائیوں کی آپس میں مشترکہ جائیداد تھی اس پر کسی شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان بھائیوں میں سے ایک بھائی موجود نہیں تو کیا اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ وغیرہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر غائب نے اپنی طرف سے کسی بھائی کو اپنی جائیداد کے تنازعہ کے متعلق مکمل اختیار دیا ہے تو وہ بھائی اس کی طرف سے وکیل بن کر باقاعدہ خصومت کر سکتا ہے اور اس کی موجودگی میں قاضی فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اپنی طرف سے مکمل اختیار نہ دیا ہو تو پھر جو بھائی موجود ہے وہ شریک کی مانند ہو کر جن شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے انہی شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے بھائی کی طرف سے خصم بن سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ مشترکہ جائیداد بھائیوں کے قبضہ میں ہو تقسیم نہیں کی گئی ہو اور ایک ہی سبب کے تحت سب بھائیوں کو اس پر ملکیت حاصل ہو تو جو بھائی موجود ہے اس کی موجودگی میں فیصلہ کیا جائے گا اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو تو پھر غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ:- انہ ینتصب احدہم عن الباقین بشروط ثلاثة کون العین کلہا فی یدہ وان لا تکون مقسومة وان یصدق الغائب انہا ارث من المیت۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ کتاب القضاء)[2]

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فیہا او بنیٰ قیل لہ اقلع البناء والغرس وردہا وفیہ ایضاً فان کانت الارض تنتقص بقلع ذلک فللمالک ان یضمن لہ قیمة البناء وقیمة الغرس مقلوعاً ویکونان لہ۔ (الہدایہ ج۴ ص۳۷۹ کتاب الغصب، فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب) ـــ ومثلہ فی مجلة الاحکام، المادة ۹۰۵ ص۵۰۱ الفصل الثانی۔

[2] قال العلامة قاضی سماوةؒ: کون المدعی شیئین بینہما اتصال فی ہذہ الصور یحکم علی الغائب وفیہ ایضاً وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ما کان المدعی شیئاً واحداً وہو الاشبہ والاقرب الی الفقہ۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب الخ)

ومثلہ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج۱ ص۳۱۳ کتاب القضاء۔

مکرہ کے اقرار پر فیصلے کا حکم

سوال :- ایک شخص پر اپنے باپ کے قتل کا دعویٰ کیا گیا، دعویٰ کے اثبات پر کوئی گواہ بھی پیش نہیں ہوا، صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کی غرض سے مدعیٰ علیہ نے اقرارِ جرم کیا، جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے اپنے اقرار سے رجوع کر لیا، تو کیا پولیس کے سامنے اقرار کو مدار بنا کر اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کا فیصلہ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل موانع میراث میں سے ہے اور باپ کو قتل کرنے سے بیٹا باپ کی میراث سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس شرط پر کہ قتل کا ثبوت شرعی قواعد و ضوابط کے تحت ثابت ہو اور قتل کے ثبوت کی دو صورتیں ہیں' ایک معائنہ کی شہادت کہ قتل پر چشم دید گواہ پیش ہو جائیں اور دوسری صورت اپنی مرضی سے قتل کا اقرار کرنا، چونکہ مذکورہ بالا صورت میں صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کے لیے بیٹے نے باپ کے قتل کا اقرار کیا ہے اس لیے یہ شخص مکرہ کے اقرار کے حکم میں ہوگا، جس طرح مکرہ کا اقرار حجت نہیں ہوتا اسی طرح اس شخص کا اقرار بھی حجت نہیں لہٰذا اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنا جائز نہیں ہے ۔

کما فی الهندیة : وکن الرضا والطوع شرط حتیٰ لایصح اقرار المکرہ کذا فی النهایة ۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۴ ص ۱۵۶ کتاب الاقرار، الباب الاول) [1]

شریک کی عدم موجودگی میں قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال :- دو اشخاص کے درمیان ایک مشترکہ زمین تھی ایک شریک کی عدم موجودگی میں دوسرے پر کسی نے دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کیے، قاضی نے شریک کی عدم موجودگی میں مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا، تو کیا جو شریک موجود ہے اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس پر فیصلہ کرنا درست ہے یا نہیں ؟ اب غائب شریک واپس آگیا ہے اور دوبارہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا دعویٰ درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جو شریک حاضر ہے اگر زمین مذکورہ اس کے قبضہ میں ہو اور تقسیم نہ کی گئی ہو اور غائب شریک اس کا اعتراف بھی کرتا ہو کہ یہ زمین ہم دونوں میں مشترکہ ہے تو اس صورت میں

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ : اقرار المکرہ باطل ۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۹۶ باب الاقرار ۔
ومِثلُہٗ فی مجلة الاحکام ، المادة ۱۵۷۵ ص ۸۶۲ کتاب الاقرار ۔ الباب الاوّل ۔

جو شریک موجود ہے وہ دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے اور اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس کی موجودگی میں فیصلہ کرنا درست ہے، اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی نے فیصلہ کیا ہو تو یہ فیصلہ صحیح اور نافذ العمل ہوگا۔ اسی بناء پر اگر غائب واپس آجائے اور دوبارہ ملکیت کا دعوٰی کرے تو یہ دعوٰی درست نہیں لیکن اگر ان شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو تو جو شریک موجود ہے وہ غائب کی طرف سے خصم بننے کا اہل نہیں اس لیے ایسی صورت میں اگر قاضی غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ صحیح نہیں تو جب وہ حاضر ہو جائے اور دوبارہ ملکیت کا دعوٰی کرنا چاہے تو اس کا دعوٰی درست ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: لا یقضی علی غائب ولا له الا بحضور نائبه حقیقة کوکیله ووصیه ومتولی الوقف۔

وفی الدر المختار: افاد الکاف عدم الحصر فان احد الورثة کذلک ینتصب خصماً عن الباقین وکذا احد شریک الدین۔

وفی رد المحتار: انه ینتصب احدهم عن الباقی بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یده وان لا تکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ کتاب الحوالة)[1]

اقرار کے بعد مقروض کا قرض سے انکار اور اس پر ایک عدالتی فیصلے کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو بارہ سو ۱۲۰۰ روپے بطور قرض دیئے اور اس شخص نے گواہوں کے سامنے بارہ سو ۱۲۰۰ روپے وصولی کا اقرار بھی کیا، جب قرض دینے والے شخص نے مقروض سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مقروض نے دو ۲ آدمی قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت مانگنے کے لیے اس شخص کے پاس بھیجے چنانچہ وہ مزید مہلت دینے پر راضی ہوگیا، کچھ عرصے کے بعد مقروض نے قرض واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا، قرض خواہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوةؒ: کون المدعی شیئین بینهما سببیة لا محالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضاً وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ما لو کان المدعی شیئاً واحداً وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب)

ومثله فی تنقیح الفتاوٰی الحامدیة ج۱ ص۳۱۳ کتاب القضاء۔

نے مجبور ہو کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اور مقروض کے اقرار پر باقاعدہ گواہ بھی پیش کیے، لیکن اس کے باوجود جج نے مقروض کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، کیا جج کا یہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: جب ایک عاقل بالغ شخص کسی کے حق کا اقرار کرے تو وہ اپنے اقرار پر ماخوذ ہوتا ہے اور اس کے اقرار کے موافق اس پر ضمان لازم آتا ہے۔ مذکورہ صورت میں جب مقروض نے ایک دفعہ لوگوں کے سامنے بارہ ۱۲۰۰ سو روپے بطور قرض لینے کا اقرار کر لیا تو پھر قرض کی واپسی سے انکار جائز نہیں اور مزید برآں قرض کی ادائیگی کے لیے مزید مہلت مانگنے کے لیے دو آدمی قرض خواہ کے پاس بھیجنے سے قرض کے اقرار کی مزید تاکید ہوتی ہے اسلیے اگر قرض دہندہ نے مقروض کے اقرار پر گواہ پیش کیے ہوں تو ان گواہوں کے ہوتے ہوئے جج کا اس کے حق میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وكذا لو قال اخّرها عنی او صالحنی فاقرار۔
(خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۱۴۱ کتاب الاقرار، الفصل الاول)[1]

باپ کو عدالتی سزا سے بچانے کے لیے اعترافِ جرم کرنے کا حکم

سوال: ایک قتل میں باپ بیٹا دونوں شریک تھے عدالت نے جرم ثابت ہونے پر دونوں کو سزا کا مستحق قرار دیا لیکن بعد میں باپ کو بچانے کی خاطر بیٹے نے اعتراف کیا کہ میں نے مقتول کو اپنی بہن کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کیا لیکن میرا والد اس میں شریک نہیں تھا، اُس کے اِس بیان پر عدالت نے باپ کو سزا سے بری کر دیا اور بیٹے کو عمر قید کی سزا سُنا دی، حالانکہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ تو کیا بیٹے کے اس بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح ہے؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے شہادت کو ہر قسم کے خطرات سے تحفظ دلانے کے لیے احتیاط پر مبنی زرّیں اصول مرتب کیے ہیں کیونکہ فیصلے کا اصل دارومدار صحیح شہادت پر ہے، اس میں ذرہ برابر تغیر و تبدل سے فیصلے کی پوری نوعیت بدل جاتی ہے، اس لیے جہاں کہیں بھی

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: لو قال لی علیك الف فقال اتزنه او انتقدها او اجلنی به او قضیتکه فهو اقرار۔ (البحر الرائق ج ۷ ص۲۵۱ کتاب الاقرار۔
ومِثلُهٗ فی شرح المجلة (۸۵۸) ص۱۵۲ الکتاب الثالث عشر فی الاقرار۔

اس میں شبہ کا احتمال موجود ہو تو شریعت نے ایسی شہادت کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اس بناء پر جس شہادت میں بھی ذاتی منفعت یا باہمی قریبی رشتہ کی وجہ سے دوسرے کو منفعت دلانے کا تصور پایا جاتا ہو وہ شہادت مقبول نہیں، چونکہ باپ بیٹے کے منافع اکثر ایک ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں۔ صورتِ مذکورہ میں حسب بیان جب مجرم نے اعترافِ جرم کیا تو اس وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوا لیکن اس کے باپ کے بارے میں اس کی گواہی قبول نہیں لہٰذا بیٹے کے بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لأبويه واجداده۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ باب من يقبل شهادته ومن لا يقبل) [1]

مدعی کے بیانات میں تعارض کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص کی زمین اس کے چچا زاد بھائی کے زیر قبضہ تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہا، بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین چونکہ دیہہ شاملات ہے اور اس کو میں نے آباد کیا ہے اس لیے اب یہ میری ہے، بعد میں اس نے دوبارہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ زمین مجھے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، از روئے شرع اس شخص کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ مدعی کے بیانات کا آپس میں "تناقض" نہ ہو، اگر اس کے بیانات میں "تناقض" آجائے تو اس سے اس کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جب مدعی نے ایک دفعہ یہ بیان دیا کہ یہ زمین دیہہ شاملات ہے اور میں نے آباد کی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین پہلے سے کسی کی مملوکہ نہیں تھی بلکہ آباد کرنے سے یہ میری مملوکہ بن گئی ہے لیکن بعد میں جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاری رحمه الله: لا يجوز شهادة الرجل لولده ولا لوالده وان علی من قبل الاب والأم ولحافده وان سفل۔
(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۷۲ الفصل الثانی فی الشهادات)

ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۱۷۰۰ ص۱۰۲۳ الکتاب الخامس عشر، الفصل الثالث۔

مجھے آباؤ اجداد سے تقسیم میں ملی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلے سے میرے آباؤ اجداد کی مملوکہ ہے تو مدعی کے دونوں بیانات کا آپس میں تناقض ہے اس لیے اس کا دعویٰ صحیح نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها عدم التناقض فی الدعوی وھو ان لا یسبق منه ما یناقض دعوٰہ لاستحالة وجود الشیٔ مع ما یناقضه و ینافیه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۳ کتاب الدعوی، فصل فی الشرائط المصححه للدعوی) [1]

ملک اور بیع کے دعویٰ میں فیصلہ بیع کے گواہوں پر ہوگا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر سو کنال زمین فروخت کی اور کاغذات میں مشتری کا نام درج کر دیا اور اس کے عوض آٹھ سو روپے وصول کیے، بعد میں بائع نے دعویٰ کیا کہ میں نے آٹھ سو روپے صرف دس کنال زمین کے عوض وصول کیے ہیں اور باقی ۹۰ کنال بطور امانت دی تھی جبکہ مشتری یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے پوری سو کنال زمین کے آٹھ سو روپے ادا کیے ہیں، دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کرتے ہیں، تو اس صورت میں کس کے گواہوں پر فیصلہ کیا جائے گا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اور بائع ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے اور زمین چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے اس لیے مشتری ذوالید ہے اور بائع خارج، تو عام طور پر فقہاءؒ کے بیان کردہ اصول کے تحت خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوتے ہیں لیکن اگر ذوالید خارج سے شراء کا دعویٰ کرے تو پھر ذوالید کے گواہ خارج پر مقدم کیے جائیں گے، اور حسبِ بیان چونکہ مشتری ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اسلئے اگر طرفین اپنے اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں تو مشتری کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں کے موافق ہوگا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولو برھن الخارج وذوالید علی الشراء منه فذوالید احق۔ (البحرالرائق ج۷ ص۲۴۲ باب دعوی الرجلین) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ:۔ التناقض یکون مانعا لدعوی الملکیة۔ (مجلة الاحکام، المادہ ۱۶۴۷ ص۹۵۴)
وَمِثْلُهٗ فی جامع الفصولین ج۱ ص۱۲۳ الفصل العاشر فی التناقض فی الدعوی۔

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملک المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولٰی۔ (الھدایة ج۳ ص۲۲۳ کتاب الدعوی)
وَبِمِثْلِهٖ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۷۶۳ ص۳۳۲ کتاب الدعوی۔ الفصل الثانی۔

حدود بیان کیے بغیر زمین پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر دعویٰ کیا کہ میں نے اس سے سولہ کنال زمین خریدی ہے اور یہ میری ملکیت ہے، لیکن دعویٰ میں حدود بیان نہیں کیں، تو کیا حدود بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی بھی دعویٰ میں یہ ضروری ہے کہ مُدعی کو اپنے مُدعیٰ بہ پر علم حاصل ہو اور اپنے حق کا تعین کر سکتا ہو، کیونکہ اگر مُدعیٰ ہی معلوم نہ ہو تو جہالت کی وجہ سے مُدعی کے حق کی تمیز اور اثبات مشکل ہوگا، چونکہ زمین میں حق کا تعین اور تمیز حدود کے بیان کرنے سے ہوتا ہے اس لیے فقہاؒ نے زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں حدود کا بیان کرنا شرط قرار دیا ہے کہ حدود کے بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعویٰ صحیح نہیں، اس لیے مذکورہ صورت میں مُدعی جب تک اپنے دعویٰ میں زمین کی حدود بیان نہ کرے اس وقت تک اس کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (وان ادعى عقارا ذكر حدوده) لانه لا تعذر التعريف بالاشارة لتعذر النقل فيصار الى التحديد وكما يشترط التحديد في الدعوى يشترط في الشهادة۔

(البحر الرائق ج ۷ ص ۱۹۱ كتاب الدعوى)[1]

فصل کے نقصان کی وجہ سے پڑوسی سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کے مطالبہ کا حکم

سوال: ایک شخص کی زمین میں درخت ہے جس کی کچھ شاخیں پڑوسی کے کھیت کی طرف جھکی ہوئی ہیں جن کے سایہ سے اسکی فصل کو نقصان پہنچتا ہے، اب پڑوسی اس شخص سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا پڑوسی کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں معاشرتی زندگی میں باہمی اُلفت و محبت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس محبت و اُلفت کے بغیر پُرسکون زندگی کا تصوّر بھی محال ہے، اور یہ اُلفت و رغبت صحیح طریقے سے تب قائم ہو سکتی ہے جب معاشرے کا ہر فرد دوسرے حقوق کا لحاظ رکھے اور ہر کوئی دوسرے

---

[1] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ويشترط التحديد في دعوى العقار كما يشترط في الشهادة عليه۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۶۹ كتاب الدعوى)

ومثله في مجلة الاحكام، المادة ۱۶۲۳ ص ۱۹۱ كتاب الدعوى۔

کو اذیت پہنچانے سے گریز کرے، اس لیے اگر کسی کے تصرفات سے دوسرے کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اسلام نے اس قسم کے تصرفات سے اس کو باز رہنے کی تاکید کی ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اگر درخت کی شاخوں سے پڑوسی کے کھیت کو نقصان پہنچتا ہو تو درخت کے مالک سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر شاخ کو اوپر باندھنے سے پڑوسی کے نقصان کا ازالہ ممکن ہو تو مالک کو شاخیں باندھنے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر باندھنے سے بھی نقصان دور نہ ہوتا ہو تو پھر مالک کو شاخیں کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا البتہ درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم بازؒ: من امتدت اغصان شجر بستانه الى دار جاره او بستانه فلجاره ان يكلفه تفريغ هوائه بالربط او القطع (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۱۹۶ ص ۶۵۶) [1]

عاریۃً کسی کی زمین پر تصرفات کی وجہ سے استحقاق کا دعوٰی کرنا

سوال: ایک قوم نے اپنی کچھ زمین حکومت افغانستان کو عاریۃً دی، حکومت نے اس زمین پر پولیس اسٹیشن (تھانہ) بنایا، تیس ۳۰ سال بعد اب ایک افغان کمانڈر نے اس زمین پر قبضہ کیا ہے اور وہ اس پر آبادی کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے حکومت نے اس زمین پر آبادی کی اجازت دی ہے، ازروئے شریعت اس زمین میں مذکورہ کمانڈر کے تصرفات جائز ہیں یا نہیں؟

الجواب: جو زمین غیر مملوکہ ہو اس میں حاکمِ وقت کو تصرفات کا اختیار حاصل ہے اگر وہ اس زمین میں سے کسی کو کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے لیکن جو زمین پہلے سے مملوکہ ہو حاکمِ وقت کو اصل مالک کی مرضی کے بغیر کسی کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے مذکورہ صورت میں جب ایک قوم نے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو عاریۃً دے دی تو اس زمین پر اس قوم کی ملکیت برقرار ہے اور وہ جب بھی واپسی کا مطالبہ کرے زمین اُسے واپس کی جائے گی لہٰذا کمانڈر مذکور کا اس زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں آبادی کرنا جائز نہیں، اور جو آبادی وغیرہ کی ہو تو اُسے گرا کر زمین اصل مالکوں کو

---

[1] قال الامام فخرالدين حسن بن منصورؒ، رجلٌ له نخلة في ملكه وخرج سعفها الى ارض جاره كان الجار ان يقطع ويفرغ هواء ملكه لان من ملك ارضاً ملك ما تحته الى الثرىٰ وما فوقه الى السماء فكان له ان يقطع وهذا اذا كان لا يمكنه تفريغ الهواء الا بالقطع۔

(الفتاوىٰ الخانية على هامش الهندية ج ۳ ص ۱۰۳ باب الصلح في العقار الخ)

واپس کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا استعار ارضاً لیبنی فیها اولیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔ (الهدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریة)[1]

کسی کی مملوکہ زمین پر قبضہ کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص تیس۳۰ سال قبل اپنی مملوکہ زمین میں تصرف کرتا رہا، کسی عذر کی وجہ سے اسے وطن چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اس کی عدم موجودگی میں اس کے تین چچا زاد بھائیوں نے اس میں تصرف شروع کر دیا، جب یہ شخص واپس آیا تو اس نے اچھے تعلقات کی وجہ سے ان کو تصرف سے نہیں روکا، اب تقریباً دس۱۰ سال سے وہ زمین پر قابض ہیں اور زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، مالک کے پاس زمین کی ملکیت پر باقاعدہ گواہ موجود ہیں، تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ مدت مدید تک غیر کی مملوکہ زمین محض تصرف کی وجہ سے کسی کی ملک میں نہیں آسکتی بلکہ ملکیت کے لیے باقاعدہ اسباب مقرر ہیں، ان اسباب میں سے کسی بھی سبب کی عدم موجودگی میں کسی چیز پر ملکیت کا تصور ہی ناممکن ہے اس لیے اگر مالک شہادت شرعیہ سے اپنی ملکیت ثابت کرے تو اس کو اپنی زمین واپس کی جائے گی، صورت مسئولہ میں چچازاد بھائیوں نے اس پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے یہ سب غاصب ہیں اور غاصب پر مغصوبہ چیز کی واپسی لازم ہے۔ اگر انہوں نے زمین میں تصرفات کی وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہو تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فیها او بنی قیل له اقلع البناء والغرس وردها فارغة فان کانت الارض تنتقص بقلع ذلك فللمالك ان یضمن له قیمة البناء وقیمة الغرس مقلوعاً ویکونان له۔ (الهدایة ج۳ ص۳۶۹ کتاب الغصب)[2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء علیها صحیحة لکن للمعیر ان یرجع عن الاعارة متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلة الاحکام، المادة ۸۳۱ ص۶۰)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۹۲ کتاب العاریة۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: ومن غصب ارضاً فبنی علیها او غرس فیها لا ینقطع ملك المالك ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردها فارغة لان الارض بحالها لم تتغیر ولم تصر شیئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۴۹ کتاب الغصب فصل حکم الغصب) ـــــ ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۹۰۵ ص۵۰ الکتاب الثامن الفصل الثانی)

مدعی کا زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں

سوال:۔ ایک آدمی کافی مدت سے کسی کی زمین پر قابض ہے اور مالک کو باقاعدہ اجارہ دیتا ہے، دریں حالات کسی نے اس زمین کے کچھ حصّہ پر قبضہ کر لیا، مزارع نے جب دعویٰ کیا تو مدعیٰ علیہ نے چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ زمین تمہاری نہیں ہے اس لیے میں تمہیں فصل کا حصّہ نہیں دوں گا، مالک اگر دعویٰ کرے تو دیکھا جائے گا۔ کیا ایسے حالات میں مزارع کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں ؟ اور مُدعیٰ علیہ رفع سے انکار میں کہاں تک حق بجانب ہے ؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مزارع کا دعویٰ درست ہے اور جب تک زمین پر مزارع تصرّف کر رہا ہو تو اس کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے اور مدعیٰ علیہ کا اس سے جان چھڑانا بے سُود ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز: ولکن اذا غصب الودیعة او المستعار او الماجور او المرهون فللمودع والمستعیر والمستاجر والمرتهن ان یدعی بها علی الغاصب وحده ولا یلزم حضور المالک۔ ولیس للمالک ان یدعی بها وحدهٗ مالم یحضر هولاء (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۶۳۷ ص۹۴۱ الفصل الثالث)[1]

زمین کے نامعلوم حصّہ پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کسی کی مملوکہ زمین کے کچھ حصّہ کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمین میں میرا حصہ ہے اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کرتا ہے کہ اس زمین کا کچھ حصّہ میرے والد نے مالکِ زمین کو دیا ہے لیکن نہ تو اس کو مقدار معلوم ہے اور نہ حدود اربعہ، جبکہ مالکِ زمین اس کی ملکیت سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس شخص کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مُدعی جس چیز پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہو وہ چیز معلوم ہو، اگر مجہول ہو تو پھر اس پر دعویٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اگر مدعیٰ بہ مجہول ہو تو پھر اس پر نہ تو صحیح شہادت قائم ہو سکتی ہے اور نہ

---

[1] لما فی الهندیة: اذا ادعی رجلٌ دارا فی یدی رجل انها فی اجارتی آجرنیها فلان وادعی ذو الید انها فی اجارتی آجرنیها فلان آخر تسمع دعوی المدعی وینتصب صاحب الید خصماً۔
(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۱۳۷ الباب الخامس فیمن یصلح خصماً لغیره)
ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۸۳ کتاب الدعوی۔

صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مدعی کو نہ تو مدعیٰ بہ کی مقدار معلوم ہے اور نہ حدود اربعہ، جبکہ زمین کے دعویٰ میں حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے اس لیے اس آدمی کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔

قال العلامة الحصكفيؒ: معلومية المال المدعى اذ لا يقضى بمجهول ولا يقال مدعى فيه وبه الا ان يتضمن الاخبار۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۴ ص۴۴۲ كتاب القضاء) [1]

عاریہ پر لی ہوئی زمین سے معیر کو تنگ کرنے کیلئے مستعیر کا درخت نہ کاٹنے کے متعلق فیصلہ

سوال :- ایک شخص نے اپنی زمین کسی کو بطور عاریہ دی ہے اُس نے زمین میں درخت لگائے اور پھر بیچ دیئے لیکن زمین واپس ہونے کے باوجود صرف تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو خود درخت کاٹتا ہے اور نہ مشتری کو کاٹنے دیتا ہے جس کی وجہ سے زمین کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس بارے میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب :- چونکہ عاریت پر زمین دینے والا اس زمین کا مالک ہے اور اپنی زمین میں ہر قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے، تو جس طرح کسی کو زمین عاریہ پر دینے کا اُسے اختیار ہے اسی طرح اسی زمین کو کسی سے واپس لینے کا بھی اس کو اختیار حاصل ہے، جب بھی وہ اپنی زمین کی واپسی کا مطالبہ کرے تو بے چون وچرا اُسے زمین واپس کرنا مستعیر کی ذمہ داری ہے اس لیے عاریہ پر دینے والے کو تنگ کرنے کی غرض سے اپنے لگائے ہوئے درختوں کو چھوڑ دینا جائز نہیں، اسلئے اُسے درخت کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔

كما قال العلامة سليم رستم بازؒ: استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء عليها صحيحة لكن للمعير ان يرجع عن الاعارة متى شاء فاذا رجع لزم المستعير قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلة الاحكام، المادة ۸۳۱ ص۴۶۲ الفصل الثاني في احكام العارية وضمانها) [2]

---

[1] قال العلامة ابو بكر الكاسانيؒ: ومنها ان يكون المدعى معلوماً لتعذر الشهادة والقضاء بالمجهول (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۲ كتاب الدعوى، فصل الشرائط المصححة للدعوى)

ومثله في مجلة الاحكام، المادة ۱۶۱۹ ص۱۹۱ الباب الاول، الفصل الاول في شروط صحة الدعوى۔

[2] قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: واذا استعار ارضاً ليبني فيها او ليغرس جاز وللمعير ان يرجع فيها ويكلفه قلع البناء والغرس۔
(الهداية ج۳ ص۲۸۱ كتاب العارية)

ومثله في مجمع الضمانات، النوع الثالث ضمان العقار ص۶۶۔

والد کا عقدِ بیع کی اجازت سے انکار کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:- ایک شخص کا سسر کراچی میں مقیم تھا اس نے اپنے داماد کو زمین کا کچھ حصہ مکان تعمیر کرنے کے لیے دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر زمین لینے سے انکار کر دیا کہ جب تک سسر بیع قطعی پر مجھے زمین نہیں دیتے میں اس پر مکان تعمیر نہیں کروں گا، کچھ عرصہ بعد اس کا بیٹا کراچی سے آیا اور بہنوئی سے کہا کہ مجھے والد نے مکمل اختیار دیا ہے اور اجازت نامہ بھی پیش کیا ہے، اس لیے اگر آپ بیع قطعی پر زمین لینا چاہیں تو میں دینے کو تیار ہوں چنانچہ بہنوئی نے دس ہزار روپیہ کے عوض زمین خرید لی اور بیع نامہ تحریر کیا جب سسر واپس آیا تو لوگوں نے اس کو اکسایا جس پر اس نے بیع پر زمین دینے سے انکار کر دیا، کیا از روئے شرع سسر زمین واپس لینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- بشرطِ صحتِ سوال اگر واقعی والد نے اپنے بیٹے کو بیع کی اجازت دی ہو تو بیع نافذ ہے اور والد کو بیع رد کرنے کا اختیار نہیں لیکن مشتری کو اس پر گواہ پیش کرنے ہوں گے کہ واقعی والد نے بیٹے کو بیع کی اجازت دی تھی، اگر مشتری اس پر گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کے مطالبہ پر بائع کے والد کو قسم دی جائے گی اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو بیع نافذ ہو کر اس کو واپسی کا حق نہیں اور اگر وہ قسم کھائے تو پھر بیع فضولی کے حکم میں ہو کر والد کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو بیع نافذ نہیں۔

اخرج الامام البیہقیؒ: فکتب ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم لادعیٰ رجال اموال قوم ودمائھم ولٰکن البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (رواہ البیہقی ج ۱۰ ص ۲۵۲ کتاب الدعویٰ)[1]

مشترکہ چشمہ پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ

سوال:- دو اشخاص کے مابین مشترکہ زمین تھی جس میں بعض حصہ بنجر اور بعض قابلِ کاشت تھا، دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس زمین کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے

---

[1] وذکر الامام مسلمؒ: عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۴ کتاب الدعویٰ) ومثلہٗ فی الھدایة ج ۳ ص ۲۰۳ کتاب الدعویٰ۔

زمین سیراب ہوتی تھی، اب ان میں سے ایک شخص نے اس چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، کیا ایک جاری چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ جاری پانی کے ساتھ عام لوگوں کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں، تو اگر اس پر کسی کی ملکیت تسلیم کرلی جائے یا کسی کے زیرِ قبضہ رکھا جائے تو اس میں لوگوں کے حقوق تلف ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعت مطہرہ نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا برابر اختیار دیا ہے اور کسی کو بھی ملکاً قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی، لہٰذا حسبِ بیان مذکورہ بالا صورت میں یہ شخص نہ اپنے شریک کو چشمہ سے روک سکتا ہے اور نہ اس پر ملکیت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ: عن رجل من مہاجرین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا اسمعہ یقول المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۶ باب فی منع الماء) [1]

رنجش کی وجہ سے پانی کا قدیم راستہ روکنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ دو بھائیوں نے اپنی مشترکہ زمین تقسیم کرکے ہر ایک نے اپنے حصہ پر قبضہ کیا، ایک بھائی نے اپنے حصہ کی زمین میں مکان بنایا اور تقریباً تیرہ ۱۳ سال اس میں رہا، بعد میں اس نے اپنا مکان کسی پر فروخت کردیا، مشتری بھی تقریباً ۶ سال اس میں رہا، اب اوّل مالک کے بھائی نے باہمی رنجش کی وجہ سے اس شخص کے مکان اور ساتھ والے دوسرے مکانات کے پانی کا راستہ بند کردیا ہے، تو کیا کسی کی ملک میں ۶۶ سال سے قائم شدہ پانی کا راستہ کوئی بند کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدتِ دراز سے لوگوں کے مکانات کے پانی کا راستہ قائم ہو تو ملک بدلنے سے اس میں تغیر نہیں آتی بلکہ ہر ایک کو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنی ہوگی تاکہ آپس میں الفت و محبت کی فضا قائم رہے، اگر ملک بدلنے سے ہر کوئی اس میں تصرف کرتا رہے کبھی

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: الماء والکلاء والنار مباحة والناس فی ھٰذہ الاشیاء الثلاثة شرکاء۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۳۴ ص ۶۷۶ الباب الرابع فی شرکة الاباحة الفصل الاول)
ومثلہٗ فی الھدایة ج ۲ ص ۲۸۳ کتاب الشرکة۔

بند کرے اور کبھی کھلا رکھے تو اس سے اہلِ محلہ کو تشویش لاحق ہوگی اور بے چینی کا شکار ہو جائیں گے، اس لیے اگر واقعی پانی کا یہ راستہ پہلے ہی سے قائم ہے تو پھر اس آدمی کو راستہ بند کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ پانی کا یہ راستہ مدتِ دراز سے قائم ہے تو پھر مشتری اور دوسرے مکانات والوں کو گواہوں سے اسی راستے سے پانی گذارنے کا حق ثابت کرنا ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ : اذا کان لرجلٍ ارض وللآخر فیها نهر واراد رب الارض ان لا یجری النهر فی ارضه لم یکن له ذلك ویترك علی حاله۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۱۴ کتاب احیاء الموات) [1]

حصہ دار کی اجازت کے بغیر اس کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ زمین مشترکہ شاملات دیہہ ہے جس میں سرکاری کاغذات کی رُو سے تین سو افراد شریک ہیں، ان میں سے ایک شریک نے دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر زمین کسی پر فروخت کر دی، شرکاء کی بار بار تنبیہ کے باوجود مشتری نے اس زمین پر مکانات تعمیر کیے، اب دیگر شرکاء زمین خالی کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے جبکہ مشتری زمین خالی کرنے سے انکار کرتا ہے اُس کا کہنا ہے کہ یہ زمین چونکہ میں نے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، تو اس بارے میں اب فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر یہ قطعہ زمین جو کہ شاملاتِ دیہہ ہے حکومت کی طرف سے گاؤں کے لوگوں کو دی گئی ہو تو جن لوگوں کو اس میں حصہ دیا گیا ہے وہ سب اس کے مالک ہیں اس لیے یہ زمین ان سب کی مشترکہ ہوگی اور مشترکہ مال میں ہر ایک شریک دوسرے کے حصہ کے بارہ میں اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اجنبی شخص کسی کی مملوکہ زمین میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق نہیں رکھتا اسلئے صورتِ مسئولہ میں شرکاء کی اجازت کے بغیر ان کے حصّہ کی زمین فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا ان کے مطالبہ پر ان کے حصہ کی زمین خالی کرا کر ان کے حوالہ کی جائے گی۔

کما قال العلامة سلیم رستم بازؒ : کل من الشرکاء فی شرکة الملك اجنبی فی حصة

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ : رجل له ارض وللآخر نهر یجری فیها فاراد رب الارض ان یمنع النهر ان یجری فی ارضه لم یکن له ذلك۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۱۵ کتاب احیاء الموات)

ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۱۲۲۸ ص ۶۷۳ کتاب احیاء الموات۔

سائرهم فليس احدهم وكيلاً عن الآخر ولا يجوز له من ثم ان يتصرف فى حصة شريكه بدون اذنه۔ (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۷۵ ص۲۰۱ الباب الاول فى شركة الملك۔ الفصل الثانی)[1]

متوفی بھائی کے بیٹوں کی موجودگی میں اسکی ذاتی جائیداد باپ کے ترکہ میں شامل کرکے تقسیم کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص فوت ہوگیا اور اس کے ورثاء میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئے، ان چار بھائیوں میں سے ایک نے والد کے ترکہ کے علاوہ ایک قطعہ زمین کسی اور شخص سے خریدا جو کسی کی شرکت کے بغیر وہ زمین اس کی ملکیت میں آئی، والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل ہی وہ وفات پاگیا اور اس کے ورثاء میں دو معصوم بچے رہ گئے، مرحوم کے بیٹے جب بالغ ہوئے تو انہوں نے اپنے چچوں سے دادا کے ترکہ کی تقسیم کا مطالبہ کیا، اب تک ان کو اپنے والد کی اپنی زرخرید زمین کے بارے میں معلومات نہیں ہوسکیں اور نہ ہی کسی نے اس بارے میں انہیں بتایا لہٰذا دادا کے ترکہ کی تقسیم کے وقت وہ قطعہ زمین ایک چچا کے حصہ میں آگیا، دادا کے ترکہ کے تین حصے کرکے مرحوم کا حصہ اس کے بیٹوں کو دے دیا گیا، تقسیم کے تقریباً ۱۲ سال بعد مرحوم کے بیٹوں کو معلوم ہوا کہ جو قطعۂ زمین ان کے فلاں چچا کے حصہ میں آچکی ہے وہ ان کے باپ کی زرخرید اپنی ذاتی ملکیت تھی، اور اس درمیانی عرصہ میں ان کے چچا نے وہ زمین اپنے دوسرے بھائی پر فروخت کردی، مرحوم کے بیٹوں کو جب علم ہوا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ جو زمین ہمارے والد کی زرخرید ملکیت ہے وہ ہمیں والد کے ترکہ میں دادا کے ترکہ کے علاوہ الگ ملنی چاہیئے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شریعت کی رو سے ان کا دعویٰ درست ہے؟ جبکہ مدعیٰ علیہم اس قطعہ زمین کے مدعی کے والد کے ترکہ سے نہ ہونے اور دادا کے ترکہ سے ہونے کے قائل ہیں، مرحوم کے بیٹوں کے پاس ہر قسم کا ثبوت موجود ہے، اگر شہادت کی ضرورت پڑی تو گواہ کس کے معتبر ہونگے؟

الجواب:- محض مدتِ دراز کے گذرنے سے کسی کا حق باطل نہیں ہوتا خاص کر ایسی حالت میں جبکہ اس کو اپنے حق کا علم بھی نہ ہوا اور لاعلمی کی صورت میں چاہے جتنی بھی تاخیر ہو جائے پھر سماعت دعوےٰ

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ: وكل من شركاء الملك اجنبی فی الامتناع عن تصرف مضر فی مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۶۵ كتاب الشركة)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ كتاب الشركة۔

کے لیے مانع نہیں، چونکہ علم نہ ہونے کو فقہاء نے شرعی عذر قرار دیا ہے اور وراثت میں تو اطلاع کے باوجود بھی تاخیر ہو جانے سے دعویٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا اس لیے صورتِ مسئولہ میں میت کے بیٹوں کا دعویٰ صحیح ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ :- ویتخصص بزمان ومکان وخصومة حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعوی بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ینفذ الا فی الوقف والارث ووجود عذر شرعی وبه افتی المفتی ابو السعود۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۸۰ کتاب القضاء)[1]

جب دونوں کے پاس گواہ موجود ہوں تو میت کے بیٹے چونکہ قطعہ اراضی کے زرخرید ہونے کے مدعی ہیں اور ان کے چچا اس کے زرخرید ہونے کی نفی کرتے ہیں، اور دعویٰ میں جب اثبات اور نفی کا تقابل آجائے تو اثبات میں چونکہ زیادت کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور زیادت کے گواہ چونکہ نقصان کے گواہ پر مقدم ہوتے ہیں اس لیے اثبات کے گواہوں کو نفی کے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی اس لیے صورتِ مذکورہ میں میت کے بیٹوں کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ ان کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : فالاصل فیه ان البینة المظهرة للزیادة اولیٰ۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ کتاب الشرکة)[2]

حکومت کی طرف سے دی گئی زمین پر فریقین کے دعویٰ ملکیت میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال :- افغان حکومت نے ۱۳۴۲ھ کو یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے حکومت انہیں زمین دے گی، ایک قوم نے کسی کی وکالت سے حکومت کو درخواست دی، حکومت نے درخواست منظور کر لی اور اس قوم کو مالکانہ حقوق کے ساتھ زمین دے دی گئی اور باقاعدہ اسناد جاری کی گئیں سنہ ۱۹۴۳ء تک یہ قوم

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز : لاتسمع دعوی الدّین والودیعة والعقار الملوک والمیراث بعد ان ترکت خمس عشرة سنة۔ (شرح المجلة، المادة ۱۶۶۰ ص۹۸۴ الباب الثانی فی مرور الزمان)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۲۸ باب التحالف۔

[2] قال العلامة سلیم رستم باز : بینة الزیادة اولیٰ۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۶۲ ص۱۱۳۱ الباب الرابع)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۲ الباب التاسع فی الشهادة علی النفی والبینات الخ۔

بطورِ کاشتکار اس سے فائدہ حاصل کرتی رہی، جب اس قوم نے پاکستان ہجرت کی تو مذکورہ بالا زمین ایک اور قوم کو اجارہ پر دے دی، اب اس قوم نے اس زمین پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہم سے غصب کی گئی تھی، شرعاً اب یہ زمین کس کی ملکیت میں رہے گی؟

الجواب:۔ جو زمین کسی کی مملوکہ نہ ہو اور موات کے حکم میں ہو یا وہ زمین جو بیت المال کے زیرِ تصرف ہو اس کے بارے میں حاکمِ وقت کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طریقہ سے بھی چاہے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ کسی قوم کو اس میں سے کچھ دینا چاہے تو اس کو اختیار حاصل ہے اور جس کو بھی حاکمِ وقت کی طرف سے کچھ زمین مل جائے وہ اس کا مالک تصور کیا جائے گا اور یہ زمین شرعی قواعد و ضوابط کے تحت اس کے مرنے کے بعد ورثاء میں بھی تقسیم ہوگی لہٰذا حاکمِ وقت کی طرف سے غیر مملوکہ زمین کسی کو دینے کے بعد کسی کو بھی اسے واپس لینے یا اس پر قبضہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وللامام ان یقطع کل موات وکل ما لیس فیه ملك لاحد ویعمل بما یریٰ انه خیر للمسلمین واعم نفعاً۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۲۹ فی احکام الاقطاعات من بیت المال۔ باب العشر والخراج والجزیة) [1]

کسی غیر کے نام مندرج زیرِ قبضہ زمین میں فریقین کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: سرکاری کاغذات میں ایک شخص کے نام زمین درج ہے اور اس زمین پر سن ۱۹۴۳ء سے کسی دوسرے شخص نے قبضہ کر رکھا ہے اس زمین میں ایک بہت بڑا درخت تھا جو کہ قابض کاٹ کر گھر لے گیا، زمین کی ملکیت جس شخص کے نام درج ہے اب اس نے زمین پر قبضہ کر کے قابض پر زمین کی ملکیت اور درخت کا دعویٰ کیا، تو مذکورہ صورت میں فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: اگر سرکاری کاغذات صحیح ہوں ان میں دھوکہ، جعل سازی اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا، ان کاغذات کے موافق زمین جس کے نام درج ہو اس کی

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: فالامام یملك اقطاع الموات من مصالح المسلمین لما یرجع ذلك الی عمارة البلاد والتصرف فیما یتعلق بمصالح المسلمین للامام۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۹۴ کتاب الاراضی)
ومثله فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۲ ص ۶۸۸۔

ملکیت تصور کی جائے گی اور درخت بھی اسی کا ہوگا لیکن اگر اس میں جھوٹ و فریب کا احتمال ہو تو متعلقہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے والا خارج ہے اور قابض ذوالید ہے، اس لیے اگر فریقین گواہ قائم کریں تو خارج کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا، اگر خارج کے پاس گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کے گواہوں پر فیصلہ ہوگا، اگر طرفین میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کو قسم دی جائے گی، اگر قسم سے انکار کرے تو زمین پر خارج کی ملکیت ثابت ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فان قامت علیٰ ملك مطلق عن الوقت فبینة الخارج اولیٰ۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوٰی، فصل فی حکم تعارض الدعوتین)[1]

حکومت کی اجازت سے مواتِ اراضی آباد کرنے کا حکم

سوال:- ایک دفعہ صوبائی حکومت نے اعلان کیا کہ جو کوئی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، چنانچہ ایک علاقہ میں غیر آباد بنجر پہاڑ کے کچھ حصہ پر بعض لوگوں نے محنت کرکے قابلِ کاشت بنایا اور بعض حصہ میں گھر بنالئے، لیکن وہاں کے بعض با اثر لوگوں نے جبراً ان لوگوں کی زمینیں چھین لیں اور مکانات بھی خالی کرالیے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حکومتِ وقت کے باقاعدہ اعلان کے بعد اگر کوئی شخص غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مذکورہ بالا پہاڑ پہلے سے کسی کا مملوکہ نہ ہو اور نہ قریبی لوگ اس کو اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہوں تو حکومتِ وقت کی اجازت کے بعد جو بھی اس کو آباد کرے چاہے کاشت کے قابل بنانے سے آباد کرے یا مکانات تعمیر کرنے سے آباد کرے تو آباد کرنے والا اس کا مالک بن جائے گا، اس لیے اس زمین پر ملکیت ثابت کیے بغیر محض طاقت کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے زمین خالی کرانا سراسر ظلم و زیادتی ہے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: من احیا ارضاً من الاراضی الموات بالاذن السلطان

---

[1] قال العلامة علاؤالدین التمرتاشیؒ: تقدم حجة خارج فی ملك مطلق علیٰ حجة ذوی الید۔

(تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۸۶ باب دعوٰی الرجلین)

ومثلهٗ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ کتاب الدعوٰی۔

صار مالکا لها۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۲ ص۶۸۸ الباب الرابع فی شرکة الاباحة) [1]

موات کو آباد کرنے کی وجہ سے چشمہ کا پانی دوسری اراضی پر بند کرنے سے متعلق فیصلہ

سوال:۔ ایک زمین مدتوں سے ایک شخص کے زیر تصرف چلی آرہی ہے اس کے قریب ایک غیر آباد پہاڑ میں چشمہ تھا جس سے زمین سیراب ہوتی تھی، اب اس غیر آباد پہاڑ کو کسی نے آباد کرکے قرب وجوار میں واقع آباد زمین پر پانی بند کردیا ہے، تو کیا اس شخص کا دوسروں کی اراضی پر پانی بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک غیر آباد زمین جاری چشمہ سے مدت دراز تک سیراب ہوتی رہی ہے تو اس غیر آباد زمین پر قبضہ کرکے اس کو آباد کرنے سے قرب وجوار میں واقع اراضی پر اس چشمہ کا پانی بند کرنا جائز نہیں کیونکہ موات اراضی کو آباد کرنے سے اس کے قرب وجوار میں واقع اراضی پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ اس زمین کے متعلقہ حقوق بدستور قائم رہیں گے، جس طرح موات میں پہلے سے قائم شدہ راستہ موات آباد کرنے کی وجہ سے کوئی نہیں روک سکتا اسی طرح موات میں پہلے سے قائم دوسری اراضی کے پانی کا راستہ روکنا جائز نہیں۔

وفی الهندیة: رجل احیا ارضا میتة ثم جاء انسان واحیا اراضی حولها حتی احاط الاحیاء بجوانبها الاربعة کان له ان یتطرق الی ارضه من الارض التی احیاها آخر۔

(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات الباب الاول) [2]

مشترکہ زمین میں دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک علاقہ میں

---

[1] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فالملك فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفةؒ

(بدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی)

ومثله فی رد المحتار ج۵ ص۳۰۰ کتاب احیاء الموات۔

[2] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: اذا احیا رجل ارضا من اراضی الموات ثم جاء آخرون ایضا فاحیوا الاراضی التی فی اطرافها الاربع یتعین طریق ذلك الشخص فی ارض المحی الاخیر یعنی ان طریقه تکون منها (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۳ ص۶۸۹ الباب الرابع فی شرکة الاباحة الفصل الثانی)

ومثله فی تنویر الابصار ج۵ ص۳۰۰ کتاب احیاء الموات۔

چھ سو ایکڑ زمین مشترکہ شاملات دیہہ ہے جس میں پانچسو افراد شریک ہیں، اب اس میں شریک چند اشخاص نے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر مکانات بنائے اور باغات لگائے، دوسرے شرکاء ان کو اس تصرف سے منع کرتے جبکہ یہ اشخاص اس تصرف سے باز نہیں آتے، تو کیا دوسرے شرکاء ان اشخاص کو اس تصرف سے منع کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمین کسی کی مملوکہ نہیں اور موات کے حکم میں ہے تو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا اس کا حقدار ہوگا، اس میں دوسرے شرکاء سے اجازت کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی اجازت کے بغیر بھی اس میں تصرف جائز ہے، البتہ اگر یہ زمین حکومت نے ان پانچسو افراد کو دی ہو جیسا کہ عام طور پر مقامی لوگوں میں شاملات زمین قرب وجوار میں موجود اراضی کے تناسب سے دی جاتی ہے تو یہ زمین سب میں مشترکہ ہوگی اور مشترکہ املاک میں تصرف کرنے سے اگر دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو پھر اس میں بعض شرکاء کا تصرف جائز ہے لیکن اگر ان کے تصرف سے دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچتا ہو تو پھر ان شرکاء کا اس زمین میں تصرف جائز نہیں اور دوسرے شرکاء ان کو تصرف سے منع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وكل من شركاء الملك اجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة. (الدر المختار ج ۳ ص۳۶۵ کتاب الشرکۃ)

عرصہ دراز تک آمدورفت کی وجہ سے راستہ پر حقِ مرور کا دعویٰ کرنے کا حکم

سوال:- دو اشخاص کا ایک راستہ پر تنازعہ ہے ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ ساٹھ سال سے اس راستہ پر میری آمدورفت جاری ہے اس لیے اب کوئی بھی مجھے اس راستے پر گذرنے سے منع کرنے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ دوسرا شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ راستہ میری ملکیت ہے اور محض تعلقات کی وجہ سے میں نے اس شخص کو اس راستہ پر سے گذرنے کی اجازت دی تھی لہٰذا مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اس شخص کو راستے پر گذرنے سے روک دوں، تو کیا زمین کا مالک اس شخص

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: انتفاع الحاضر بالملك المشترك بوجه لا يضر الغائب يعد رضي من الغائب. (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۷۹ ص۶۰۲ الباب الاول في شركة الملك)
ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ کتاب الشرکۃ۔

راستے پر گزرنے سے روک سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: محض آمد و رفت کی وجہ سے حقِ مرور کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں بلکہ مدعی پر لازم ہے کہ مدعیٰ علیہ کی مملوکہ زمین میں اپنے لیے راستہ ثابت کرنے پر گواہ پیش کرے، اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

کما فی الهندیة: لو ادعیٰ علیٰ آخر حق المرور ورقبة الطریق فی داره فالقول صاحب الدار ولو اقام المدعی البینة انه فی هٰذه الدار لم یستحق بهٰذا شیئًا كذا فی الخلاصة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۱۰۴ الباب التاسع فیما یجوز بیعه) لہ

ایک ہی شخص سے خریدی ہوئی زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں تاریخ کی تقدیم و تاخیر کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین اپنے بھتیجے پر فروخت کی، پھر دوبارہ خفیہ طور پر وہی زمین اپنے بھائی پر فروخت کی، بائع کا بھتیجا اور بھائی دونوں اپنی اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ پر ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جبکہ بائع لاپتہ ہے تو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کس طرح کیا جائے گا ؟

الجواب: ایک ہی وقت میں دو اشخاص پر زمین فروخت کرنا جائز نہیں یہ سراسر دھوکہ ہے اور اس دھوکہ اور فریب کی وجہ سے دونوں آپس میں دست و گریبان ہیں، صورتِ مذکورہ میں جب بائع نے زمین دو افراد پر فروخت کی تو اگر دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں اور دونوں نے ایک ہی تاریخ پیش کی ہو اور ہر ایک اپنے دعویٰ کے اثبات پر گواہ پیش کرتا ہو تو زمین فی الحال جس کے قبضہ میں ہے اس کے گواہوں کو دوسرے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی البتہ اگر

لہ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو ادعیٰ علیٰ آخر حق المرور ورقبة الطریق فی داره القول قول صاحب الدار، ولو اقام المدعی البینة انه كان یمر فی هٰذه الدار لم یستحق بهٰذا شیئًا ولو شهدوا ان له طریقا فیها وبینوا حدوده .... یقضیٰ له بذٰلك۔

(خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۹۵ كتاب الدعویٰ۔ الفصل الثانی)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم بازؒ، المادة ۱۱۵۵ فصل فی دعوی الحائط والطریق۔

دونوں نے مختلف تاریخیں بیان کی ہوں تو پھر جس کی تاریخ مقدم ہو اس کے گواہ بھی دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوں گے۔

قال العلامة محمد علاؤ الدین افندیؒ: ولو ادعی الخارج وذو الید بسبب من الاسباب نحو شراء وارث وشبهه فلا یخلوا اما ان یدعیا تلقی الملك من جهة واحد او من جهة اثنین فلو ادعیاه من جهة واحد وبرهنا حکم به لذی الید لو لم یؤرخا او ارخا سواءً فلو ارخا وتاریخ احدهما اسبق فهو اولی۔ (تکملة رد المحتار ج۲ ص۱۸ باب دعوی الرجلین)[1]

مقتول کے وارث کی طرف سے قاتل کو معاف کرنے کے بعد قتل کے دعوے کا جائزہ

سوال:- ایک آدمی نے کسی شخص پر اپنے بیٹے کے قتل کا دعویٰ کیا جبکہ مدعا علیہ قتل سے منکر ہے، گواہوں کی شہادت سے قبل مدعیٰ علیہ نے دعویٰ کو ان الفاظ سے رفع کیا کہ مقتول کے باپ سے میرے بھائی نے قتل کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر اس نے قتل کیا بھی ہو تو میں نے اس کو معاف کر دیا ہے، تو کیا یہ معافی دفع دعویٰ کیلئے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:- قصاص جاری کرنا چونکہ سنگین نوعیت کا حامل معاملہ ہے کیونکہ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے اس باب میں شریعت نے مقتول کے ورثاء کے عفو و درگذر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی بھی قاتل کو معاف کر دے تو اس سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ حسب بیان اگر شرعی طریقے سے ثابت ہو جائے کہ مقتول کے والد نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو میں نے معاف کیا ہے، تو اس کا یہ اعتراف اور معافی دعویٰ کے دفاع کے لیے کافی ہے اور اس سے قتل کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔

---

[1] وفی الهندیة: ان کانت فی ید احدهما فهی لذی الید سواء ارخ او لم یؤرخ الا اذا ارخا وتاریخ الخارج اسبق فیقضی بها للخارج کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۷۲ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)

ومثلهٔ فی شرح مجلة الاحکام (۱۱۲۷) کتاب الدعوی۔

کمافی الهندیة: ومن عفا من ورثة المقتول عن القصاص رجلٌ او امرأةٌ او أم او جدة ومن سواهن من النساء او كان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القصاص فلا سبیل الی القصاص۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۲۰ الباب السادس فی الصلح والعفو والشهادة فیه)[1]

بیٹے کو ہبہ کی ہوئی زمین پر ورثاء کے دعوی ملکیت کا جائزہ

سوال: ایک شخص نے کچھ زمین خریدی، خریدنے کے بعد زمین کا کچھ حصہ اپنے بیٹے کے نام منتقل کر دیا اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا اس کی وفات کے بعد جو زمین اس کے نام درج تھی وہ ورثاء میں تقسیم کر دی گئی اور جو زمین بیٹے کے نام درج تھی وہ اس کے قبضہ میں اپنے حال پر باقی رہی، اب ورثاء نے اس کی زمین میں بھی وراثت کا دعوی کیا ہے کہ وراثت کے تحت ہمارا بھی اس میں حصہ ہے جبکہ بیٹا اپنی زمین میں ان کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اندریں صورت کیا بیٹے کے حصہ کی زمین میں ورثاء کی ملکیت کا دعوی صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: در حقیقت حالتِ حیات میں باپ اپنی جائیداد میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے بیٹے کے لیے ہبہ ہوتا ہے اور ہبہ کی تمامیت کے لیے قبض شرط ہے اگر موہوب لہ ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ نہ کرے تو بغیر قبضہ کے ہبہ تام نہیں ہوتا اس لیے حسب بیان اگر واقعی والد نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کر دی ہو اور اس کی زندگی میں بیٹے نے اس پر قبضہ کر لیا ہو تو یہ زمین محض اس کی ملکیت ہوگی اس میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں اس لیے اس زمین پر دوسرے ورثاء کا ملکیت کا دعوی کرنا صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ومنها ان یکون الموهوب مقبوضاً حتی لا یثبت الملك للموهوب له قبل القبض وان یکون مقسوماً اذا کان مما یحتمل القسمة۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۲ ص۹۳ کتاب الهبة)[2]

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: فاما اذا کان اثنین او اکثر فعفا احدهما سقط القصاص عن القاتل لانه سقط نصیب العافی بالعفو فیسقط نصیب الآخر ضرورة انه لا یتجزأ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۷ کتاب الدعوی)

ومثلهٗ فی الهدایة ج۴ ص۵۵۶ کتاب الدعوی۔

[2] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: یملك الموهوب له الموهوب بالقبض۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۸۶۱ ص۴۷۳ الباب الثالث)

ومثلهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۳ فصل حکم الهبة، کتاب الهبة۔

ہلاک شدہ مال کے بارے میں قرض اور مضاربت کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: ایک شخص جو کہ اسلحہ کا کاروبار کرتا تھا اور وہ اپنے ایک ساتھی سے چار ہزار روپے، دوسرے سے دو ہزار روپے اور تیسرے سے ایک ہزار روپے لے کر چلا، اس نے کل سات ہزار روپے ایک دلال کو دیئے، دلال نے کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر میں آپ کو کارتوس دوں گا، یہ شخص جب طے شدہ مقام پر پہنچا تو اس کی موجودگی میں پولیس نے دلال کو گرفتار کر لیا اور کارتوس وغیرہ ضبط کر لیے، یہ شخص خالی ہاتھ وہاں سے واپس آگیا، بعد میں اس کو پتہ چلا کہ یہ سب دلال کا اپنا چکر تھا اور واقعہ بناوٹی تھا، اس لیے اس نے دلال سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن دلال نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا، وہاں سے ناکام واپس لوٹا، جب ساتھیوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے اس سے اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کیا، اس وقت اس شخص نے کہا کہ تم پرواہ نہ کرو تمہاری رقم میں واپس کروں گا، بعد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ چونکہ آپ لوگوں نے رقم مجھے مضاربت پر دی تھی اس لیے اس ہلاکت کے بعد میں رقم کا ضامن نہیں ہوں جبکہ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ رقم قرضِ حسنہ کے طور پر دی تھی۔ فریقین میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہیں، تو اب فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساتھیوں نے یہ رقم اسے بطور قرضِ حسنہ دی تھی کیونکہ مدعیٰ علیہ نے جب یہ کہا کہ تم پرواہ نہ کرو میں تمہاری رقم واپس کروں گا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرضِ حسنہ کا قائل تھا، اب یہ تینوں ساتھی مدعی ہیں اور وہ شخص مدعیٰ علیہ چونکہ ساتھیوں کے پاس گواہ موجود نہیں اس لیے البینة للمدعی والیمین علی من انکر کے تحت اس شخص کو قسم دی جائے گی اور اگر وہ قسم کھائے کہ مجھے رقم مضاربت پر ملی تھی تو مضاربت ثابت ہونے کے بعد وہ ضمان سے بری الذمہ ہوگا کیونکہ مضاربت میں مال مضارب کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے اور امانت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو موجبِ ضمان نہیں اس لیے یہاں بھی ضمان لازم نہیں آئے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ: فان زاد الهالك على الربح فلا ضمان على المضارب لانه امين۔

(الهداية ج٣ ص٢٦٤ كتاب المضاربة، فصل فى العزل والقسمة) [1]

---

[1] قال العلامة سليم رستم بازؒ: اذا تجاوز مقدار الربح سرى الى راس المال فلا يضمنه المضارب سواء كانت المضاربة صحيحة او فاسدة۔ (شرح المجلة۔ المادة ١٤٢٧ ص٧٥٧ الباب الرابع۔ الفصل الثالث)

ومثله فى خلاصة الفتاوى ج٤ ص١٨٨ كتاب المضاربة۔

غیر اختیاری کاموں میں کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ایک شخص سعودی عرب میں ایک کمپنی میں ملازم تھا اور اس کی نگرانی میں تقریباً ۳۵ آدمی کام کرتے تھے، یہ سارے آدمی چونکہ غیر قانونی طور پر وہاں مقیم تھے اس لیے حکومت نے ان کو گرفتار کرلیا، اب ان آدمیوں میں سے ایک نے اپنے نگران پر دعویٰ کر دیا کہ اس نے ہماری ذمہ داری لی تھی کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور جو بھی نقصان ہوگا میں اس کا ذمہ دار ہوں، جبکہ نگران انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم بھاگ جاؤ لیکن یہ خود نہیں بھاگ سکے اس لیے میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب مذکورہ بیانات کے تحت فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ دراصل جس شخص نے ان لوگوں کی ذمہ داری قبول کی تھی وہ ان کی طرف سے کفیل بن گیا تھا اور کفالت کے لیے فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف ان امور میں کفالت معتبر ہے جو کفیل کے دائرہ اختیار میں ہو اور جو کام اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو اس کے بارے میں کفیل بـ [illegible] نہیں، تو غیر قانونی طور پر مقیم لوگوں کو حق سکونت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے یہ کفیل کے دائرہ اختیار میں نہیں اس لیے اس بارہ میں اس آدمی کا اپنی طرف سے وکیل بننا صحیح نہیں، تو جب کفالت ہی صحیح نہیں تو نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وكل حق لا يمكن استيفاءه من الكفيل لا يصح الكفالة به كالحدود والقصاص۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۲۰ كتاب الكفالة)[1]

کسی کے عقد پر دوبارہ عقد بیع کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ۱۹۶۶ء سے ایک شخص نے دوکان کرایہ پر لے رکھی ہے اور حسب دستور دوکاندار مالک دوکان کو کرایہ ادا کرتا رہا، مالک دوکان کے فوت ہونے کے بعد اس کا بیٹا مسلسل کرایہ وصول کرتا رہا، [illegible]ء میں موجودہ مالک دوکان نے اپنی دوکان فروخت

---

[1] قال العلامة الكاسانیؒ: ان يكون المكفول به مقدور الاستيفاء من الكفيل ليكون العقد مفيداً فلا تجوز الكفالة بالحدود والقصاص لتعذر الاستيفاء من الكفيل فلا تفيد الكفالة فائدتها۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۹ كتاب الكفالة ۔ فصل شرائط الكفالة)

ومثلهٗ في مجلة الاحكام، المادة ۶۳۲ ص ۳۴۴ الفصل الثاني في شرائط الكفالة۔

کرنے کا اظہار کیا تو کرایہ دار نے اس سے پچاس ہزار کے عوض بات کی، رجسٹری کرانے میں تین دن باقی تھے کہ اس دوران ایک شخص نے دلال کی وساطت سے مالک دوکان کے پاس جاکر مذکورہ رقم ادا کرتے ہوئے دوکان اپنے نام رجسٹری کرالی اور اس کے ساتھ دوسری دوکان بھی خرید کر اپنے بھائی کے نام رجسٹری کرالی، اب وہ دوکان فی الحال کرایہ دار کے قبضہ میں ہی ہے اور دوسرا شخص دوکان خالی کرانے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے، اندریں حالات اب یہ دوکان کس کا حق بنتی ہے؟ اس بارے میں شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں فیصلہ صادر فرمائیں؟

الجواب:- اگر کرایہ دار اور مالکِ دوکان کے مابین بیع قطعی ہوتی ہو تو کرایہ دار اس مذکورہ عقد سے مالک بن گیا اگرچہ ابھی تک رجسٹری نہ کرائی ہو کیونکہ عقدِ بیع کی تامیت کے لیے رجسٹری کرانا شرعاً ضروری نہیں۔ جب بیع قطعی سے کرایہ دار مالک بن گیا تو جو دوکان اسکی دوکان کے ساتھ متصل ہے اگر اس دوکان کا کوئی شریک موجود نہ ہو اور نہ اس کے حقوق میں شریک موجود ہو تو پڑوسی ہونے کے ناطے وہ اس دوکان پر شفعہ کا حق رکھتا ہے تو حق شفعہ کی رو سے وہ اس دوکان کو واپس کراسکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار۔ (الهداية ج ۴ ص ۳۷۷ كتاب الشفعة) [1]

باپ کی وفات کے بعد بیٹوں کا اس کے عقدِ بیع سے انکار

سوال:- ایک شخص نے تیس سال قبل اپنی زمین شاملاتِ دیہہ سمیت کسی پر فروخت کی، بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض پر لے لی مگر قرض کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے مشتری نے قرض کی رقم کے بدلے زمین بائع پر دوبارہ فروخت کردی اور واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن واپسی سے قبل ہی وہ وفات پاگیا، اب بائع اس کے بیٹوں سے زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بیٹے زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ ہمارے باپ نے زمین دوبارہ بائع پر فروخت نہیں کی، اب عقدِ بیع پر مدعی کے پاس گواہ موجود نہیں

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز: الثالث ان يكون جاراً ملاصقاً للعقار المبيع۔
(شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۰۸ ص۵۶۳ كتاب الشفعة)
وَمِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۴۵۲ كتاب الشفعة۔

تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:- اگر شاملات موات کے حکم میں ہو اور شرعی اصول کے موافق اس شخص نے اس زمین پر قبضہ کر کے اُسے آباد کیا ہو تو اس زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہونے کی وجہ سے بیع نافذ ہے، جب بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض لے لی اور اس کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تو بائع کو اس عقد کے تحت زمین واپس لینے کا حق حاصل ہے، اب بائع چونکہ عقدِ بیع کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے مشتری کے مرنے کے بعد بائع کو اس عقد پر گواہ پیش کرنے ہوں گے اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مشتری کے بیٹوں کو ان کے علم پر قسم دی جائے گی کہ ان کو معلوم نہیں کہ ان کے والد نے رقم کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تھی، اگر وہ اس پر قسم کھالیں تو فیصلہ بیٹوں کے حق میں ہوگا اور اگر انکار کریں تو زمین بائع کو واپس کی جائے گی۔

کما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: والتحلیف علی فعل غیره یکون علی العلم ای انه لا یعلم انه کذلک لعدم علمه بما فعل غیره۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۷۳ کتاب الدعوی)[1]

عقدِ مضاربت کے متعلق ایک فیصلے کی تصحیح

سوال:- دو آدمیوں نے مضاربت پر کاروبار شروع کیا، رب المال نے ۲ لاکھ روپے مضارب کو دے دیئے اور مضارب نے اس رقم سے کپڑے کی دوکان کھول لی اور اس پر اپنے ایک دوست کو بٹھا دیا اکثر اوقات وہی دوکان چلاتا رہا، رب المال نے اس پر ناراضگی ظاہر کی لیکن اس کے باوجود مضارب نے اپنے دوست کو دوکان سے نہیں ہٹایا، نتیجتاً اس کاروبار میں تیرہ ۱۳ ہزار روپے کا نقصان ہوا، رب المال نے دعویٰ کیا کہ مضارب نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر تیرہ ۱۳ ہزار روپے کی چوری کی ہے، جب رب المال نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مضارب نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس دوکان پر

---

[1] قال العلامة قاضی سماوۃؒ: ولو وقع الدعوی علی فعل الغیر من کل وجه یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباک اتلفه او سرقه او غصبه منی یحلف علی العلم وهذا مذهبنا۔
(جامع الفصولین ج۱ ص۱۹۴ الفصل الخامس عشر فی التحلیف)
ومثله فی فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۲ ص۴۲۴ فصل فیما یتعلق بالنکاح من المهر والولد وغیر ذلک۔

میرے ۴۵ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں، ان دونوں نے ثالث مقرر کیا، اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ دوکان رب المال کے پاس رہے گی اور مضارب ۴۵ ہزار روپے خرچہ ادا کرے گا، ثالث کے اس فیصلے کے مطابق رب المال کو ۵۸ ہزار روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ از روئے شریعت یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دراصل مضارب کاروبار میں رب المال کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے رب المال جن شرائط کے تحت مضارب کو تصرف کا اختیار دے اُن شرائط کی پابندی مضارب پر لازم ہے اگر ان شرائط کی خلاف ورزی کرے اور کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی ضمان مضارب پر لازم آئے گی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں جب رب المال نے مضارب کے دوست کو دوکان پر بٹھلانے سے روکا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے دوست کو بدستور دوکان پر بٹھائے رکھے لہٰذا اگر رب المال شہادت سے یہ ثابت کرے کہ مضارب نے واقعی خیانت کی ہے تو تجارت کے سامان کو فروخت کر کے رب المال کی رقم پوری کی جائے گی اور جو رقم اس سے بچ جائے اس کو دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا، مضارب نے اپنے خرچہ کے لیے جو رقم لی ہے وہ مضارب کی کمائی سے جُدا کی جائے گی۔

لما قال العلامة الكاسانيؒ: فاذا خالف شرط رب المال صار بمنزلة الغاصب ويصير المال مضموناً عليه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۸۷ كتاب المضاربة۔ فصل في حكم المضاربة)[1]

ٹیوب ویل کی نوکری پر فریقین کے تنازعہ کا فیصلہ

سوال:۔ ایک شخص جو کہ اسّی سال سے زمین میں تصرف کر رہا ہے اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ حکومت کو ٹیوب ویل لگانے کے لیے اس شرط پر دیا کہ ٹیوب ویل کی نوکری میری ہو گی، ٹیوب ویل لگنے کے بعد اس نے نوکری کے لیے کسی اور شخص کو خرچہ وغیرہ دے دیا اس شخص نے مالکِ زمین کو دھوکہ میں رکھا اور ٹیوب ویل کی نوکری اپنے نام منظور کرالی، مالکِ زمین نے

---

[1] قال العلامة سليم رستم بازؒ: واذا تجاوز المضارب حد ماذونيته وخالف الشرط كان غاصباً وفي هذه الحال يعود الربح والخسار في تجارته له وعليه واذا تلف مال المضاربة كان ضامناً۔
(شرح مجلة الاحكام المادة ۱۴۲۹ ص۷۵۴ كتاب المضاربة)
وَمِثْلُهٗ في الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۵۳۲ كتاب المضاربة۔

اس پر دعویٰ کیا کہ یہ نوکری میرا حق ہے کیونکہ میں نے اس شرط پر حکومت کو زمین دی ہے۔ دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ نوکری میرا حق بنتا ہے کیونکہ یہ زمین مشترکہ ہے اور شاملات ہے جس میں میرا بھی حصہ ہے اگرچہ متعین نہیں کہ ٹیوب ویل کی جگہ میری ہے یا کسی اور کی، مالکِ زمین نے یہ جواب دیا کہ یہ زمین مجھے اسّی سال قبل پوری قوم نے دی تھی۔ تو مذکورہ بالا صورت میں ٹیوب ویل کی نوکری کا حقدار کون ہے؟

سوال: اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین شاملاتِ دیہہ ہے اور پوری قوم نے اس شخص کو دی ہے تو یہ شخص اس پر قبضہ کرنے اور تصرف کرنے سے مالک بن گیا ہے، تو جب اسّی سال اُس نے اس زمین میں تصرف کیا اور کسی نے اس پر ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تو اس کی زمین میں کسی اور کو تصرف کا حق نہیں۔ لہٰذا جب اس نے اپنی زمین ٹیوب ویل لگانے کے لیے دے دی تو یہ زمین وقف ہو گئی اور وقف زمین میں واقف جو شرط لگائے اس کی رعایت کی جائے گی۔ تو جس طرح موقوفہ زمین کا منافع واقف اپنے لیے خاص کر سکتا ہے، اسی طرح اگر مالکِ زمین موقوفہ زمین میں ٹیوب ویل کی نوکری اپنے لیے خاص کرے تو یہ اس کا حق ہے اس لیے اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور شخص اس نوکری کا حقدار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وذکر الفقیہ ابوجعفر انہ لو شرط لنفسہ ان یأکل من الغلۃ یجوز عند محمد وکذا الملک لو شرط الغلۃ لابیہ فہو کاشتراطہا لنفسہ۔
(الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۴۲۲ الفصل الرابع فیما یتعلق بالشرط الوقف)[1]

بیٹے کا باپ کے ترکہ میں سے اپنے لیے زمین کا کچھ حصہ ہبہ کرنے کے دعویٰ کا جائزہ

فریق اوّل ـــــــ فریق ثانی

حقِ تحکیم: مندرجہ بالا فریقین بذاتِ خود تو حاضر نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اپنے نمائندے یعنی وکیل بھیج دیئے اور قرآن و سنت کے تحت فیصلے کے لیے تیار ہوئے لہٰذا

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وجاز جعل غلۃ الوقف والولایۃ لنفسہ عند الثانی و علیہ الفتویٰ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۴۲۴ کتاب الوقف)
ومثلہ فی الہندیۃ ج۲ ص۳۹۸ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط الوقف۔

ان کے نمائندوں کے واسطے سے فریقین کے بیانات سن لیے گئے۔

تنقیحات:۔ مندرجہ بالا فریقین کے نمائندوں کے واسطے سے بیانات سن لیے گئے، ان بیانات سے چند امور سامنے آئے ۔

(۱) دونوں فریق آپس میں حقیقی بھائی ہیں اور ان کے بیان سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنی بہنوں کو جائیداد سے محروم رکھتے ہیں، جائیداد کی تقسیم کو صرف فریقین تک محدود رکھا جاتا ہے، فریقین کے والد کے تصرفات. مابعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے اپنی بہنوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

(۲) فریق اول اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے اپنی حین حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی، دیگر حصص کے علاوہ خسرہ نمبر آٹھ سو سات ۸۰۷ جو کہ ارتل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی مقدار اسی ۸۰ کنال آٹھ ۸ مرلے ہے یہ مجھے دی گئی ہے جو کہ سنہ ۱۹۶۶ء و سنہ ۱۹۶۷ء کی بندوبست میں بحال رکھی گئی ہے، فریق مذکورہ کے بیان کی رُو سے فریق ثانی نے یہ جائیداد اپنے نام منتقل کرائی ہے جس کے خلاف فریق اول نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران ایک شخص نے ان میں مصالحت کرادی۔

(۳) فریق اول مصالحت میں ایک ہزار روپے کی رقم دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو فریق ثانی نے برضا و رغبت وصول کی ہے اور بطور بینہ سند تحریری سٹامپ پیش کرتا ہے۔

(۴) فریق ثانی کا بیان ہے کہ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کردی تھی تاہم اچھی [illegible] ایک بیٹے کو بھی [illegible] اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی، فریق اول نے سازباز کرکے خسرہ نمبر آٹھ سو سات ۸۰۷ جعلی طور پر اپنے نام انتقال کرالیا ہے جو کہ ہمارے رجوع کرنے پر عدالت نے بحال کردیا ہے۔

(۵) فریق ثانی کا دفاعی بیان یہ ہے کہ اس نے فریق اول کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ فریق ثانی نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کی تھی اور جس جائیداد سے فریق ثانی نے مصالحت کرائی یہ اس کی جائیداد نہیں تھی بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد تھی یہی وجہ ہے کہ فریق ثانی نے ایک ہزار روپیہ فریق اول کو واپس کرکے مصالحت کو کالعدم قرار دیا ہے۔

حقیقت حال:۔ ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین بہنوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں، یہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے اگر باپ نے دیدہ دانستہ طور پر بیٹوں کے نام جائیداد منتقل کرکے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ناجائز اور حرام حرکت ہے اگرچہ قضاءً ایسے اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عند اللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے واحد ذریعہ یہ ہے کہ ورثاء مورث کی ذمہ داری کی فراغت کیلئے ہر صاحب حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے اس کا گرفتار ہونا یقینی امر ہے تاہم قضاءً والد کے تصرفات نافذ رہیں گے۔

شرعی فیصلہ: جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ سرکاری کاغذات میں محض انتقال کا ہونا نہ تو کسی کی ملکیت کی شرعی دلیل ہے اور نہ اس پر ملکیت موقوف ہے اسلئے فریقین کے والد کے مالکانہ تصرفات کے نفاذ کیلئے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں، جو بھی باقاعدہ گواہوں سے ثابت ہو جائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ ولا یعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتصنیع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجه آخر۔ (مجلة الاحکام، المادة ۱۷۳۶ ص ۱۰۹۰)

لیکن بعد ازاں جہاں تک فریقین کے تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت کی صورت ہے تو مصالحت کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہوں کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر فریق ثانی کی رضا و رغبت سے مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ ماننے کے بعد نہ تو خود فریق ثانی اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں لیکن ایسی مصالحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ فریق ثانی جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہو وہ اس کی ملکیت میں ہو ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں باقاعدہ تقسیم کرکے قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر فریق ثانی کی ملکیت باقی نہیں رہتی اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی متنازعہ جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون مملوکاً للمصالح حتی انه اذا صالح علی مال ثم استحق من ید المدعی لم یصح الصلح لانه تبین انه لیس مملوکاً للمصالح فتبین ان الصلح لم یصح۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۴۸ کتاب الصلح، فصل فی ما شرائط التی المصالح علیه)

تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا فریق ثانی کی ملکیت کے ثبوت کے لیے باقاعدہ

گواہوں کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی۔ اگر فریقِ اول کی ملکیت پر گواہ پیش ہو جائیں تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر فریقِ اول کے مطالبہ پر فریقِ ثانی کو ملکیت سے انکار کرنے پر قسم دی جائے گی اگر فریقِ ثانی قسم کھالے تو مصالحت کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔[1]

عقدِ بیع میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال:- **بیاناتِ فریقین**

فریقِ اول:- میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے فلاں محدودہ ۱۳ جریب زمین فریقِ ثانی سے مبلغ ساٹھ ہزار روپے کے عوض خریدی، بیع کے وقت دو ہزار روپے میں نے ادا کیے باقی رقم دو قسطوں میں ادا کرنی تھی، ایک قسط مبلغ تیس ہزار روپے میں نے ادا کر دیئے اور باقی رقم بھی ادا کرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھ سے رقم لے کر میری خریدی ہوئی زمین مجھے دی جائے۔

فریقِ ثانی:- میں اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ قطعہ اراضی جو کہ میرے اور میرے بھائی کے درمیان مشترک ہے اپنے بھائی کی اجازت سے فریقِ اول پر فروخت کی ہے لیکن فروخت کرتے وقت میں نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر فلاں قطعہ اراضی جو کہ ایک دوسرے شخص کی ملکیت میں ہے مجھ پر فروخت کرے تو میں بھی یہ زمین فروخت کروں گا، اب چونکہ اُس شخص نے مجھ پر اپنی زمین فروخت نہیں کی لہٰذا میں بھی فروخت نہیں کرتا۔

الجواب:- دعویٰ متعلقہ ۱۳ جریب قطعہ اراضی ــــ مدعی: مشتری (فریقِ اول) مدعیٰ علیہ: بائع (فریقِ ثانی)

فریقین کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اگر مدعیٰ علیہ کا بھائی کے حصہ میں وکیل بالبیع ہونا مبرہن ومسلّم

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهراً وعلیه فما یوجد فی دفاتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما علیه فی دفتره الذی یقرب من الیقین انه لا یکتب فیه علی سبیل التجربة والهزل یعمل به۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۲ ص۲۱ کتاب الدعوی)

ومثله فی تقریرات الرافعی ج۲ ص۹۲ کتاب الدعوی۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: یشترط ان یکون المصالح علیه مال المصالح وملکه فلو اعطی المصالح مال غیره لیکون بدلاً للصلح فلا یصح صلحه (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۵۴۵ ص۸۳۲ باب الثانی)

ومثله فی الهدایة ج۳ ص۲۴۲ کتاب الصلح۔

ہو تو تمام قطعہ اراضی کی بیع درست ہے اور اگر یہ ولایت ثابت نہ ہو تو پھر بائع کا اپنے حصے میں بیع درست ہو کر بھائی کے حصے کی بیع بیع فضولی کے حکم میں ہو کر اُس کی اجازت پر موقوف ہے، اگر مذکورہ شرط موجود ہو تو تمام زمین کی بیع درست ہو کر بائع بیع توڑنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ بیع میں مذکورہ شرط نہ تو مقتضیاتِ عقد اور نہ مدعاتِ عقد میں سے ہے کہ جس کا ایفا ضروری ہے اور نہ اس میں بائع مشتری، مبیعہ کو فائدہ ہے کہ جس کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: المراد بالمنفع ما شرط من احد العاقدين على الآخر فلو على اجنبي لا يفسد ويبطل الشرط لما في الفتح من الوجيه بعتك الدار بالف على ان يقرضني فلان الاجنبي عشرة دراهم فقبل المشتري لا يفسد البيع لانه لا يلزم الاجنبي ولا خيار للبائع۔
(رد المحتار ج۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد، مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر الخ)[1]

شفعہ کے دعویٰ میں راستہ کا شریک پڑوسی پر مقدم ہے

فریقِ اوّل۔ فریقِ ثانی۔ فریقِ ثالث

تنازعہ: ایک عورت کی طرف سے فریقِ اوّل پر فروخت شدہ مکان محدود بحدود اربعہ غرباً جائیداد والدہ فریقِ اوّل، شرقاً راہ خاص فریقِ اوّل وثالث وغیرہ، شمالاً مکان فریقِ ثالث وجنوباً جائیداد والدہ فریقِ اوّل واقع ہے۔

حقِ تحکیم: مندرجہ بالا فریقین اپنے علاقہ کے معززین کی نگرانی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوئے، مذکورہ جملہ فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلے کے لیے سرِ تسلیم خم کر کے تیار ہوئے اور تحریری طور پر حلفیہ بیان دے کر قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلہ ماننے کے لیے تیار ہوئے۔

تنقیحات: جملہ فریقین سے فرداً فرداً بحضورِ فریقِ آخر بیان لیا گیا اور تحریر میں لا کر ہر ایک سے دستخط لیے گئے، فریقین کے بیانات کی روشنی میں جو تنقیحات سامنے آئیں

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: وفي المنتقى قال محمدؒ كل شئ يشترطه المشتري على البائع يفسد به البيع فاذا شرطه على اجنبي فهو باطل (اى فالشرط باطل) كما اذا اشترى دابة على ان يهبه فلان الاجنبي كذا فهو باطل كما اذا شرط على البائع ان يهبه وكل شئ يشترطه على البائع لا يفسد به البيع فاذا شرطه على اجنبي فهو جائز وهو بالخيار۔ (البحر الرائق ج۶ ص۸۶ باب بیع الفاسد)

ومثله في شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز اللبنانيؒ تحت المادة ۱۸۹ ص۸۹ ۔

وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) فریق اوّل جس نے یہ مکان خریدا ہے وہ خریدے ہوئے مکان کے راستہ میں شریک ہے جبکہ فریق ہذا اور ثالثان کے بیان کے مطابق راہ عام سے جو خاص راستہ جدا ہو کر آگے آتا ہے تو فریق ثالث وغیرہ کے مکان سے گذر کر متنازعہ فروخت شدہ مکان اور فریق اوّل کے گھر کی طرف جاتا ہے جس میں فریق ثالث بھی آمد و رفت رکھتا ہے لیکن ثالثان کے بیان کے مطابق یہ صرف تین اشخاص کا مخصوص راستہ ہے، بایں معنٰی یہ کسی عام شخص کو اس راستہ پر آمد و رفت کا حق حاصل نہیں گویا یہ ایک خاص راستہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان ھٰذا میں کسی قسم کی شرکت کا دعوٰی نہیں رکھتا اور نہ اس مکان کا پڑوسی ہے بلکہ محض اس وجہ سے شفعہ کا دعوٰی کرتا ہے کہ مکان ھٰذا میرے بھائی کی ملکیت تھا جس کا میں وارث ہوں، یہ مکان میرے بھائی کو باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا جو کہ فروخت ہوتے وقت صرف اور صرف میرا حق ہے اس لیے میری اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو مکان لینے کا حق حاصل نہیں۔

(۳) فریق ثالث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان مذکورہ میں شفعہ کا دعوٰی ہمسایہ ہونے کی وجہ سے کرتا ہے جس کے لیے طلب مواثبت اور طلب اشہاد کے جملہ مراحل کی تکمیل کا دعویدار ہے اگرچہ فریق اوّل موصوف کے مکان اور متنازعہ مکان کے درمیان مسجد کیلئے باقاعدہ وقف راستہ بیان کرکے ہمسایہ ہونے سے انکار کرتا ہے لیکن فریق ثالث اس پر قائم ہے کہ میں نے اس راستہ پر گذرنے کی ان لوگوں کو عارضی اجازت دی تھی لیکن جب انہوں نے مجھ سے باقاعدہ وقف کا مطالبہ کیا اور میں نے انکار کیا تو اس کے بعد اس راستہ کو فریق اوّل یا کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا چنانچہ موصوف اس راستہ کے نہ ہونے پر مُصر ہے اور یوں اپنا مؤقف مضبوط کر رہا ہے کہ فروخت شدہ مکان سے میرے گھر کی دیوار متصل ہے جس سے مجھے ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے زیادہ حق حاصل ہے۔

حقیقت حال:۔ مذکورہ تنقیحات کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فروخت شدہ مکان جس کے جنوب میں فریق ثالث کا مکان واقع ہے، اس کے بیان کے مطابق وہ جار ملاحق یعنی جڑا اور ملا ہوا پڑوسی ہے جبکہ فریق اوّل متنازعہ مکان کے راستہ میں شریک ہے بایں معنٰی کہ یہ راستہ عام نہیں بلکہ خاص راستہ ہے جس میں صرف اس گلی میں رہنے والے شرکاء کو آمد و رفت کا حق حاصل ہے

کوئی عام شخص اس راستہ کو اُن کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کا مجاز نہیں ۔

فقہی نظائر:۔ حدیث کی رُو سے جہاں کسی کو شفعہ کا حق دیا گیا ہے تو اس میں راستے کی شرکت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ راستہ میں شریک کو دوسرے پڑوسی پر سبقت حاصل ہو گی اسلئے کہ وہ مبیعہ کے حقوق میں شریک ہے لہٰذا جب تک شریک فی حقوق المبیعہ دعویدار ہو تو پڑوسی کو شفعہ کا حق نہیں دیا جاتا ۔

کما فی الحدیث: عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعتہ ینتظر لھا وان کان غائبًا اذا کان طریقھما واحدًا۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۵۷ باب الشفعۃ)

خاص کر وہ راستہ جو خاص افراد کے لیے مخصوص ہو جس راستہ پر گلی میں رہنے والوں کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے عام اشخاص کو آمدورفت کا حق حاصل نہ ہو تو وہ خاص راستہ کہلاتا ہے ۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الطریق الخاص ھو الزقاق الذی لاینفذ ای کما انہ لو فتح اصحاب الطریق الخاص منفذًا وَوَصَلُوْہُ بالطریق العام کان لھم ان یمنع غیرھم من المرور فیہ۔ (شرح المجلۃ مادۃ ۹۰۲ ص۵۳۲ کتاب الشفعۃ)

اس حالت میں جو لوگ گلی کے شروع میں رہتے ہوں ان کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے جبکہ گلی کے آخر میں رہائش رکھنے والے کو پوری گلی میں آمدورفت کا حق حاصل ہوتا ہے ۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: فان کانت سکۃ غیر نافذۃ ینشعب فیھا سکۃ غیر نافذۃ وھی مستطیلۃ فبیعت دارًا فی السفلی فلاھلھا الشفعہ خاصۃ دون اھل العلیا ۔

(الھدایۃ ج ۴ ص۳۸۹ کتاب الشفعۃ)

پڑوسی بلاشک وشبہ شفعہ کا حق دار ہے لیکن یہ تب ہے کہ اس میں حق رکھنے والا شریک فی حقوق المبیعہ نہ ہو جیسا کہ شریک فی نفس المبیعہ کو شریک فی حقوق المبیع پر سبقت حاصل ہے ۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ:۔ حق الشفعۃ اولًا للمشارک فی نفس المبیع ثانیًا للخلیط فی حق المبیع ثالثًا للجار الملاصق وما دام الاول طالبًا لیس للاٰخرین حق الشفعۃ وما دام الثانی طالبًا فلیس للثالث حق الشفعۃ۔ (مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۰۵۹ ص۵۶۲ کتاب الشفعۃ)

شرعی فیصلہ:۔ ان تنقیحات، حقیقت حال اور فقہی نظائر کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فریق اوّل جس نے یہ مکان باقاعدہ بیع قطعی سے خریدا ہے یہ سکۃ غیر نافذہ یعنی خاص راستہ میں اس گھر کی شرکت کا حق رکھتا ہے اور فریق ثالث نے اگرچہ اپنا پڑوس ثابت کرنے میں

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن پڑوسی ثابت ہونے کے باوجود خاص راستہ میں شرکاء کا حق اس سے زیادہ ہے جبکہ فریقِ ثانی کا محض بھائی ہونے کے ناطہ سے شفعہ کا دعویٰ بے بنیاد ہے اس کا کوئی حق نہیں، اس لیے فریقِ اوّل کے معاملہ خرید کو درست تسلیم کرکے مکان اس کے قبضہ میں رکھا جائے یہی فریقِ اوّل اس کا زیادہ حقدار ہے[1]

دعوے بابت اراضی

فریقین میں سے ہر ایک کا زمین پر ملکیت اور قبضہ کے دعویٰ کا جائزہ

بیانِ فریقِ اوّل: میرے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے اور فی الحال میں نے فریقِ ثانی کو اجارہ پر دی ہے جبکہ اس کا قبضہ میرے پاس ہے۔

بیانِ فریقِ ثانی: میرے والد نے یہ زمین فریقِ اوّل کے والد پر فروخت نہیں کی پہلے ہی سے اس پر میری ملکیت چلی آرہی ہے اور زمین میرے قبضہ میں ہے، یہاں تک کہ ہائیکورٹ نے بھی میری ملکیت تسلیم کی ہے۔

تنقیحات: دونوں فریق مذکورہ زمین پر ملکیت اور قبضہ کا دعویٰ کرتے ہیں، فریقِ اوّل تو اس وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اور فی الحال محض اجارہ پر دی ہے۔ فریقِ ثانی اس وجہ سے زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین اس کو اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے اور وہ فریقِ اول پر فروخت کرنے سے انکار کرتا ہے، مزید برآں اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی پیش کرتا ہے۔

طریقِ فیصلہ: اگر واقعی ہائی کورٹ نے فریقِ ثانی کی ملکیت تسلیم کی ہو تو اس فیصلے پر

---

[1] (۱) قال العلامة المرغینانیؒ: فالطریق الخاص ان لا یکون نافذاً۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۸ کتاب الشفعة)

(۲) قال العلامة ابن نجیمؒ: ولذا لو بیعت دار فی القصوی لم یکن لاهل الاولی شفعة بخلاف اهل القصوی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۱ باب التحکیم)

(۳) قال العلامة المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۶ کتاب الشفعة علی الصفحة الاولی من المجلد الرابع)

عملدرآمد کیا جائے گا اس لیے اگر قبضہ فریق ثانی کے پاس نہ ہو تو حق قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر ہائی کورٹ نے فریق ثانی کی ملکیت تسلیم نہ کی ہو تو اگر فریق اول کے پاس گواہ موجود ہوں تو اس کے مطابق فیصلہ فریق اول کے حق میں کیا جائے گا اور اگر فریق اول گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو فریق ثانی چونکہ والد کے شراء سے انکار کرتا ہے اس لیے فریق ثانی کو اس کے علم پر قسم دی جائے گی کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے والد نے یہ زمین فروخت کی ہے یا نہیں، اگر اس نے قسم اٹھالی تو زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر اس نے قسم اٹھانے سے انکار کیا تو فیصلہ فریق اول کے حق میں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: والتحلیف علی فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لا یعلم کذلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۴۷ کتاب الدعوی)[1]

فریقین میں سے ہر ایک کا دوسرے کی مقبوضہ جائیداد میں ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

دعویٰ بابت الاراضی

بیان مدعی: میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مذکورہ اراضی محدود بحدود اربعہ جو کہ شرقاً زرد مٹی تک غرباً سبز درخت تک، جنوباً زیتون کے درخت تک اور شمالاً ندی سے نیچے تک ہے یہ میری ملکیت ہے جس نے اس پر قبضہ کیا ہے یہ ظالمانہ قبضہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ چار اشخاص نے میری زمین کی تحدید کے وقت اس پر قسم کھائی ہے اور خود مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

بیان مُدعیٰ علیہ: میں کہتا ہوں کہ مدعی دعویٰ کا کوئی حق نہیں رکھتا بلکہ اس نے میری زمین کو ظالمانہ طور پر قبضہ میں رکھا ہوا ہے۔ جو مشترکہ پہاڑی تک میرا حق ہے اور میری طرف سے اس پر چار اشخاص نے قسم بھی کھائی ہے اور مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

فریق اول : مُدعی ——— **فریق ثانی** : مُدعیٰ علیہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوۃؒ: لو وقع الدعوی علی فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباک اتلفہ او سرقہ او غصبہ متی یحلف علی العلم ھذا مذھبنا۔

(جامع الفصولین ج۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف وما یتعلق بہ)

ومثلہ فی فتاوی قاضی خان ج۲ ص۴۱۴ کتاب الحدود۔

حقِ تحکیم: مندرجہ بالا فریقین نے علاقہ کے معززین کی سرپرستی میں دار العلوم حقانیہ حاضر ہوکر اپنے فیصلے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کی درخواست کی اور اپنے تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلے کے لیے تیار ہوکر سرِتسلیم خم کرکے علماء کی کمیٹی کو موقع دکھلانے کی خاطر اپنے علاقہ میں لے گئے، علماء کی کمیٹی نے موقع پر جاکر متنازعہ اراضی کا معائنہ کیا، چونکہ فریقین نے پہلے ہی سے ایک ثالث کو اپنے بیانات قلمبند کرائے تھے اس لیے اپنے سابقہ بیانات پر اکتفاء کرتے ہوئے مزید نئے بیانات دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کمیٹی نے فریقین سے بیانات کے متعلق کچھ اہم سوالات پوچھے تاکہ فریقین کی طرف سے بیانات سمجھنے میں مدد ومعاون ہوسکے۔

تنقیحات: دونوں فریقوں کے بیانات سے چند امور معلوم ہوئے:

(۱) فریق اوّل نے اپنے بیان کی رُو سے جس محدودہ زمین کا دعویٰ کیا ہے اس میں کچھ زمین ایسی ہے جس پر فریق مخالف کا قبضہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف یہ نہیں کہ مُدعی کے دعویٰ کا رَدّ کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایسی زمین کا دعویٰ بھی کیا ہے جس پر فریق اوّل یعنی مُدعی قابض ہے، گویا اندریں صورت دونوں فریق ایک دوسرے کے دعوؤں کے رَدّ کے علاوہ کچھ زائد ایسی زمین کا دعویٰ کررہے ہیں جس پر دوسرا فریق قابض ہے، اگرچہ موقع دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ فریقین کے دعاوی میں وسعت سے کام لیا گیا ہے۔

حقیقتِ حال: دونوں فریق ایک دوسرے کے قبضہ کو غاصبانہ اور ظالمانہ جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ فریقین کے درمیان نسبتی قرابت بھی قائم ہے، چونکہ فریقین قریبی نسل میں ایک جد پر ملتے ہیں، قرب وجوار کے حالات، موقع دیکھنے اور دوسرے قرائن پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حالات سامنے آتے ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ تنازعہ کسی خانگی دشمنی کا نتیجہ ہے ورنہ دونوں فریق کچھ عرصہ قبل تک ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہ رہے تھے یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے مُردے بھی ایک ہی قبرستان میں دفن ہوتے تھے، غم اور خوشی میں ایک دوسرے سے باہمی مشارکت قائم تھی، فریقین کے دعوؤں کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے ارث کا دعویٰ کررہا ہے، گویا ہر ایک فریق اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میرے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے اور دُوسرے

فریق کا اس میں کوئی حق نہیں۔

فقہی نقطۂ نگاہ سے اختلاف کا جائزہ:۔ از روئے شرع ایسی حالت میں جہاں دو فریق کسی جائیداد پر قابض ہو کر ایسی جائیداد پر وراثت کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرے کہ وہ مخالف فریق کی ملکیت میں ہو تو اس دعویٰ کو دعویٰ رجلین سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی حالت میں طرفین سے گواہ طلب کیے جاتے ہیں لیکن مذکورہ تنازعہ میں بظاہر گواہوں کے گواہی مشکل ہے کیونکہ احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کی تمام قوم قولاً یا فعلاً دونوں فریقوں کی طرفداری میں بھٹک گئی ہے، یہاں تک کہ قرب وجوار میں رہنے والے اور حالات سے واقف لوگ حقیقتِ حال کے اظہار سے چشم پوشی پر مجبور ہیں اور جو قوم ثالث کی حیثیت سے کردار ادا کر رہی ہے اس کو صحیح حالات کا علم نہیں، علاوہ ازیں اس علاقہ میں کوئی غیر قوم جو کہ دعویٰ میں شریک نہ ہو کسی دوسری قوم کے لیے گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے آپس میں دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے، خاص کر جب گواہی میں قسم کھا کر بیان دینا ہو تو اس کے لیے عام لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ قسم کھا کر بیان دینے کا دوسرا نام گواہی ہے، اس لیے جب گواہ میسر نہ ہو تو پھر دوسرے کے دعویٰ کو دفع کرنے کے لیے مدعی کے مطالبہ پر مدعیٰ علیہ کو قسم دی جاتی ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ، وان عجز عن ذٰلك وطلب یمین خصمه استحلف علیها لما روینا ولا بد من طلبه لان الیمین حقهٗ انهٗ کیف اُضیف الیه بحرف اللام فلا بد من طلبه۔ (الهدایة ج۳ ص۲۰ کتاب الدعویٰ)

اور خاص کر ایسی صورت میں جب دونوں قابض بھی ہوں اور ایک دوسرے کی مقبوضہ جائیداد کا دعویٰ کر رہے ہوں تو ایسی حالت میں ہر ایک قسم کھانے کے بعد دوسرے کو اپنے اپنے حصہ پر بحال رکھا جاتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: ادعیا ملکاً ارثاً من ابیهما والعین فی ایدهما وفیه ایضاً ان لم یورخا یقضی بینهما او ارخا تاریخاً واحداً یقضی بینهما۔

(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۷۶۱ ص۱۱۲۵ الفصل الثانی)

آخری فیصلہ: ان حالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ دونوں فریقوں کی قوموں سے پانچ پانچ افراد منتخب کیے جائیں اور طرفین سے منتخب شدہ افراد دوسرے فریق

کے حق نہ ہونے پر قسم اٹھائیں اور جو جائیداد دونوں قوموں کے قبضہ سے باہر ہو تو قسم اٹھانے کے بعد وہ فریقین کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی اور جو نقصانات ہوئے ہوں اس کا جبیرہ کیا جائے گا۔[1]

قدیم راستہ میں تنازعہ کے متعلق فیصلہ

سوال: (بیانِ فریقِ اوّل) ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی کے مشرقی جانب اخیر میں ہمارے کھیتوں اور مکانات کا ایک قدیم راستہ تھا جس پر لوگوں کی آمدورفت ہوتی تھی، اس کے مغربی جانب ایک بڑی ندی بھی تھی اور اس راستے کے کنارے درختوں کا ایک جھاڑ بھی تھا جو کہ اب بھی موجود ہے۔ یہ راستہ ندی کے ساتھ ساتھ پڑوسی کی زمین سے گذر کر جنوب کی طرف ایک بڑے کنوئیں سے گذرتا تھا، کچھ عرصہ سے لوگوں کی اس راستہ پر آمدورفت کم ہونے کی وجہ سے پڑوسی نے رفتہ رفتہ اس راستہ کو ختم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ راستہ بالکل بند ہوگیا، اس پر ہم نے راستے پر آمدورفت اور اس کی وسعت کا مطالبہ کیا لیکن پڑوسی نے ایسا کرتے سے انکار کردیا، اس لیے ہمیں اپنے قدیم راستے پر گذرنے اور اس کو وسیع کرنے کا حق دیا جائے۔

(بیانِ فریقِ ثانی) میری زمین میں کوئی قدیم راستہ نہیں البتہ کچھ عرصہ قبل میری زمین میں ایک راستہ تھا اور اس پر لوگوں کی آمدورفت جاری تھی لیکن میں نے بطور احسان ان کو یہاں سے گذرنے کی اجازت دی تھی، کیونکہ زمین خریدتے وقت مجھے نہ تو یہاں قدیم راستے کی نشاندہی کی گئی اور نہ اس میں کسی قدیم راستے کے نشانات موجود تھے، لہٰذا میری زمین میں قدیم راستے کا دعویٰ بے جا ہے، اس لیے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زمین میں لوگوں کو

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز، فاذا ظهر المدعی العجز عن اثبات دعواه حلف المدعیٰ علیه بطلبه - (شرح مجلة الاحکام - المادة ۱۷۴۲/۱۰۹۳ الفصل الثالث فی التحلیف)

وفی الهندیة: دار فی یدی رجل ادعاها رجلان کل واحد منهما یدعی انها داره ورثها عن ابیه فلان واقام علیٰ ذلك بینة فان لم یؤرخا او ارخا وتاریخهما علی السواء یقضی بها بینهما۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۴ ص ۷۲ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)۔

گذرنے سے روک لوں۔

الجواب:۔ مندرجہ بالا فریقین کے بیانات موقعہ اور معززین قوم کی شہادت کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فریق اول جس راستے کا دعویٰ کرتا ہے وہ راستہ چند مہینوں اور سالوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ قدیم مدت سے قائم ہے، بلکہ بعض معمر افراد کے بیانات کے مطابق پچاس ساٹھ سال یہ لوگ اس راستے کو استعمال کرتے رہے بلکہ فریق اول جس راستہ کی نشاندہی کر رہا ہے اس پر درختوں کی بھاڑ بھی قائم ہے خاص کر ندی سے گذر کر قدیم راستے کی نشاندہی جس مقام سے ہو رہی ہے وہاں درخت کھڑے ہیں اور اس سے آگے گذر کر جس کنوئیں کے قرب وجوار سے راستہ گذرنے کا کہا جا رہا ہے وہاں پر بھی موجودہ وقت میں کسی قدیم راستے کی نشاندہی نہیں ہوتی، اس کے مقابلے میں مطلوبہ راستہ پر آمدورفت کا اقرار خود فریق ثانی کچھ مدت سے کر رہا ہے، اگرچہ یہ لوگ (فریق ثانی) یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمین کے خریدنے کے وقت ہمیں کسی قسم کے راستہ کی نشاندہی نہیں کی گئی، لیکن از روئے شرع جو راستہ پہلے سے قائم ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر رکھا جائے گا اور اس راستے سے منع کرنے کا حق فریق ثانی کو حاصل نہیں جبکہ ابھی تک یہ راستہ آمدورفت کے لیے استعمال ہو رہا ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ کر آئندہ کیلئے بھی آمدورفت کیلئے استعمال کیا جائے گا۔

قال العلامة سليم رستم باز: اذا كان لرجل نهر في ارض رجل او ميزاب في دار رجل فاختلفا في ذلك وانكر صاحب الارض والدار ثبوت حقه فالقول قوله وعلى المدعي البينة ان له حق السيل الاجراء الماء فيه الا اذا كان الماء جاريا زمان الخصومة فحينئذ القول قول صاحب الماء۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۷۲ ص۱۱۵ كتاب الدعوى- الفصل الثالث)[1]

تاہم موجودہ راستہ سے مغربی جانب فریق ثانی کی زمین کی طرف تصرف نہیں کیا جائے گا اگر راستہ میں وسعت کی ضرورت پڑے تو مشرقی جانب ندی کو استعمال میں لایا جائے گا۔

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغيناني: اذا كان نهر لرجل يجري في ارض غيره فاراد صاحب الارض ان لا يجري النهر في ارضه ترك على حاله لانه مستعمل له باجراء مائه فعند الاختلاف يكون القول قوله۔ (الهداية ج۴ ص۴۸۶ كتاب احياء الموات- فصل في الدعوى والاختلاف)

ومثله في الهندية ج۵ ص۴۰۲ الباب الرابع في الدعوى في الشرب۔

گواہوں پر جرح کے متعلق قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال: (بیانِ مدعی) میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فلاں شخص نے میرے گھاس کے ڈھیر میں عمداً زہریلی دوائی ڈالی جس سے میری ایک بھینس، ایک گائے اور ایک بچھڑا ہلاک ہو گئے، اور اس شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار بھی کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے

(بیانِ مدعیٰ علیہ) میں نے مدعی کے گھاس میں نہ زہریلی دوائی ڈالی ہے اور نہ لوگوں کے سامنے اقرار کیا ہے ۔

فیصلہ قاضی: مدعی نے اپنے دعویٰ پر دو گواہ پیش کئے اور انہوں نے گواہی دی کہ ہمارے سامنے مدعیٰ علیہ نے اقرار کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے اور مدعی کے مویشی میں نے ہلاک کئے ہیں ۔ اس کے بعد مدعیٰ علیہ نے چار گواہ پیش کیے لیکن قاضی صاحب نے یہ کہا کہ جرح کے گواہ شریعت میں منع ہیں، اس لیے فیصلہ مدعی کے گواہوں پر ہوا ۔ تو کیا قاضی صاحب کا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں ؟

الجواب: ۔ قضاء کا معاملہ چونکہ حساس نوعیت کا حامل ہے اس لیے قاضی کو پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہر مسئلے کو حل کرنا چاہیئے، چنانچہ ہر فیصلہ کی حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے شریعت نے زرین اصول مرتب کیے ہیں تاکہ اس بارے میں ہر کسی کی تسلی ہو جائے اور کوئی بھی فریق عدم اطمینان کا شکار نہ ہونے پائے۔ چونکہ فریقین کے درمیان کسی تنازعہ کے فیصلہ میں مدعی کے گواہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس کے گواہوں کا شریعتِ مطہرہ کی بیان کردہ صفات کا حامل ہونا ضروری ہے ۔ لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں اگر قاضی کے ہاں مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت ہو چکی ہو اور وہ پُر اعتماد ہوں تو ان گواہوں پر مدعیٰ علیہ کو جرح وغیرہ کا حق نہیں ہے بلکہ قاضی ان گواہوں کی گواہی کے موافق فیصلہ کرے گا، اور اگر پہلے سے مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت نہ ہوئی ہو تو پھر مدعیٰ علیہ کو گواہوں پر جرح کا حق حاصل ہے ۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله : لا تقبل الشهادة على جرح مجرد من اثبات حق لله تعالى او للعبد بعد التعديل ولو قبله قبلت اى الشهادة

بل الاخبار ولو من واحد علی الجرح المجرد۔ (الدر المختار علی ہامش ردالمحتار ج۴ ص۴۲۸ کتاب الشہادات، باب القبول وعدمہ)[1]

نوے سال سے قابض زمین پر ملکیت کے دعوی کے متعلق فیصلہ

سوال
دعوی بابت اراضی

بیان فریق اوّل:۔ میں یہ دعوی کرتا ہوں کہ فریقِ ثانی نے ساٹھ ستر سال سے ہماری پدری جائیداد کے ایک قطعہ اراضی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور اس قطعہ اراضی کا کچھ حصہ کسی اور شخص پر فروخت کر دیا ہے، لہٰذا فروخت شدہ قطعہ اراضی اور فریقِ ثانی کے زیر تصرف زمین میری ہے۔

بیان فریقِ ثانی: یہ قطعہ اراضی ہمارے دادا نے فریقِ اوّل کے دادا سے خریدا تھا جو کہ نوے سال سے ہمارے قبضہ میں ہے اور اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں، چالیس سال قبل اس سے کچھ حصہ ہم نے ایک شخص پر فروخت کیا اور بیع پر خبردار ہونے کے باوجود مدعی نے کوئی دعوی نہیں کیا۔

ان بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ شرعی اصول کے تحت اوّلاً یہ معلوم کیا جانا چاہیئے کہ فریقِ اوّل نے دعوی کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی ہے؟ اگر اس نے دیدہ دانستہ بلا عذر دعوی میں اتنی تاخیر کی ہو تو اس کا دعوی ناقابلِ سماعت ہے، اور اگر اس نے لاعلمی، خوف یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے تاخیر کی ہو تو پھر اس کا دعوی صحیح ہے۔ چونکہ فریقِ ثانی بیع قطعی کا دعوی کرتا ہے اسلیئے اس پر لازم ہے کہ اپنے دعوی کے اثبات کے لیے سو سالہ دو معتمد گواہ پیش کرے، اگر فریقِ ثانی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر فریقِ اوّل کو اس علم پر قسم دی جائے گی کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دادا نے فریقِ ثانی کے دادا پر زمین فروخت کی تھی؟ اگر

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: لا تقبل الشهادة علی الجرح المجرد اذا اقام البینة علی العدالة اما اذا لم یقم للبینة علیها فاخبر مخبر ان الشهود فساق او اکلوا الربوا فان الحكم لا یجوز قبل ثبوت العدالة لاسیما اذا اخبر مخبر ان الشهود فساق۔ (البحر الرائق ج۷ ص۶۱ کتاب الشهادة)

ومثله فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز، المادة ۱۷۲۴ ص۱۰۲۱ الفصل السادس۔

فریقِ اول قسم اٹھائے تو اس کی قسم پر فیصلہ اس کے حق میں کیا جائے گا اور اگر وہ قسم سے انکار کرے تو پھر فیصلہ فریقِ ثانی کے حق میں کیا جائے گا۔

قال العلامۃ محمود بن اسماعیل الشہیر بقاضی سماوۃؒ: ولو وقع الدعوی علی فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباك اتلفہ او سرقہ او غصبہ منی یحلف علی العلم ھذا مذھبنا۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۱۲ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقہ) لہ

آباؤ اجداد کی شرکت کی وجہ سے ورثاء کا شریک کی جائیداد میں کچھ حصہ پر ملکیت کے دعوٰی کا جائزہ

فریقِ اوّل ـــــ فریقِ ثانی

حقِ تحکیم: فریقین بالا نے برضاء و رغبت اپنے متنازعہ متعلقہ قطعہ اراضی تقریباً ایک سو پچاس ^۱۵۰^ جریب مع سرکاری کاغذات شرعی فیصلہ کرانے کیلئے دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء میں پیش ہوئے، ایک معزز شخص کے توسط سے فریقین کو فیصلہ کا پابند رکھنے کے لیے ہر ایک فریق سے تین تین سو روپے بطور ضمانت لئے گئے جو اس معزز شخص کے پاس بطور امانت رکھے گئے اور فیصلہ پر عملدرآمد یقینی ہونے پر طے شدہ تاریخ کے مطابق واپس کر دیئے جائیں گے۔

تنقیحات: فریقین کے بیانات سننے کے بعد مندرجہ ذیل امور سامنے آئے:۔

(۱) فریقِ ثانی زیرِ تنازعہ قطعہ اراضی کا قابض ہو کر فریقِ اوّل اس میں ۱/۴ حصہ کی ملکیت کا دعویدار ہے اور بیان کرتا ہے کہ مدعیٰ علیہ کے آباؤ اجداد سے ہمارے آباؤ اجداد کا مشترکہ کاروبار تھا اور متنازعہ جائیداد مشترکہ کھاتہ سے خریدی گئی ہے جس میں ہمارے باپ مدعیٰ علیہم کے باپ وغیرہ سے ۱/۴ حصہ کا حقدار ہے۔

(۲) فریقِ اوّل اپنے دعوٰی کے اثبات کے لیے ایک تحریر پیش کر رہا ہے جو مدعیٰ علیہم کے باپ کے نام منسوب ہے جس کے مطابق وہ تسلیم کرتا ہے کہ مدعی کا باپ ہمارے ساتھ اس خریدی ہوئی جائیداد میں برابر کا حصہ دار ہے، اگرچہ سرکاری کاغذات میں نام کا اندراج رہ گیا ہے لیکن وقت مقررہ پر اس کا

لہ قال العلامۃ تمرتاشیؒ: والتحلیف علی فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لا یعلم کذلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۷۳ کتاب الدعوٰی)

ومثلہ فی فتاوٰی قاضی خان ج۲ ص۴۱۴ کتاب الدعوٰی۔

نام درج کیا جائے گا تاہم تحریر پر موقعہ کی تاریخ ڈالی گئی ہے البتہ بعد میں ۱۹۷۵ء کا سال لکھا ہوا نظر آرہا ہے جبکہ توثیق ۱۹۸۶ء میں کی گئی ہے۔

(۳) فریق اوّل علاوہ ازیں حاصلات کی وصولی کا بحیثیت مالک ہونے اور اس کی حصہ داری کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے مُدّت دراز تک اس کے حاصلات لیے ہیں جبکہ فریق ثانی محض تبرّع واحسان اور خریداری کے وقت ایک معاہدہ کے تحت کچھ وقت تک اس کی ادائیگی کے قائل ہیں لیکن مُدعیٰ علیہم کے باپ کی موت سے یہ مراعات بھی ختم ہوگئیں، یعنی فریق ثانی کا بیان ہے کہ یہ مراعات ان کو اس معاہدہ کے تحت دی گئی تھیں کہ خریدنے کے بعد زمین کے قبضہ کی وصولی تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ فریق اول کے باپ کے پاس یہ جائیداد اس وقت رہن تھی۔

فیصلہ: از روئے شرع فریق اوّل مُدعی ہے اس لیے دعویٰ کے اثبات کے لیے اُس سے گواہ مانگے گئے لیکن وہ اپنے دعویٰ ملکیت کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے سے قاصر رہا کیونکہ تحریری بیان پر جن گواہوں کے نام ثبت ہیں ان میں سے حسب بیان مُدعی ایک گواہ مخالف فریق سے تعلقات کی وجہ سے ہمارے لیے گواہی نہیں دیتا جبکہ دوسرا گواہ اکیلے ناکافی ہے اس لیے فریق اوّل یعنی مُدعی کے مطالبہ پر فریق ثانی کو قسم دی گئی، چونکہ یہ دوسرے کے فعل پر قسم ہے اس لیے فریق ثانی کو قسم بالعلم دی گئی قسم کھانے کے بعد جائیداد مذکورہ فریق ثانی کے پاس رہ کر فریق اوّل اپنے دعویٰ کے اثبات میں ناکام ہوا۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انه لایعلم انه کذلك لعدم علمه بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۷۳ کتاب القضاء)

---

[1] لما قال العلامة محمود بن اسماعیل الشہیر بقاضی سماوہ رحمه الله: ولو وقع الدعوٰی علیٰ فعل الغیر من کل وجه یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباك اتلفه اوسرقه او غصبه منی یحلف علی العلم وهٰذا مذهبنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقه)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص ۴۱۴ باب مایکرہ من الثیاب والحلی والزینة۔

فیصلہ شرعی درباب شفعہ

دعوٰی

مفتاح الدین ولد عبد المالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات

بنام

(۱) رحمت اللہ جان ولد نورا جان سکنہ محلہ رحمانیہ نزد رحمانیہ مسجد عیدگاہ میدان مٹھیانے کالونی، منگھوپیر روڈ کراچی۔

(۲) خان بہادر ولد عبد المالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور، تحصیل مینگورہ ضلع سوات (مدعا علیہم)

دعوٰی دخلیابی بہ نفاذ حق شفعہ اراضی زرعی مشتمل بہ پانچ قطعات معروف بہ نمبر۱ اکس نمبر۲ شونگرہ نمبر۳ لمہ نمبر۴ جماعت باڑی نمبر۵ ناغہ غبرآباد بحدود ذیل!

قطعہ نمبر۱ اکس: شرقاً، اراضی مدعی۔ غرباً، اراضی گل محمود۔ شمالاً: اراضی عبد الظاہر، جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ برادر مدعی۔

قطعہ نمبر۲ شونگرہ:۔ شرقاً اراضی مفتاح الدین (مدعی)، غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ، شمالاً: اراضی مدعی۔ جنوباً اراضی مدعی۔

قطعہ نمبر۳ لمہ:۔ شرقاً، اراضی مدعی۔ غرباً، باراتی ندی نالہ۔ شمالاً، اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔

قطعہ نمبر۴ جماعت باڑی:۔ شرقاً، اراضی نیک محمد۔ غرباً، اراضی گل اعظم خان۔ شمالاً، اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی گل اعظم خان۔

قطعہ نمبر۵ ناغہ (غبرآباد) شرقاً، اراضی و مکان مدعی۔ غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔ شمالاً، راہ عام۔ جنوباً، اراضی عبد الظاہر واقع شگہ مجد رقبہ سیرائی تحصیل و ضلع دیر بہ ادائیگی اصل زر ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی درست قیمت فاضل عدالت مقرر کرے۔

مالیت دعوٰی بغرض کورٹ فیس و اختیار سماعت مبلغ -/۱,۰۰,۰۰۰ روپے	بنائے دعوٰی ۱۸/۹/۹۸ کو بیع کا علم و اعلان پر شفعہ اندر حدود تحصیل دیر پیدا ہوئی۔

جناب عالی! گذارش حسب ذیل ہے :۔

(۱) یہ کہ مُدعا علیہ ۱ نے ہر پانچ قطعاتِ الاضیات متدعویہ ازاں مدعا علیہ ۲ بعوض مبلغ ایک لاکھ روپے (۱,۰۰,۰۰۰) خفیہ طور پر بیع کی ہوئی ہے اور جملہ لین دین کو اخفاء میں رکھ کر حسب قانونِ مروّجہ مُدعی کو قبل از بیع کوئی نوٹس نہ دیا ہے۔

(۲) یہ کہ مدعا علیہم نے مُدعی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کے لیے اگر اپنے خانگی بیع نامہ میں زیادہ رقم درج کی ہو تو وہ فرضی ہوگی، حالانکہ بیع اصل میں ایک لاکھ روپے کے عوض ہوئی ہے اور یہی اراضیات متدعویہ کی بازاری قیمت ہے۔

(۳) یہ کہ مُدعی کو مذکورہ بیع کا علم مؤرخہ ۱۸/۸/۹۸ کو بوقتِ صبح آٹھ بجے گھر خود بمقام دیر ہو کر اطلاع دہندہ مسمی عبدالظاہر سکنہ شگی کے رُوبرو فی الفور اور بر موقع اپنے حقِ شفعہ کا اعلان کیا، اور ساتھ ہی اسی روز ہمراہ اطلاع دہندہ اراضیات متدعویہ پر جا کر کاشتکارانِ اراضیات مشفوعہ مسمیان عبدالحمید اور محمد طیب ساکنان شگی کے علاوہ گواہان عباس خان، اجمیر خان وحمیداللہ خان ساکنان سیرائی کی موجودگی میں اپنے حقِ شفعہ کا پھر اعلان کیا۔

(۴) یہ کہ بعد ازاں بروئے تحریر مؤرخہ ۲۲/۸/۹۸ کو مدعا علیہ ۱ بذریعہ رجسٹری اے ڈی نوٹس بھیج کر جملہ طلباتِ اسلامی پورے کئے۔ (نقل رسید نوٹس کارڈ لف ہیں)

(۵) یہ کہ مدعی کا حقِ شفعہ بمقابل مدعا علیہ ۱ ہر لحاظ سے فائق تر ہے۔

(ا) یہ کہ اراضی متدعویہ خاندانی اراضی ہے۔

(ب) یہ کہ اراضی متدعویہ کے پیوست مُدعی کی اراضیات ہیں۔

(ج) یہ کہ اراضیاتِ مشفوعہ کے ساتھ مُدعی کے جملہ حقوق آب نالش وراہ ہیں۔
اراضی متدعویہ و مدعی کی اراضیات ایک ہی نالہ سے سیراب ہوتی ہیں۔

(د) یہ کہ مدعا علیہ ۱ علاقہ میں غیر مالک و نیز غیر باشندہ ہے اور اس کا کوئی بھی وصف حقِ شفعہ نہ ہے۔

(ہ) یہ کہ مدعی کے حقوق ہر لحاظ سے فائق و برتر ہیں۔

(۶) یہ کہ ہر چند مدعا علیہم سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حقوقِ مُدعی کو تسلیم کر کے اراضیاتِ متدعویہ سے بحقِ مدعی بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن دستبردار ہو جائے مگر وہ انکاری ہیں جس کی بناء پر

دعویٰ ہذا کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۷) بنائے دعویٰ و مالیتِ دعویٰ مندرجہ عنوان عرض دعویٰ ہے۔

(۸) یہ کہ اراضیات متدعویہ تحصیل دیر میں واقع ہے اس لیے عدالت ہذا کو اختیارِ سماعت حاصل ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ڈگری دخلیابی بہ نفاذ حقِ شفعہ بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی قیمت فاضل عدالت ہذا مقرر کرے بہ حق مُدعی بمع خرچہ صادر فرمایا جائے۔

العــــــارض

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار سکنہ دیر (مُدعی)

بیانِ حلفی:۔ حلفاً عرض ہے کہ جملہ مراتب بر عرض دعویٰ درست ہیں۔

جوابِ دعویٰ منجانب مدعا علیہم

جنابِ عالی! جوابِ دعویٰ ذیل عرض ہے:۔

تمہیدی عُذرات:۔

(۱) مدعی کو بہ خلافِ مدعا علیہ کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہ ہے۔

(۲) دعویٰ مُدعی مبہم اور ناقص ہے۔

(۳) دعویٰ مُدعی سازشی ہے اور بدنیتی و ایذا رسانی پر مبنی ہے۔

(۴) حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔

(۵) اراضی متدعویہ مُدعا علیہ ۲ و برادر خورد (بہادر زیب) جو کہ فالج کا مریض تھا کا حصہ رسدی ملکیت تھا، مُدعی و دُوسرے برادران کے خرید نے سے انکار پر مجبوراً علاج کی غرض سے مسمی متذکرہ پہ نزد مدعا علیہ ۱ بہ عوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار (۳۶۰۰۰۰ ر) روپیہ فروخت کی تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔

(۶) دعوئ مُدعی بوجہ عدم استمال ضروری فریق ناقابلِ سماعت و قابلِ اخراج ہے۔

(۷) مُدعی کو بلیعہ کا خوب علم تھا اور بر وقت حسبِ قانون دعویٰ نہ کیا اور اب دعوئ ھذا بہ ایماء عبدالظاہر سازش اور ایذا رسانی کی خاطر کیا گیا ہے۔

(۸) مُدعی نے حسبِ قانونِ شفعہ پورے نہیں کئے ہیں۔

(۹) مدعی بوجہ قول و فعل میں تضاد کے خود مانع دعویٰ ھٰذا ہے۔

(۱۰) بوجہ عدم چسپانگی کورٹ فیس بھی دعویٰ مدعی ناقابلِ پیش رفت و قابلِ اخراج ہے۔

(۱۱) دعویٰ مدعی از خود زائد المیعاد ہے۔

واقعاتی عذرات

(I) فقرہ ۱ جیسا کہ مرتب کردہ ہے غلط اور من گھڑت ہے اور انکار ہے۔ بجواب عرض ہے کہ اراضی متدعویہ مدعا علیہ ۲ و برادر مسمی بہادر زیب کی حقہ رسدی ملکیت تھی، مسمی بہادر زیب فالج کا مریض تھا، کے علاج معالجہ کے لیے بعد از اطلاع و خرید نے سے مدعی و دیگر برادران کے انکار پر مجبوراً نزد مدعا علیہ ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (۳،۶۰،۰۰۰) فروخت کی گئی، نقل بیعنامہ لف ہذا ہے۔

(II) فقرہ ۲ غلط، بلاجواز اور جھوٹ پر مبنی ہے اس لیے انکار ہے، اراضی متدعویہ کی قیمت اُس وقت ۳،۶۰،۰۰۰/- روپے تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔

(III) فقرہ ۳ بھی غلط، خلافِ قانون و خلافِ شرع ہے، بیانِ حلفی دریں بارہ لف ہے۔

(IV) فقرہ ۴ غلط، خلافِ قانون ہے، مدعی نے حسبِ قانون طلباتِ اسلامی پورے نہیں کیے ہیں۔

(V) فقرہ ۵ کا بہ تفصیل جواب ذیل عرض ہے:-

(ا) جُز ھٰذا غلط اور بلاجواز ہے۔

(ب) جُز ھٰذا بھی غلط ہے، حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔

(ج) جُز (ج) بھی غلط اور بلاجواز ہے۔

(د) جُز (د) بھی غلط ہے۔

(ہ) جُز (ہ) غلط ہے، مدعی بوجہ تضاد قول و فعل خود مانع عذر ھٰذا ہے۔

(VI) فقرہ ۶ غلط، خلافِ قانون و خلافِ شرع ہے اس لیے انکار ہے اور مدعی کو کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہیں۔

(VII) متدعویہ کی قیمت لاکھوں روپے ہے ــــــــــــــ اور کورٹ فیس دعویٰ مدعی ناقابلِ سماعت و قابلِ اخراج ہے۔

(VIII) فقرہ ۸

فیصلہ

اسلامی قانون میں شفعہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی مشروعیت کسی کے ضرر سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اس کا حق صرف تین اشخاص یعنی شریک فی نفس المبیع، شریک فی حق المبیع اور پڑوسی کو حاصل ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخليط فی نفس المبيع ثم للخليط فی حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار۔ (الهداية ج۴ ص۳۸۶ كتاب الشفعة)

(۱) ان تینوں کو تب حق شفعہ حاصل ہوگا کہ علم ہوتے ہی طلب المواثبہ اور ایسے الفاظ کہے جس سے حق شفعہ کا مطالبہ کرنا ظاہر ہوتا ہو۔ اس طلب پر گواہ بنانا ضروری نہیں تاہم بہتر ضرور ہے۔

لما فی الهداية: اذا علم الشفيع اشهد فی مجلسه ذلك على المطالبة واعلم ان الطلب على ثلاثة اوجه طلب المواثبة وهو ان يطلبها كما علم حتى لو بلغ الشفيع البيع ولم يطلب شفعته بطلت الشفعة۔ (الهداية ج۴ ص۳۹ كتاب الشفعة)

آگے لکھتے ہیں: والاشهاد فيه ليس بلازم انما لنفی التجاحد۔ (الہدایہ ج۴ ص۳۹۱ کتاب الشفعۃ)

قال العلامة البابرتیؒ: والاشهاد فی ذلك ليس بشرط۔ العناية شرح الهداية

وفی شرح المجلة: ويلزم الشفيع ان يقول كلاما يدل على طلب الشفعة فی المجلس الذی سمع فيه عقد البيع فی الحال كقوله انا شفيع المبيع او اطلبه بالشفعة ويقال لهذا طلب المواثبة۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۸۹ الفصل الثالث)

(۲) طلب المواثبہ کے بعد شفیع پر طلب التقریر والاشہاد کرنا ضروری ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ شفیع بائع یا مشتری یا مشفوعہ زمین وغیرہ کے پاس اپنا طلب شفعہ ظاہر کرے اگرچہ خط کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، مگر بلا عذر شرعی زیادہ تاخیر کرنا مبطل الشفعہ ہے۔

لما فی شرح المجلة، ومدة هذا الطلب ليس على الفور كطلب المواثبة بل هی مقدرة بمدة التمكن من الاشهاد وهذا الطلب لابد منه بعد طلب المواثبة حتى لو تمكن ولو بكتاب اور سول ولم يشهد بطلت شفعته۔ اھ

(شرح المجلة لرستم باز ص۵۹۱ المادة ۱۰۳۰)

اس طلب التقریر پر گواہ بنانا ضروری ہے تاکہ خصم کوئی بات نہ کر سکے۔

لما فی شرح المجلۃ، ویجب علی الشفیع بعد طلب المواثبۃ ان یطلب التقریر وان یشھد بان یقول فی حضور رجلین عند العقار المبیع ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ج۲ ص۹۹۵ کتاب الشفعۃ)

ورنہ دراصل دونوں طلبات میں گواہ بنانا کوئی شرط نہیں ۔

لانہ قد جرح فی الخانیۃ والبدائع بان الاشھاد لیس شرطاً فی صحۃ الطلب المذکور بل انما تجب الاشھاد للتمکن من الاثبات باقامۃ الشھود فیما اذا انکر الخصم الذی ھو المشتری وقوع طلب التقریر والاشھاد حتی ان الشفیع لو اجری طلب التقریر بلا اشھاد واقر بہ المشتری وصدقہ او نکل المشتری عن الیمین المکلف بھا فیثبت ویتحقق طلب التقریر

(درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ج۲ ص۹۹۵ کتاب الشفعۃ)

(۳) اس سے فراغت کے بعد شفیع پر طلب الخصومۃ ضروری ہے کہ قاضی یا علاقائی مجسٹریٹ کے پاس شفعہ کا دعویٰ دائر کرے، لیکن یہ طلب اس وقت ضروری ہے جب مشتری شفیع کو مشفوعہ زمین دینے سے انکاری ہو، اگر مشتری بغیر عدالتی کاروائی کے شفیع کو مشفوعہ شئے حوالہ کردے تو اس طلب کی کوئی ضرورت نہیں ۔

کما فی شرح المجلۃ، ویلزم ان یطلب الشفیع ویدعی فی حضور الحاکم بعد طلب التقریر والاشھاد ویقال لھذا طلب الخصومۃ والتملک یجب علی الشفیع اذا لم یسلمہ المشتری العقار المشفوع بعد طلب التقریر والاشھاد ان یطلب الشفعۃ ویدعی فی حضور الحاکم ----- لو سلم المشتری العقار المشفوع برضائہ للشفیع بناءً علی شفعتہ فلا حاجۃ لطلب الخصومۃ بعد ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۹۹۶)

اس طلب میں ایک ماہ سے کم تک بلا عذر تاخیر کرنا جائز ہے جبکہ ایک ماہ تک بلا عذرِ شرعی تاخیر مبطلِ شفعہ ہے اور عذرِ شرعی کی وجہ سے کوئی تحدید نہیں ۔

لما فی شرح المجلۃ: واخر الشفیع طلب الخصومۃ بعد طلب التقریر والاشھاد من دون عذر شرعی لکونہ فی دیار یسقط حق شفعتہ ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۸۰۲ م ۱۰۳۴)

قال البابرتیؒ: معناہ اذا ترکھا من غیر عذر لانھم اجمعوا علی انہ اذا ترک بمرض او حبس او غیر ذلک ولم یمکنہ التوکیل بھذا الطلب لا تبطل شفعتہ وان طالت المدۃ ۔ (العنایۃ شرح الھدایہ .)

لہٰذا مثل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار دیر نے

درباب شفعہ جملہ شرعی تقاضے پورے کئے ہیں۔

(۱) زمین کی بیان کردہ حدودات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ان اراضی میں حق الشرب والطریق کا اشتراک رکھتا ہے اور ساتھ ہی ان اراضی کا جار یعنی پڑوسی بھی ہے، اور یہ تو مذکورۂ بالا تصریحات کی روشنی میں حقِ شفعہ کے اسباب ہیں۔

(۲) اور پھر موصوف نے طلب المواثبہ بھی بروقت علم ہوتے ہی کیا ہے اور ساتھ ہی طلب التقریر والاشہاد پر مشفوعہ زمین کے ساتھ کاشتکاران اراضی کے سامنے مسمی اجمیر خان، عباس اور حمید اللہ خان کو گواہ بنا کر حقِ شفعہ کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا اگر مدعا علیہ رحمت اللہ خان ان طلبات کا منکر ہو اور مذکورہ گواہان مسمی مفتاح الدین ولد عبدالمالک ومدعی) کی اس طلب التقریر کی گواہی دیں تو دعویٰ قابلِ سماعت ہے۔

(۳) اور طلب الخصومۃ کی دعویٰ میں تاخیر زائد المیعاد نہیں اس لیے کہ ایک ماہ سے کم کی مدت تک بلا عذرِ شرعی تاخیر کرنا بھی مبطلِ شفعہ نہیں جبکہ موصوف نے ایک ماہ سے بھی کم مدت کی تاخیر کی ہے اور باہمی اصلاح وغیرہ کے لیے بھی کی گئی ہے جیسا کہ تحریری نوٹس اور علاقائی جرگہ کے بیانِ تحریری سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) اور ساتھ ہی آپ کا یہ مطالبہ مدعا علیہ مسمی رحمت اللہ جان نے علاقائی جرگہ کے سامنے تسلیم کیا ہے اور جرگہ والوں نے فیصلہ بھی مدعی مفتاح الدین کے حق میں کیا ہے جس پر مرسولہ بیان کی تحریر شاہد ہے۔

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس اراضی کا حقِ شفعہ مدعی مسمی مفتاح الدین ولد عبدالمالک کو حاصل ہے۔

تاہم اگر مدعیٰ علیہ اس بات پر گواہ پیش کردے کہ مدعی مفتاح الدین ولد عبدالمالک کو ان اراضی کی بیع کی اطلاع طلب المواثبۃ کی تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس پر خاموش رہا یا انکار کیا تو پھر مفتاح الدین کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی خاموشی یا انکار سے باطل ہو چکا ہے جیسا کہ ماقبل کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

◆

راضی نامہ کے بعد دعویٰ کرنا اور مدعا علیہ سے قسم لینا

سوال :۔ غلام رسول، غلام حسین اور بخت رسول تین بھائی ہیں، ان کے مابین کاروباری تنازعہ تھا، مؤرخہ ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء کو ان کے درمیان رُوبروئے گواہان یہ فیصلہ بطور راضی نامہ طے پایا کہ آئندہ کے لیے ہم تینوں میں سے جس کے پاس نقد رقم، پنشن اور زرخرید اراضی میں سے جس کے نام پر بیع نامہ ہو وہ سب کچھ اسی کا ہوگا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا اعتراض یا دعویٰ وغیرہ نہیں کرے گا، راضی نامہ پر تینوں بھائیوں کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں۔ اب راضی نامہ کے آٹھ ماہ بعد بخت رسول نے راضی نامہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف سول جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ غلام حسین کے پاس ہماری مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی ہے اگر وہ نہیں مانتا تو قسم اٹھائے کہ میرے پاس مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی نہیں ـــــ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بخت رسول کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے؟ اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعویٰ کر کے اپنے بھائی غلام حسین سے حلف لے لے، جبکہ وہ یہ تمام کاروائی صرف اپنے بھائی کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :۔ قانونِ شرعی کے مطابق جب کسی نزاع کے فیصلہ کا حل درکار ہو تو البینۃ علی المُدعی والیمین علیٰ من انکر (الحدیث) کی رُو سے مُدعی کے ذمہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہوں کا پیش کرنا لازم ہوتا ہے اور اگر مُدعی گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو تو مُدعی کے مطالبہ پر مُدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔ یہ کاروائی تب صحیح اور درست ہوگی اور اس طریقے پر فیصلہ تب کیا جائے گا جب دعویٰ قابلِ سماعت ہو۔

صورتِ مسئولہ میں راضی نامہ کے جملہ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت رسول کا اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف یہ دعویٰ اُس صلح اور راضی نامہ کے بعد کا ہے جو ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء کو گواہوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے کہ بخت رسول نے اپنا دعویٰ سول جج کی عدالت میں دائر کیا ہے۔ اس لیے شرعاً اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی مُدعی کے لیے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مُدعیٰ علیہ غلام حسین وغیرہ سے یمین (قسم) لینے کی، بشرطیکہ مذکورہ صلح نامہ

شرعی قوانین کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اس لیے کہ جب کسی نزاع سے متعلق شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق فریقین میں ایک بار صلح ہو جائے تو پھر بدون رضا فریقین کوئی ایک فریق از خود اس کو فسخ (ختم) نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بخت رسول کا راضی نامہ کے بعد غلام حسین پر دعویٰ کرنا شرعاً غیر مسموع اور ناقابلِ اعتبار ہے اور غلام حسین کو حلف دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: اذا تم الصلح فليس لواحد من الطرفين فقط الرجوع ويملك المدعی بالصلح بدله ولا يبقى له حق فی الدعوى وليس للمدعى عليه ايضاً استرداد بدل الصلح۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج ۴ ص ۵۶۹ المادة ۱۵۵۶) لـه

مدعیٰ بہ کی مقدار میں غلطی ہوجانا مسقطِ دعویٰ نہیں

سوال :- ایک صاحب نے علاقہ دیر میں قاضی کے سامنے ایک قطعہ زمین پر دعویٰ کیا جس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا مگر بدقسمتی سے مقدارِ زمین میں غلطی کر گیا، کاغذات میں وہ زمین پانچ ایکڑ ہے اور مدعی نے دعویٰ میں چار ایکڑ کا ذکر کیا، اس پر قاضی نے اُسے جھوٹا قرار دے کر اس کے دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے، تو کیا واقعی یہ دعویٰ شرعاً ناقابلِ سماعت ہے؟

الجواب :- ایسا دعویٰ کرتے وقت مدعیٰ بہ کا حدودِ اربعہ صحیح بیان کرنا ضروری ہوتا ہے مقدار کا بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی مُدعی بوقتِ دعویٰ مقدار کے بیان کرنے میں غلطی کر جائے اور حدودِ اربعہ درست بیان کیا ہو تو دعویٰ قابلِ سماعت ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں قاضی صاحب نے بلا تحقیق و بلا عذرِ شرعی دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بيان الحدود واخطأ فی بيان مقدار ذراع العقار او دونه لا يمنع صحة دعواه۔ (مجلة الاحکام العدلية۔ المادة ۱۶۲۴)

لـه قال العلامة سليم رستم بازؒ: تحت هذه القاعدة: سواء كان الصلح عن اقرار او انكار او سكوت حتى لو ادعى عليه شيئاً فانكر فصالحه على شئ ثم اقر المدعى عليه لا يلزمه ما اقر به وكذا لو برهن المدعی بعد صلحه لا يقبل لان الصلح عقد لازم ليس لاحدهما نقضه الخ

(شرح مجلة الاحکام سليم رستم باز ص ۸۲۵ الباب الرابع)

دعوٰی ہبہ کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے

سوال :- زید کا ایک قطعۂ اراضی پر قبضہ اور تصرف ہے اور اس کا دعوٰی ہے کہ یہ زمین مجھے بکر نے ہبہ کی تھی، جبکہ بکر کے بیٹے کا دعوٰی ہے کہ یہ زمین میرے والد کی میراث ہے لہٰذا یہ میرا حق ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ شرعاً یہ زمین کس کا حق ہے؟

الجواب :- اگر زید اپنا دعوٰی ہبہ معتبر شہادت سے ثابت کرے تو یہ زمین اس کا حق ہے ورنہ بکر کے بیٹے کو حلف علی العلم دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ : سئلت فی رجل ادعٰی علی اٰخر عقاراً انه ملکهٗ تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعٰی علیه بانی اشتریتهٗ من ابیك حال حیاته وانهٗ فی حوزی وتصرفی فی مدة تزید علٰی خمسین سنة مع حضورك وعلمك وسکوتك بلاعذر شرعی هل یکون جواب المدعٰی علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج الٰی بیّنة تشهد لهٗ بالشراء ولاینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولاتکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة فاجبت نعم جواب المدعٰی علیه من قبیل دعوٰی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرار لهٗ بالملك ثم دعواه الانتقال الیه منه تحتاج الٰی بینة لان کل مدع یحتاج الی البینة ولا ینفعه الید المدة المذکورة مع الاقرار المذکور ولیس هٰذا من باب ترك الدعوٰی بل من باب المواخذة بالاقرار ومن اقر لشیء لغیره اخذ باقراره ولوکان فی یده احقاباً کثیرة لا تعد افاده المحقق الرملی فی فتاوٰی الخیریة۔ واللّٰه تعالٰی اعلم۔ (فتاوٰی کاملیة ص۱۲۳ کتاب الدعوٰی) [1]

الحق لایسقط بتقادم الزمان کا مطلب

سوال :- ایک شخص نے آج سے ۳۶ سال پہلے کچھ زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کی اور وہ اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے، اب اس کی وفات کے بعد دیگر ورثاء حقداری کا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : اذا اراد الرجل ان یحلف علٰی فعل نفسه یحلف علی البتات یعنی یحلف علی القطع بان هٰذا الشیء کذا ولیس بکذا اما اذا اراد ان یحلف علی فعل غیره یحلف علٰی عدم العلم یعنی یحلف علٰی عدم علمه بذالك الشیء۔ (شرح المجلة ص۱۱۰۱ المادة ۱۷۴۸)

دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟ جبکہ فتاویٰ انقرویہ جلد ۲ ص ۵۸ میں ہے کہ:۔ وفی المبسوط رجل ترك الدعوىٰ ثلاثاً وثلاثين سنة ولم یکن لہٗ مانع من الدعوىٰ ثم ادعیٰ لہٗ لا تسمع دعواہ لان ترك الدعوىٰ مع التمکن علیہ یدل علیٰ عدم الحق ظاهراً انتهیٰ

جنابِ مفتی صاحب! مسئلہ ھٰذا کا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ شرح المجلہ میں ہے کہ: اذا ترك المورث الدعوىٰ مدةً وترکها الوارث ایضاً مدة وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (ج ۵ ص ۱۸۱ المادة ۱۶۷۰)

اس سے معلوم ہوا کہ مورث اور اس کے وارث نے جب اپنا دعویٰ ۳۶ سال تک چھوڑا ہو اور کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو تو ایسا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے، البتہ جب مدعیٰ علیہ یہ مانتا ہو کہ مدعی کا حقِ ارث ہمارے ذمہ باقی ہے تو پھر سینکڑوں سال گذرنے کے باوجود بھی دعویٰ مسموع ہوگا اور حق دینا ہوگا، اور یہی معنیٰ ہے فقہاء کے اس قول کا کہ الحق لا یسقط بتقادم الزمان .....[1]

دعویٰ کب تک قابلِ سماعت ہے

سوال:۔ ایک آدمی ایک قطعہ اراضی پر ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ سے قابض اور اس میں مالکانہ تصرفات کرتا چلا آرہا ہے، اب ایک دوسرا شخص اس قطعہ زمین پر ارث کا دعویٰ کرتا ہے، تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہے یا نہیں؟ اور کیا اس تاخیر سے اس شخص کا استحقاق باطل ہوجاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سماعِ دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہوئی جو ۳۶ سال تک پہنچتی ہو اسی طرح مدعیٰ علیہ کسی طرح مقر بھی نہ ہو اور نہ ہی مدعی اس مدت میں غائب، بچہ اور پاگل بغیر ولی کے ہو۔ اور اگر دعویٰ کرنے میں ۳۶ سال یا اس سے زیادہ مدت گذر جائے، اسی طرح دیگر شرائط بھی قبولِ دعویٰ کی مفقود ہوں تو دعویٰ قابلِ سماعت نہ رہے گا۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی اس دوسرے شخص کا ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے بعد دعوائے ارث

---

[1] لما فی مجلة الاحکام، لا یسقط الحق بتقادم الزمان فاذا اقر المدعیٰ علیہ واعترف صراحةً فی حضور الحاکم بان حق المدعی عنده فی الحال علی الوجه الذی یدعیه وکان قد مر الزمان علی الدعوىٰ فلا یعتبر مرور الزمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیه۔ (شرح المجلہ ص ۹۹۶ المادة ۱۶۷۴)

قابلِ سماعت نہیں، تاہم مرورِ زمانہ کی وجہ سے استحقاق باطل نہیں ہوتا، کیونکہ الحق لایسقط بتقادم الزمان۔

قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللہ: قال المتاخرون من اھل الفتویٰ لاتسمع الدعویٰ بعد ست وثلثین سنۃ الا ان یکون المدعی غائباً او صبیاً او مجنوناً ولیس لھما ولی او المدعیٰ علیہ امیراً جابراً۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۱۷۷ المادۃ ۱۶۶۳)

اذا ترک المورث الدعویٰ مدۃ یترکھا الوارث ایضاً مدۃ وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلاتسمع۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۱۸۷ المادۃ ۱۶۷۰)[1]

پاگل کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک پاگل نے کسی شخص کی شرارت اور ایما پر گاؤں کے ایک معزز اور شریف آدمی پر دس ہزار روپے کا دعویٰ کر دیا جبکہ اس پاگل کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے، تو کیا اس کا یہ دعویٰ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قوانینِ شرع کے تحت وہ دعویٰ قابلِ سماعت اور صحیح ہوتا ہے جو عاقل بالغ آدمی کسی پر دائر کرے۔ اور اگر مدعی عاقل، بالغ نہ ہو تو شرعاً اس کا دعویٰ غیر مسموع اور غیر صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال اگر تو اس پاگل شخص نے بلا کسی تحریک کے خود دعویٰ کیا ہو اور اس کا کوئی ولی اس کی ولایت کر کے دعویٰ کی پیروی نہیں کرتا ہو تو شرعاً یہ دعویٰ ناقابلِ سماعت اور صحیح نہیں ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یشترط ان یکون المدعی والمدعیٰ علیہ عاقلین فدعوی المجنون والصبی غیر الممیز لیست بصحیحۃ ولکن ان یکون اولیاؤھما او اوصیاؤھما مدعین او مدعیٰ علیھم فی محلھما۔

{شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۹
الباب الاول فی شروط الدعویٰ}

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذا ترک الدعویٰ ثلاثاً وثلاثین سنۃ ولم یکن مانع من ترک الدعویٰ الخ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۲ مطلب اذا ترک الدعویٰ ثلاثۃ وثلاثین سنۃ لاتسمع)

ومثلہٗ فی فتاویٰ کاملیۃ ص۱۳۱ کتاب الدعویٰ۔

نابالغ بیٹے کی جگہ باپ کو قسم دینے کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر پہ چوری کا دعوٰی کیا جبکہ بکر چوری سے انکار کرتا ہے اور قسم کھانے کے لیے تیار ہے مگر وہ نابالغ ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا نابالغ پر شرعاً قسم آسکتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پھر اس کا والد اس کی جگہ قسم کھا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دونوں پر قسم نہیں آتی تو کیا پھر مدعی قسم کھا سکتا ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں اگر مدعی (زید) کے پاس اثباتِ دعوٰی کے لیے گواہ نہ ہوں تو پھر بکر ہی کو حلف وقسم دیا جائے گا اُس کے باپ کو نہیں؛ اس لیے کہ قسم کھانے کے لیے بلوغ شرط نہیں اور نہ ہی مدعی کا قسم کھانا شرعاً معتبر ہے۔

قال العلامة علی حیدر، (تحلیف الصبی) اذا کان المدعٰی علیه صبیًا وکان غیر ماذون لهٗ یتوجه علیه الیمین فاذا وجه ولکل فلا یحکم علیه بل یجب تحلیفه بعد البلوغ اما اذا کان ماذونًا فیتوجه الیمین علیه عند بعض الفقهاء ویحکم بیمینه وبنکوله عن الیمین وهٰذا هوالمفتی به الخ۔ (دُرر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص۲۸۹ الباب الثالث فی بیان التحلیف)[1]

مصالحت کے بعد ارث کا دعوٰی کرنا

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے اپنی حینِ حیات میں ہی جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا تھا کہ میرا آبادگھر میرے تین بیٹوں یعنی حبیب خان، قادر خان، افضل خان کا ہے اور سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) رقبہ تعدادی ایک کنال ۹ مرلے دوسرے دو بیٹوں (غلام خان، محمد طفیل) کو دے دیا اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی کہ مستی غلام خان اپنے چھوٹے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کا گھر بنا کر دیتے اور اس کی شادی کرنے کے بعد بقیہ ڈاگہ (پلاٹ) کا مالک ہوگا والد صاحب کی وفات کے بعد غلام خان نے اپنے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کی بجائے تین کمروں کا گھر بنا کر دیا اور اس کی شادی بھی کر دی، بعد ازاں والدہ صاحبہ اور جملہ بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ بھی کر دیا جسے سب نے قبول کیا (جس کا اسٹامپ لف ہذا ہے) اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں،

---

[1] وفی الهندیة: الصبی الماذون یحلف کالبالغ وبه ناخذ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۴ ص۲۵ کتاب الدعوٰی۔ الباب الثالث فی الیمین وفیه ثلاثة فصول)

مگر اس فیصلہ کے بعد بھائیوں نے انکار کر دیا اور پھر علاقائی جرگہ نے دوبارہ فیصلہ کیا جس پر سب بھائیوں نے رضامندی ظاہر کر دی جس کا تحریری ثبوت بھی لف ہٰذا ہے اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود تینوں بھائیوں (حبیب خان، قادر خان، افضل خان) نے پھر اس سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) پر دعوٰی ارث کر دیا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیانات مذکورہ کی روشنی میں تینوں بھائیوں کا دعوٰی ارث صحیح ہے یا نہیں؟ شریعتِ اسلامی کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:- مذکورہ بالا بیان اور ملفوف اسٹامپ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ نے اپنی زندگی میں بیٹوں میں جائیداد کی تقسیم کا جو فیصلہ کیا تھا اُس وقت سب بھائی اس فیصلہ پر رضامند تھے اور بعد ازاں علاقائی جرگہ کا فیصلہ قبول کر کے آپس میں سب بھائی صلح بھی کر چکے ہیں، لہٰذا مصالحت کے بعد کسی بھی وارث کو اپنی صلح سے رجوع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، اس لیے مذکورہ سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) میں محمد طفیل کا گھر بن جانے کے بعد باقی حصہ صرف مسمّی غلام خان کا ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی بھی وارث اس میں شراکت کا دعوٰی نہیں کر سکتا بلکہ یہ قطعہ زمین غلام خان کی ملکیت متصور ہوگا۔

لما فی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۵۵۶: اذا تم الصلح فلیس لواحد فقط من الفریقین الرجوع عنه۔ قال الشیخ سلیم رستم باز تحته سواء کان الصلح عن اقرار او انکار او سکوت حتی لو ادعی علیه شیئاً فانکر فصالحه علی شیء ثم اقر المدعی علیه لا یلزمه ما اقر به وکذا لو برهن المدعی بعد صلحه لا یقبل لان الصلح عقد لازم لیس لاحدهما نقضه۔ (شرح المجلة ص۸۴۵ الباب الرابع فی احکام الصلح)[1]

دعوٰی کے ثبوت کے لیے شرعی ضابطہ

سوال: زید سے عمرو نے چوری کی ہے، اب زید عمرو پر دعوٰی (مقدمہ) کرنا چاہتا ہے تو اس

---

[1] وفی الهندیة: فوقوع الملك فی البدل وثبوت الملك فی المصالح عنه ان کان مما یحتمل التملیك کالمال ووقوع البرأة عنه للمدعی علیه ان کان لا یحتمل التملیك کالقصاص هذا اذا کان الصلح علی الاقرار الخ۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۲۲۹ کتاب الصلح)

کے لیے اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ اور اگر زید شرعی تقاضوں کے مطابق عمرو کو چور ثابت کر دے تو جتنا مال اس کا چوری ہوا ہے اس سے زیادہ عمرو سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- دعویٰ کے اثبات کے لیے شرعی ضابطہ یہ ہے کہ مدعی (دعویٰ کرنے والا) قاضی کے سامنے معتبر شہادت پیش کرے اور مدعیٰ علیہ (منکر) کے ذمہ حلف یعنی قسم کھانا لازم ہے، مگر یہ تب ہے جب مدعی گواہ پیش نہ کر سکے اور وہ مدعیٰ علیہ سے قسم کا مطالبہ کرے۔ حدیث میں ہے: البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر (صحیح مسلم ج۲ ص۷۴ کتاب الاقضیۃ)[1] اور فعل الغیر پر قسم کرنے کی صورت میں قسم علی العلم کی جائے گی۔ اور شہادت یا نکول یعنی قسم کھانے سے انکار کی صورت میں مدعی کے لیے صرف وہ چیز ثابت ہوگی جس کا وہ دعویدار ہے اس سے زائد مال لینا اس کے لیے شرعاً درست نہیں۔

ہبۂ تام کے بعد دعویٰ ارث ناقابلِ سماعت ہے

سوال:- جناب مفتی صاحب! ہماری والدہ صاحبہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا جملہ ترکہ اپنے ایک بیٹے کے نام کر دیا تھا جس کے گواہان اور سرکاری اسٹامپ لف ہٰذا ہے، تو اب ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے والدہ کے ترکہ میں اپنے حصہ کے دعویدار ہیں، تو کیا ان کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:- ہر شخص کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی حینِ حیات میں ہی اپنی جائیداد وغیرہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو تملیکاً ہبہ کر سکتا ہے، اس کی وفات کے بعد اس تملیک شدہ جائیداد میں کسی بھی وارث کا دعویٰ ارث قابلِ سماعت نہیں، صورتِ مسئولہ میں جب آپ کی والدہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد ایک بیٹے کو تملیکاً دے دی ہے اور اس پر مروجہ قانون کے مطابق تحریر اور گواہ بھی موجود ہیں تو اب ان کی وفات کے بعد دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق باقی نہیں رہا۔

لما فی الہندیۃ: رجل وہب فی صحتہ کل المال للولد جاز

---

[1] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۶ باب الاقضیۃ والشہادات الفصل الثانی)

فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (الفتاوی الہندیہ ج۴ ص۳۹۱ کتاب الہبۃ)[1]

تنازعہ تقسیم ترکہ میراث الحاج نواب خان مرحوم، پلوسی، پشاور

بیان مدعی! ہم نے اپنے حق میں ایک عدد وصیت نامہ، ہبہ نامہ منسلک کیا ہے اور اس کے ساتھ پورا بیان بھی دیا ہے، لہٰذا میں اپنے بیان میں مزید یہ شامل کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

(۱) یہ زمین خریدتے وقت میرے بھائی عالم زیب کی عمر ۹ سال تھی، زمین ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو خریدی گئی اور عالم زیب کی تاریخ پیدائش ۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۸ء ہے، لہٰذا اس سے میرا بڑا بھائی ۴، ۵ سال بڑا ہوگا، دونوں بھائی زمین خریدتے وقت بغیر کمائی کے تھے اور سکول میں پڑھتے تھے جس کا ثبوت بھی منسلک ہے۔

(۲) یہ کہ آٹھا شتین میری والدہ صاحبہ کی ہے جو کہ والد صاحب نے انہیں حق مہر میں دی تھی، لیکن اس کا ذکر پہلے والے بیان میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ یہ تنازعہ صرف اور صرف خریدی گئی زمین تک محدود ہے۔

(۳) مزید کوئی ثبوت یا گواہ میرے بیان کے بارے میں درکار ہوں تو آپ کے کہنے پر پیش کر دوں گا۔

(۴) کوئی بھی فیصلہ جرگے کے ممبران جناب سعید جان صاحب اور عبدالحمید کاکا صاحب کا دستخط شدہ ہو میں قبول کروں گا۔

میں اپنی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بہن بھائیوں اور اپنی طرف سے اقرار کرتا ہوں کہ جو کوئی فیصلہ شریعت کی رو سے ہوگا مجھے قابلِ قبول ہوگا۔ (عطاء الرحمٰن ولد حاجی نواب خان ساکن پلوسی، پشاور)

بیان مدعیٰ علیہ! ہم دونوں بھائی عالم زیب و اورنگزیب پسران حاجی

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثماً فیما صنع۔
{الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۷۹
فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ الخ}

نواب خان مرحوم ساکنان پلوسی ضلع پشاور یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے والد محترم نے ۱۹۶۷ء میں تہکال I نزد تاج آباد میں واقع ۲۲ کنال ۷½ مرلہ زمین اپنے نقد پیسوں سے خریدی تھی۔ والد محترم نے اراضی مذکورہ کا یہ حصہ مساوی انتقال کچھ اس طرح کرایا کہ ع۱ حاجی نواب خان ولد سربلند کا حصہ ۷ کنال ۹½ مرلے ع۲ عالم زیب ولد حاجی نواب خان کا حصہ ۷ کنال ۹ مرلے ع۳ اورنگزیب ولد حاجی نواب خان ۷ کنال ۹ مرلے کے باقبضہ مالکان ہیں۔

زمین کے انتقال کے وقت ہماری دو سگی بہنیں، سوتیلی والدہ اور دو سوتیلی بہنیں موجود تھیں؛ اس کے بعد ۳۱ سال والد صاحب زندہ رہے، اور اس عرصہ میں ہماری سوتیلی والدہ سے سات بھائی اور چار بہنیں پیدا ہوئے۔ (یعنی کل سات بھائی اور چھ بہنیں) بعد ازاں ہمارے والد صاحب نے کچھ اور زمین خریدی جس کا انتقال و رجسٹری وغیرہ انہوں نے اپنے نام پر کرایا ہے۔

ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو کچھ زمین دی تھی جس پر والد صاحب نے آبادی کر کے وہاں آٹا پیسنے کی مشین لگائی جو کہ ہم دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ملکیت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہمارے سوتیلے بہن بھائیوں کے حصے کے بارے میں شرعی حکم صادر فرمایا جائے۔

(نوٹ) اس سے پہلے بیان میں ہم اپنے والد صاحب کی جائیداد اور مکانات کے بارے میں تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔

اورنگزیب —— عالم زیب

فیصلہ شرعیہ

(۱) فریقِ اوّل: عالم زیب خان و اورنگ زیب خان پسران حاجی نواب خان

(۲) فریقِ ثانی، عطاء الرحمٰن مع برادران پسرانِ حاجی نواب خان۔

ع۱: فریقین کے بیان کے مطابق حاجی نواب خان مرحوم نے ۱۹۶۷ء میں تاج آباد تہکال (پشاور) میں ۲۲ کنال ۷½ مرلے زمین خریدی، اس میں سے ۷ کنال ۹½ زمین حاجی نواب خان نے اپنے نام انتقال کرالی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر عالم زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر اورنگ زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی۔

چونکہ حاجی نواب خان نے خریدکردہ زمین سے ۴ کنال ۱۸ مرلے اپنے دونوں بیٹوں کے نام انکی صغرسنی میں مالکانہ حقوق کے ساتھ انتقال کرادی ہے لہٰذا اب اس کے یہ دونوں بیٹے (اورنگزیب خان، عالم زیب خان) اس انتقال شدہ زمین کے باقاعدہ مالکان ہیں اور انتقال شدہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی ، اس لیے کہ صغرسنی میں شئے موہوبہ پر صغیر کا قبضہ ضروری نہیں ہے، باپ کے قبضہ ہی سے ہبہ تام ہوجاتا ہے ۔ اور اس کے بالمقابل عطاء الرحمٰن و برادران نے اپنے باپ حاجی نواب خان کا جو خط پیش کیا ہے شریعت کی رو سے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے ۔

(۱) لما فی الفتاوی الخیریة علی هامش العقود الدریة ج ۲ ص ۱۰۱ ۔)

(۲) اس لیے کہ اس خط کے ثبوت میں گواہان نہیں ہیں۔

(۳) یہ پیش کردہ خط وصیت نامہ ہے، اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میری جائیداد مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم ہو، اور شرعی اعتبار سے اپنے وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قال العلامة قاضی خانؒ: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع، رجل قال جعلت هذا لولدی فلان کانت هبة، رجل وهب لابنه الصغیر دارًا وهی مشغولة بمتاع الاب۔ قال ابو نصرؒ جاز ولا یحتاج الی التفریغ لانها مشغولة بمتاع القابض وهو الاب ۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۲۷۹ کتاب الهبة۔ فصل فی هبة الوالد لولده والهبة للصغیر)

(۲) قال العلامة الزیلعیؒ: وهبة الاب لطفله تتم بالعقد لانه فی قبض الاب فینوب عن قبض الصغیر لانه ولیه۔ (تبیین الحقائق ج ۵ ص ۹۵ کتاب الهبة)

(۳) لما فی الهندیة: رجل اتخذ لولده او لتلمیذه ثیابًا ثم اراد ان یدفع الی ولده الآخر او تلمیذه الآخر لیس له ذلک الا اذا بین وقت الاتخاذ انها عاریة ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۳۹۲ کتاب الهبة۔ الباب السادس فی الهبة للصغیر)

(۴) قال العلامة الزیلعیؒ: قال وانما یصح الرجوع بتراضیهما او بحکم الحاکم لأن ملک الموهوب له ثابت فی العین فلا یخرج عن ملکه الا بالرضاء او بالقضاء ۔
(تبیین الحقائق ج ۵ ص ۱۰۱ کتاب الهبة)

(۵) قال العلامة ابن نجیمؒ: وکتبنا فی القضاء من القوائد انه یعمل بدفتر البیاع والسمسار والصیاف فالخط فیه حجة۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۱۲۵)

(۶) قال العلامة قاضی خانؒ: رجل کتب صك وصیة وقال للشهود اشهدوا بما فیه ولم یقرأ وصیته علیهم قال علماؤناؒ لا یجوز للشهود ان یشهدوا بما فیه وقال بعضهم وسعهم ان یشهدوا والصحیح انه لا یسعهم ان یشهدوا۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۲ ص۳۸۲ کتاب الشهادات، فصل فی الشاهد یشهد بعد ما اخبر بزوال الحق)

(۷) قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: واما الثالث فلقوله علیه الصلوٰة والسلام، ان الله تعالیٰ أعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۸۲ کتاب الوصایا)

(۸) قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثه لقوله علیه السلام ان الله تعالیٰ أعطی کل ذی حق حقه ألا ولا وصیة لوارث۔

(الهدایة ج۴ ص۶۵۷ کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصیة الخ)

(۲) حق مہر (۳) آٹا مشین

جناب الحاج نواب خان مرحوم نے مسماۃ حسن آرا دختر اوّل خان سے عقدِ نکاح کرتے وقت حق مہر میں جو ایک عدد رہائشی مکان اور ایک آٹا مشین مسمّی کیا ہے اس کی ادائیگی نواب خان مرحوم پر لازم ہے، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا ہو تو اب اس کے جملہ ترکہ سے ادا کیا جائے گا، حقِ مہر ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ تاہم عالم زیب اور اورنگ زیب جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آٹا مشین کی زمین ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو دی ہے، اس پر آبادی اور آٹا مشین ہمارے والد صاحب نے بنائی ہے، اگر انہوں نے اس دعویٰ کا صحیح ثبوت شرکاء جرگہ کے سامنے پیش کیا ہو تو شرکاء جرگہ صرف اس زمین کی قیمت طے کریں، پھر اگر اورنگزیب و عالم زیب اس زمین کی قیمت لینے پر راضی ہوں تو نواب خان مرحوم کے کل ترکہ سے زمین کی قیمت منہا کرکے ان کے حوالہ کردیں اور آٹا مشین مع زمین حاجی نواب خان کو حق مہر میں دے دیں، اور اگر عالم زیب اور اورنگزیب زمین کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوں تو اس زمین کو خالی کردیں، کیونکہ یہ انکی

سوتیلی والدہ کا حق ہے، اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کا حق اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کے حوالے کر دے۔ لیکن جب اورنگزیب، عالم زیب کی والدہ اپنے شوہر سے پہلے فوت ہوئی ہے تو اس کی ملکیت میں چاہے آٹا مشین کی زمین ہو یا دیگر اشیاء، ان میں ۴/۱ حصہ اس کے شوہر نواب خان کو بھی میراث میں ملے گا اور باقی ۴/۳ حصے اس کی اولاد (عالم زیب وغیرہ) کو میراث میں ملیں گے، اب چونکہ شوہر بھی فوت ہو چکا ہے اس لیے اس ۴/۱ حصہ میں بھی (جو کہ بیوی کی طرف سے اس کو میراث میں ملا ہے) نواب خان کے جملہ ورثاء (عالم زیب اور اس کے سگے بہن بھائی مع سوتیلی والدہ و سوتیلے بہن بھائی) شریک ہوں گے، اور اگر مدعی معتبر شہادت سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ (منکر) کو حلف و قسم دیا جائے گا۔ البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیه۔ (مشکوٰۃ ص ۳۲۷ باب الاقضیة والشہادات)

حوالہ حسب ذیل ہے :-

لما فی الهندیة: واذا تزوجها علی هذا العبد وهو ملك الغیر او علی هذه الدار وهی ملك الغیر فالنکاح جائز والتسمیة صحیحة فبعد ذلك ینظر ان اجاز صاحب الدار وصاحب العبد ذلك فلها عین المسمیٰ وان لم یجز المستحق لا یبطل النکاح ولا التسمیة حتیٰ لا یجب مهر المثل وانما تجب قیمة المسمیٰ کذا فی المحیط۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۳۰۳ کتاب النکاح الباب السابع فی المهر)

وقال ایضاً: ولو تزوجها علیٰ شیءٍ بعینه وهلك قبل التسلیم او استحق فان کان ذلك من ذوات الامثال رجعت علی الزوج بالمثل والا فبالقیمة کذا فی المحیط۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۳۱۶ الباب السابع فی المهر الفصل التاسع)

(۴) تقسیم ترکہ میراث

صغرسنی میں عالم زیب و اورنگزیب کے نام مالکانہ طور پر انتقال شدہ زمین اور نواب خان مرحوم کی بیوی کے حق مہر کے علاوہ نواب خان مرحوم کی ملکیت میں جتنا اثاثہ ہو، منقولہ ہو یا غیر منقولہ جائیداد، سب ورثاء اس میں شریک ہوں گے اور تقسیم میراث اس طرح ہوگی کہ سارے ترکہ میراث میں ۸/۱ حصہ اس کی بیوہ کو ملے گا اور باقی سات حصے نواب خان مرحوم کی دونوں بیویوں کی تمام اولاد میں بایں طور تقسیم ہوگی کہ ہر ایک بھائی کو دو دو حصے اور ہر ایک بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

ارشاد ربانی ہے، يُوْصِيكُمُ اللّٰهُ فِىْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔
(سورۃ النساء آیت مـ۱۲)

وفی الهندية: واذا اختلط البنون والبنات عصب البنون والبنات فيكون للابن مثل حظ الانثيين۔ (الفتاوی الہندیہ ص۴۴۸ ج۶ کتاب الفرائض، الباب الثانی)

فیصلہ شرعی مابین سید یوسف شاہ وسلطان شاہ پسران حیات شاہ

فریق اول: سید یوسف شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
فریق ثانی: سید سلطان شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
نمائندہ فریق اول: گل علی شاہ ولد سید یوسف شاہ
نمائندہ فریق ثانی: سید فرمان شاہ ولد سید سلطان شاہ

مندرجہ بالا فریقین کا بیان ان کے نمائندوں کے واسطے سے سنا گیا، دونوں نمائندوں کے بیانات سے چند امور سامنے آئے :-

(۱) فریقین کے بیانات سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ حیات شاہ کی بیٹیوں کو اس کی جائیداد سے محروم رکھا گیا ہے، جائیداد کی تقسیم صرف اسکے بیٹوں تک محدود رکھی گئی، والد کے اپنے تصرفات یا بعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے بیٹیوں کا کوئی تذکرہ فریقین نہیں کرتے بلکہ اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

(۲) فریق اول سید یوسف شاہ اس کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے حین حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی اس میں دیگر حصص کے علاوہ خسرہ مـ۹۰۲ جو کہ "ارتل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا رقبہ اسّی کنال آٹھ مرلہ ہے، یہ سید یوسف شاہ کو دی گئی ہے جو کہ ۱۹۶۶ء/۱۹۶۷ء کی بندوبست اراضی میں بحال رکھی گئی ہے۔ فریق مذکورہ کے بیان کی رُو سے سلطان شاہ نے یہ زمین اپنے نام منتقل کرالی ہے جس کے خلاف یوسف شاہ نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران شاد علی خان نے دونوں میں مصالحت کرادی۔

(۳) فریق اول مصالحت میں ایک ہزار روپے نقد دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو کہ فریق ثانی نے برضا ورغبت وصول کیے ہیں اور بطور سند تحریری سٹامپ پیش کرتے ہیں۔

(۴) فریق ثانی سلطان شاہ کا بیان ہے کہ حیات شاہ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے

درمیان تقسیم کی تھی، تاہم اس میں اچھی اور کمزور زمین کی رعایت کرتے ہوئے ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی۔ فریق اول سید یوسف شاہ نے سازباز کر کے خسرہ ع۸۰ کا بوگس طریقے سے اپنے نام انتقال کرایا ہے جو کہ عدالت نے میری درخواست پر میرے حق میں بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریق ثانی کا دفاعی بیان ہے کہ سلطان شاہ نے سید یوسف شاہ کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ سلطان شاہ نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور جس جائیداد سے سلطان شاہ نے مصالحت کی ہے یہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد ہے، یہی وجہ ہے کہ سلطان شاہ نے ایک ہزار روپے فریق اوّل کو واپس کر کے مصالحت کالعدم کر دی ہے۔

نتیجہ بیانات

ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین کسی نہ کسی طریقے سے بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں جو کہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر والد نے دیدہ دانستہ طور پر اپنی جائیداد بیٹوں کے نام منتقل کر کے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ایک ناجائز اور حرام حرکت ہے، اگرچہ قضاءً یہ اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عنداللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ورثاء مورث کے فراغتِ ذمہ کے لیے ہر صاحبِ حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے انسان کا عذابِ الٰہی میں گرفتار رہنا یقینی امر ہے۔ تاہم والد کے تصرفات قضاءً نافذ رہیں گے۔ (الفتاویٰ الہندیہ ج ۴ ص ۱۲۹)

اصل دعویٰ کے بارے میں شرعی فیصلہ

جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں اس کا محض انتقال و رجسٹری ہونا شرعاً نہ کسی کے ملکیت کی دلیل ہے اور نہ اس پر حقِ ملکیت موقوف ہے، اس لیے حیات شاہ کے اپنی جائیداد میں مالکانہ تصرفات کے نفاذ کے لیے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں بلکہ جو باقاعدہ گواہان سے ثابت ہو جائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک بعد ازاں یوسف شاہ اور سلطان شاہ میں متنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت بھی ہوئی ہے تو اس کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہان کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر سلطان شاہ کی رضا و رغبت سے

مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ تسلیم کر لینے کے بعد خود سلطان شاہ اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس مصالحت کے نفاذ کے لیے یہ ضروری ہے کہ سلطان شاہ جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہے یہ اس کی اپنی ملکیت میں ہو، ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر اس جائیداد پر سلطان شاہ کی ملکیت باقی نہیں رہتی، اس لیے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا سلطان شاہ کی ملکیت میں ہونے کے ثبوت کے لیے باقاعدہ گواہان کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریقِ اوّل سلطان شاہ کی ملکیت پر گواہ قائم کرے تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر ان کے مطالبہ پر فریقِ ثانی پر ملکیت سے انکار کرنے اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریقِ ثانی قسم کھائے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔

اس لیے متعلقہ حاکم فریقین سے گواہان کا مطالبہ کرے یا ان کی قسم پر فیصلہ کرے۔

مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے قسم کس پر ہے؟

سوال:۔ خالد نے واجد پر دعویٰ کیا ہے کہ تم نے مجھ سے گیارہ ہزار روپے قرض لیے ہیں جبکہ واجد اس کا انکار کرتا ہے اور مدعی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اب قسم مدعی کو دی جائے گی یا مدعیٰ علیہ کو؟

الجواب:۔ قسم شرعاً مدعیٰ علیہ کے ذمے ہوتی ہے اور مدعی کے اختیار میں دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنا لازم ہوتا ہے، صورتِ مسئولہ میں اس تنازع کے حل کے لیے مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے بشرطیکہ مدعی اس کا طالب بھی ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ وفی روایة والیمین علی المدعی علیه۔ (جامع الترمذی ص۱۶۰ ابواب الاحکام۔ باب ما جاء فی ان البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه)[1]

---

[1] عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواهم ادعی ناس دماء رجال واموالهم ولکن الیمین علی المدعی علیه۔ (سنن ابن ماجہ ص۱۶۸ ابواب الاحکام۔ باب البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه)

ومثلهٗ فی صحیح المسلم ج۲ ص۷۴ کتاب الاقضیة، باب الیمین علی المدعی علیه

زمین کے تنازعہ پر فریقین میں شرعی فیصلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زمین کا ایک ٹکڑا دو فریقوں کے مابین متنازعہ ہے۔

فریقِ اوّل امیر حمزہ وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ متنازعہ زمین ہماری ہے، جبکہ فریقِ ثانی دلبر و دین محمد وغیرہ نے فریقِ اول کے دعویٰ کے ردّ میں یہ کہا ہے کہ یہ زمین تمہارے باپ نے ہمارے باپ کو اس مشترکہ مال کے حق کے بدلے میں جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا، دیدی ہے یعنی ہمارے والد پر بیچدی ہے۔

لہٰذا آپ حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ فریقین کے درمیان قرآن وسنت کی روشنی میں اس تنازعہ کا فیصلہ فرمایا جائے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں فریقِ اول امیر حمزہ وغیرہ مدعی ہے اور فریقِ ثانی دلبر و دین محمد مدعیٰ علیہ ہے، فریقِ ثانی نے فریقِ اوّل کے دعویٰ کے رَدّ میں یہ کہا ہے کہ زمین کا یہ متنازعہ ٹکڑا تمہارے مورث (والد) نے ہمارے والد کے حق کے بدلے میں (یعنی ہمارے والد کے اُس مال کے بدلے جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا اور جسے تمہارے مورث (والد) نے خرچ کرلیا تھا) دیدیا ہے (یعنی بیچدیا ہے)۔ تو اب شرعی ضابطہ کے مطابق فیصلہ کی صُورت یہ ہوگی کہ دافع اپنے دفع کو معتبر شہادت سے ثابت کرے گا، اثباتِ دفع کی صورت میں فیصلہ مدعیٰ علیہ کے حق میں کیا جائے گا، بصورتِ دیگر مدعی (فریقِ اوّل) کو حلف علی العلم دیا جاوے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فی رجل ادعی علیٰ اٰخر عقارا انهٗ تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعیٰ علیه باقی اشتریتهٗ من ابیک حال حیاته بکذا وکذا من القروش وانه فی حوزی وتصرفی مدة تزید علیٰ خمسین سنة مع حضورك وعلمك وسکوتك بلا عذر شرعی هل یکون جواب المدعیٰ علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج إلیٰ بینة تشهد لهٗ بالشراء ولا ینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولا تکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة، فاجبت نعم جواب المدعیٰ علیه من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرار لهٗ بالملك ثم دعواه الانتقال الیه منه تحتاج الی بینة لان کل مدع یحتاج الی البینة ولا ینفعه وضع الید المدة المذکورة مع الاقرار

المذكور وليس هذا من باب ترك الدعوى بل من باب المواخذة بالاقرار ومن اقر بشیٔ لغيره اخذ باقراره ولو كان فی يده احقابًا كثيرًا لا تعد الخ

(الفتاوى الكاملية ص۱۲۳ كتاب الدعوى)

وفی مجلة الاحكام : اذا ثبت من ادعى دفع الدعوى دفعه تندفع دعوى المدعى ولا يحلف المدعى الاصلی بطلب صاحب الدفع۔ فان نكل المدعى عن اليمين يثبت دفع المدعى عليه وان حلف تعود دعواه الاصلية۔

(المجلة الاحكام العدلية المادة ۱۶۳۲ كتاب الدعوى الفصل الثانی فی دفع الدعوى)

قال العلامة خالد اتاسی رح : وان كان فعل غيره۔ كما اذا كان بقوله اودعنيه الغائب او آجرنيه الى قوله يحلفه على العلم ای على انه لا يعلم ان المدعى به وديعة او رهن او مستاجر ـــ وهو هذا الثانی هو المعنی يقول صاحب رد المحتار ويحلفه على العلم لانه على فعل الغير۔ (شرح المجلة ج ۵ ص۴۵ كتاب الدعوى الفصل الثانی فی دفع الدعوى)

قال العلامة علی حيدر رح : واذا حلف المدعى تعود دعواه الاصلية وفی هذه الحال يكون فی اصل الدعوى احتمالان۔ الاحتمال الاول : ان تثبت دعوى المدعى نظرًا لكون دفع المدعى عليه يتضمن الاقرار وفی هذا الحال يحكم باصل الدعوى كما هو فی المثال المذكور آنفًا حيث ان دفع المدعى عليه بقوله اننی اديت المبلغ المدعى به هو اقرار بالمبلغ المذكور فاذا لم يثبت المدعى عليه الاداء وحلف المدعى اليمين على عدم الاداء يحكم على المدعى عليه باداء المبلغ المدعى به للمدعى۔

(درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۴ ص۲۲۴ كتاب الدعوى الفصل الثانی)

درر الحکام کی عبارت مسطورہ سے معلوم ہوا کہ مُدعی فریق کے حلف اٹھانے کی صورت میں جبکہ مُدعیٰ علیہ اپنے دفع کے اثبات سے عاجز آجائے تو جیت مُدعی فریق کی ہوگی یعنی اس صورت میں فیصلہ اس کے حق میں کیا جاوے گا۔

مدعی مدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد گواہ پیش کرے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک متنازعہ زمین تھی، مدعی گواہوں کو کسی وجہ سے حاضر نہ کر سکا تو مدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد فیصلہ کیا گیا، بعد ازاں مدعی کو گواہ مل گئے، تو کیا مدعی اب گواہ پیش کر سکتا ہے یا نہیں اور ان کی شہادت قبول ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نزاع کے حل کے لیے گواہ اصل اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اگر مدعی کسی وجہ سے مقدمہ میں گواہ پیش نہ کر سکے اور قاضی مدعیٰ علیہ کو قسم دے کر فیصلہ کر جائے اور بعد ازاں مدعی کو گواہ مل جائیں اور وہ ان کو پیش کرنا چاہے تو کر سکتا ہے شرعاً ان کی گواہی قبول ہوگی اور گذشتہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (سوال) هل تقبل البیّنةُ لو اقامها المدّعی بعد یمین المدعیٰ علیه؟

(الجواب) تسمع البیّنة وتقبل علی ما هو الصواب کما صرح به فی شرح الملتقیٰ والتنویر وغیرهما من الدعویٰ۔

قال فی التنویر: وتقبل البیّنةُ لو اقامها المدعی بعد یمین المدعیٰ علیه عند العامة وهو الصحیح۔ (العقود الدرّیة فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج۲ ص۲۱/۲۲ کتاب الدعویٰ) [1]

مدعیٰ علیہ کے تصرفات پر اظہارِ رضامندی کے بعد دعویٰ کرنا

سوال:- ایک آدمی کا مسجد سے متصل ایک

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وتقبل البیّنة لو اقامها المدعی وان قال قبل الیمین لا بیّنة لی بعد یمین المدعیٰ علیه کما تقبل البیّنة بعد القضاء بالنکول عند العامة وهو الصحیح...... ولان الیمین کالخلف عن البیّنة فاذا جاء الاصل انتهیٰ حکم الخلف کانه لم یوجد اصلاً۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۴ ص۴۲۴ کتاب الدعویٰ)

ومثله فی البحر الرائق ج۷ ص۲۰۶ کتاب الدعویٰ۔

کمرہ ہے، اہلِ محلہ نے اس سے کہا کہ یہ کمرہ ہم کو دے دو ہم آپ کو اس کی قیمت دے دیں گے اور اس کمرے کو مسجد میں شامل کر دیں گے اس میں لوگ نمازیں پڑھیں گے، اس پر کمرے کے مالک نے کہا کہ میں روپے نہیں لیتا بلکہ اس کمرے کو مسجد کے لیے بنام خدا وقف کرتا ہوں، اس پر اہلِ محلہ نے اس کمرے کو مسجد میں شامل کر لیا، تقریباً دو سال تک محلہ کے لوگوں نے، خود اس کمرے کے مالک اور اس کے دوسرے بھائیوں نے اس میں نمازیں ادا کیں، مسجد میں باقاعدہ امام بھی مقرر کیا گیا، اب دو سال کے بعد کمرے کے مالک کے دوسرے بھائی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کمرہ جو مسجد میں شامل کیا گیا ہے میرا ہے اور اپنے بھائی سے بھی اور اہلِ محلہ سے بھی جھگڑتا ہے اور لوگوں کو مسجد میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتا، حالانکہ اس آدمی نے خود بھی تقریباً دو سال تک اس مسجد میں نمازیں پڑھی ہیں اور اپنے بھائی کے فیصلے پر راضی تھا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض بھی نہیں کیا۔ تو اب اس آدمی کا دو سال کے بعد مقدمہ چلانا کیسا ہے؟ کیا شرعاً اس کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب اہلِ محلہ نے کمرے کو مسجد میں شامل کر لیا اور مالک نے اس کو بنام خدا مسجد کے لیے وقف کر دیا جس پر اس کے سب بھائی بھی راضی تھے اور دو سال تک کسی نے کوئی اعتراض نہیں بھی نہیں کیا تو اس رضامندگی کی وجہ سے ان کا حقِ دعویٰ ختم ہو گیا ہے اسلئے اب اگر ان میں سے کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فیمن باع عقاراً وسلمه للمشتری وتصرف فیه زماناً وجاره او غیره حاضر یریٰ البیع والتسلیم والتصرف وهو ساکتٌ بلا مانع ثم یقوم ویدعی انه کله او بعضه هل لاتسمع دعواه هذه؟ ـــــ فالجواب: لاتسمع لما تقرر ان من یریٰ غیره یبیع ارضاً او داراً فتصرف فیه المشتری زماناً والرائی ساکتٌ تسقط دعواه۔ (الفتاوی الکاملیة ص۱۱۴ کتاب الدعوٰی۔ مطلب لاتسمع دعوٰی من رأی البیع والتصرف)[1]

---

[1] قال العلامة خیر الدین الرملیؒ: (سئل) فیما لو باع شیئاً وبعض اقاربه یطلع علی بیعه وقبضه وتصرف المشتری فیه زماناً ثم ادعی فیه ملکاً هل تسمع دعواه ام لا ـــــ (اجاب) قال کثیرٌ من علمائنا اذا باع شخص عقاراً او حیواناً او ثوباً او نحو ذلك وقبضه المشتری وتصرف فیه تصرف الملاك وبعض اقاربه مطلع علیٰ ذلك ثم ادعاه او ادعی بعضه انه ملکه لاتسمع دعواه لان ذلك اقرارٌ منه بانه ملك البائع قطعاً للاطماع الفاسدة وسدّ الباب التزویر والتلبیس الخ۔ (الفتاوی الخیریة علیٰ هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۲ کتاب الدعوٰی ومطالبه۔ مطلب باع شیئاً الخ) ومثله فی فتاوی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵ کتاب الدعویٰ۔ باع داراً او قریبه حاضر تترك الدار .... الخ

کاغذی ثبوت پیش کرنے کے بعد مدعیٰ علیہ کا انکار کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فریقین (فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ اور فریقِ ثانی اجمل خان وغیرہ) نے تحریری طور پر لکھ کر دیا کہ ہم متفقہ طور پر شرعی فیصلہ کروائیں گے، پھر ایک دینی مدرسہ میں آکر علماء کو یہ تحریر کرکے دے دیا کہ فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ چھ ماہ تک اپنے حق کے ثبوت میں کاغذات پیش کرے گا اور اگر کاغذی طور پر اپنا حق ثابت نہ کرسکا تو اپنا قبضہ چھوڑ دے گا۔ فریقِ ثانی (اجمل خان وغیرہ) نے بھی اس بات پر رضامندی کا اظہار کردیا کہ ٹھیک ہے اگر اس (فریقِ اوّل) نے ثبوت پیش کردیا تو ہم اس کو یہ حق چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد فریقِ اوّل (محمد خان وغیرہ) نے چھ ماہ تک کاغذی طور پر اپنا حقِ ثبوت پیش کیا تو اس کے مخالف فریق اجمل خان وغیرہ نے کہا کہ اب ہم بھی اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا اور اپنے تحریری وعدہ سے منحرف ہوگیا، اب آنجناب شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ اس شخص کا حکم یہ ہے کہ حاکم اس کو مقدمہ چلانے پر مجبور کرے گا، پھر دیکھا جائے گا کہ فیصلہ کس فریق کے حق میں کیا جاتا ہے۔

قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللہ: اذا اصر المدعیٰ علیہ علی سکوتہ الخ فیحبس حتی یقر او ینکر۔ (شرح المجلۃ تحت المادۃ ۱۸۲۲ ج ۶ ص ۱۱۹ باب فی بیان احکام کتاب القاضی) [1]

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: واذا قال المدعیٰ علیہ لا اقر ولا انکر لا یستحلف بل یحبس لیقر او ینکر الخ۔ (الدر المختار ج۴ ص۴۲۷ کتاب الدعوٰی)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۰۳ کتاب الدعوٰی۔

مدعی بہ کے سامنے ہونے کی صورت میں اشارہ ہی کافی ہے

سوال :- امارت اسلامی افغانستان کے صوبہ خوست میں ایک متنازعہ زمین پر دو فریقین کے مابین دعوٰی ہے۔ فریق اول (مدعی) محمد قاسم ہے اور فریق ثانی (مدعٰی علیہ) محمد قیوم ہے، اس دعوٰی کے تصفیہ کے لیے دونوں نے مشترکہ طور پر دو محکمین مقرر کرلیے، ایک محکم مولانا نورالحق صاحب اور دوسرے محکم مولانا سید گلزار صاحب ہیں۔ مدعی اور مدعٰی علیہ دونوں نے محکمین علماء کو متنازعہ زمین پر لے جاکر اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرکے دکھائی اور محکمین حضرات نے خود مشاہدہ کرکے دیکھ لی۔ اس کے بعد موقع پر ہی مدعی محمد قاسم نے اپنا دعوٰی لکھا اور اسی جگہ پر محکمین حضرات کو دے دیا تاکہ وہ اس کو پڑھ کر کوئی فیصلہ کرسکیں۔ تحریری دعوٰی دیکھ کر محکمین میں سے مولانا سید گلزار صاحب نے کہا کہ یہ دعوٰی قابلِ سماعت ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں زمین مدعی بہا کا حدود اربعہ نہیں لکھا گیا، حدود اربعہ کا لکھنا ضروری ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ:

معلومة المدعی به ان کان عقاراً تعیین بیان حدوده۔ (شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۱۴)

اس پر دوسرے محکم مولانا نورالحق صاحب نے کہا کہ صورتِ دعوٰی درست ہے، اس لیے کہ اس متنازعہ زمین پر ہم کھڑے اور حاضر ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لہٰذا حدود لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، دلیل اس کی یہ ہے: والتعریف بالاشارة یکون صحیحاً فی کل نوع من المدعی به الموجود منقولاً او کان عقاراً والوصف والتعریف یکون فی المدعی به الغائب وغیر الموجود۔ (درر الحکام ج۴ ص۱۶۱)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) اگر کسی متنازعہ زمین کو قاضی یا محکم خود حاضر ہوکر مشاہدہ کرلے تو پھر حدود لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) اوپر دی گئی صورت میں کون سا محکم فقہ حنفی کے موافق ہے؟ اور جو صورتِ دعوٰی اوپر دی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- کوئی متنازعہ چیز جب مجلسِ قضاء میں برائے تصفیہ حاضر ہو تو اس کے تعین کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے، اس کے دیگر صفات اور حدود اربعہ وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف اشارہ کردینے سے مدعٰی بہ کا تعین ہوجاتا ہے، تاہم اگر متنازعہ چیز مجلسِ قضاء میں حاضر نہ ہو تو محکمین یا عدالت میں قاضی یا جج کے سامنے اس چیز کی تعریف بالاوصاف اور حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہوگا تاکہ نزاع ختم کرنے کے لیے

مدعیٰ بہ سب پر واضح ہوجائے ۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ تحکیمین مدعی بہ زمین کے پاس کھڑے ہیں اور اشارہ کے ساتھ اس کی تعیین ممکن ہے، اس کے بعد کوئی جہالت وغیرہ باقی نہیں رہتی، اس لیے حَکم مولانا نورالحق صاحب کی بات درست ہے ۔

لما فی شرح المجلة: معلومیة المدعی به تکون بالاشارة او بالوصف والتعریف هو اذا کان عیناً منقولاً وکان حاضراً فی مجلس المحاکمة فالاشارة کافیةٌ ۔ (المادة ۱۶۲۰ ۔ درر الحکام ج۴ ص۱۸۵ کتاب الدعوی)

وفیه ایضاً: کذلك لایشترط بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشهرته ۔ (المادة ۱۶۲۳ ۔ درر الحکام ج۴ ص۱۹۶ کتاب الدعوی)

وفیه المسألة الثانیة لایشترط عند الامامین بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشهرته لان الشهرة مغنیة عن التحدید وقد حصل المقصود بلا تحدید ۔ (درر الحکام ج۴ ص۱۹۹ کتاب الدعوی)

مقدار مدعیٰ بہ میں غلطی ہوجانا

سوال: جناب مفتی صاحب! زمین کے ایک تنازعہ میں فریقین نے بندہ کو حَکم بنایا ہے، اب مدعی نے جس زمین پر دعویٰ کیا ہے اس میں اس نے حدودِ اربعہ تو صحیح بیان کیا ہے مگر مقدارِ زمین کے بیان میں غلطی کر گیا ہے اس زمین کی اصل مقدار ۲۰ کنال ہے جبکہ مدعی نے ۱۶ کنال کا ذکر کیا ہے ۔ مدعیٰ علیہ کے وکیل ایک مولوی صاحب ہیں، ان کا کہنا ہے کہ متنازعہ زمین کی مقدار ۲۰ کنال ہے اور مدعی نے ۱۶ کنال ذکر کی ہے اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے ۔ تو کیا واقعی یہ دعویٰ صحیح نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

الجواب: شرعاً دعویٰ کی صحت کے لیے مدعی کا مدعیٰ بہٖ کا صحیح اور درست حدودِ اربعہ بیان کرنا ضروری ہے، اگر مدعی سے مقدارِ رقبہ بتلانے میں غلطی ہوجائے تو اس سے دعویٰ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دعویٰ درست ہوگا ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور مدعیٰ علیہ کے وکیل کا دعویٰ کو رد کرنا صحیح نہیں ۔

لما فی مجلة الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطأ فی بیان مقدار ذراع العقار او دونه لا یمنع صحة دعواه ۔

(مجلة الاحکام المادة ۱۶۲۴)

فیصلہ شرعی بین الفریقین

فریق اوّل : فاروق شاہ ولد احمد شاہ
فریق ثانی : عرب خان ولد شیر علی خان
ساکنان پانٹی متنی

فقہاء اسلام کے تعریف مدعی اور مدعی علیہ : المدعی من یلتمس خلاف الظاهر و المدعی علیه من یلتمس بظاهر (شرح المجلة لخالد اتاسی ۔ ۵/۵)

وفی الهدایة المدعی من یتمسك بغیر الظاهر والمدعی علیه من یتمسك بظاهر الی أخره (۳/۳۰۰)

وقال محمد المدعی علیه هو المنکر (الهدایة ۳/۳۰۰)

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تنازع میں دونوں فریقین مدعیان ہیں۔ لہذا ہم اولاد دونوں کے دعاوی کا جائزہ لیں گے کہ کونسا دعویٰ اصول شرع کے موافق اور براہین کے ساتھ اپنے مقصد کو ثابت کرتا ہے۔

فاروق شاہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نعیم شاہ نے اپنے جملہ جائیداد کو میرے والد احمد شاہ ولد ابنالی اپنے بھائی کے نام کئی سال پہلے کر دیا تھا اور اس کا سٹام میرے پاس موجود ہے۔

جائزہ یہ دعویٰ کئی وجوہات کی بنا پر اپنے مقصد کو ثابت کرنے میں ناقص ہے۔

(۱) جس اسٹام کا حوالہ مدعی دعویٰ میں دے چکا ہے اور بیان کے ساتھ وہ اسٹام منسلک ہے اس میں گواہ درج نہیں، جب کہ صرف اسٹام اثبات دعویٰ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا فیصلہ ہے کہ صرف تحریر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

کما قال ابن عابدین : لا یعتمد علی الخط ولا یعمل بمکتوب الوقف الذی علیه خطوط القضاة الماضین ۔ (رد المختار ۔ ۵/۴۳۵) وہ اس لیے کہ الخط یشبه الخط کی وجہ سے تحریر خبر واحد کے حکم میں ہو کر ناقابل احتجاج ہے۔

۲۔ مدعی فاروق شاہ اپنے دعویٰ ارث کے اثبات کے لیے گواہان بھی پیش نہ کر سکا جب کہ مدعی کے ذمہ قانون شرعی کے مطابق اثبات دعویٰ کے لیے گواہان کا پیش کرنا لازمی ہے۔ لقوله علیه السلام : البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (الحدیث)

(۳) اگر نعیم شاہ نے اپنا جملہ جائداد اپنے بھائی احمد شاہ کو ہبہ بھی کیا ہو لیکن انہوں نے بھائی کو موہوبہ اراضی قبضے میں نہیں دیا تھا جب کہ ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ شرعی کا ہونا ضروری ہے

بدون اس کے ہبہ صحیح نہیں ہوتا۔ چوں کہ مدعی بھی قبضہ نہ دینے کا مُقر ہے لہٰذا ہبہ تام نہ ہوا۔ اس لیے مدعا علیہ کو حلف دینے کی حاجت نہ رہی۔

کما قال ابراھیم حلبی: الھبۃ ھی تملیک عین بلا عوض وتصح بایجاب وقبول وتتم بالقبض الکامل۔ فان قبض فی المجلس بلا اذن صح وبعدہ لابد من الاذن۔ (ملتقی الابحر علی صدر مجمع الانھر ۳/۴۸۹ تا ۴۹۲ کتاب الھبۃ)

قال المرغینانی: الھبۃ عقد مشروع وتصح بالایجاب والقبول والقبض۔ اما الایجاب والقبول فلأنہ عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول۔ والقبض لابد منہ لثبوت الملک...... ولنا قولہ علیہ السلام: لا یجوز الھبۃ الا مقبوضۃ..... فان قبضہ الموھوب لہ فی المجلس بغیر اذن الواھب جاز استحساناً وان قبض بعد الافتراق لم یجز۔ (الھدایۃ ۳/ ۲۸۱ کتاب الھبۃ)

وفی مجلۃ الاحکام: تنعقد الھبۃ بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔ قال سلیم رستم باز تحتہا: الکامل لانہا من التبرعات والتبرع لا یتم الا بالقبض۔

(شرح المجلۃ۔ ۴۶۲)

۴۔ مکتوب (اسٹام) میں ذکر ہے کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ ولد انبالی کا اکیلا وارث ہے۔ جب کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ سے قبل فوت ہو چکا ہے اور وراثت کا تعلق موت کے بعد سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب احمد شاہ نعیم شاہ کا خود وارث نہ بن سکا تو اس کی اولاد بدرجہ اولیٰ وارث نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ نعیم شاہ کا بھائی شیر علی ولد انبالی زندہ ہے۔ لہٰذا نعیم شاہ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد شیر علی کے نام ہوگی۔

دعویٰ عرب خان ولد شیر علی: موصوف کا دعویٰ ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنے ہوش و حواس کی سالمیت کے ہوتے ہوئے ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو بارہ دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی کے قیمتاً میرے ہاتھ فروخت کی ہے اور میرے پاس گواہ اسٹام پیپر سرکاری انتقالات کی فوٹو کاپیاں اور نعیم شاہ کی اپنی آواز کی کیسٹ موجود ہے۔

جائزہ۔ قانون شرعی کے مطابق کسی تنازع کے حل کے لیے اصول یہ ہے کہ مدعی خلاف ظاہر کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرے گا اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہو تو پھر مدعی کے مطالبہ پر مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔ لما قال علیہ الصلاۃ والسلام: البینۃ علی المدعی

والیمین علی من انکر (الحدیث)

اس لیے عرب شاہ ولد شیر علی کے ذمہ اثبات دعویٰ کے لیے گواہ پیش کرنا ہے جو کہ انہوں نے پیش کیے۔

(۱) چمن خان (۲) عبدالرحمن۔ پسران قدرت اللہ ساکنان پائی۔

نے کلمہ پڑھ کر گواہی دی کہ نعیم شاہ (مرحوم) نے ۵ مرلے مارکیٹ اور تین کنال اراضی مسمی عرب خان ولد شیر علی کے ہاتھ فروخت کی ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

ان دونوں گواہوں کے علاوہ واحد شاہ، راحت شاہ اور گل نبی نے بھی گواہی دی۔ کہ نعیم شاہ نے اپنی مارکیٹ اور تین کنال اراضی کا عرب خان کو مالک بنایا ہے۔ اور نعیم شاہ نے ہمیں گواہ بنایا تھا۔ ہم بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ نعیم شاہ اپنی زندگی میں اس مذکورہ جائیداد کا مالک عرب خان کو ٹھہرایا ہے۔ اس کے ساتھ اقرار نامہ نمبر ۱۶۷۲۶ تحریر کردہ ۳/۴/۹۸۔ گواہان کے اصنائات کے ساتھ پیش کیا جس میں تحریر ہے۔ من مسمی نعیم شاہ ولد انبالی خان عمر ۷۵ سال ۔۔۔ بذریعہ تحریر ہذا مقر ہوں کہ میری ذاتی ملکیتی مارکیٹ واقع چوک پائی ۵ مرلہ جس میں ۱۲ دکان بعوض ۲۵۰۰۰ ہزار روپے فی دکان جن کی کل قیمت تین لاکھ ہوتی ہے اور علاوہ ازیں ایک کھیت تعدادی تین کنال آبی و فصلی بعوض ڈھائی ہزار فی مرلہ جس کی کل قیمت ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے اور ۳۰ منٹ پانی از ٹیوب ویل نمبر ۱۱ پانی برائے سرابی اراضی جس کی قیمت مبلغ ۷۰۰۰ ہزار روپے ہوتی ہے بطریقہ قطعی فروخت کرتا ہوں یہ کل رقم ۵۷۰۰۰ ۴ لاکھ نقد بوقت سپردگی مارکیٹ و کھیت و پانی وصول کر چکا ہوں مندرجہ بالا مملوکا جائیداد بدست مسمی عرب خان ولد شیر علی سکنہ پائی فروخت کر دی ہے۔ تحریر ہذا من مقر نے بہ عقل سلیم اپنی مرضی سے حوالہ کرتا ہوں یہ ملکیت بلاشرکت غیرے میری ذاتی ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرے تو میں ہر قسم سے اس کا ذمہ دار ہوں گا۔

العبد نعیم شاہ ولد انبالی۔ راقم الحروف ملک سردار احمد نمبردار۔ گواہ مسلم علی، امیر زیب ولد ظہور علی، چمن خان ولد قدرت اللہ، عبدالرحمن ولد قدرت اللہ۔

اس کے علاوہ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں بھی پیش کیے۔

اور اس کے ساتھ وہ کیسٹ بھی پیش کی جس میں نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنی مارکیٹ، تین کنال اراضی مع پانی نمبر عرب خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا اقرار کیا ہے اور کئی لوگوں کو مخاطب کر کے گواہ بنایا ہے۔

قانون شرعی یہ ہے کہ جب کوئی مدعی اپنا دعویٰ پر بینہ پیش کرتے تو شرعاً قاضی پر لازم ہے کہ اس کے حق میں فیصلہ کرے کما فی مجلۃ الاحکام۔ (المادۃ ۱۸۱۸) ان أثبت المدعی دعواہ بالبینۃ حکم القاضی لہ بذلک۔ قال علی حیدر تحت ہذہ المادۃ ان اثبت المدعی دعواہ بالبینۃ ای: اذا شہد شہود وجرت تزکیتہم سراً وعلانیۃ فظہر انہم عدول ومقبولۃ الشہادۃ حکم القاضی بذلک۔ (درر الحکام ۴/ ۶۴۵)

ہذا گواہان کی گواہی اور بطور تائید اسٹام میں تحریر شدہ اقرار نامہ جس پر گواہوں کے دستخط موجود ہے۔ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ فوٹو کاپیاں اور ٹیپ شدہ بیان سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی سکنہ پانئی نے بقائمے ہوش وحواس اپنی ذاتی ملکیت ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو ۱۲ عدد دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی نمبر کے عرب خان ولد شیر علی سکنہ پانئی کے ہاتھوں فروخت کی ہے اور اس کو اپنی حیات ہی میں قبضہ دیا ہے جو آج تک عرب خان کے قبضہ میں ہے۔ شریعت مقدسہ میں جب دو فریق کے باہمی رضامندی سے ایک بار ایجاب قبول ہو کر عقد بیع ہو جائے تو پھر کسی کو بھی شرعاً اس عقد کے فسخ کا اختیار نہیں ہے۔

کما فی الہدایۃ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منہما الخ (۳/ ۲۵)

وفی الملتقی الابحر واذا وجد الایجاب والقبول لزم البیع بلا خیار (بحوالہ مجمع الانہر ۲/ ۱۰)

وہکذا فی الہندیۃ (۳/ ۸) وکذا فی فتح القدیر (۵/ ۴۶۴)

اس لیے جملہ مدعی بہ (تین کنال اراضی مع پانی نمبر اور پندرہ مرلہ مارکیٹ) عرب خان ولد شیر علی کی زرخریدا ملکیت ہے۔ کسی کا اس پر دعویٰ ارث وغیرہ کرنا شرعاً صحیح نہیں۔

فیصلہ شرعی

فریق اول: فاروق شاہ بن احمد شاہ مدعی۔
فریق ثانی: شیر علی، نعیم شاہ، وغیرہ پسران انبالی۔

فریق اول: فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ہے کہ انبالی (جو شیر علی، نعیم شاہ وغیرہ کا باپ ہے) اور اس کے بھائی میر علی نے آج سے تقریباً ۵۰، ۶۰ سال قبل میرے والد احمد شاہ ولد انبالی کی زوجہ اول امرو بی بی (مرحومہ) جو ۵۰، ۶۰ سال قبل فوت ہو چکی ہے کے جائیداد کو باہمی تقسیم کیا ہے، جب کہ اس جائیداد کا حقدار میرا والد صاحب ہے اس لیے وہ مجھے واپس دیا جائے۔ جبکہ

مدعا علیہان مدعی کے اس دعوی ارث کے منکر ہیں۔

جائزہ: قانون شرعی کے اندر ارث، وقف وغیرہ کے دعوی کے سماع کے لیے ضروری ہے کہ ۳۶ سال کے اندر اندر کیا جائے اگر بلا ضرورت شرعی ۳۶ سال تک تاخیر کیا جائے تو شرعاً وہ دعوی قابل سماعت نہیں۔ اتنی مدت کی تاخیر سے سمجھا جائے گا کہ مدعی بہ مدعی کا حق نہیں ورنہ وہ اتنی تاخیر نہ کرتا۔

كما قال ابن عابدين: عن المبسوط اذا ترك الدعوى ثلاثا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوى ثم ادعى لا تسمع دعواه لان ترك الدعوى مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهرا وفي الجامع الفتوى لا تسمع الدعوى بعد سته وثلاثين سنة الا ان يكون المدعى غائبا او صبيا او مجنونا وليس لهما ولي او المدعى عليه اميرا جائرا الى اخره (رد المحتار ۶/۲۲۲)

وقال العلامة سليم رستم باز: اذا مضى على الدعوى ثلاثون سنة بلا عذر فلا تسمع وان امر السلطان بسماعها۔ (شرح المجلة ۹۸۳)

وقال علي حيدر: لذلك فالدعوى التي تترك سنه وثلاثين سنة بلا عذر لا تسمع مطلقاً حيث ان ترك الدعوى تلك المدة مع الاقتدار عليها وفقدان العذر يدل على عدم الحق۔

(درر الحكام شرح المجلة ۴/۲۹۵)

وقال العلامة الخالد اتاسي، عن جامع الفتاوى ان المتاخرين من اهل الفتوى قالوا لا تسمع بعد ستة وثلاثين سنة الا ان يكون المدعى غائبا او صبيا او مجنونا وليس لهما ولي او المدعى عليه اميرا جائرا يخاف منه وعللوا ذلك بأن ترك الدعوى جميع هذه المدة مع تمكن منها دليل على عدم الحق ظاهراً۔ (شرح المجلة-۵/۱۶۷)

لہذا ان دلائل کے پیش نظر فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعوی ارث چوں کہ ۶۰ سال گذر جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ جب کہ اس دوران کوئی عذر شرعی جو دعوی سے مانع ہو موجود نہیں تھا۔ اس لیے شرعاً ان کا یہ دعوی قابل سماعت نہیں ہے۔ مدعی بہ انبالی اور اس کے بھائی میر علی کا منصور ہے اور ان کے بعد ان کے ورثاء کا حق ہے۔

باب التحکیم

(ثالثی کے احکام و مسائل)

ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کسی تنازع کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ ہر مستحق کو اس کا حق دلانا شریعت میں مطلوب و مقصود ہے اور حق دار کو جہاں کہیں سے بھی اپنے حق کے حصول کا اطمینان حاصل ہو جائے چاہے قاضی کے ذریعے سے ہو یا کسی اور کے ذریعے سے ہو تو اس میں شریعت نے فریقین کو اختیار دیا ہے کہ جس طرح ہر شخص کو دوسرے معاملات میں اپنے اوپر ولایت حاصل ہے، اسی طرح تنازعات میں بھی اگر وہ اپنی ولایت کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے کسی شخص کو حَکَم مقرر کرے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں فریقین کی باہمی رضامندی اور اتفاق رائے ضروری ہے، اگر کوئی بھی فریق ثالث مقرر کرنے سے انکار کرے تو صرف ایک فریق کی رائے سے ثالث مقرر کرنا جائز نہیں۔

کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا۔ (سورۃ النساء آیت ۳۵) [1]

کسی فاسق کو ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ شرعی امور میں غفلت کے مرتکب شخص کو کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی شخص سے اس وقت صحیح انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے جب وہ زہد و تقویٰ کی زینت سے آراستہ ہو کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات میں احتیاط سے کام لے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا، اور جو شخص زہد و تقویٰ سے خالی ہو اس سے

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: اذا حَكَّمَ رَجُلَانِ رجلاً فَحَكَمَ بينهما ورضيا بحكمه جاز۔ (الهداية ج۳ ص۱۴۳ باب التحكيم۔ كتاب آداب القاضي)

وَمِثْلُهُ في مجلة الاحكام، المادة ۱۸۴۱ ص۱۱۹۳ الباب الرابع في المسائل المتعلقة بالتحكيم۔

صحیح انصاف کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے ثالث تب صحیح فیصلہ کر سکے گا جب وہ شرعی امور کا پابند ہو اور احکاماتِ شرعیہ کی بجاآوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا ہو لہٰذا ابتداءً فاسق کو ثالث مقرر کرنا درست نہیں لیکن اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے مقرر کر لیا ہو اور اس کا فیصلہ شرعی قواعد وضوابط کے موافق ہو تو وہ شرعاً نافذ العمل ہوگا، چونکہ فریقین میں سے ہر ایک کو فیصلے سے قبل رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے کوئی بھی فریق فیصلے سے قبل اس کو زائل کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وافاد بقوله لو صلح قاضیاً جواز تحکیم المرأة والفاسق لصلاحیتهما للقضاء، والاولیٰ ان لا یحکما فاسقاً۔

(البحر الرائق ج ۷ ص۲۶ باب التحکیم) ؎۱

دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دراصل فریقین کے تنازعہ کا حل نکالنا اور ہر ایک کو اپنا حق دلانا ثالث کی اہم ذمہ داری ہے اور ثالث یہ ذمہ داری اس وقت صحیح طریقے سے نبھا سکتا ہے جب وہ دینی امور سے واقف ہو کیونکہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر ان حقوق کے تحفظ کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے دینی امور سے واقف عالم کے ہوتے ہوئے کسی غیر عالم کو ثالث مقرر کرنا مناسب نہیں، البتہ اگر غیر عالم کو ثالث مقرر کیا گیا تو جائز ہے لیکن اس پر لازم ہے کہ تنازعات کے تصفیہ میں ذاتی رائے قائم کرنے سے گریز کرے اور مسائل میں علماء سے رجوع کرے اس لیے کہ اگر اس کا فیصلہ شرعی اصول وضوابط کے موافق ہو تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: انه یمکنه ان یقضی بفتوی غیره ومقصود القضاءُ

؎۱ قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ:۔ والفاسق اذا حکم یجب ان یجوز عندنا کما مر فی المولّٰی۔ (الهدایة ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم، کتاب آداب القاضی)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۴ ص۳۸۶ کتاب القضاء، باب التحکیم۔

يحصل به وهو ايصال الحق الى مستحقه۔ (الهداية ج۳ ص۱۳۲ ادب القاضي) [1]

ثالث کا شرعی اصول کے خلاف فیصلہ کرنے کا حکم

سوال:۔ دو بھائیوں نے مشترکہ مال سے ۵۰۰ کنال زمین خریدی ان میں سے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، اس کے وارثوں میں ایک نابالغ بیٹا موجود ہے، بھائی کے انتقال کے بعد دوسرا بھائی اس کی زمین میں تصرف کرتا رہا، جب متوفیٰ کا بیٹا بالغ ہوا تو اس نے اپنے حصے کی زمین کا مطالبہ کیا، دونوں نے فیصلے کے لیے ایک ثالث مقرر کیا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۱۵ کنال زمین متوفیٰ بھائی کے بیٹے کو دی جائے گی اور باقی زمین دوسرے بھائی کی ملک میں رہے گی، اس وقت اس فیصلے پر دونوں راضی تھے لیکن متوفیٰ کے بیٹے نے بعد میں انکار کیا، تو کیا شریعت کی رو سے ثالث کا یہ فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے اگر ثالث کو کسی متنازعہ معاملہ میں فریقین میں فیصلے کا اختیار دیا ہے تو اس میں یہ شرط لازمی قرار دی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو، اگر اس کا فیصلہ ان امور میں سے کسی کے بھی خلاف ہو تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، تاہم فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنا حق معاف کرکے ثالث کے فیصلہ کو دوام بخش سکتا ہے، اس لیے حسبِ بیان مذکورہ بالا ثالث کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی ہے کیونکہ اگر متوفیٰ اور زندہ موجود بھائی نے مشترکہ مساوی مال سے زمین خریدی ہو تو اس زمین میں متوفیٰ نصف حصے کا حقدار ہے اور اس کا یہ نصف حصہ اس کے وارثوں میں وراثت کے شرعی اصول کے تحت تقسیم کیا جائے گا، صورتِ مسئولہ میں ثالث کا فیصلہ چونکہ قرآن کریم اور سنت کے اصول کے منافی ہے اس لیے شرعاً نافذ نہیں، جب نافذ ہی نہیں تو فریقین میں سے ہر کوئی اس کو رد کرسکتا ہے۔

لما قال العلامة ابو بكر بن مسعود الكاسانیؒ: فان وقع فی فصل فيه نص مفسر من الكتاب او الخبر المتواتر او الاجماع فان وافق قضاءه ذلك نفذ ولا يحل له النقض

---

[1] قال العلامة الكاسانیؒ: لانه يمكنه ان يقضي بعلم غيره بالرجوع الى فتوى غيره من العلماء۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ فصل التحكيم، كتاب آداب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳ كتاب القضاء۔

لانه وقع مجمعاً قطعاً وان خالف شیئاً من ذٰلک یردہ لانهٗ وقع باطلاً قطعاً۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۴ کتاب آداب القاضی۔ فصل واما بیان ماینفذ من القضایا ـــ منها) [1]

قاضی اور حَکَم کا فرق

سوال:۔ بعض علاقوں میں لوگ باپ دادا کے قانون کے موافق اپنے فیصلے عدالتوں سے کراتے ہیں، اس میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی نہیں ہوتا، اور بعض لوگوں نے شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے باقاعدہ ایک عالم مقرر کیا ہوتا ہے جو اُن کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھاتا ہے، تو کیا شرعاً اس کو قاضی تصور کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلوں کے بارے میں بااختیار ہو اور ہر خاص و عام پر اس کو یکساں ولایت حاصل ہو کیونکہ اختیارات میں معمولی سی کمی بیشی کے باعث لوگوں میں صحیح فیصلے کرنے سے قاصر رہے گا جس کی وجہ سے قضاء کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا، اور قاضی کو یہ مکمل اختیارات تب حاصل ہوں گے جب اس کو حکومتِ وقت نامزد کرے کیونکہ قاضی حکومت کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور فریقین اپنی مرضی سے جس کو فیصلوں کے لیے مقرر کریں اس کو تو صرف ان لوگوں پر اختیارات حاصل ہوں گے جنہوں نے اس کو مقرر کیا ہو، ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو اختیارات حاصل نہیں، اس لیے اگر لوگ اپنے فیصلوں کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ حَکَم ہو گا قاضی نہیں؟

لما قال العلامة اکمل الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: ان المحکم ادنیٰ مرتبة من القاضی لاقتصار حکمه علیٰ من رضی بحکمه وعموم ولایة القاضی۔ (العنایة علیٰ هامش فتح القدیر ج ۶ ص۴۰۲ باب التحکیم۔ کتاب آداب القاضی) [2]

---

[1] قال العلامة ابن قاضی سماوۃؒ: قضایا القضاة ثلاثة اقسام (۱) حکم بخلاف نص او اجماع وهٰذا باطل فلکل من القضاة نقضه اذا رفع الیه ولیس لاحد ان یجیزہ۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۳۳ الفصل الثانی فی القضاء فی المجتهد فیه)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص۱۱ کتاب ادب القضاء۔ باب التحکیم۔

[2] لما قال العلامة الحصکفیؒ: عرفاً تولیة الخصمین حاکماً یحکم بینهما ورکنه علیه مع قبول الاٰخر۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۴ ص۳۸۶۔ باب التحکیم۔ کتاب القضاء)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص۲۴ کتاب آداب القاضی۔ باب التحکیم۔

معزول ثالث کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:۔ فریقین نے دو آدمیوں کو زمین کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا، بعد میں کسی وجہ سے ایک فریق کا دونوں ثالثوں پر اعتماد باقی نہ رہا اور اس نے فیصلے سے پہلے ان دونوں کو معزول کرنے کا باقاعدہ اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ثالثوں نے فیصلہ کر دیا، تو کیا ثالثوں کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ان دونوں آدمیوں کو فریقین نے چونکہ اپنی طرف سے ثالث مقرر کیا ہے لہٰذا فریقین میں سے اگر کوئی بھی ان کو معزول کرنا چاہے تو فیصلے سے قبل ان کو یہ اختیار حاصل ہے، جب ایک فریق نے دونوں ثالثوں پر عدم اعتماد یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو معزول کر دیا تو اب ان کی تحکیم کالعدم ہوگی اور ان کا فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: لو عزل احد الخصمین قبل الحکم لم ینفذ حکمه علیه۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۲۹ الفصل الخامس فی التحکیم کتاب القضاء)[1]

فریقین کا تحکیم سے رجوع کے بعد حَکَم کیلئے اُجرت لینا جائز نہیں

سوال: فریقین فیصلہ کے لیے ایک قاضی کے پاس گئے، اُس نے فیصلے پر پندرہ (۱۵) روپے اُجرت پیشگی وصول کی، فریقین کی سُستی کی وجہ سے ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا، اب فریقین قاضی سے اُجرت واپس کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن قاضی اُجرت واپس کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سُستی تمہاری طرف سے ہوئی ہے اس لیے میں پیشگی لی ہوئی اُجرت واپس نہیں کروں گا، تو کیا قاضی کے لیے فیصلے سے قبل اُجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قاضی شرعی قاضی نہیں کیونکہ قاضی تو حکومت کی طرف سے مقرر

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: وقال انه یخرج عن الحکومة باحد اسباب ثلاثة بالعزل او بانتهاء الحکومة نهایتها بان کان موقتاً فمضی الوقت او بخروجه من ان یکون اهلاً للشهادة۔
(البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸ باب التحکیم)
ومثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۷ کتاب القضاء۔ باب التحکیم۔

ہوتا ہے، جب فریقین فیصلے کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ مُحکّمؒ ہوتا ہے اور تحکیم میں چونکہ فیصلے سے قبل فریقین کو رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے ان میں سے اگر ایک فریق یا دونوں رجوع کر لیں تو یہ تحکیم فسخ ہو جائے گی، جب تحکیم فسخ ہو جائے تو محکم اجرت کا مستحق نہیں رہتا، ان کے مابین اجارہ تحکیم پر ہوتا ہے، جب فریقین رجوع کر لیں تو اجارہ بھی فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اجارہ محض عقد سے لازم نہیں آتا بلکہ جو شرط اس میں لگائی گئی ہو اس کا پورا ہونا ضروری ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حَکَمؒ کو یہ رقم لینا جائز نہیں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والاجر لایلزم بالعقد فلایجب تسلیمه بل بتعجیله اوشرطه فی الاجارة۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۷ کتاب الاجارة) [1]

علاقائی اِصلاحی کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال :- مروجہ اصلاحی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے کسی فیصلے سے انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- علاقائی اصلاحی کمیٹیاں جو کہ اکثر علاقہ کے معززین پر مشتمل ہوتی ہیں جو کہ لوگوں کے تنازعات ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن فیصلوں کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ فریقین جب ان سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں تو اپنی طرف سے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں اور جس فیصلے میں بھی اختیار حکومت کی بجائے عوام کی طرف سے ملتا ہے تو ان اختیارات کے تحت فیصلے کرنے والے کی شرعی حیثیت مثل حَکَمؒ کے ہوتی ہے، تو جس طرح فریقین کو حَکَمؒ کے فیصلے سے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح جب حَکَمؒ فیصلہ کر دے تو پھر فریقین کے لیے اس کا تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے، اسلئے اگر کسی اصلاحی کمیٹی کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار جائز نہیں۔

قال العلامة المرغینانی رحمه الله: اذا حکّم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما۔

{ الهدایة ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم
کتاب ادب القاضی } [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: لاتلزم الاجرة بالعقد المطلق یعنی لایلزم تسلیم بدل الاجارة حالاً بمجرد انعقادها (شرح مجلة الاحکام، المادة ۴۶۶ ص۲۶۱ الفصل الثانی فی المسائل المتعلقة الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۲۹۲ کتاب الاجارة، باب الاجر متی یستحق۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: اذا حکّم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب آداب القاضی)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۸۴۸ ص۱۱۹۸ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم۔

کسی فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کے فیصلے کا حکم

سوال:۔ فریقین میں سے ایک فریق غائب ہے اور ثالثوں نے اس کی عدم موجودگی میں فیصلہ دوسرے فریق کے حق میں کر دیا، تو کیا ثالثوں کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر فریقین نے ثالثوں کو باقاعدہ فیصلے کا اختیار دیا ہو اور فیصلے سے قبل کسی ایک فریق نے بھی ان سے رجوع نہ کیا ہو تو ثالثوں کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے بیانات وغیرہ حاصل کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں، اگر ثالثوں نے طرفین سے بیانات وغیرہ حاصل نہ کیے ہوں اور محض ایک فریق کے بیانات پر فیصلہ کیا ہو تو وہ فیصلہ جائز نہیں، کیونکہ جس طرح قضاء میں یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ قضاء کے وقت عدالت میں حاضر ہو، اگر وہ خود حاضر نہیں ہوتا اور اپنی طرف سے وکیل وغیرہ مقرر کیا ہو تو اس کا حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ مدعیٰ علیہ یا اس کی طرف سے مقرر شدہ خصم کی عدم موجودگی میں مقدمہ کی صورتحال کی پوری وضاحت مشکل ہے تو جب قضاء میں مدعیٰ علیہ کا موجود ہونا ضروری ہے تو تحکیم جو کہ اس سے کم درجہ رکھتی ہے اس میں بطریق اولیٰ اس کی موجودگی ضروری ہے لہٰذا ایک فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کا یکطرفہ فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

قال العلامة المرغيناني: ولا يقضي القاضي على غائب الا ان يحضر من يقوم مقامه۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۴۲ باب كتاب القاضي الى القاضي)[1]

ثالث کے فیصلے سے انکار کا حکم

سوال:۔ دو اشخاص کے درمیان زمین کی حدود پر تنازعہ ہوا، ان دونوں کے درمیان جرگہ نے فیصلہ کیا اور دونوں اس فیصلے پر راضی ہوئے، ان میں سے ایک نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے اور اس کی حدود نہیں توڑوں گا لیکن تین چار ماہ گذرنے کے بعد وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا اور فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور حدود بھی توڑ دیئے، تو کیا جرگہ کے فیصلہ کے بعد اس سے انکار کرنا

---

[1] قال العلامة الكاساني رحمه الله: اما الذي يرجع الى المقضي عليه فحضرته حتى لا يجوز القضاء على الغائب اذا لم يكن عنه خصم حاضر وهذا عندنا۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۸ كتاب آداب القاضي۔ فصل واما شرائط القضاء فانواع الخ)
ومثله في البحر الرائق ج ۷ ص ۱۷ باب كتاب القاضي الى القاضي۔

درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ان دونوں نے اپنی مرضی سے ثالث مقرر کیے ہوں اور مدتِ تحکیم کے اندر ان ثالثوں نے فیصلہ کیا ہو اور ان کا فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو وہ نافذ العمل ہے، کیونکہ تحکیم کی وجہ سے ثالثوں کو ان دونوں پر مکمل اختیار حاصل ہے اس لیے ان کا فیصلہ دونوں فریقوں پر تسلیم کرنا لازم ہے، لہٰذا فیصلہ کے بعد کسی بھی فریق کا اس سے انکار کرنا درست نہیں، اسی قسم توڑنے کے بدلے اس پر کفارہ لازم آئے گا۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما۔

(الهدایة ج۳ ص۱۴۳ باب کتاب القاضی الی القاضی) [1]

ثالث معزول کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر فریقین کسی کو ثالث مقرر کریں تو ان میں سے کوئی فریق اس کو معزول کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین اپنی مرضی سے کسی کو ثالث مقرر کریں اور اس کو فیصلے کا اختیار دیدیں تو ثالث کو چونکہ فیصلے کا اختیار ان دونوں کی وجہ سے ملا ہے، اس لیے اگر ثالث کے فیصلے سے قبل کسی بھی فریق کو اس پر اعتماد باقی نہ رہے یا کسی اور وجہ سے اس کو معزول کرنا چاہے تو جیسا کہ قاضی کو فیصلوں کا اختیار حکومت سے مل جاتا ہے اور حکومت کو ہر وقت اس کے معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے اسی طرح فریقین میں سے ہر ایک کو ثالث معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من الخصمین عزل الحکم قبل الحکم لانه مقلد من جهتهما فکان لکل منهم عزله وهو من الامور الجائزة فینفرد احدهما بنقضه کما ینفرد احد العاقدین فی مضاربة وشرکة ووکالة۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۷ ص۱۱۹ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم) [2]

---

[1] قال العلامۃ الکاسانیؒ: واذا حکم صار لازمًا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب ادب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۸ ص۱۱۹۵ کتاب الدعوٰی۔

[2] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: (وینفرد احدهما بنقضه) ای التحکیم بعد وقوعه (کما) ینفرد احد العاقدین (فی مضاربة وشرکة ووکالة) بلا التماس طالب۔
(تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج۴ ص۳۸۷ باب التحکیم)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء۔

فیصلے کے لیے مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کے باہمی اختلاف کا حکم

سوال:۔ فریقین نے تنازعہ کے فیصلے کا اختیار چند افراد پر مشتمل کمیٹی کو دیا، فیصلے کے بارے میں کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوگیا، بعض ارکان نے مخالفت کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے ایک فریق کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، تو کیا ان کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی کو فیصلے کا اختیار فریقین کی طرف سے ملا ہے اس لیے اس کمیٹی کی حیثیت حکم کی طرح ہے اور فریقین فیصلہ کا اختیار دیتے وقت ثالث پر جو بھی شرائط عائد کریں ثالث پر ان کی پابندی کرنا لازمی ہے، اگر ثالث ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی کرے تو کوئی بھی فریق اس کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اسی طرح مذکورہ صورت میں جب فریقین نے اپنے فیصلے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین نے کمیٹی کے تمام ارکان کو فیصلے کا اختیار دیا اور فیصلے میں کمیٹی کے تمام افراد کے اتفاق رائے کو شرط قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر متعدد ثالثوں میں سے ایک بھی فیصلہ کی مخالفت کرے تو فیصلہ نافذ نہیں ہوگا ـــــــــ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال جب کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوا تو اختلاف کے ہوتے ہوئے بعض ارکان کا اپنے طور پر فیصلہ کرنا جائز نہیں اس لیے فیصلہ نافذ العمل نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبنانيؒ: اذا تعدد المحكمون على ما ذكر آنفاً يلزم اتفاق رأي كلهم وليس لواحد منهم ان يحكم وحده۔

لہ {شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۸۴۴ ص۱۹۶
الباب الرابع في المسائل المتعلقة بالتحكيم}

◆ ◆

لہ قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: ولو حكما رجلين فحكم احدهما لم يجز ولا بد من اتفاقهما على المحكوم به فلو اختلفا لم يجز۔
(البحر الرائق ج۷، ص۲۶ باب التحكيم)

اسلامی قوانین ○ جامعیت و اہمیت

✱

دنیا کے اندر ملکی نظام کو چلانے، شاندار حکومت کرنے اور ملک و ملت میں امن و امان پیدا کرنے کے لیے مختلف نظریات کے تحت قوانین بنائے گئے اور ان کے اجراء و نفاذ کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے گئے لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ بدامنی اور لاقانونیت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ کسی کی جان، مال اور عزت و آبرو نہ پہلے محفوظ تھی نہ اب ہے۔ اس بارے میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ قوانین انسانی ذہن کی اختراع ہیں اس لئے آئے دن ان میں کوئی نہ کوئی تبدیلی سامنے آتی رہتی ہیں جس سے امن و مسائل مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔

اسلامی قوانین چونکہ منزل من اللہ ہیں اس لئے انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور ان پر عمل کرکے ہی امن و امان، دہشت گردی جیسے بین الاقوامی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ اس اہمیت کے پیش نظر جامعہ حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مقالہ بعنوان "اسلامی قوانین، جامعیت و اہمیت" لکھا جسے شائع کرنے کا اعزاز بھی ماہنامہ الحق نے حاصل کیا۔ اب اس مقالہ کو فقہ اور فتاویٰ کی مناسبت سے افادۂ عوام و خواص کے لیے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

اسلامی قوانین / جامعیت و اہمیت

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہٗ

انسان مَدَنی الطبع ہونے کی وجہ سے معاشرہ سے اس کا تعلق لازمی ہے۔ تجرد، انفرادیت اور رہبانیت شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح سمجھی جاتی ہے۔ انسان کائنات عالم کی خوبصورتی اور زینت ہے، یہ خوبصورتی ایک اچھے معاشرہ کی صورت میں باقی رہے گی، انسان کی ضروریات اور حوائج کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی جملہ ضروریات بذاتِ خود پورا نہیں کر سکتا بلکہ معاشرہ میں رہ کر ایک دوسرے سے فائدہ اور استفادہ کی ضرورت ہوگی۔

قانون کی حقیقت

فائدہ اور استفادہ میں اگر انسان کو کھلے طور پر اجازت دی جائے اور اس پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے تو اس سے انسان کی زندگی تباہ ہوگی۔ ایسی صورت میں جبر و تشدد، حرص و لالچ، ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا۔ انسانی زندگی گزارنے کے لیے، انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات ضروری امر ہے کہ جس میں معاشرہ بربادی سے محفوظ ہو، انسان کی زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس میں اس کو کسی قانون کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اگر انسان کی ابتدائی زندگی یعنی بچپن میں اس کا تحفظ قانونی ذریعہ سے نہ ہو تو اس سے اس کی تربیت و تعلیم کا پیارا مرحلہ ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر جوانی میں کسی ضابطۂ حیات کی پابندی کا احساس نہ ہو تو اس سے انسان شباب کے وقت ایسی راہ پر چل سکتا ہے جس سے اس کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے، اگر بڑھاپے اور ناتوانی کی حالت میں انسان کو مکمل تحفظ میسر نہ ہو تو اس سے خودکشی جیسے قبیح امور کے ارتکاب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، غرضیکہ انسان زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی کے سنوارنے کے لیے اس ضابطۂ حیات کا دوسرا نام "قانون" اور "آئین" ہے۔ علماء قانون کی نظر میں اس کی جامع تعریف یوں کی گئی ہے:۔

"قانون ایسے مجموعہ کا نام ہے جس میں مروّجہ مسلّمہ سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کا تحفظ کیا جائے۔"

قانون کی ضرورت

اسلام کی نظر میں تو مکلّف انسان قانون اور ضابطہ کا پابند ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الدنیا سجن المؤمن"۔ دنیا مسلمان کے لیے ایک جیلخانہ ہے جہاں اس کی ہر ایک حرکت قانون اور ضابطہ کے تحت ہو گی۔ مذہب کے لحاظ سے یہ پابندی لازمی امر ہے۔ آج کے نام نہاد جمہوریت پسند اور حریت پسند لوگ بھی قانون کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے، ان کے ہاں بھی قانون کی پابندی لازمی امر ہے، اگرچہ زبان پر آزادی کا خوشنما نعرہ ہر وقت دھوکہ دینے کے لیے جاری رہتا ہے لیکن ان کی آزادی کی حقیقت صرف اور صرف مذہب اور عقیدہ سے آزادی سے عبارت ہے۔ آج اگر یورپی ممالک کی مثال لی جائے تو وہاں پر قانون کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً لاکھوں لوگ مغربی ممالک میں رہائش چاہتے ہیں لیکن قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہاں رہائش نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ قانون ہی ان لاکھوں افراد کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر انسانی خواہشات کو پابند رکھنا جرم ہو تو پھر سب سے بڑے مجرم آج ترقی یافتہ ممالک ہیں جنہوں نے غریب ممالک کے لوگوں پر اپنے ملک کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ان ممالک میں تاجر و مالک، کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان تعلقات بنانے کا واحد ذریعہ قانون سمجھا جاتا ہے، جب ترقی یافتہ ممالک کی کشتی قانون کے بغیر نہیں چل سکتی تو ترقی پذیر ممالک میں قانون کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔

قانون کی ابتدا

اسلامی نقطہ نظر سے قانون کی ابتدا ہبوطِ آدم سے شروع ہوئی ہے۔ گویا جب انسان کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تو خلافت کے نظم ونسق کے لیے قانون کی ضرورت خود بخود محسوس ہوئی۔ موجودہ دور کے قانونی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ خاندان اور قبیلہ کے وجود کے ساتھ ہی دنیا میں قانون کا ظہور ہوا۔

انسان نے حرص اور لالچ سے جب ہم نوع کے حقوق پر دست درازی شروع کی تو حقوق کی حفاظت کے فطری جذبہ نے لوگوں میں قانون کی ضرورت کا احساس ابھارا۔ چنانچہ غیر اختیاری طور پر خاندانوں اور قبیلوں میں عرف، رواج یا دوسرے ایسے قواعد وضوابط پیدا ہوئے جن کے تحت زندگی گذارنی ضروری ہوئی۔ جوں جوں خاندان اور قبیلہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی تو قانون کی ضرورت میں بھی شدت ہوتی رہی اور قانون کو معاشرہ کے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے جدت اور تبدیلی لازم قرار پائی، یہ قانون کے لیے اگرچہ طفولیت کے ادوار تھے، لیکن پھر ایک خاندان اور قبیلہ میں قانون لازمی امر رہا۔ خاندان اور قبیلہ سے انسانی معاشرہ جب ریاست کی شکل میں تبدیل ہوا تو قانون نے دوسرا قدم اٹھایا، اور جب ریاست سے سلطنت اور حکومت کی صورتیں سامنے آئیں تو اس سے

قانون میں اور بھی جدت پیدا ہوئی۔ گویا انسانی زندگی کے اول روز سے ہی قانون کو اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔

قانون کی قسمیں

تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لیے دو قسم کے قوانین وضع ہوئے۔ پہلی قسم کا قانون وہ ہے جو انسان نے خود اپنے لیے بنایا، مقنن خود بھی اس کا پابند رہا، اس قانون میں عموماً وقت اور حالات کی رعایت ہوتی رہی اور مقنن معاشرہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر قانون مرتب کرتا رہا، جب حالات کی تبدیلی ایک لازمی امر تھا تو اس قانون میں بھی ترمیم و اضافے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا۔ قانون کی اس قسم کو ہم ”انسانی قانون“ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس کا بنانے والا خود انسان ہوتا ہے اور یہ انسانی دماغ کا اثر ہے۔

دوسری قسم کا قانون وہ ہے جس کا بنانے والا بالائی طاقت رہی، یعنی مقنن نے اپنی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی ضروریات کے لیے قانون وضع کیا، اس میں وقتی مصلحت یا حالات کی ضرورت کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ ابدی ضرورت کو مدنظر رکھ کر قانون بنایا تھا اس لیے وقت اور ضرورت کی تبدیلی سے اس کی قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، یہ عمر بھر کے لیے قابلِ عمل رہا، اس قانون کو ”رحمانی قانون“ کہا جاتا ہے۔

انسانی قانون کی حقیقت

آج قانون کا لفظ بول کر معاشرہ میں اس سے اول الذکر قانون مراد لیا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگ جو ذہنی جمود کا شکار ہوتے ہیں، ان کے نزدیک قانون صرف انسانی قانون سے عبارت ہے، مذہب یا عقیدہ کا قانون سے کوئی رشتہ نہیں، ان لوگوں کے نزدیک قانون اجتماعی زندگی کا محافظ ہے جبکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قانون ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کا تعین کرتا ہے جبکہ مذہب خدا اور انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔ یہ رائے حقیقت اور واقعات سے صریح مخالف ہے لہٰذا ایسی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ انسانی قانون نے کچھ اچھے ثمرات بھی دکھائے لیکن ”واثمهما اکبر من نفعهما“، یعنی ثمرات سے مضرات زیادہ ہیں۔ قانون کی یہ شکل ہر دور میں مختلف رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں قانون قبیلہ یا خاندانی سربراہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہوتی، خاندانی سربراہ جو قاعدہ یا ضابطہ مقرر کرتا اُسے قانون کا درجہ حاصل ہوتا، کسی کو اس سے مخالفت کی جرأت نہ ہوتی اور خلاف ورزی کی صورت میں بڑی شدت سے اس کا محاسبہ کیا جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انسانی حقوق کے تحفظ کا نیا نعرہ لگا کر جمہوریت کی آواز بلند ہوئی تو اس سے قانون بنانے کے طریقۂ کار میں کافی تبدیلی آئی۔ موجودہ وقت کے قانونی ذخائر اور حالات و واقعات خاص کر جمہوری اصول کو مدِ نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں انسانی قانون کے بنانے والے تین شعبے ہیں۔

مقننہ کے مختلف شعبے

انسانی قانون بنانے میں تین شعبوں کا بڑا دخل ہے، گویا یہ تینوں شعبے انسانی قانون کے ماخذ اور مراجع ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) سربراہِ مملکت (۲) آئین ساز ادارے (۳) عدالتی نظائر

سربراہِ مملکت

یہ شعبہ قدیم دور کے خاندانی سربراہ کی ایک جدید شکل ہے، البتہ قدیم دور میں خاندانی سربراہ مختارِ کل ہوتا تھا جبکہ عصرِ حاضر میں اس شعبہ کو محدود اختیارات حاصل ہیں۔ سربراہِ مملکت مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ہنگامی حالات میں نظریۂ ضرورت کے تحت کوئی نہ کوئی قانون "آرڈیننس" کی صورت میں نافذ کر سکتا ہے اگرچہ اس کی منظوری کے لیے کسی پارلیمنٹ کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے لیکن پھر بھی قانون بنانے میں سربراہ مملکت کافی دخل رکھتا ہے۔

آئین ساز ادارے

قانون بنانے والوں کا دوسرا اہم شعبہ "آئین ساز" ادارہ ہے اور جمہوری ممالک میں اس ادارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ایسے ادارہ کی محنت اور سعی سے بنا ہوا قانون جدید ذہن والے صحیفہ آسمانی کے برابر سمجھتے ہیں، اس میں ترمیم و منسوخی کا حق بھی اسی ادارہ کو حاصل رہتا ہے، آجکل قومی اور صوبائی اسمبلیاں اور سینیٹ کے ادارے اس کے نمونے ہیں، ان اداروں میں کثرتِ رائے سے جو بات سامنے آتی ہے اسی کو ملک کا قانون سمجھا جاتا ہے، اس میں ووٹوں کی کثرت کا اعتبار رہتا ہے، جس بات کی حمایت میں زیادہ ووٹ نکل آئیں تو وہ قانون بن جاتی ہے، گویا کہ اس میں تمام تر فیصلے کثرتِ رائے پر ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے قانونی شکل میں نفاذ کیلئے (BILL) وغیرہ کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے لیکن حتمی منظوری کے بعد اس کو قانونی قالب میں ڈھال کر ملک کے قانون کا مستقل حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

عدالتی نظائر

انسانی قانون کا تیسرا ماخذ عدالتی نظائر ہوتے ہیں، کسی جمہوری ملک کی عدالتِ عالیہ اپنی صوابدید کے مطابق قانون کی تشریح کرتے ہوئے جو فیصلہ کرتی ہے تو ماتحت عدالتیں بھی اس کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملکِ عزیز پاکستان کی اعلیٰ عدالت "سپریم کورٹ" نے جب کوئی فیصلہ کیا تو "ہائیکورٹ" یا ماتحت عدالتیں اس فیصلہ سے متاثر ہوتی ہیں اور وہ اپنے فیصلوں

اس کا لحاظ رکھتی ہیں تو یہ فیصلے مستقل قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں انسانی قانون یا قانون سازی کو انسان کے بنیادی حقوق کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

رحمانی قانون کی حقیقت

قانون کی دوسری قسم یعنی "رحمانی قانون" کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو جنت سے اتار کر زمین پر بھیجا تو اس وقت حضرت آدمؑ سے فرمایا: "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۸) یعنی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت نامہ اور ضابطۂ حیات آئے گا، تیری اولاد کے لیے اس کی تابعداری ضروری ہو گی۔"

انسانی ہدایت کی یہ حقیقت دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے: "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۳۵) اے اولادِ آدم تمہارے پاس میرے رسول آئیں گے جو میری آیتیں بیان کریں گے۔"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے ضابطۂ حیات کی تقرری اور تعین کے لیے دو راہیں متعین کیں۔ ایک راہ "هُدًی" یعنی ہدایت اور دوسری راہ "رسول" ہے۔ گویا رحمانی قانون کے ماخذ اور مراجع اصولی طور پر یہ دونوں ٹھہرائے گئے۔

رحمانی قانون کے ماخذ

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کتنی کتابیں نازل کیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک سو چار کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں، دس صحائف حضرت آدمؑ پر، پچاس صحائف حضرت شیثؑ پر، تیس صحائف حضرت ادریسؑ پر اور دس صحائف حضرت ابراہیمؑ پر اتارے اور چار بڑی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید نازل کیں۔

یہ ایک سو چار کتابیں حقیقت میں رحمانی قانون کے مختلف ایڈیشن اور نسخے ہیں، پھر قانون کا یہ اہم کام ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے لیا گیا، گویا ماضی میں یہ دو راہ یعنی هدًی اور رسول متعین تھیں، لیکن جب رحمانی قانون کا آخری کامل اور مکمل نسخہ قرآن کی شکل میں خاتم الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور آئندہ کے لیے سلسلۂ نبوت ختم کر کے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کے ساتھ دوسرے دو طریقے اور بھی شامل کیے، جن کو "اجماعِ امت" اور "قیاس" کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۹)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ؐ کی تابعداری کرو اور اولی الامر کی تابعداری کرو اور اگر کسی چیز میں جھگڑا پڑے تو اللہ اور رسول ؐ کے احکام کی طرف رجوع کرو۔"

اس آیت میں رحمانی ہدایت کے ماخذ اربعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلامی قانون اور رحمانی ہدایت کے چار ماخذ ہیں۔ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ، اطیعوا الرسول ؐ سے سنت الرسول، اولی الامر سے اجماع اور فردوہ الی اللہ والرسول ؐ سے قیاس کی طرف اشارہ ہے۔

گویا اسلامی قانون کبھی آدم ؑ اور صحف آدم کی شکل میں آیا، کبھی شیث ؑ کے پچاس صحیفوں میں آیا، کبھی ادریس ؑ اور صحف ادریس ؑ کی شکل میں، کبھی ابراہیم ؑ اور صحف ابراہیم ؑ کی شکل میں وضع ہوا، کبھی داؤد ؑ اور زبور، کبھی موسیٰ ؑ اور توریت اور کبھی عیسیٰ ؑ اور انجیل کی شکل میں آیا، اور آخری ناقابلِ ترمیم مسودہ "قرآن" کی شکل میں اترا جس کی تفصیل سنتِ رسول ؐ، اجماعِ امت اور قیاس سے کرائی گئی۔

اسلامی قانون کے بارے میں غیر مسلموں کے تاثرات

اسلامی قانون کی خصوصیات اور امتیازات یا تقابلی مطالعہ کے بغیر ہمارے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانی قانون کے مقابلے میں "رحمانی قانون" انسانی معاشرہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ صرف ہم نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کوئی دوسرا قانون وقت اور حالات کیلئے مناسب نہیں۔

(۱) ڈاکٹر سیموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنت میں گونجتے ہیں۔

(۲) مسٹر ولف کہتا ہے کہ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم و مالیات اور غرباء کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

(۳) ڈاکٹر مولیس فرانسیسی لکھتا ہے کہ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں قرآن ان سب سے افضل ہے۔ (علوم القرآن صـ۴۳)

اِسلامی قانون کے اہم شعبے

اگرچہ قانون کے شعبہ "دستوری قانو (Constitutional Law "انتظامی قانون" (Administrative Law) "وخارجہ پالیسی" کا پورا تذکرہ قرآن وحدیث میں موجود ہے اور عملی تجربہ خلفائے راشدین کے دورِ خلافت میں نمایاں ہے۔ دستوری قانون اور انتظامی قانون اظہر من الشمس ہیں کہ ہمارا دستور قرآن وسنت ہے اور اس میں ہر ایک کے اختیارات محدود ہیں' اور خارجہ پالیسی بھی واضح ہو کر تعلقات جوڑنے اور توڑنے کے لیے اسلام ہی بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے تاہم غیر مسلم ممالک سے معاملات' اور تعلقات رکھنے میں رخصت دے کر تمام دنیا سے خارجی پالیسی بنانے کی اجازت دی ہے لیکن دوستی کا ہاتھ صرف اسلامی ممالک کے ساتھ بڑھایا جائے گا۔

موجودہ وقت میں بین الاقوامی یا ملکی قوانین کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قانون کے دو شعبے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ رعیت کی خوشحالی وترقی اور امن وامان کا مسئلہ ان دونوں شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں پہلا شعبہ شخصی قانون (Personal Law) اور دوسرا شعبہ ملکی قوانین (Public Law) ہے۔ ہم پوری تفصیل بیان کیے بغیر ان دونوں شعبوں کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا راز صرف اسلامی قانون میں مضمر ہے۔

اِسلام کا شخصی قانون

شخصی قانون کا تعلق عموماً فرد اور خاندان سے ہوتا ہے۔ اسلام میں فرد کی اصلاح کیلئے تین چیزیں خصوصی طور پر بیان کی گئی ہیں جو نماز' روزہ اور حج ہیں' ان تینوں عبادات سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، مفسرین ان تینوں کو امور مصلحہ للنفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان تینوں عبادات میں باقاعدگی سے انسان میں اتباع قانون' ایثار اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ ابتداء میں ہوتا رہتا ہے۔

ان تینوں امور کے بعد گھرانے اور خاندان کے جوڑنے کے لیے نکاح، مہر، نفقہ، حضانت' طلاق کی دفعات کتاب النکاح میں بیان ہوتی ہیں تاکہ اس سے انسان ایک خوشحال گھرانہ میں زندگی بسر کر سکے اور طلاق کے قانون پر سہولت دی گئی کہ بصورت ناچاقی خلاصی ممکن ہو۔ گذر اوقات کیلئے اسباب ملک میں بیع وشراء (خرید وفروخت) وصیت' ہبہ، شفعہ، وراثت وغیرہ قوانین معاملات میں بیان ہوئے ہیں تاکہ ملکیت کے اسباب متعین ہوں اور کسی کو دوسرے کی جائیداد پر ناجائز قبضہ جمانے کا موقع نہ مل سکے، وفات کی صورت میں میت کی جائیداد میں زور آزمائی، ظلم وستم

اور زیادتی سے بچنے کے لیے وراثت کا عظیم قانون موجود ہے۔

اِسلام کا ملکی قانون (Public Law) میں چند چیزوں کی رعایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور ان چیزوں کی حفاظت کو قانون میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں: (۱) حفاظتِ نفس (۲) حفاظتِ نسب (۳) حفاظتِ مذہب (۴) حفاظتِ مال (۵) حفاظتِ عقل (۶) حفاظتِ عزّت ـــــ اسلامی قانون میں بحمداللہ ان چھ چیزوں کو جو تحفظ حاصل ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسّر نہیں۔

۱ حفاظتِ نفس

حفاظتِ نفس کے لیے قرآنِ کریم نے دوٹوک اعلان کیا "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی" اس سے قصاص کا منصفانہ قانون نافذ ہوا تاکہ کسی شخص کا خون رائیگاں نہ کرنے پائے۔ یہاں تک کہ دوسرے امور میں خطا کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا، یعنی حقوق اللہ میں اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے "رفع عن اُمتی الخطاء والنسیان۔ یعنی میری اُمت کی خطا اور بھول معاف ہے"

لیکن انسانی قتل میں خطا کی صورت میں کفّارہ اور دیت واجب قرار دی، پھر بھی اگر قاتل کا علم نہ ہوسکے تو پھر محلہ والوں کے لیے "قسامت" کا قانون نافذ کرکے دیت کی وصولی کے لیے عام اہلِ محلّہ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انسانی نفس تو کیا انسان کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ایک ایک پور کی حفاظت کی گئی کہ ایک پور کے بدلہ میں ۱/۳ حصہ دیت واجب ہوگی۔

۲ حفاظتِ نسب

آج آپ ترقی یافتہ ممالک کی حالت دیکھیں کہ وہ جنسی خواہشات کے غلام بن گئے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کا نسب محفوظ نہیں ہے، اسلام نے نسب کی حفاظت اس انداز میں کی کہ چند سال قبل ہندوستان کی اعلیٰ عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ "چادر اور چار دیواری کی حفاظت اگر مقصود ہے تو مسلمانوں کے قانونِ رجم اور حد پر عمل کرنا پڑے گا" ـــــ زنا اور حرام کاری کی ممانعت کے علاوہ فسادِ نسب سے بچنے کے لیے نظر کی حفاظت لازمی قرار دی گئی کہ مسلمان مرد اور عورت کو چاہیئے کہ اپنی نظر نیچے رکھیں۔ پردہ کو لازمی قرار دیکر غیر محرم عورتوں سے خلوت اور ناجائز اختلاط ممنوع قرار دے کر فحش کاری کی بیخ کنی کی گئی، زنا کا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں شادی شدہ (مرد اور عورت) کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا، ارشادِ ربّانی ہے:-

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِی فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ۔ (سورۃ النور آیت ۲)
(ترجمہ) ''زناکار مرد اور عورت کو سو سو کوڑے لگا دیئے جائیں۔''

حفاظتِ مذہب[۳] انسان کو عقیدہ اور مذہب سے بڑا پیار ہوتا ہے، اسلام میں ''ذمی'' کی حیثیت تسلیم کرنے کے بعد اس کے مذہبی اور اعتقادی مسائل میں دخل اندازی ممنوع قرار دی گئی لیکن اسلام جو کہ ابدی اور ازلی مذہب ہے اس کی مخالفت حدِ ارتداد سے کی گئی کہ:-
من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (جس نے دین تبدیل کیا اس کو قتل کر دو۔)

حفاظتِ مال[۴] مال و دولت کی حفاظت عصرِ حاضر کا بڑا اہم مسئلہ ہے، آج دولت ہماری حفاظت نہیں کر سکتی بلکہ ہمیں دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اسلام میں پہلے انسان کو حلال خوری کی ترغیب دے کر اس کے حلال مال کی حفاظت یوں کی گئی کہ کسی مسلمان کا مال غیر شرعی طریقے سے کھانا حرام ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ زنی، چوری اور دھوکہ دہی کو جرم قرار دیا گیا، اگر کوئی شخص کسی کے حلال مال پر دست درازی کرے تو اس پر ''حدِ سرقہ'' جاری کی جائے گی مستقل حکم یہ دیا گیا:-
''اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا۔ (سورۃ النور آیت) چور مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

حفاظتِ عقل[۵] عقل انسان کا وہ جوہر ہے جس کو محفوظ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے عصرِ حاضر میں منشیات کی وبا عالمی سطح پر حکومتوں کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے، امریکہ سمیت پوری دنیا حیران ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوجوان اس مکروہ نشہ کا شکار ہو کر بالآخر خودکشی پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مسلمان میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر حدِ شربِ خمر کا مطالعہ کر کے صرف ''کتاب الاشربۃ'' کے باب کا قانون نافذ کر کے حدِ شربِ خمر کا اجراء کر دیا جائے تو پورے ملک میں ہیروئن کا نشہ کرنے والا ایک آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور عقل کی یہ حفاظت حدِ شربِ الخمر کے اجراء کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔

حفاظتِ عزت[۶] انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عزت ہے، دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہتک عزت کا قانون ہے لیکن اسلام کی یہ دفعہ سب سے اہم اور نرالی ہے اس میں ایک شخص کسی دوسرے کو زانی یا چور جیسے قبیح الفاظ سے نہیں پکار سکتا ورنہ حدِ قذف کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہر وہ کلمہ جس سے ایک مسلمان کی عزت و وقار پر حرف آتا ہو قابلِ مواخذہ جرم قرار دیا گیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار

غیر اسلامی ممالک اپنی عدالتوں اور ان کے طریقۂ قضاء پر بہت نازاں ہیں اور اپنے طریقۂ قضاء کے لیے ہر کسی کو دعوت دیتے ہیں مگر یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ اخبارات، رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے طریقۂ قضاء میں صاحب ثروت اور اثر و رسوخ والے شخص کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہے جبکہ غریب، نادار، کمزور اور بے بس آدمی کو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا طریقۂ قضاء فطرت کے عین مطابق ہے، جس میں ہر ایک کو پورے عدل و انصاف کے ساتھ اس کا حق اس کی دہلیز پر دیا جاتا ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے اس پروپیگنڈے کے جواب میں دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مضمون بعنوان "غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار" لکھا جسے ماہنامہ الحق نے شائع بھی کیا تھا۔ اب افادۂ عام اور فقہ و فتاویٰ کی مناسبت سے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

غیر اسلامی ممالک میں قضا کا طریقہ کار

قضا اسلامی تشخص کی تکمیل کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بغیر اسلامی زندگی ناقص اور ادھوری ہے۔ نظام قضا کے ذریعہ محاسبہ اور مواخذہ کی اس اہم دفعہ کی آبیاری ہوتی ہے جس پر اسلامی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ اگر انسان کے انفرادی یا اجتماعی افعال پر اپنی یا کسی قابلِ تعظیم شخصیت کی نظر نہ ہو یا اس کو آزاد چھوڑ کر اس کے کئے ہوئے افعال پر کوئی باز پُرس نہ ہو تو اس سے قوتِ بہیمی کو حوصلہ افزائی کا ایسا موقع مل سکتا ہے جس سے انسانی اقدار مجروح ہوں۔

اسلام کے نظام قضاء و قانون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قضا صرف ایک معاشرتی ضرورت نہیں کہ جس کی حاجت اجتماعی معاشرہ میں محسوس ہو بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا دینی اور مذہبی فریضہ ہے جس کی ضرورت قدم بقدم محسوس ہوتی ہے۔ قضاء دیگر عبادات کی طرح ایک مستقل عبادت ہے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھنا مجھے ستر سال کی عبادت سے زیادہ پسند ہے ـــــ چنانچہ علماء کرام اسے تقرب الٰہی کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلیؒ: قال بعضھم القضاء امر من امور الدین ومصلحۃ من مصالح المسلمین تجب العنایۃ بہ لان بالناس الیہ حاجۃ عظیمۃ وھو من انواع القربات الی اللہ عزوجل ولذا تولاہ الانبیاء علیھم السلام۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۷۳ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "بعض علماء فرماتے ہیں کہ قضاء دین کے امور میں سے (ایک اہم) امر ہے اور مسلمانوں کی بہتری کا ایک شعبہ ہے، اس کا اہتمام ہونا چاہیئے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ذرائع میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی یہ ذمہ داری قبول کی۔"

اس لیے اسلامی معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی رعایت ضروری ہے اس کی ادائیگی کے بغیر مسلمان مسئولیت کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا ہے۔

نظام قضاء کیلئے قوت تنفیذی کی ضرورت

ایسی صورت میں نظام قضاء کا نفاذ اور اجراء کسی ولایت عامہ یا قوت تنفیذی کے وجود پر موقوف نہیں یہی وجہ ہے کہ تحکیم (پنچایت) یعنی کسی ثالث کو فیصلہ کرنے کا اختیار دینا نظام قضاء کا ایک شعبہ ہے اس لیے

اگرچہ حَکَم یعنی ثالث کی ولایت ناقص ہو کر صرف طرفین تک محدود رہتی ہے، اس میں بھی طرفین فیصلہ کرنے سے قبل بغیر کوئی وجہ بتائے رجوع کا حق "قضاءً" محفوظ رکھتے ہیں، لیکن جب ایک دفعہ ثالث کا فیصلہ صادر ہو جائے تو یہ مستقل قضاء بن کر کسی دوسرے اعلیٰ قاضی کی عدالت میں مرافعہ کے وقت کسی خاص ضرورت کے بغیر اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، طرفین حسب معاہدہ اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نظامِ قضاء جزوی طور پر کسی طاقت اور قوت کے استعمال پر موقوف نہیں، یہ الگ بات ہے کہ شر القرون کے ان ادوار میں انسان طبعی حرص ولالچ کی وجہ سے کسی دوسرے کے حق کی ادائیگی کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا اور اپنا حق منوانے کے لیے جملہ وسائل بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اس لیے نظامِ قضاء کے مثبت نتائج کے مشاہدہ کیلئے قوتِ تنفیذی کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ کی برکت سے شرعی فیصلہ کا تقدس اور عظمت بحال رہ سکے۔

غیر اسلامی علاقوں میں نظامِ قضاء کے چند نظائر

مسلمان ممالک کی طرح غیر اسلامی ممالک میں بھی جہاں پر کفّار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں مسلمان اپنا مذہبی تشخص قائم رکھنے کے پابند ہیں، جیسا کہ عبادات سے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ایسا ہی حسبِ طاقت مسلمان اپنے مسائل اسلامی طرزِ حیات میں طے کرنے کے پابند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۶۵) ــــ ترجمہ "پس تیرے رب کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ کو منصف نہ جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے"۔

مکی زندگی کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمانوں کو یہاں پر غلبہ حاصل نہیں تھا بلکہ اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے لیکن اس کے باوجود مسلمان اپنے فیصلے اپنے درمیان کرتے تھے، کسی غیر اسلامی فیصلہ کرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

ایسا ہی مدنی زندگی میں اگرچہ خاص علاقوں پر مسلمانوں کا غلبہ تھا لیکن جو علاقے مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھے وہاں کے کچھ باشندے جب اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے مشرف ہو جاتے تو اپنے فیصلے باہمی مشورہ سے طے کرتے۔

فقہی جزئیات کی تائید

فقہاء کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جہاں کہیں کفّار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں تو وہ اپنے باہمی منازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی مسلمان قاضی کی تقرری کے پابند رہیں گے، علامہ کمال ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:-

هٰذا اذا لم يكن سلطان ولا من يجوز منه كما في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبه في المغرب الان وبنسيه وبلاد الحبشه واقروا المسلمين عندهم على مال يؤخذ منهم يجب عليهم ان يتفقوا على واحدٍ منهم يجعلونه واليا فيولّي قاضياً ويكون هو الذي يقضي بينهم وكذا ينصبوا لهم اماماً يصلّي بهم الجمعة. (فتح القدير ج۶ ص۳۶۵ كتاب القضاء)

(ترجمہ) "یہ حکم اس وقت ہے جہاں کہیں حاکم نہ ہو یا کسی کافر سے قضاء قبول کرنے کی کوئی صورت نہ ہو جیسا کہ بعض مغربی اور حبشہ کے ممالک میں ہے، تو جب مسلمان باقاعدہ مال کی ادائیگی کے معاہدہ پر رہ رہے ہوں اُن پر ضروری ہے کہ اپنے درمیان کسی ایک پر اتفاق کرکے اُسے قاضی مقرر کریں جو اُن کے درمیان فیصلے کرے اور ان کے لیے امام مقرر کرے تاکہ وہ ان کو جمعہ (اور عیدین) کی نماز پڑھائے۔"

مسلمانوں کے اتفاق سے قاضی کی تقرری

ایسی حالت میں اگر مسلمان باہمی اتفاق سے کسی ایک معتمد شخص کو اپنا فیصل مقرر کریں تو اس کی حیثیت قاضی کی ہوگی، مسلمان اس کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ رؤیتِ ہلال سے صوم و افطار میں اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور جمعہ وعیدین دیگر شرائط کی رعایت کے بعد اس کی موجودگی میں ادا ہوں گے۔ شیخ بدرالدین محمود بن اسماعیل الشہیر بابن قاضی سماوۃؒ فرماتے ہیں:-

واما في بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضي قاضياً بتراضي المسلمين. (جامع الفصولين ج۱ ص۱۴ الفصل الاول في القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقے جہاں پر کفّار کا غلبہ ہو تو مسلمانوں کے لیے جمعہ وعیدین کا پڑھنا جائز ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی باقاعدہ قاضی ہوگا۔"

علامہ علاؤ الدین الحصکفیؒ اس کی مزید اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ولو فقد وال الغلبة على الكفار وجب على المسلمين تعيين وال. (الدر المختار على هامش ردّ المحتار ج۴ ص۳۰۹ كتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کفار غلبہ سے کہیں مسلمان ولایتِ عامہ سے محروم رہیں پھر بھی اپنے لیے والی کی تقرری ان پر ضروری ہے۔"

عصرِ حاضر میں غیر اسلامی ممالک میں قضاء کی چند صورتیں

آجکل دنیا مذہب و عقیدہ، رنگ و نسل اور سوچ و فکر کے حوالہ سے منقسم ہے، عام محاورہ میں جسے جمہوری دور کہا جاتا ہے، اس میں جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور حکومت کر رہے ہیں تو اپنے جملہ وسائل بروئے کار لاکر اس ملک میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اس ملک کے ہر مسلمان باشندہ کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں بلکہ کسی غیر اسلامی نظام حیات کے تابع ہوں تو ان ممالک میں بھی بقدر استطاعت مسلمان اپنی مذہبی اقدار کی رعایت کرنے کے پابند ہوں گے، عقائد و اعمال کی درستگی اور اسلامی طرز حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا تو انفرادی معاملہ ہے جس میں ان کا کوئی عذر قابلِ سماع نہیں، خاص کر جن ممالک میں مذہبی آزادی ہو لیکن باہمی جھگڑے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طے کرنے کی بظاہر دو صورتیں نظر آتی ہیں:۔

پہلی صورت

پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان اگر کہیں اجتماعی طور پر اس نظام کے قیام سے عاجز ہوں تو خود مذہبی جذبہ کی روشنی میں انفرادی طور پر اپنے معاملات قرآن و حدیث کی روشنی میں طے کریں، ایسی صورت میں کسی غیر اسلامی حکومت کے لیے کسی قسم کی قانونی پیچیدگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی مروجہ قوانین تک نوبت پہنچنے سے قبل ہی مسلمان اپنے معاملات کسی ایسے عالم کے ذریعہ طے کریں جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق متنازعہ معاملات طے کرنے کی اہلیت ہو، اس سلسلہ میں کسی فعال اسلامی تنظیم کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے کہ وہ تنظیم خود مسلمانوں کے معاملات طے کرانے کا انتظام کرے یا کسی اور کے ذریعہ کرانے کا بندوبست کرے۔

انفرادی طریقۂ کار کی کمزوریاں

اس طریقہ کار سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی اس کا دائرہ بہت محدود ہوگا کیونکہ اس کی حیثیت "تحکیم" کے سوا اور کچھ نہیں اور "تحکیم" کا دائرہ بہت محدود ہے۔ علاوہ ازیں ایسی صورت میں سیاسی طور پر مسلمانوں کے لیے کئی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اوّلاً یہ کہ مسلمانوں کے پاس ایسے نظام کی تنفیذ کے لیے جب تک کسی مروجہ قانون کا سہارا نہ ہو تو محض دینی جذبہ سے اس کے تابع رہنے کے نتائج بہت کم سامنے آئیں گے، انسان طبعی طور پر نقصان برداشت کرنے یا کسی معاملہ میں ہار ماننے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان کو اگر شرعی فیصلہ میں اپنا نقصان نظر آئے تو وہ کسی مسلمان فیصلہ کنندہ کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کریگا۔

بلکہ متبادل ذرائع تلاش کر کے رائج الوقت قانون میں اپنا سہارا ڈھونڈے گا۔ علاوہ ازیں شرعی طور پر بھی "محکم" کا اختیار چند مسائل تک محدود ہے، قصاص و دیت اور حدود جیسے مسائل نمٹانے کی اہلیت "محکم" میں نہیں۔ اور اگر کہیں کسی فعال اسلامی تنظیم یا دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کی مساعی سے یہ نظام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اس کے اچھے نتائج محسوس ہوں تو یہ مسلمانوں کے سیاسی استحکام کی دلیل ہوگی اور اس سے رائج الوقت حکومت اپنے لیے مستقبل میں خطرہ محسوس کرے گی ممکن ہے کہ اس باہمی تعاون کی وجہ سے مسلمان بعض علاقوں میں اس درجہ میں منظم ہوں کہ ان کے پاس معاشرتی میدان میں عملی طور پر قوتِ تنفیذی حاصل ہو اور مسلمان جبری طور پر اسلامی فیصلہ ماننے کیلئے تیار ہوں۔ یہ صورت اگرچہ بذاتِ خود بہت اچھے نتائج کی حامل ہے لیکن سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی سرگرمیاں اس سے متاثر ہوسکتی ہیں جس سے غیر اسلامی اقتدارِ اعلیٰ ایسی کامیابی میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرے گا۔

دوسری صورت | ایسے غیر اسلامی ممالک میں مسلمان اپنی ذمہ داری ایک دوسرے طریقے سے نباہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی نظامِ قضاء کے تحفظ کے لیے رائج الوقت قوانین کا سہارا لیں، اور یہ موجودہ وقت میں شخصی قوانین کے تحت قابلِ عمل بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمان محنت کر کے سیاسی میدان میں اتنا مقام پیدا کرلیں کہ حکومت وقت سے اپنے حقوق منوا سکیں، مسلمان ایسے قوانین کے بنانے پر زور دیں کہ رائج الوقت قوانین میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے، یعنی جو مسلمان ہوگا وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے گا، ممکن ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ ہر مسئلہ میں ایسے فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے لیکن بعض امور میں یہ حق ملنا بھی مسلمانوں کے لیے موقع غنیمت سے کم نہیں کیونکہ ما لا یدرک کلہ کا یترک کلہ کے قاعدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو کچھ بھی ہوسکے اس سے روگردانی اور اعراض نہ کیا جائے، ایسی صورت میں علاقائی تحدید کی طرح اگر بعض مسائل تک قاضی کا دائرہ اختیار محدود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نظامِ قضاء میں اس کی گنجائش ہے کہ کسی قاضی کا دائرہ اختیار ایام یا احکام کے اعتبار سے محدود ہو۔ چنانچہ علامہ الماوردیؒ فرماتے ہیں:-

ویجوز انہ تکون ولایۃ القاضی مقصورۃ علی حکومۃ بینھما بین خصمین ولا یجوز انہ ینفذ النظر الی غیرھما من الخصوم وتکون ولایۃ علی النظر بینھما باقیۃ ما کان التشاجر بینھما باقیاً فاذا بت الحکم بینھما زالت ولایۃ .... فلو لم یعین الخصوم وجعل مقصوراً علی الایام وقال قلدتک النظر بین الخصوم فی یوم السبت وحدہ جاز نظرہ فیہ بین الخصوم فی جمیع الاعادی۔

(الاحکام السلطانیہ والولایات ص۲۳) ـــ (ترجمہ) "یہ جائز ہے کہ کسی

قاضی کا دائرہ اختیار کسی خاص افراد کے فیصلہ تک محدود ہو تو ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں، ان مخصوص افراد کے درمیان جب تک یہ معاملہ باقی ہو تو قاضی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے جب ان کا فیصلہ ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو گا۔۔۔۔ اگر طرفین کا تعین نہ ہو بلکہ خاص ایام میں اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، مثلاً یہ کہ تجھے ہفتہ کے دن فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، تو ہفتہ کے دن جملہ فیصلوں کا اختیار اس کو حاصل ہوگا۔"

غیر اسلامی حکومت سے عہدۂ قضاء قبول کرنے کی شرعی حیثیت

اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت سے قضاء کا عہدہ قبول کرنا کہاں تک جائز ہے، کیونکہ اس میں غیر اسلامی حکومت کو دوام بخشنے اور اس سے تعاون کی ایک صورت ہے جو تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کسی مذہبی عقیدہ اور تشخص کے مجروح ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر ایسا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں کہیں (غیر اسلامی) حکومت میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کر کے شرکت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی غیر اسلامی قانون کے ذریعہ جب اسلامی قضاء کو دوام بخشا جائے تو ایسے قاضی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں واجب العمل ہوگا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

ولکن اذا ولی الکافر علیہم قاضیاً ورضیہ المسلمون صحت تولیۃ بلاشبہ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کسی کافر نے مسلمانوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق قاضی مقرر کیا تو اس کی یہ تولیت بلا شبہ جائز ہے۔"

ایسا قاضی مسلمانوں کے لیے وہ تمام امور جاری کر سکتا ہے جو دار الاسلام میں ایک قاضی کے دائرہ اختیار میں ہو۔ چنانچہ شیخ بدر الدینؒ فرماتے ہیں:۔

وکل مصر فیہ وال مسلم من جہۃ الکفار تجوز فیہ اقامۃ الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیہم۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۲ الفصل الاول فی القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقہ جس میں کسی کافر بادشاہ کی طرف سے مسلمان گورنر ہو تو اس میں جمعہ و عیدین کی اقامت، خراج، قضاء کی تقرری اور یتیم بچیوں کی شادی کرانے کا حق حاصل ہے کیونکہ ان پر مقامی طور پر مسلمان کی حکومت ہے۔"

بہرحال کفار کے غلبہ کے وقت ان کی قوت تسلیم کرنا شریعت میں ناجائز نہیں لیکن اگر مسلمانوں کے ترکِ موالات سے کہیں کافرانہ نظام حکومت متزلزل ہو کر اپنی زندگی پوری کرنے کی حالت میں ہو تو پھر کفر کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینا تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے، ایسی حالت میں یہ کشتی کسی سنجیدہ اور باوفا ملاح کے حوالے کرنی چاہیئے تاکہ وہ ان کی بہتری کے بارے میں سوچ سکے ۔

انصاف کی رعایت نہ ہونے کے وقت عہدۂ قضا قبول کرنا جائز نہیں

لیکن یہ طریقہ کسی ایسے غیر اسلامی ملک میں اپنانا اُس وقت مرخّص ہے جب تک حکومتِ وقت ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتی ہو، اگر کہیں ایسی حالت میں مسلمان انصاف قائم نہ رکھ سکتے ہوں تو پھر ظلم وستم کے لیے آلۂ کار نہیں بننا چاہیئے ورنہ اپنا مذہبی تشخص ضائع کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں :۔

ما ذکر المصنف من جواز التقلید من الجائر مقید بما اذا کان یمکنه من القضا بالحق اما اذا لم یمکنه فلا کما فی الهدایة لان المقصود لا یحصل به ۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۲۷۳ کتاب القضاء)

(ترجمہ) ”مصنفؒ نے ظالم سے قضاء قبول کرنے کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، یہ اُس وقت ہے جب قاضی انصاف کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہو، جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر قضاء قبول کرنا جائز نہیں جیسا کہ ھدایہ میں ہے کیونکہ ایسی صورت میں مقصود حاصل نہیں ہوتا۔“

اسلام کا نظامِ عدل وانصاف

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہ

موجودہ دور میں دنیا کے ہر ملک کے حکمرانوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ ہم ہر ایک کو انصاف فراہم کریں گے اور ہمارے فیصلے عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں گے، اس آواز میں مسلم اور غیر مسلم ممالک سب شامل ہیں لیکن آج تک کسی نے بھی عدل وانصاف کے جملہ تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ الٹا نظام عدل وانصاف سے تمسخر کیا۔ دنیا بھر کے تمام نظامہائے قوانین میں ایک اسلام کا واحد نظام قانون ہے جس میں امیر وفقیر، آقا وغلام، بادشاہ ورعایا، چھوٹے بڑے اثر ورسوخ والے کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے، اسلامی قانون کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں تمام فیصلے عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی نظام عدل وانصاف کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے سابق نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے ایک جامع اور پر مغز مضمون تحریر فرمایا جسے دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق نے شائع کیا، اب اس مضمون کو اسلامی قانون وفقہ سے مناسبت کی بناء پر عمومی فائدہ کے لیے "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

لفظ عدل قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر مستعمل ہوا ہے جس کے مقابلہ میں ظلم آتا ہے، اہلِ لغت کے ہاں ظلم "گذاشتن چیزے درغیر محل آں"[1] کو کہتے ہیں۔ ظلم کے اس مفہوم کے اعتبار سے اس میں بہت وسعت موجود ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ گناہ سے لے کر کبائر اور شرک تک کو شامل ہے۔ مثلاً خداوندِ عالم نے جس مقصد کے لیے انسان کو زبان اور قوتِ گویائی دی ہے اگر زبان کا استعمال اس میں نہ ہو تو یہ ظلم ہے، تو ظلم کے مفہومی اعتبار سے اس کے مقابلہ میں بھی اسی جیسی وسعت موجود ہے۔

---

[1] غیاث اللغات ص۲۹۸ ۔

عدل کی ہمہ گیری

اعضاءِ انسانی اور انعاماتِ خداوندی کو اپنے محل میں استعمال کرنا عدل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں قیام عدل کا مطالبہ بنی آدم سے ہوا ہے وہاں عدل سے یہی عمومی معنیٰ مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف عدالت اور حکومت کا فریضہ نہیں ہے، بلکہ ہر انسان اس کا مکلف اور مخاطب ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کیلئے کوشش کرے، ہاں انصاف کا ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے، وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف اڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں اور نہ دوسروں کو انصاف کرنے دیں تو حاکمانہ سزا اور تعزیر کی ضرورت ہے، یہ اقامتِ عدل و انصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑیئے لکھے پڑھے تعلیمیافتہ حضرات بھی سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ ہے عوام اسکے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہ وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک اور سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔“ (معارف القرآن ج ۲ ص ۱، ۵، ۵۲۷)

قیام عدل کے مطالبہ کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبہ سے ہے اور انسان کے اخلاق و کردار (Character) ظاہر و باطن، عبادات و معاملات، سیاست و مذہب، غرض ہر ایک شعبہ میں عدل کا ہونا ضروری ہے۔ اس تعلقِ عامہ کے پیشِ نظر خداوندِ عالم نے جب انبیاء و رسل کو دنیا میں بھیج کر ان کی وجہ سے رُشد و ہدایت کا درس نوعِ انسان کو دینا چاہا تو انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے قیام عدل کا مطالبہ بھی کیا جس کی تکمیل کتبِ سماویہ سے کی گئی ہے قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ یَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورۃ الحدید آیت ۲۵)	ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف سے۔

شیخ الاسلام والمسلمین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

”یعنی کتاب اس لیے اتاری کہ لوگ عقائد اور اخلاق و اعمال میں سیدھے انصاف

کی راہ پر چلیں، افراط اور تفریط کے راستہ پر قدم نہ ڈالیں''۔ (تفسیر عثمانی ص۸)

الغرض بعثتِ انبیاء کے دیگر مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد قیامِ عدل بھی رہا ہے۔

مروجہ بین الاقوامی قوانین اور ان کے نتائج

آج دنیا کی جس قوم پر بھی آپ نظر ڈالیں تو قیامِ عدل کا یہ مطالبہ مختلف نعروں اور مختلف انداز سے سنیں گے۔ کہیں مساوات اور برابری، کہیں انصاف اور حقوق کی بحالی کے عنوان سے عوام و خواص رطب اللسان ہیں مگر عملاً یہ عنقا کے مترادف ہے بلکہ دن بدن جرائم اور مظالم میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، قانون عملاً معطل ہے۔ آج ہر ملک میں قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ اور اسمبلیاں قائم ہیں، جرائم کے انسداد کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جا رہے ہیں لیکن جرائم میں بجائے کمی کے زیادتی ہی ہو رہی ہے ؎

نگاہِ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
میری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

آپ حضرات دو منٹ کے لیے خالی الذہن ہو کر عالمی سطح پر جرائم کے معیار کو دیکھیں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر گذشتہ چھ سالوں میں راہزنی میں ۷۹ فیصد، چوری میں ۴۶ فیصد اور قتل میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ (روزنامہ جنگ ۱۵ر نومبر سنہ ۱۹۸۰ء)

اگر ایک طرف سائنسی دور میں انسدادِ جرائم کے لیے سائنسی آلات استعمال کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف مجرم بھی نت نئے طریقے اختیار کر کے بڑی صفائی سے جرم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے امور ضرور ہونے چاہئیں جو جرائم کی بیخ کنی کرتے ہوئے امن کا معاشرہ (Peaceful Society) مہیا کریں، آپ اقوامِ عالم کے مذاہب اور عقائد کو بھی دیکھ لیں، نام نہاد ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کا مطالعہ کریں، مگر یقین کیجئے کہ اس کا واحد علاج آپ کو آج سے چودہ سو سال پہلے کوہِ صفا پر یَآ اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا کے داعی کے دیئے ہوئے نسخۂ کیمیا میں ملے گا جہاں مجرم جرم کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف اور اعلان کر کے قانون اور انصاف کا مطالبہ کرتا نظر آئے گا۔

نظامِ عدل کا مرکزی نکتہ

اسلام میں قیامِ عدل کا بنیادی نکتہ (Basic Point) خوفِ خداوندی ہے جس کا تعلق فرد سے لے کر معاشرہ تک

اور رعیت سے لیکر بادشاہ تک ہے، اگر دل و دماغ میں خوفِ خدا موجود ہو اور نظریہ یہ ہو کہ آج میں جو کام کر رہا ہوں کل قیامت کے روز دربارِ خداوندی میں مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی اور مجھے ضرور حساب دینا ہوگا۔ تو اس عقیدہ کے بعد ہر انسان قدم بقدم خیال رکھے گا کہیں مجھ سے ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو قیامت میں خسارہ اور ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔

عدالت میں عدل کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم اور مجسٹریٹ کا اگر یہ عقیدہ ہو اور سامنے ندامت اور پشیمانی کے عالم میں کھڑے ہوئے مجرم بھی خوفِ خداوندی کے ہتھیار سے مسلح ہوں تو یقین کیجئے کہ ظلم و ناانصافی کا نام ہی عالم سے فنا ہو جائے گا۔ مگر یاد رہے کہ یہ صرف خیالی یا فرضی تصوّر نہیں ہے بلکہ اسلام اور ہمارے اسلاف کی تاریخی زندگیوں میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں۔

حضرت ماعزؓ کا واقعہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ماعزؓ بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے، آپؐ نے فرمایا اے ماعز لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کر، راوی کہتا ہے کہ ماعزؓ قدرے دور گئے تھے کہ پھر لوٹ آئے اور پھر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول مجھے پاک کیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا، تین بار ایسا ہی ہوا، چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کی زنا سے، حضور نبی کریمؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر ماعزؓ کے منہ کو سونگھا تو اسے اس سے شراب کی بو نہ آئی۔ آپؐ نے ماعزؓ سے پھر پوچھا کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے عرض کی ہاں مجھ سے زنا ہوا ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی تین ہی دن گذرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا ماعز بن مالکؓ کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو سب کیلئے کافی ہے۔ (ترجمۃ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام صـ ۲۶۶، ۲۸۹)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں ہی قبیلہ ازد کے بطن غامد کی ایک عورت نے بھی اقرارِ جرم کیا تھا جس کے باعث آپؐ کے حکم سے اُسے بھی سنگسار کر دیا گیا۔

رات کی تاریکی میں خوفِ خدا کا اثر

خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے جب ایک ایسے مکان کے قریب سے گذرے

جہاں والدہ اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ میں دودھ میں پانی ملاؤں گی لیکن بیٹی انکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ حضرت عمرؓ کا حکم ہے کہ دودھ میں ملاوٹ نہ کرو، والدہ کہتی ہے کہ عمرؓ اس وقت کون سا یہاں ہے؟ بیٹی جواب دیتی ہے کہ اگرچہ عمرؓ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے لیکن اس کا خدا جو کہ علیم و خبیر ہے وہ تو موجود ہے۔

اسلامی تاریخ نے خوفِ خداوندی کے اس جذبہ سے شدتِ احساس کے اتنے نمونے اکٹھے کر رکھے ہیں کہ ان کا بالاستیعاب احصاء کرنا انسانی بس کی بات نہیں ہے۔

عرض کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ قیامِ عدل کے لیے خوفِ خداوندی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخرات کی تاریکی میں گھر کی چار دیواری کے اندر اس خداترس لڑکی کو دودھ میں ملاوٹ کرنے سے باز رکھنا، ماعز بن مالکؓ کا اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہو کر بارگاہِ نبوت سے بار بار واپس کرنے کے باوجود لوٹ لوٹ کر اپنے جرم کا اقرار کرنا، آخر کون سے جذبہ سے یہ لوگ سرشار تھے؟ یہ وہی جذبہ ہے جسے ہم خوفِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

موانع عدل عدل کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے واضح طور پر ان امور کی نشاندہی کر دی ہے جو قیامِ عدل کے لیے سب سے بڑے موانع اور رکاوٹیں ہیں، خاص کر شہادت اور قضا میں یہ امور انسان کو انصاف سے ہٹا کر ظلم پر آمادہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اور وہ درج ذیل ہیں:

(۱) قرابت Relation (۲) عداوت ENMITY (۳) مال و دولت Wealth

قرابت: بسا اوقات ایک انسان تعلقات، قرابت اور رشتہ داری کے ماحول سے متاثر ہو کر درست اور صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً گواہ اپنی شہادت میں ان تعلقات کی بنا پر جھوٹ بول کر ناجائز اور غیر مشروع امور کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، افسر مجاز اپنے بالا افسران کے رعب سے غلط کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس طرح عدل کو چھوڑ کر ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

قرآن مجید میں اس امر کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔ (سورة ——)	اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔

شہادتِ حق اور قرابتیں

خداوند عالم نے ایمان والوں کو مخاطب کرکے فرمایا:۔ "اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے رہو اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابل ہو"۔ (بیان القرآن)

گویا قانون اور انصاف کے سامنے رشتہ داری اور قرابت کوئی روک نہیں، والدیت اور ولدیت کے محبوب رشتوں کو بھی قربان کرنا ہو گا، خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اس کے راہنما اصول اور عملی نشانِ راہ موجود ہیں۔

حضرت اُسامہؓ کی سفارش پر دربارِ نبوت کا ردِعمل

ام المومنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے قبیلہ مخزومی کی ایک عورت سے چوری سرزد ہو گئی، قریش نے باہمی مشورہ کیا کہ اس عورت کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سے بچانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں سفارش کر دینی چاہیئے، اس کام کے لیے سب نے حضرت اسامہؓ کو منتخب کیا کیونکہ وہ رسول اللہ کے محبوب رفیق تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس نظرِ شفقت سے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تھے حضرت اسامہؓ بھی اسی طرح آپؐ کے منظورِ نظر تھے) حضرت اسامہؓ نے جب سفارش کی تو بارگاہِ نبوت سے جلال آمیز ارشاد صادر ہوا۔

اتشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فاختطب فقال یاایھا الناس انما اھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔

(دعوات حق جلد اول ص۹)

کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! بیشک تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی نادار چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے، خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی (خدانخواستہ) چوری کرتی تو میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹتا۔

ایک انسان جب کسی اعلیٰ عہدہ اور مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کے تعلقات اور رشتہ داری بڑھ جاتی ہے، اجانب اقارب بن جاتے ہیں، مدتوں سے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑ جاتے ہیں، لیکن

مسلمان سے مذہب اسلام کا یہی مطالبہ ہے کہ قانونِ شریعت کے مقابلہ میں کسی کو بھی ترجیح نہ دی جائے۔

عدل فاروقی کی ایک جھلک

خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کے مبارک دور میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حکمرانوں کے اعزا اور اقربا کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں امتیازی مقام حاصل ہو۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جب شراب پی لی تو اس پر بھی حد جاری کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ الادارۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص ۲۴۴ نیز حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار قدامہ بن مظعون (جو آپ کے سالے اور معزز صحابی تھے) کو بھی شراب نوشی کے جرم میں اسّی کوڑے لگوائے۔ (تاریخ اسلام ص ۲۰۷)

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی سے گھوڑے کا سودا طے کیا، پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سوار ہونے لگے تو گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا، حضرت عمرؓ نے چاہا کہ گھوڑا اس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا، دونوں مقدمہ لیکر قاضی شریح کی عدالت میں گئے، قاضی نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد فرمایا:۔

> "امیرالمؤمنین! جو چیز آپ نے خریدی ہے اُسے لے لیجئے ورنہ جس حال میں خریدی تھی اُسی حال میں واپس کیجئے۔"

یہ سنکر حضرت عمرؓ بول اٹھے "اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا" پھر آپ نے شریح کو عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ (تاریخ اسلام ص ۳۴۴)

امیرالمؤمنین قاضی کی عدالت میں

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مقدمہ میں فریق بن کر عدالت میں حاضر ہوئے، فیصلہ امیرالمؤمنین کے خلاف ہوا اور آپ اسے محسوس نہیں کرتے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ:۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ گر گئی جو ایک نصرانی کے ہاتھ لگ گئی، حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، نصرانی کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کی اپنی زرہ ہے، قاضی شریح نے حسبِ قاعدہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے دو گواہ ایک اپنا بیٹا اور دوسرا اپنا آزاد کردہ غلام قنبر کو حاضر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں بیٹے کی گواہی والد کے لیے درست تھی، لیکن قاضی شریح

نے فرمایا کہ آپ کے بیٹے کی گواہی آپ کے لیے درست نہیں ہے' اور دوسرا گواہ جو کہ آزاد کردہ غلام ہے اور اس ایک گواہ کی گواہی سے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

چنانچہ زرہ کا فیصلہ نصرانی کے حق میں ہوا، اس فیصلے کا نصرانی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور زرہ حضرت علیؓ کو واپس کر دی، لیکن حضرت علیؓ نے دوبارہ زرہ اسے دیدی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی اسے عنایت فرمایا۔ (نورالانوار ص ۲۲۲)

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نظام عدل کے قیام میں انسان کو کسی سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ آقا اور غلام، امیر اور غریب، حاکم اور محکوم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آج اگر کوئی افسر بالا ماتحت افسر کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو معلوم نہیں اس انصاف کی وجہ سے اس فیصلہ کرنے والے کو کیا کیا سزائیں ملیں گی۔ اگر کسی خوف کی وجہ سے معزول نہ کرے لیکن انتقام کی آگ ہر وقت محکوم علیہ کے ذہن میں سلگتی رہے گی اور فیصلہ کرنے والا انتظار کی گھڑیاں شمار کرتا رہے گا۔

انصاف کی نظر میں عمر فاروق اور ایک عام آدمی برابر ہیں

لیکن اسلام کے شیدائیوں کو جہاں حق بات نظر آئی وہاں اپنے خلاف فیصلہ پر بھی راضی اور خوش رہے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا حضرت ابی بن کعبؓ سے کچھ نزاع ہو گیا، حضرت ابی بن کعبؓ نے زید بن ثابتؓ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا، حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت زیدؓ نے آپ کی تعظیم کی' اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق ابی بن کعبؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور حضرت عمرؓ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ ابی بن کعبؓ نے قاعدہ کے موافق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی تو زید بن ثابتؓ نے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ امیر المؤمنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمرؓ اس ترجیحی سلوک پر آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا کہ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں اس وقت تک تم منصب قضا کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (کنز الاعمال جلد ۳ ص ۱۷۴)

اسلامی نظام عدل نے شاہان وقت کو بھی معاف نہیں کیا

ان مثالوں اور واقعات کا تعلق صرف خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور سے خاص نہیں ہے بلکہ حقانیت اور حق گوئی کا یہ جذبہ ہمیشہ اسلاف اور بزرگان دین

کا شیوہ رہا ہے، جہاں حق بات نظر آئی وہاں بادشاہِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا۔

قاضی ابو یوسفؒ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں، ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ پیش کرتا ہے کہ عباسی بادشاہ ہادی سے ایک باغ کے بارے میں میرا جھگڑا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ رائے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ گواہ بادشاہ کے پاس ہیں، انہوں نے کہا مدعی کا مطالبہ ہے کہ ہادی قسم کھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں، ہادی نے قسم کھانے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کیا اور باغ اپنے مالک کو واپس کر دیا۔

عداوت: دوسری چیز جو نفاذِ عدل کے لیے مانع ہے اور انسان کو ظلم اور ناانصافی کی طرف لے جاتی ہے وہ عداوت اور آپس میں دشمنی ہے، قرآن مجید نے اس امر کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى
اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ۭاِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ
لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(سورۃ المائدہ آیت ۸)

کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو اور عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اہلِ اسلام کا طرۂ امتیاز

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:۔

> ”عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے، عدل اور انصاف کا ترازو ایسا صحیح اور برابر ہونا چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو جھکا نہ سکے“۔ (تفسیر عثمانی ص ـــ)

اور یہی وہ رسم ہے جس کو اہلِ اسلام نے ہمیشہ کے لیے قائم رکھا، مفتوحہ علاقوں میں اسلام کا برتاؤ ہمیشہ کے لیے انسانیت پر مبنی رہا، معاملات اور دیگر حقوق میں غیر مسلموں کو پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

اہلِ مغرب کا سفاکانہ کردار

ہم جب اقوامِ عالم اور ایامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ دیگر مذاہب اور ادیان والے غیر مذہب والوں سے چوپایوں جیسا سلوک بھی روا نہیں رکھتے، اور صرف یہ نہیں

بلکہ اسلام کا مقابلہ اگر دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے کیا جائے تو یقیناً اسلام اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع اور بلند و پاکیزہ نظر آئے گا۔

اہلِ مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گذر چکا ہے جس میں اندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔

اہلِ مغرب نے اپنے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کو آگ میں جلانے تک کی سزا کو جائز رکھا، اور یہی وجہ تھی کہ مذہبی دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے دشمنوں کو بلا وجہ وہ سزائیں دیں جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں مل سکے گی۔

ان عدالتوں اور احتساب کے محکموں نے ایک اندازے کے مطابق ۳۲ ہزار انسانوں کو زندہ جلایا جن میں ہیئت اور طبیعات کے مشہور عالم برونو (Brunoe) اور گلیلو (Galtlio) کو بھی یہی سزا دی گئی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص۲۶۴، ص۲۶۵)

اہلِ مغرب نے کسی مفتوحہ علاقہ میں مخالفین کے وجود کو دیکھنا بھی برداشت نہیں کیا جس علاقہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوتے وہاں اعلان کرتے کہ جو ہمارے خیالات اور نظریات سے متفق نہیں وہ ہمارے ملک سے نکل جائے۔ جیسا کہ فرانسیسی جنرل کاسترو نے سنہ ۱۹۴۰ء میں دمشق کے گذشتہ انقلاب کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں جس کو ہماری حکومت پسند نہ ہو وہ یہاں سے نکل جائے"۔

اور اس سے ملتی جلتی بات جنرل کاسترو کے ایک ہم مشرب نے سنہ ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص۳۲۵)

روسی کمیونسٹوں کا مسلم اقلیت سے ظالمانہ سلوک

موجودہ دور میں دوسری عظیم طاقت روس کا کمیونسٹ بلاک تو غیر کمیونسٹوں کے وجود کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، مذہبی رسوم اور عبادت خانوں کو ختم کرنے کا خواہاں ہے، اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک کا اندازہ آپ روسی مسلمانوں کی مساجد اور مدارس سے کیے ہوئے حشر سے لگا سکتے ہیں۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کے ۲۵ ہزار مدارس تھے لیکن کمیونسٹ انقلاب کے بعد یہ مدارس بند کر دیئے گئے اور اساتذہ کو گرفتار کر لیا گیا، مدارس کی وہ عمارتیں جن میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں بعض کو مسمار اور بعض کو ضبط کر کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا، اور پچیس سال کے عرصہ میں ایک بھی مذہبی مدرسہ نہ رہا۔

یہی حال مساجد کا تھا، ۳۱ ہزار مساجد آباد تھیں لیکن ۱۹۴۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اب پورے روس میں صرف ۱۳۱۲ مساجد رہ گئی ہیں باقی سب کو شہید کر دیا گیا۔ (تاریخ میں مسلمان قومیں ص۔۔۔)

برطانوی دور کے مظالم

روس اور یورپ تو درکنار خود اس پاک و ہند کی تاریخ کو دیکھئے برطانوی گورنمنٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟

کراچی کے مقدمہ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین کا آخر جرم کیا تھا؟ صرف اس قدر کہ مذہب اسلام کے مطابق مسلمان سپاہیوں کو ترکی کی مسلمان افواج کے مقابلہ میں استعمال نہ کیا جائے۔

ان واقعات اور حالات کو پیش کرنے سے میرا واحد مقصد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب نے اقلیت اور دشمنوں سے وہ کون سا ناروا سلوک ہے جو روا نہ رکھا ہو، عداوت اور دشمنی کی بناء پر وہ کونسی بے انصافی ہے جو استعمال نہ کی گئی ہو۔

دشمنوں سے اسلام کا روادارانہ سلوک

مگر اسلام نے اپنے مخالفوں اور اقلیت سے جو حُسنِ سلوک کیا اس کا اندازہ آپ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل اور کردار سے کر سکتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، ذمیوں کے لیے باقاعدہ حقوق مقرر کئے گئے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی اسی اصول کو اپنایا گیا، یہاں تک کہ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو وہی حقوق دیئے جو ان کیلئے تاجدارِ حرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیے تھے۔

حقوق کی اقسام

کسی قوم کے حقوق صرف تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ جاؔن، ماؔل اور مذہبؔ۔ ان کے سوا اور جتنے بھی حقوق ہیں وہ سب ان ہی کے تحت آجاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے عادلانہ دور میں بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدہ میں انہیں جو حقوق دیئے گئے تھے وہ یہ ہیں:۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے اہلِ ایلیا کو دی۔ یہ امان جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذہب کے لیے ہے، نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان

پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔"

(طبری، فتح بیت المقدس، بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

اور یہ حقوق صرف ایلیا والوں سے مخصوص نہیں تھے بلکہ پوری دنیا میں مسلمان جہاں بھی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والوں کو یہ حقوق دیئے۔ اہلِ جرجان کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ان کی جان، مال، مذہب و شریعت سب کو امان ہے ان میں سے کسی شے میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

آذربائیجان کے معاہدہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ تھے:۔

"انکی جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

دورِ صدیقیؓ کے عہد نامے

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی حیرہ کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ یہ حقوق دیئے گئے:۔

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کیے جائیں اور نہ ان کا کوئی قصر گرایا جائے گا جن میں وہ ضرورت کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی اور نہ مذہبی تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

اور یہ بات صرف کاغذی کارروائی تک محدود نہ تھی بلکہ خلفائے راشدین ہمیشہ کیلئے ماتحت گورنروں کو اس کے متعلق ہدایات جاری فرمایا کرتے تھے، غیر مسلموں سے وہی سلوک برتا جاتا تھا جو سلوک مسلمانوں سے روا رکھا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے، جب سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جزیہ ادا نہیں کیا گیا، پوچھا گیا کیوں؟ جواب ملا سبب ناداری ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو لوگ دنیا میں دوسروں کو عذاب دیتے ہیں خدا انہیں قیامت

کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسفؒ)

نادار، مفلس اور معذور ذمی جزیہ سے مستثنیٰ تھے بلکہ بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی، چنانچہ حیرہ کے معاہدہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

”اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے یا کوئی آفت آئے یا دولتمندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔“
(کتاب الخراج للقاضی ابویوسفؒ)

حضرت عمرؓ کا ایک لطیف استدلال

یہ معاہدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا اور عہدِ فاروقی میں اس پر باقاعدہ عمل جاری رہا بلکہ حضرت عمرؓ نے تو قرآنی استدلال سے اس کو اور زیادہ مؤکد کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک ضعیف ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میں ادا نہیں کر سکتا، یہ سنکر حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد رقم دیکر داروغہ کو پیغام بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اور فرمایا کہ کلام اللہ کی یہ آیت

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاکِیْنِ میں فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں، اور فرمایا خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے کہ ان کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسف)

حفاظتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ باقاعدہ اس سے قصاص لینے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر کے اس سے قصاص لیا۔ (المدرایة بحوالہ تاریخ اسلام)

حفاظتِ مال کے بارے میں اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی کسی جائیداد یا مال کو نقصان پہنچاتا تو حضرت عمرؓ اس کا معاوضہ بیت المال سے دلاتے۔ جیسا کہ ایک دفعہ اسلامی لشکر نے شام کے ایک ذمی کی زراعت کو پامال کیا تو حضرت عمرؓ نے اس ذمی کو بیت المال سے دس ہزار درہم کا معاوضہ دلایا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسف)

ذمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خصوصی ہدایت

حضرت عمرؓ جس طرح خود ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کرتے تھے ایسے ہی ماتحت گورنروں سے بھی کرواتے، چنانچہ فاتح شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو لکھا کہ۔

> "مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کے مال کھانے سے روکو اور ان سے جو شرطیں طے کی گئی ہیں انہیں پورا کرو۔"
>
> (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

بلکہ حضرت عمرؓ دنیا سے جاتے وقت آئندہ خلیفہ کے لیے جو ہدایات لکھتے ہیں ان میں ذمیوں کے حقوق اور ان کی نگہداشت کا خصوصی تذکرہ موجود ہے۔

> "میں ان لوگوں کے حق میں جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا جائے، اس کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ انہیں تکلیف نہ دی جائے۔" (تاریخ اسلام ص۲۲۶)

یہی وہ اسلامی عدل وانصاف ہے جس میں دوست اور دشمن کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے وہ دشمن جو بدترین دشمن تھے، جو مذہب اور عقیدہ کے دشمن تھے اُن سے جب اس قدر انصاف قائم رکھا گیا تو اور کون ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اسلام نے ظلم کی گنجائش رکھی ہو؟ ان واقعات سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے اس فرمانِ خداوندی پر "کسی قوم کی دشمنی تم کو ظلم پر آمادہ نہ کرے" کا حقہ عمل کیا ہے اور امتِ محمدیہ کے لیے قیامت تک ایک عملی نمونہ چھوڑا ہے۔

وہ دشمن جو اپنے کیے ہوئے افعال و کردار کی وجہ سے بڑی بڑی سزاؤں کے مستحق و منتظر تھے، ندامت اور پشیمانی کی وجہ سے ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی جانیں خطرے میں دیکھتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس کے برعکس ان کی جان کی حفاظت کے علاوہ مال و مذہب کو بھی محفوظ رکھا اور معاشرہ میں ان کو انسانیت کی نظر سے دیکھا گیا۔

مال و دولت: تیسری چیز جو قیامِ عدل وانصاف میں مانع ہے وہ مال و دولت کی فراوانی یا فقدان ہے۔ مثلاً ایک انسان بسا اوقات کسی غریب کی غربت کو دیکھ کر اس پر ترس کھا کر اس کیلئے جھوٹی گواہی دیتا ہے یا پھر غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ اس کے حق میں کر جاتا ہے جس میں ظلم اور زیادتی کا ارتکاب ہوتا ہے، جبکہ آجکل ہمارے معاشرہ میں یہ بہت کم ہوا ہے کہ لوگ غریب

کی غربت سے متاثر ہوئے ہوں۔ دوسری صورت میں انسان بعض اوقات مالدار کی مالداری کی وجہ سے ظلم پر آمادہ ہوجاتا ہے، مالدار سے کچھ طمع اور امید کی خاطر گواہ جھوٹی گواہی دے کر حاکم سے غلط فیصلے کا حکم صادر کراتا ہے جو یقیناً ظلم اور ناانصافی ہے، قرآنِ مجید نے اس کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ

(سورۃ النساء آیت ۱۳۵)

اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیرخواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو خواہش کی انصاف کرنے میں۔

شہادت کے اصول

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

"یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو جو حق ہو، سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ اور ان کے مصالح واقف ہے اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" (

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہیئے تاکہ اس سے بے مروّتی نہ ہو، یا یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کر دیں۔ تم گواہی دینے میں کسی کی امیری، غریبی یا نفع ونقصان نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی، اگر امیر ہے تو، غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالےٰ نے ان کی مصلحت اس میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے، تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو۔" (بیان القرآن)

چونکہ شہادت اور فیصلہ دونوں میں تسلط علی الغیر موجود ہے، جب گواہی دیتے وقت گواہ ان امور کو مدنظر رکھے گا تو قاضی اور فیصلہ کرنے والا حاکم بطریقِ اولیٰ ان امور کا پابند رہے گا۔

قاضی اور حاکم فیصلہ کرتے وقت جیب بھرنے کی انتظار میں نہیں بیٹھے گا بلکہ جو حق ہوگا اس کا امضاء کرے گا۔ اسلامی قوانین انصاف کی راہ میں حائل اس مانع اور رکاوٹ کا سخت نوٹس لیا گیا ہے جب صاحب عہدہ کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو تو اپنے اس منصب سے غلط فائدے نہیں اٹھائے گا، ایسی پارٹیوں (دعوتوں) میں شمولیت سے اجتناب کرے گا جو پارٹیاں صرف اس کے عہدہ کی وجہ سے اس کو دی جاتی ہوں۔

رشوت کی اقسام اور ان کے احکام

یہی وجہ ہے کہ رشوت کی تمام اقسام کو لینے والے کے لیے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اور رشوت کا مال قبض کرنے سے بھی ملکیت میں نہیں آسکتا بلکہ رشوت میں لیا ہوا مال صاحب مال کو واپس کرنا واجب ہے۔ اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ رشوت کی جملہ اقسام اور ان کے احکام کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

فقہاء کرام کے فرمان کے مطابق رشوت کی چار قسمیں ہیں:-

(۱) رشوت کی پہلی قسم جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں' یہ ہے کہ کسی ایسے منصب پر فائز ہونے کے لیے رشوت دے جس منصب کا یہ اہل نہ ہو، چونکہ غیر اہل کا کسی منصب پر فائز کرنا اور فائز ہونا دونوں ناجائز ہیں لہٰذا اس ناجائز کام کے لیے رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں۔

(۲) دوسری قسم رشوت کی یہ ہے کہ کسی فیصلہ کرنے والے حاکم، قاضی، جج یا مجسٹریٹ کو کچھ رقم یا کوئی اور چیز اس لیے دی جائے کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے' یہ بھی طرفین کے لیے حرام ہے۔

(۳) رشوت کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم یا کوئی چیز اس لیے دی جائے کہ اس سے اپنا جائز کام کرایا جائے، لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ کام جائز ہونے کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے شخص کی حق تلفی کا سبب اور ذریعہ نہ ہو' لہٰذا ان شروط کے بعد رشوت دینے کی تو اجازت ہے لیکن رشوت لینا اس صورت میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم اس لیے دی جائے تاکہ اس کے شر اور فساد سے محفوظ رہا جا سکے۔ اپنی جان سے ظلم اور فساد کے دفع کرنے کے لیے کسی کو کچھ دینا تو جائز ہے لیکن لینا اس صورت میں بھی حرام ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱۴ ص ۳۵۳، ۳۵۴)

جب ایک گواہ اور ایک حاکم یہ نظریہ قائم کرلے کہ مجھے کسی بھی مالدار سے کوئی سروکار نہیں، نہ وہ چائے پانی کے انتظار میں ہو اور نہ بخشش کی طمع اور لالچ میں، تو یہ ممکن ہی نہیں

کہ وہ کسی مالدار شخص کی وجہ سے اس سے کسی قسم کی رعایت کرے۔ اسلام میں تو آقا اور غلام، امیر اور غریب سب برابر ہیں۔

شرعی عدالت میں شاہ و گدا برابر ہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاں کہیں امیر اور غریب کے اس امتیازی سلوک کو دیکھتے تو اس سے منع فرماتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان تمام بے جا امتیازات کو مٹا کر شاہ و گدا، بلند و پست کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا تھا جس کی ایک جھلک اس واقعہ میں موجود ہے کہ،۔

شام کا ایک نامور بادشاہ جبلہ غسانی مسلمان ہو گیا تھا، ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا، جبلہ نے غصہ میں آکر اس شخص کو تھپڑ مارا، اس شخص نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے جیسا کیا ویسا پایا۔

جبلہ نے جواب میں کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔

جبلہ نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے تو میں اس سے باز آتا ہوں لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ (تاریخ اسلام)

آج دنیا میں یہ نظارہ موجود ہے، معاشرہ مختلف قسم کی بے ضابطگیوں کا شکار ہے، امیر اور غریب ایک دوسرے کے مدمقابل بنے ہوئے ہیں۔ امیر اپنے آپ کو مال کی کثرت کی وجہ سے مختلف جرائم کا ارتکاب کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہے، جرم کو معیوب نہیں سمجھتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ بات معلوم ہوگی کہ امراء کو صرف مال کی بہتات کی وجہ سے بے جا رعائتیں دی گئی ہیں، یہ اس کے نتائج اور اثرات ہیں جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہیں۔

قاضی عدالتوں کو کتاب و سنّت کا پابند کرانا ہوگا

۹ فروری ۱۹۸۳ء کو مجوزہ قاضی عدالتوں کے مسودہ پر عام بحث میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا :-

مولانا سمیع الحق | نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، امّا بعد!

جناب چیئرمین | جہاں تک قاضی کورٹس کے قیام کے سلسلہ میں حکومت کے اور جناب صدر پاکستان کے ارادوں اور عزائم کا تعلق ہے تو اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا سب سے بڑا اور پہلا فریضہ اس ملک کے شہریوں کو عدل و انصاف آسانی سے مہیا کرنا ہوتا ہے، یہ مسلمانوں کی مدتوں سے ایک آرزو ہے، خاص کر ملکِ عزیز پاکستان کے شہریوں کی کہ یہاں انصاف سستا ہو جائے، اس سلسلہ میں جو اصل مسودہ قانون ہے اور جو ہمارے سامنے ہے ایک تو اس کے بارے میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ شاید پہلے سے علماء اور اسلامی علوم پر عبور رکھنے والے حضرات کی نگاہ سے گذرا ہے، حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی اس پر اسلامی نظریاتی کونسل جو کہ ملک کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء پر مشتمل ادارہ ہے جس میں وکلاء بھی شامل ہیں، اُن سے کوئی استصواب رائے اس بارہ میں نہیں کیا گیا، دوسرا مرحلہ جو اصل مسودۂ قانون پر بنیادی توجہ کا تھا وہ یہ تھا کہ ہم قاضی کورٹس تو قائم کرتے ہیں جو بلاشبہ ایک نہایت مستحسن اقدام ہے، لیکن اصل مسودے میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کیا گیا کہ یہ عدالتیں کن قوانین کے تحت فیصلے کریں گی؟ یہی مروّجہ قوانین، یہ فوجداری اور دیوانی ضابطے اور یہی پروسیجر اگر قائم رکھنا ہے تو اگر ہم قاضی کا نام جج رکھ دیں اور جج کا نام قاضی رکھ دیں اس سے تو عدالت اسلامی عدل و انصاف مہیا نہ کر سکے گی اور نہ ہی عوام کو عدل و انصاف مل سکے گا، ہم اگر قاضی کو قاضی محمد احمد کہیں یا قاضی نکلسن کہیں یا قاضی ہر بندرائے کہیں، اس سے انصاف نہیں ملتا، یہاں اصل مسودۂ قانون میں یہ وضاحت ہونی چاہیئے تھی کہ......

اخوندزادہ بہرور سعید | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! یہ قاضی کی توہین ہے ان کو کہیں کہ اپنے الفاظ واپس لیں۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! یہ قاضی کی توہین نہیں ہے۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید جناب والا! یہ قاضی محمد احمد، یا قاضی نکلسن یا قاضی ہربند رائے، یہ قاضی کی توہین ہے، ان کو کہیں کہ یہ اپنے الفاظ واپس لیں، یہ قاضی کی توہین ہے۔

مولانا سمیع الحق کون سی توہین میں نے کی ہے؟

اخوندزادہ بہرہ ور سعید یہ قاضی نکلسن کیا ہوتا ہے؟

مولانا سمیع الحق آپ جسٹس نکلسن کہیں یا قاضی نکلسن کہیں بات ایک ہی ہے۔ اگر اس کے پاس قانون وہی ہوں جو موجودہ دیوانی یا فوجداری عدالتوں کے ہوتے ہیں یعنی انگریزی قانون ہو اور آپ اس کو علامہ نکلسن کہیں یا مولانا نکلسن کہیں یا جسٹس نکلسن کہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بنیادی بات سب سے پہلے یہی تھی کہ اصل مسودۂ قانون میں یہ واضح ہونا چاہیے تھا کہ یہ تمام عدالتیں قرآن کے مطابق فیصلے کریں گی۔ یہاں متفرقات کے ضمن میں جو تعبیر کے عنوان سے کہا گیا ہے کہ اس سے آرڈیننس کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے قاضی عدالتیں قرآن پاک اور سنتِ رسول میں مقرر کردہ اسلام کے احکام سے راہنمائی حاصل کریں گی۔ یہ قرآن اور سنت کے ساتھ ایک صریح مذاق ہے، راہنمائی کے لفظ سے قاضی عدالتوں کے قیام کے مقاصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

سید معین الدین پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! THIS IS A MIS STATEMENT OF CLEARLY، اس میں سیکشن نمبر ۵۳ اور ۶۴ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہو سکتی، دو سیکشن میں ایک نہیں دو سیکشن ہیں ۵۳×۶۴۔

اطلاقِ قوانین کے لیے راہنمائی نہیں پابندی لازمی ہے

مولانا سمیع الحق : ایک بار دو حوالے دے رہا ہوں، اسی کے متعلق کچھ عرض کر رہا ہوں۔ اس میں ایسی بات نہیں ہے۔ ابتداء میں یعنی مسودے کے آغاز میں جس قسم کے الفاظ ہیں اس میں یہی درج ہے اور یہاں بھی یہی ہے کہ عدالتیں راہنمائی حاصل کریں گی۔ اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے، آپ قانون دان ہیں، وکلاء حضرات کو بھی پتہ ہے کہ اس سے کوئی قانون اسلامی قانون نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہم تمام آئینوں میں ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قراردادِ مقاصد لکھ دیتے ہیں اسی طرح قراردادِ مقاصد کی طرح یہ بھی ایک ابتدائیہ ہے، تو یہ ایک لازمی اور ضروری شرط ہے کہ تمام قوانین کا اطلاق جو ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو گا، اور کوئی طریقۂ کار دیوانی اور فوجداری ضوابط ہوں کہیں بھی قرآن و سنت کی مخالفت بالکل نہیں کی جائے گی۔ اصل قانون جس کو کہتے ہیں جب تک اسے قرآن و سنت کے مطابق نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک

شرعی عدالتیں حق اور انصاف کے طریقہ پر نہیں بنائی جاسکتیں ۔

اس لیے دوسری عرض یہ ہے کہ اصل مسودۂ قانون جس پر ہمارے وکلاء حضرات اور دوسرے دوستوں کے جو خدشات تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ خدشات بالکل بے جا ہیں یہاں اسلامی نظام عدل کا نام لینے والوں نے کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ ان کا یہ ارادہ ہے کہ یہاں عدالتوں میں وکلاء کی جگہ یا مجسٹریٹوں کی جگہ پر علماء قبضہ کر لیں، مقصد ہمارا صرف یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام اور اسلامی عدل و انصاف کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو اسلامی قوانین جاری کرنا ہوں گے اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی اور اس کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد لاء کمیشن کے سامنے مسودہ قانون آیا اور لاء کمیشن کے بعد ہماری فاضل سلیکٹ کمیٹی نے جناب منٹو صاحب کی سرکردگی میں اس رپورٹ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں۔

تو اس پر میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، غالباً مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے جسم پر بھی شیر کا نقشہ یا تصویر ہونی چاہیئے، تو وہ اس قسم کی چیزیں جسم پر بنانے والے ایک شخص کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میرے جسم پر شیر کی شکل بنا دو، تو گودنے والے نے شیر کی شکل بنانے کی غرض سے جب اُسے سوئی چبھوئی تو اس شخص کو تکلیف ہوئی، وہ چیخا کہ یہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ شیر کی تصویر بنا رہا ہوں، اُس نے کہا اِس وقت کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ مثال کے طور پر اس کے سینگ بنا رہا ہوں، مثال کے طور پر اُس نے کہا کہ ارے بھائی شیر بغیر سینگ کے بھی ہو سکتا ہے اس سینگ کو چھوڑ دیئے۔

جناب زیڈ اے سلہری | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! شیر کے تو سینگ نہیں ہوتے یہ مثال ہی غلط دے رہے ہیں تو ان کی بات کو کیسے صحیح مان سکتے ہیں وہ بھی غلط ہی ہوگی، دیکھئے کہتے ہیں کہ شیر کے سینگ بنا رہا تھا۔

مولانا سمیع الحق | شیر یا کوئی دوسرا جانور، میں نے کہا ہے کہ مثال کے طور پر۔ بہر حال میں نے گدھے کا نام تو نہیں لیا، کیا تکلیف ہوگئی ان لوگوں کو، جیسے مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ ”گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونا“ تو کیا واقعی گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ — بہر حال جب اُس نے دوبارہ سوئی چبھوئی شروع کی تو اس شخص نے کہا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ دُم بنا رہا ہوں، اس نے کہا رہنے دو دُم کو، دُم کے بغیر بھی تو شیر ہو سکتا ہے۔ اور پھر جب اس نے تیسری بار سوئی چبھوئی تو اُسے پھر تکلیف ہوئی، کہنے لگا کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے

کہا کہ شیر کا سر بنا رہا ہوں، کہنے لگا کہ سر کو بھی چھوڑ دو، تو اُس نے سوئی وغیرہ پھینک دی اور کہا بھئی ایسا شیر تو ہم نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا کہ جس کی نہ دُم ہو، نہ سر ہو، نہ پیر ہوں ۔

تو ہماری سلیکٹ کمیٹی نے بھی اس مسودہ کی ایک ایک دفعہ کو ایسا ہی مجروح اور فسخ کر کے پیش کیا ہے

جناب وائس چیئرمین مولانا صرف ایک منٹ باقی ہے ۔

مولانا سمیع الحق اور آج یہ جو بڑھ چڑھ کر سلیکٹ کمیٹی کی تعریف کر رہے ہیں اور اس کی تائید کر رہے ہیں یہ بالکل شیر تو نہیں ایک ڈھانچہ ہے جس پر شیر کا صرف ٹھپہ لگے گا لیکن اس میں توانائی اور شجاعت نہیں ہوگی، تو یہاں ہر اس دفعہ میں ایسی ترامیم کی گئی ہیں جس سے عدل و انصاف مہیا کرنا اور بھی طویل ہو جائے گا ۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید جب وہ شیر کا صرف ڈھانچہ ہے تو یہ اس شیر سے ڈرتے کیوں ہیں؟

مولانا سمیع الحق جناب ہم ڈرتے نہیں ہم اس شیر کو مکمل شیر انشاء اللہ بنا کر چھوڑیں گے ۔

جناب وائس چیئرمین تشریف رکھئے ۔

جناب گرداری لال بھاٹیہ پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! کیا انسانوں کے معاملہ میں جانوروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں ؟

جناب وائس چیئرمین آپ تشریف رکھیں ۔

مولانا سمیع الحق جناب والا! موجودہ جو مسودہ قانون پیش کیا گیا ہے وہ اور بھی اسلامی عدل و انصاف کو دُور کر دے گا، ہمارے معزز رکن جناب عبیدالرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی بالادستی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تو اصل چکر وہی ہے کہ ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت اور پھر اس کے بعد تیسری عدالت کے پاس جائے، جیسا کہ صدر صاحب نے ذکر کیا تھا کہ وہ کہیں پندرھویں صدی میں جا کر فیصلہ ہوگا۔ اس لیے خدا کے واسطے اس کے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالیے اور جو لوگ اس کے منتظر ہیں خدارا ان کے ساتھ تعاون کیجیے تا کہ ان کو عدل و انصاف مل سکے ۔

جناب وائس چیئرمین آپ مسودے کو اچھی طرح سے پڑھیے پھر سمجھ آ جائے گی ۔

مولانا سمیع الحق جناب والا! ہم پڑھ چکے ہیں انشاء اللہ اس کی ایک ایک دفعہ کا کامیاب اپریشن کریں گے ۔

كتاب الشهادة

ومن اظلم ممن كتم
شهادة عنده من الله وما
الله بغافل عما تعملون.

کتاب الشہادۃ

(گواہی کے احکام و مسائل)

سگے بھائی کے لیے گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کی گواہی اپنے سگے بھائی کے حق میں قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائیوں کی املاک چونکہ آپس میں مختلف ہوتی ہیں اس لیے ایک دوسرے کے لیے گواہی دینے میں تہمت لازم نہیں آتی، لہٰذا ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول ہوسکتی ہے۔

وتقبل شهادة الرجل لاخيه وعمه لانعدام التهمة لان الاملاك ومنافعها متباينة ولا بسوطة لبعضهم فی مال البعض۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ کتاب الشهادة باب من يقبل شهادته الخ)

تاہم اگر ان کی املاک ایک ہوں تو پھر جس طرح شریک کی گواہی دوسرے شریک کے حق میں قبول نہیں ہوتی اسی طرح ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یہ گواہی بعض وجوہ سے اپنی ذات کے لیے ہوگی۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ولا شهادة الشريك لشريكه فيما هو من شركتهما لانه شهادة لنفسه من وجهٍ لاشتراكهما۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ کتاب الشهادة۔ باب من يقبل شهادته الخ)[1]

نابینا کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ نابینا شخص کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کن امور میں اس کی شہادت قبول ہوگی؟

الجواب:۔ چونکہ شہادت (گواہی) کے اکثر امور کا تعلق معائنہ اور مشاہدہ سے ہوتا ہے

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ويقبل شهادة الاخ لاخيه من النسب وان كان ابوهما حيًا۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۵۹ الفصل الثانی فی الشهادات۔ کتاب الشهادات) ومثله فی الهندية ج۳ ص۴۷۵ الباب الرابع، الفصل الثالث فيمن لا تقبل شهادته

اور معائنہ کئے بغیر اس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً اداۓ شہادت کے وقت اشارہ سے اس کی تمیز ہوتی ہو تو قوتِ بینائی کے بغیر ان میں تمیز ناممکن ہے اور بعض امور کا تعلق سماع سے ہوتا ہے لیکن مسموعات میں آپس میں خلط ملط اور ہم مثل ہونے کی وجہ سے اشتباہ لازم آتا ہے اور شہادت میں اشتباہ سے تحرز ضروری ہے، لہٰذا نابینا آدمی کی گواہی کسی حال میں درست نہیں۔ تاہم جس شہادت کا تعلق صرف سماع سے ہو مثلاً نکاح، تو وہاں نابینا آدمی کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشهود له والمشهود علیه ولا یمیز الاعمی الا بالنغمة وفیه شبهة یمکن التحرز عنها بجنس الشهود والنسبة لتمییز الغائب دون الحاضر وصار کالحدود والقصاص۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۴۶۷ کتاب الشهادة۔ باب القبول وعدمه)[1]

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ وعدہ معاف گواہ کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وعدہ معاف گواہ کی گواہی شرعاً درست نہیں، کیونکہ وعدہ معافی کی وجہ سے گواہی دینے والا خصم بن جاتا ہے اور اس گواہی سے اُسے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور جس گواہی سے گواہی دینے والے کو فائدہ حاصل ہوتا ہو تو وہ گواہی قابلِ قبول نہیں۔

لما قال الشیخ سلیم رستم بازؒ: یشترط ان لا یکون فی الشهادة دفع مغرم او جر مغنم یعنی ان لا تکون داعیة لدفع المضرة او جلب المنفعة۔ (مجلة الاحکام۔ مادة ۱۷۰۰ ص ۱۰۲۳ شروط فصل فی الشهادة الاساسیة)[2]

---

[1] قال العلامة مرغینانیؒ: ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشهود له والمشهود علیه ولا یمیز الاعمی الا بالنغمة وفیه شبهة یمکن التحرز عنها بجنس الشهود۔

(الهدایة ج ۳ ص ۱۵۹ کتاب الشهادة۔ باب من یقبل شهادته الخ)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشهادة، فصل فی الشرائط فی الاصل۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: ومن الشرائط عدم قرابة ولاد او زوجیة او عداوة دنیویة او دفع مغرم او جر مغنم۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۱ کتاب الشهادة)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۵ ص ۲۴۸ نوع فی الرجل متی تحل له الشهادة۔

اُجرتی قاتل کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ایسا شخص جو کہ اُجرتی قاتل ہو اور اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر چکا ہو تو کیا اس کی گواہی کسی معاملہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی کو بے گناہ قتل کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اس لیے اس حرام فعل کا مرتکب فاسق و فاجر ہے، خصوصاً جبکہ خود اس کا اعتراف بھی کر چکا ہو اور فاسق و فاجر کی گواہی شرعاً درست نہیں لہٰذا اجرتی قاتل کی گواہی شرعی لحاظ سے درست نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ سلیم رستم بازؒ: یشترط ان یکون الشاهد عدلاً۔

(شرح مجلة الاحکام - مادة ۱۷۰۵ ص ۱۰۳۹ فصل فی لشهادة الاساسیة شروط) [1]

داڑھی منڈانے والے کی شہادت کا حکم

سوال:۔ داڑھی منڈانے یا ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والے کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ داڑھی منڈانا یا کترانا حرام ہے جو کہ موجبِ فسق ہے کیونکہ اس کی مشروعیت احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں وجوب کے درجہ کو پہنچ چکی ہے اس لیے اس فعلِ حرام کا مرتکب فاسق و فاجر ہے اور فاسق کی گواہی شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق دونها لقوله تعالیٰ: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ وَالشَّاهِدُ المرضی هُوَ الشَّاهِدُ العدل۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشہادات فصل فی الشرائط فی الاصل)

لیکن موجودہ معاشرہ کے انحطاط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر داڑھی والا گواہ موجود نہ ہو اور حق تلفی کا اندیشہ ہو اور گواہی دینے والا داڑھی منڈا معتبر شخص ہو جس کے صدق پر قاضی کو اعتماد حاصل ہو تو پھر داڑھی منڈوانے کے باوجود اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی جامع الفتاوی واما شهادة الفاسق فان تحری القاضی

---

[1] قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق دونها۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشهادة، فصل فی الشرائط فی الاصل)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۱۵۵ کتاب الشهادة۔

الصدق فی شهادته تقبل والا فلا ـــــ قال فی الفتاوی القاعدة هذا اذا غلب علی ظنه صدقه وهو مما یحفظ درر اول کتاب القضاء وظاهر قوله وهو مما یحفظ اعتماده۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۱۲ کتاب الشهادة)[1]

قتل میں عورت کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا قتل کے معاملہ میں عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں، اور اس کی گواہی سے قاتل کو سزائے موت دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود کا نفاذ چونکہ یقینی امور پر ہوتا ہے جو کہ معمولی شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، عورتوں کی گواہی میں بدلیت کے شبہ کا احتمال ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی گواہی حدود کے نفاذ میں معتبر نہیں، لہٰذا عورت کی گواہی کی بنیاد پر قاتل کو قصاص میں سزائے موت دینا جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یقبل فیها شهادة النساء لحدیث الزهریؓ مضت السنة من لدن رسول الله صلی الله علیه وسلم والخلیفتین من بعده ان لا شهادة النساء فی الحدود والقصاص ولان فیها شبهة البدلیة لقیامها مقام شهادة الرجال فلا تقبل فیما یندرئ بالشبهات۔ (الهدایة ج۳ ص۱۵۳ کتاب الشهادة)[2]

دشمن کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا ایک دشمن کی گواہی دوسرے دشمن کے خلاف قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دشمنی عموماً باہمی ضرر رسانی اور ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ رویہ اپنانے کا سبب بنتی ہے، اس لیے ایک دشمن اگر اپنے مخالف پر گواہی دے تو اس میں ضرر رسانی

---

[1] قال العلامة الشیخ سلیم رستم بازؒ: ویشترط ان یکون الشاهد عدلاً۔ (شرح مجلة الاحکام مادة ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل فی شروط الشهادة الاسلامیة)

ومِثلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۱۵۵ کتاب الشهادة۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها الذکورة فی الشهادة بالحدود والقصاص فلا تقبل فیها شهادة النساء۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشهادة)

ومِثلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام للشیخ سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادة ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳۔

کا احتمال موجود ہو کر شریعت کی رُو سے اس کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی اگرچہ یہ گواہ عادل ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: ان شهادة العدو على عدوه لا تقبل وان كان عدلاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۸۰ کتاب الشهادات۔ باب القبول وعدمه)[1]

گواہی کے لیے آمد و رفت کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہو اور حکومت اپنی طرف سے اس کو آمد و رفت کا خرچہ دینا چاہے تو کیا اس کے لیے خرچہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی معاملہ میں گواہی دینا دراصل لوگوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ہر شخص کے حقوق کا تحفظ دوسرے پر فرض ہے تو شہادۃ دینا گویا اپنا فریضہ سرانجام دینا ہے، اس لیے اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا اپنی ایک شرعی ذمہ داری پوری کرنے پر اجرت حاصل کرنا ہے لہٰذا اگر گواہان شہادت پر اجرت کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں گواہی پر ذاتی منفعت کے حصول کا شائبہ لازم آتا ہے اور جس گواہی میں ذاتی منفعت کا شبہ ہو وہ شرعاً قبول نہیں لیکن شریعت نے اگر ایک طرف گواہوں کو اجرت لینے سے روکا ہے تو دوسری طرف مشہود لہ کو گواہوں کے اعزاز و اکرام کا درس بھی دیا ہے اس لیے اگر گواہوں کو آمد و رفت وغیرہ کا مسئلہ درپیش ہو اور مشہود لہٗ ان کو آمد و رفت کا خرچہ دینا چاہے یا ان کے لیے اپنی خوشی سے کھانے پینے کا بندوبست کرے تو گواہوں کو خرچہ وغیرہ لینا جائز ہے، اس لیے اگر حکومت قانون کے موافق خرچہ دینا چاہے تو اس کا لینا جائز ہے لیکن جو پیسے خرچہ سے زائد ہوں وہ حکومت کو واپس کرے۔

لما قال العلامة ابن نجيمؒ: لو وضع للشهود طعاماً فاكلوا ان كان مهيئاً من قبل ذلك تقبل وان صنعه لاجلهم لا تقبل وعن محمد لا تقبل فيهما وعن ابي يوسف تقبل فيهما

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ولا يجوز شهادة على الرجل اذا كان بينهما عداوة يعني من امور الدنيا فان كان من امور الدين لا تقبل۔

(خلاصة الفتاوى ج۴ ص۷۲ الفصل الثاني في الشهادات۔)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحكام للشيخ سليم رستم بازؒ، مادة ۱۷۰۲ ص۱۰۳۴۔

شہادۃ الجاریۃ بالطعام من حل محل الانسان ممن یعز علیہ شاھداً اکلا.......... وجزم فی الملتقط بالقبول مطلقاً وفی شرح منظومۃ ابن وھبان للمصنف الفتویٰ علی قول ابی یوسف

(البحر الرائق ج ۷ ص۵۹ کتاب الشہادۃ) [1]

قبضہ اور ملکیت میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی زمین سے نہر گذرتی ہے اور دوسرا شخص اس نہر سے اپنی زمین کو مدتوں تک سیراب کرتا رہا، اب دونوں نے اس نہر پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، مالکِ زمین کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ نہر میری زمین سے گذرتی ہے اس لیے یہ میری ملک ہے جبکہ دوسرا شخص اس نہر سے استفادہ کی وجہ سے ملکیت کا دعویدار ہے، اگر دونوں گواہ پیش کریں تو کس کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا؟

الجواب:۔ متنازع فیہ مقدار اگر معروف ومشہور نہ ہو تو اس کی حدود بیان کرنا ضروری ہے اور اگر معروف ومشہور ہو تو پھر حدود بیان کرنا ضروری نہیں۔ فقہاء کرام کی صریح عبارات کے مطابق صحتِ دعویٰ کے بعد طلب بیّنہ وغیرہ ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں بظاہر دونوں مِلک اور ید کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دونوں ید کو ثابت کریں اگر دونوں کا ید ثابت ہو جائے تو پھر مِلک پر گواہ طلب کیے جائیں گے، تو ان دونوں میں سے جو بھی اپنے مِلک پر گواہ قائم کرے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور اگر دونوں گواہ قائم کریں تو پھر مدعیٰ دونوں میں تقسیم کیا جائے گا اور نہر دونوں کے درمیان مشترک رہے گی کوئی ایک فریق کسی دوسرے کو انتفاع سے منع نہیں کرسکتا ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا ادعی الرجلان ارضاً یعنی یدعی کل واحد منهما انها فی یدہ لم یقض انها فی ید واحد منهما حتی یقیما البینۃ انها فی ایدیهما لان الید فیها

---

[1] قال العلامۃ خیر الدین الرملیؒ:۔ (سئل) فیما اذا طلبت الشهود الشهادۃ فی مکان بعید مسافۃ یومین احتیج الی الرکوب فادی المدعی للشاهدین اجرۃ دابتهما هل تسقط شهادتهما بذلک ام لا، اجاب لا تسقط شهادتهما بذلک کما جزم به فی الملتقط۔

(الفتاویٰ الخیریۃ علی هامش تنقیح الحامدیۃ جلد ۲ ص۳۱ کتاب الشهادۃ)

ومثلہ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۲۹ کتاب الشهادۃ۔

غیر مشاهدة لتعذر احضارها وما غاب عن علم القاضی فالبينة تثبته وان اقام احدهما البينة جعلت فی يده لقيام الحجة لان اليد حق مقصود وان اقام البينة جعلت فی ايديهما لما بينا فلا تستحق لاحدهما من غير حجة۔ (الهداية ج۳ ص۲۲۴ كتاب الدعوى فصل فی التنازع بالايدی) [1]

شہادت غیر قابض کی قبول ہوگی

سوال:۔ کسی شخص کے زیر تصرف زمین پر دوسرے شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میراث میں ملی ہے جبکہ دونوں کے پاس گواہ بھی موجود ہیں، ازروئے شریعت ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ زمین جس شخص کے قبضہ میں ہے وہ ذوالید ہے اور دوسرا شخص جو ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے خارج ہے لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو تو عام معاملات کی طرح خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوں گے، ذوالید کے گواہوں کو اس وقت ترجیح دی جائے گی جب دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ثبوت موجود ہو، اور اگر ذوالید کی تاریخ خارج کی تاریخ سے اسبق ہو تو اس وقت ذوالید کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی، اور اگر دونوں میں سے صرف ایک کے پاس تاریخ کا ثبوت موجود ہو تو اس صورت میں بالاجماع خارج کے گواہوں کو ذوالید پر ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: ولو كان فی يد احدهما فهو للخارج الا اذا كان تاريخ ذی اليد اسبق فهو اولیٰ عند ابی حنيفةؒ وابی يوسفؒ وعند محمدؒ يقضی به للخارج لانه لا عبرة للوقت فی الميراث عنده وان ارخ

---

[1] قال العلامة فخر الدين القاضی خانؒ: فان اقام احدهما البينة انها فی يديه يقضی له باليد ويصير هو مدعیٰ عليه والآخر مدعيًا وان قامت البينة لكل واحد منهما فان القاضی يجعل الدار فی يدهما لانهما تساويا فی اثبات اليد۔
(الفتاوى قاضی خان علی هامش الهندية ج۲ ص۳۹۱ فصل فی دعوى الدور والاراضی)
ومثله فی شرح مجلة الاحكام للشيخ سليم رستم باز، المادة ۱۷۵۵ ص۱۱۱۱۔

احدهما ولم یورخ الآخر فهو للخارج بالاجماع۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۱۱۳ کتاب الدعوی الفصل الثالث عشر فی العین یتنازع فیها اثنان)[1]

زیرِ کاشت زمین پر ملکیت کا دعوی کرنے میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے

سوال:۔ ایک شخص ایک زمین بطورِ کاشت کھاتا رہا، ایک دوسرے شخص نے دعوی کیا کہ یہ زمین میری ہے، اس نے جواب میں کہا کہ یہ تو پٹھانوں کا دفتر ہے، یہ کہنے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ زمین نہ میری ہے نہ تیری، تو اس صورت میں گواہ کس کے معتبر ہوں گے؟

الجواب:۔ اگر کاشتکار کے اس کہنے سے کہ "یہ زمین پٹھانوں کا دفتر ہے" مطلب یہ ہو کہ زمین مجھے پٹھانوں نے دی ہے اور میری ملکیت ہے تو اس صورت میں دوسرے شخص کا دعوی صحیح ہے اور گواہ اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ یہ خارج ہے اور مِلک مطلق کا دعوی کرتا ہے، اور فقہاء کی تصریح کے مطابق مِلک مطلق کے مطالبہ میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے اور اگر اس کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ یہ زمین پٹھانوں نے مجھے صرف کاشت کے لیے دی ہے اور میری ملکیت نہیں تو اس صورت میں کاشتکار خصم نہیں بن سکتا اور مدعی ان لوگوں پر گواہ پیش کرے جن کی اصل ملکیت ہو اور گواہ بہر حال اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ خارج ہے۔

لما قال الشیخ سلیم رستم بازؒ: بینۃ الخارج اولی فی دعوی الملک المطلق الذی لم یبین فیها تاریخ۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ فصل فی ترجیح البینات)[2]

---

[1] قال العلامۃ ابن قاضی سماوۃؒ: واذا کان العین فی ید احدهما ولم یورخا اوارخا سواء یقضی للخارج وان ارخا واحدهما اسبق فهو لا سبقهما وعند محمدؒ للخارج لانه لاعبرۃ للتاریخ هنا وان ارخ احدهما لا الآخر فهو للخارج اجماعاً۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۷۷ الفصل الثامن فی دعوی الخارج مع ذی الید)

وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین۔

[2] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: تقدم حجۃ خارج فی ملک الخارج۔ (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوی۔ فصل حکم تعارض الدعوتین مع تعارض البینتین۔

نکاح کی مجلس میں بغیر حاضر ہوئے نکاح کی گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ جو لوگ نکاح کی مجلس میں حاضر نہ ہوں اور ان کو محض خبر سے نکاح کا پتہ چلا ہو اور وہ عقدِ نکاح کے بارے میں گواہی دینا چاہیں تو کیا ان کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بعض احکامات کا دارومدار چونکہ گواہی پر ہے اس میں ذرہ برابر بھی ردوبدل آنے سے احکامات میں تبدیلی آجاتی ہے، اس لیے شریعت میں شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شریعت نے اس کی حفاظت کے لیے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لیے بہت سے شرائط عائد کیے ہیں، ان شرائط میں ایک یہ بھی ہے کہ گواہ جس معاملہ میں گواہی دینا چاہے اس کی پوری نوعیت اس کے سامنے ہو اور یہ نوعیت تب پوری طرح واضح ہوتی ہے جب گواہ خود موجود ہو، اس لیے شہادت میں شریعت نے دیکھنے اور حاضر ہونے کو شرط قرار دیا ہے لیکن بعض ایسے امور جو کہ شہرت سے متعلق ہو کر چشم دید گواہی دینا اس میں مشکل ہو اصل شرط سے مستثنیٰ قرار دیئے ہیں، اگر ان امور کی اطلاع معتمد ذرائع سے حاصل ہو تو ان میں گواہی دینا جائز ہے، ان ہی امور میں سے ایک نکاح بھی ہے لہٰذا اگر کوئی عقدِ نکاح کے وقت مجلس میں موجود نہ ہو اور اس کو معتمد ذرائع سے اس کا علم ہو جائے تو وہ شخص اگر اس پر گواہی دینا چاہے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني: ولا يجوز للشاهد ان يشهد بشئ لم يعاينه الا النسب والموت والنكاح والدخول۔ (الهداية ج۳ ص۱۵۸ کتاب الشهادة۔ فصل من يقبل شهادته الخ) [1]

اثباتِ زیادتی کی وجہ سے خارج کے گواہوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص عرصۂ دراز تک زمین کے ایک ٹکڑے کی پیداوار

---

[1] قال العلامة ابن قاضي سماوة: شهدا بنسب او نكاح وقالا سمعناه من قوم لا يتصور اجتماعهم على الكذب لا تقبل وقيل تقبل وفي (عده) اشادة الى ان القبول اصح على ما يأتي۔ (جامع الفصولين ج۱ ص۱۲۴ الفصل الثاني عشرة فيما تسمع فيه الشهادة بلا فصل)

ومثله في شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز تحت المادة ۱۶۸۸ ص۱۰۲۰۔

کھاتا رہا، اس پر تعمیر بھی کرائی اور درخت بھی لگوائے، اب ایک دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ زمین میں نے اس کو بطور امانت دی تھی اور اس نے مجھے ۱۹۰۰ روپے قرض اس شرط پر دیئے تھے کہ جب وہ اس زمین سے ۱۹۰۰ روپے کے برابر پیداوار حاصل کرلے گا تو یہ زمین مجھے واپس کردے گا، لیکن کاشتکار اب اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زمین اس نے مجھے بیع قطعی پر دی تھی، تو اس صورت میں گواہ کس کے مقدم ہوں گے؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں کاشتکار جو کہ ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اور ذوالید اگر ملک مطلق کے دعویٰ کی صورت میں شراء کا دعویٰ کرے تو اس کے[1] گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملک المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولیٰ۔ (الهدایة ج۳ ص۲۲۱ کتاب الدعویٰ باب ما یدعیه الرجلان)

لیکن دوسرا شخص چونکہ خارج ہے فعلِ زائد یعنی ودیعت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے ہاں اصل ملکیت خارج کے لیے مُسَلَّم ہے اور خارج چونکہ اثباتِ زیادتی کا دعویٰ کرتا ہے، لہٰذا اگر یہ دوسرا شخص ودیعت پر گواہ قائم کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: اذ لو ادعی الخارج الفعل علی ذی الید کالغصب والاجارة والعاریة فبینة الخارج اولیٰ۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۴۴ باب دعوی الرجلین)

زیادت کا دعویٰ کرنے والے کے گواہ مقدم ہوں گے

سوال:- دو آدمیوں نے ایک قومی مشترک زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے اور دونوں اس میں مالکانہ تصرّفات کرتے رہے ہیں، اب ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ساری زمین میری ہے، مجھے وراثت میں ملی ہے، جبکہ دوسرے فریق کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: الا اذا ادعی الخارج علیه فعلا کغصب او ودیعة او اجارة ونحوها فی روایة دُرر او کان سببا یتکرر کبناءٍ وغرس ونسج خز وزرع بر ونحوه او اشکل علی اهل الخبرة فهو للخارج لانه الاصل وانما عدلنا عنه بحدیث النتاج۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۹ باب دعوی الرجلین)
ومِثلُهُ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۸ ص۱۱۱۸ کتاب الدعویٰ۔

میرے اور تمہارے درمیان مشترکہ ہے کیونکہ دونوں کا اس پر قبضہ ہے، ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شخص محض زمین آباد کرنے کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو زمین آباد کرنا چونکہ سببِ ملک نہیں اس لیے اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے تاہم اگر یہ زمین موات ثابت ہو جائے جس میں آباد کرنے سے ملکیت ثابت ہو سکتی ہے تو پھر دونوں کا دعویٰ قابلِ سماع ہے لیکن صورتِ مسئولہ میں دونوں فریقین کے تصرفات اور دعویٰ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مدعی بعض نے زمین کے اس حصہ سے کوئی سروکار نہیں رکھا جس میں اس کا خصم تصرف کر رہا ہے بلکہ مدعی کل تصرفات کے ہوتے ہوئے مدعی بعض کے حصہ سے تصرفات میں خارجی اور اجنبی ہے، اس لیے اگر دونوں گواہ پیش کریں تو تمام جائیداد کا فیصلہ مدعی کل کے حق میں ہوگا کیونکہ آدھی جائیداد اس کو کسی کے دعویٰ نہ کرنے سے رہ گئی اور بقیہ جائیداد میں مدعی کل خارج متصور ہو کر ذوالید کے مقابلہ میں خارج کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز رحمه: اذا ادعى اثنان مالاً احدهما بالاستقلال والآخر بالاشتراك وكل منهما متصرف فيه اى ذو يد عليه فبينة الاستقلال اولى يعنى اذا اراد كلاهما اقامة البينة ترجح بينة الذى ادعى الاشتراك۔ [1]
(شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۷۵۶ ص ۱۱۱۲ فصل فی ترجیح البینات)

گواہوں کی عدم موجودگی میں محض شک کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم

سوال:۔ کیا حدود کے جاری کرنے کیلئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا محض شک کی وجہ سے کسی مجرم کو سزائے موت دینا درست ہے؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ نے لوگوں کے مال وجان اور عزت و آبرو کے تحفظ

---

[1] قال العلامة الكاسانى رحمه الله: فالاصل فيه ان البينة المظهرة للزيادة اولى۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۴۱ كتاب الدعوى۔ فصل حكم تعارض الدعوتين۔ الخ)
ومثله فى الهداية ج۳ ص۲۰۸ باب التحالف۔

کا تہیہ کر رکھا ہے اور ہر حال میں ان کی عزت وآبرو اور مال وجان کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے کیونکہ ان چیزوں کے تحفظ کے بغیر سکون وراحت کی زندگی کا تصور بھی محال ہے، ان امور کے تحفظ اور حقوق اللہ کے احیاء کے لیے حدود وقصاص وغیرہ کا اجراء عدیم المثال نظام ہے اس لیے اگر کسی کے وجود یا افعالِ بد سے دوسروں کے مال وجان وغیرہ کو خطرہ ہو تو جرم کے ثابت ہو جانے پر مجرم کو حدود وقصاص کے تحت سزا دی جاسکتی ہے لیکن اگر جرم کے اثبات میں معمولی سی غفلت بھی برتی جائے تو اس میں کسی بے گناہ کی جان یا اس کی عزت وآبرو کے ضیاع کا خطرہ ہے اس لیے جرم کے اثبات کے لیے شریعت نے شہادت میں سختی سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ شبہ کے احتمال کی وجہ سے عورتوں کی گواہی غیر معتبر قرار دی ہے اس لیے صحیح گواہوں کے بغیر محض شک وشبہ کی بناء پر کسی کو سزائے موت دینا ناجائز ہے۔

کما فی الحدیث: عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیرٌ من ان یخطئ فی العقوبة۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰة ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحدود، الفصل الثانی) [1]

شرکاء کاروبار کا ایک دوسرے کیلئے گواہی دینا

سوال:۔ دو آدمی ایک کاروبار میں شریک ہیں کیا وہ کاروبار کے معاملہ میں ایک دوسرے کے لیے گواہ بن سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے ایک شریک دوسرے شریک کیلئے طرفداری کی تہمت کی وجہ سے گواہی نہیں دے سکتا اور نہ ان کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں مقبول ہوگی۔

لما فی مجلة الحکام: وکذلک لا تقبل شهادة الشرکاء لبعضهم فی مال الشرکة ولا تقبل شهادة الکفیل بالمال للاصیل علی کون المکفول به۔ الخ (درر الحکام علی مجلة الاحکام ج۴ ص۳۹۳ کتاب الشهادة) [2]

---

[1] قال العلامة الکاسانی رحمه الله: لان الحدود والقصاص مبناها علی الدرء والاسقاط بالشبهات۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشهادات۔ فصل واما الشرائط فی الاصل الخ)

ومثله فی الهدایة ج۲ ص۵۰۷ کتاب الحدود۔

[2] قال العلامة علی حیدر: لا تقبل شهادة الشرکاء لبعضهم فی مال الشرکة۔ (درر الحکام علی مجلة الاحکام ج۴ ص۳۹۵)

باپ کا بیٹے کے لیے گواہی دینا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر باپ عدالت میں جج کے سامنے بیٹے کے حق میں یہ گواہی دے کہ میرے بیٹے نے فلاں شخص سے دعویٰ میں درج شدہ اراضی قطعی بیع سے خریدی ہے، تو کیا باپ کی یہ گواہی بیٹے کے حق میں مقبول ہوگی یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے باپ بیٹے یا بیٹا باپ کیلئے گواہی نہیں دے سکتا اس لیے کہ اس میں طرفداری اور قرابتداری کی تہمت ہے کہ ہوسکتا ہے باپ بیٹے کے حق میں بلا جواز جھوٹی گواہی دے رہا ہو، تو اس تہمت کی وجہ سے اسلام اصول و فروع کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کرتا اسلئے عدالت باپ کی گواہی کی بنیاد پر بیٹے کے حق میں فیصلہ دینے کی شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لابويه واجداده والاصل فيه قوله عليه السلام لا يقبل شهادة الولد لوالده ولا الوالد لولده ولا المرأة لزوجها ولا الزوج لامرأته الخ (الهداية ج۳ ص۱۶۰ كتاب الشهادة) [1]

ہیجڑے کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا ہیجڑے کی گواہی شرعاً قبول کی جائے گی یا نہیں؟ جبکہ وہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچ گانے کا کام بھی کرتا ہو، قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ جو ہیجڑا عورتوں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچتا گاتا بھی ہو تو اس کی گواہی اس کے فسق کی وجہ سے شرعاً مقبول نہیں۔ تاہم جس کے اعضاء اور ادا و انداز میں نرمی ہو اور وہ فسق و فجور کا ارتکاب نہیں کرتا ہو تو وہ صرف نرمی کی بناء پر مردود الشہادت نہیں ہوتا بلکہ شرعاً اس کی گواہی کو قبول کیا جائے گا۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: وقال فقهاء الحنفية: لا تقبل شهادة مخنث لفسقه وهو الذي يفعل الردي ويؤتى كالنساء اما الذي في كلامه

---

[1] وفي مجلة الاحكام: لا تقبل شهادة الاصل للفرع والفرع للاصل يعني لا تقبل شهادة الآباء والاجداد والامهات والجدات لاولادهم واحفادهم وبالعكس اي شهادة الاولاد والاحفاد للآباء والاجداد والامهات والجدات. الخ (درر الحكام على مجلة الاحكام ج۴ ص۳۹۳ كتاب الشهادة، المادة ۱۷۰۰)۔

وفی اعضائہ تکسر فہو مقبول الشہادۃ۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہٗ ج۶ ص۵۶۶ المطلب الثالث، شروط اداء الشہادۃ)[1]

تائب فاسق کی گواہی کا حکم

سوال :۔ ایک آدمی پہلے جُوا، چوری، زنا وغیرہ قبیح افعال کا ارتکاب کرتا تھا لیکن اب اس نے تمام تمام برائیوں سے توبہ کرلی ہے، تبلیغ میں بھی وقت لگانا شروع کردیا ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ اب اگر وہ کسی مجرم پر گواہی دے تو کیا شرعاً اس شخص کی گواہی قبول کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فاسق وفاجر جب اپنے فسق وفجور سے توبہ کرکے صراطِ مستقیم پر آجائے تو وہ شہادت دینے کا شرعاً اہل ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں موصوف کسی بھی مجرم پر گواہی دینے کا اہل ہے اس کو سابقہ جرائم کی وجہ سے گواہی دینے سے نااہل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی، واتفق الفقہاء علیٰ أن الفاسق اذا تاب من فسقہ تقبل شہادتہ واستثنی الحنفیۃ المحدود فی القذف فانہٗ لاتقبل شہادتہ عندھم وان تاب۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۶ ص۵۶۷ المطلب الثالث فی شروط اداء الشہادۃ)[2]

بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا تھا اور دو آدمیوں نے اسے عین قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا، جب قاتل کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی گئی تو اُس نے موقعہ کے ان گواہوں میں سے ایک کو قتل کردیا اور دوسرے کو اغوا کرکے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اُس کی بینائی ختم ہوگئی

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: (ولا تقبل شہادۃ) مخنث بالفتح من یفعل الردی ویؤتی وأما بالکسر فالتکسر المتلین فی اعضائہ وکلامہ خلقۃ فتقبل۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار جلد۵ ص۴۷۹ کتاب الشہادۃ۔ باب قبول الشہادۃ وعدمہ)

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: الفاسق اذا تاب تقبل شہادتہ الا المحدود بقذف۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار جلد۵ ص۴۷۷ کتاب الشہادۃ۔ باب قبول الشہادۃ وعدمہ)

اب وہ قاتل گرفتار ہو گیا ہے اور عدالت میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے تو دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ قاتل کے تشدد سے بینائی سے محروم ہو جانے والا شخص عدالت میں اُس قاتل کے خلاف گواہ بن سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس نے خود قاتل کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

الجواب:۔ حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں اداء شہادت کے لیے چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے اور بدون ان شرائط کے گواہ اداءِ شہادت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ ان شرائط میں عقل، بلوغ اور اسلام وغیرہ کے ساتھ ساتھ گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق گواہ اداءِ شہادت کے وقت چونکہ بینائی کی نعمت سے محروم ہے اس لیے وہ حنفیہ کے نزدیک اداءِ شہادت کا اہل نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ وھبة الزحیلی: البصر: یشترط عند ابی حنیفةؒ و محمدؒ والشافعیة ان یکون الشاھد مبصراً فلا تقبل شهادة الاعمٰی لانه لا بد من معرفة المشهود له والاشارة الیه عند الشهادة ولا یمیز الاعمٰی بین الناس الّا بنغمة الصوت و فیه شبهة لان الاصوات تتشابه وتشدد الحنفیة فمنعوا قبول شهادة الاعمٰی وان کان بصیراً عند تحمل الشهادة۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد ۶ ص۵۶۲ المطلب الثالث شروط اداء الشہادۃ)[1]

قوتِ گویائی سے محروم شخص (گونگے) کی شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی جو کہ بات چیت کرنے کی نعمت سے محروم (گونگا) ہے، اگر وہ خود کسی شخص کو کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھے اور اس کی آواز کو پہچانتا بھی ہو، تو کیا یہ شخص اس مجرم کے خلاف عدالت میں اشارہ کے ساتھ گواہی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کے مطابق مجرم کو سزا وغیرہ دینے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق گواہ میں چند شرائط کا ہونا ضروری

---

[1] لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله: لا تقبل من اعمٰی مطلقاً۔ قال العلامة ابن عابدینؒ، ولنا ان الاداء یفتقر الى التمیز بالاشارة بین المشهود له والمشهود علیه ولا یمیز الاعمٰی الّا بالنغمة وفیه شبهة۔ (رد المحتار والدر المختار ج۵ ص۴۷۶ کتاب الشهادة۔ باب قبول الشهادة وعدمه)

ضروری ہے مثلاً مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عاقل بالغ اور بصیر ہونا وغیرہ، ان شرائط میں ایک شرط قوتِ گویائی کی بھی ہے، اگر کوئی شخص شہادت کی دیگر شرائط تو پوری کرتا ہو مگر وہ قوتِ گویائی سے محروم ہے تو وہ شہادت کا شرعاً اہل نہیں اور عدالت اس کی دی ہوئی گواہی پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: النطق! اشترط الحنفية والشافعية والحنابلة ان يكون الشاهد ناطقاً فلا تقبل شهادة الاخرس وان فهمت اشارته لان الاشارة لا تعتبر في الشهادات لانها تتطلب اليقين وانما المطلوب التلفظ بالشهادة۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۵۲۴ المطلب الثالث، شروط اداء الشهادة)

گواہ کی خفیہ تحقیقات کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک مسئلے کا حل مطلوب ہے وہ یہ کہ آجکل بعض لوگ سفید لباس پہن کر خود ساختہ معززین بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں لیکن پسِ پردہ وہ جرائم پیشہ افراد کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر عدالت میں جج کے سامنے کسی مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لیے آئیں اور خود مجرم یا اس کا وکیل ان پر جرح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ موصوف تو خود فلاں فلاں جرم کا مرتکب ہے۔ تو کیا جج حقیقت جاننے کے لیے خفیہ طور پر ان کی عدالت کی تحقیق کر سکتا ہے یا صرف ان کی ظاہری عدالت پر اعتماد کر کے فیصلے کر سکتا ہے؟ فقہاء کرام کی اس بارہ میں کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گواہ کی ظاہری عدالت پر اکتفاء کر کے جج یا قاضی کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے، گواہ کی خفیہ طور پر تحقیقات کرنا ضروری نہیں ہے، البتہ حدود اور قصاص کے معاملے میں اس احتیاط کو بروئے کار لانا ان کے ہاں بھی ضروری ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک جملہ معاملات اور مقدمات میں گواہ کی خفیہ طور پر عدالتی تحقیق ضروری ہے، متأخرین علماء احناف نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی گواہ کی عدالتی خفیہ تحقیق ضروری ہے، اس لیے کہ خصم (مجرم) یا اس کے وکیل نے گواہ پر اعتراض کیا ہے،

اس لیے جج یا قاضی ایسے گواہ کی خفیہ عدالتی تحقیقات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے صرف گواہ کی سفید پوشی پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: واکتفی ابوحنیفۃ بظاھر العدالۃ فی المسلم ولا یسأل عن الشھود حتیٰ یطعن الخصم بھم الا فی الحدود والقصاص فانہ یسأل عن الشھود وان لم یطعن فیھم الخصوم ودلیلہ علی الاکتفاء بظاھر العدالۃ قولہ علیہ السلام: المسلمون عدول بعضھم علیٰ بعض الا محدوداً فی قذف۔ ومِثْلُہٗ مروی عن عمر......... وقال الصاحبان والفتویٰ علیٰ قولھما لا بد عن ان یسأل القاضی عن الشھود فی السر والعلانیۃ فی سائر الحقوق لان القضاء قائم علی الحجۃ وھی شھادۃ الرجال فلابد من التعریف علی العدالۃ و فی ذلک صیانۃ للحکم القضائی عن النقض والابطال بسبب الطعن فی عدالۃ الشھود۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص۵۶۵، ص۵۶۶ المطلب الثالث فی شروط اداء الشھادۃ)

علّت زائل ہونے کے بعد اسی مقدمے میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کے لیے قاضی کے سامنے یہ شہادت دی کہ میری بیوی کا اپنے بھائی زید پر ایک لاکھ روپیہ (جو کہ اُسے اپنے والد کے ترکہ سے نقدی کی صورت میں ملے تھے) قرضہ ہے لیکن قاضی نے اس کی شہادت کو ازدواجی رشتے کی بناء پر ردّ کر دیا۔ اب جبکہ اس شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ بائن دے کر رخصت کر دیا ہے تو کیا یہ شخص اسی مقدمہ میں شہادت دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ عورت اب اس کے لیے اجنبیہ بن گئی ہے؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے تحت جب ایک بار کسی شخص کی گواہی کسی علت کی بناء پر ردّ کر دی جائے تو اسی مقدّمے میں اس شخص کی شہادت علّت زائل ہونے کے بعد بھی قبول نہیں ہو گی۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاق دینے کے بعد بھی اثباتِ دعویٰ کے لیے اس شخص کی شہادت کارآمد نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: متی رُدّت الشھادۃ لعلّۃ ثمّ زالت العلّۃ فتشھد فی تلک الحادثۃ لاتقبل فلوشھد الزوج لزوجتہ بدعویٰ فرُدّت

ثم ابانها وتزوجت غیرہ ثم شهد لها بتلك الدعوىٰ لم تقبل۔

(شرح المجلۃ لرستم باز ص۳۰۰ المادۃ ۵۵۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)

شہادۃ میں مشہود لہٗ یا علیہ کا نام مع ولدیت لینا

سوال:۔ ایک آدمی جب کسی کیلئے گواہی دے تو اس کا نام مع ولدیت لے گا یا نہیں؟ اسی طرح جس کے خلاف گواہی دے رہا ہو تو اس کا نام بھی مع ولدیت کے لے گا یا نہیں؟ شریعت اسلامی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ گواہی دیتے وقت اگر مشہود لہٗ (جس کے لیے گواہی دیتا ہو) اور مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہو) عدالت میں موجود ہوں تو گواہ کے لیے ان کے نام مع ولدیت کے لینا ضروری نہیں، صرف اشارہ کرنے سے بھی تعیین ہو جائے گا۔ البتہ اگر دونوں موجود نہ ہوں یا کوئی ایک غیر حاضر ہو تو اس کا نام مع ولدیت کے لے کر گواہی دینا ضروری ہے صرف نام پر اکتفاء کرنے سے بات نہیں بنے گی، تاہم اگر وہ مشہور و معروف ہو تو شہرت کی وجہ سے صرف نام لینا بھی کفایت کر جاتا ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یجب ان یشیر الشاهد عند الشهادة الیٰ کل من المشهود لهٗ والمشهود علیه والمشهود به اذا کانوا حاضرین فان فعل ذٰلك کفیٰ ولا یلزمه ان یذکر اسم ابی المشهود لهٗ والمشهود علیه ولا جدهما اما فی الشهادة المتعلقة بالمؤکل الغائب او بالمیّت فیلزم الشاهد ذکر ابیهما وجدهما ولکن اذا کان کل منهما مشهورًا ومعروفًا فحسب الشاهد ان یذکر اسمه وشهرته لان المقصد الاصلی تعریفه بوجه یمیزه من غیرہ۔[1] (شرح المجلۃ الاحکام لرستم باز ص۱۰۱۱ م ۱۶۹۰)

شہادت کیلئے خود مشاہدہ کرنا ضروری ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص گواہی دیتے وقت قاضی کے سامنے یہ کہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے یا

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وهی ان علیٰ حاضر یحتاج الشاهد الی الاشارة الی ثلاثة التی الخصمین والمشهود به لو عینا ولا دینا وان علیٰ غائب کما فی نقل الشهادة او میت فلا بد لقبولها من نسبته الی جده فلا یکفی ذکر اسمه واسم ابیه وصناعته الا اذ کان یعرف بها ای بالصناعة لا محالة بان لا یشارکه فی المصر وغیرہ فلو قضی بلا ذکر الجد نفذ فالمعتبر التعریف لا تکثیر الحروف حتی لو عرف باسمه فقط او بلقبه وحدہٗ کفیٰ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۴۶۶ کتاب الشهادة)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۲ الباب الاول فی الشهادة۔

لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں شخص نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے، جبکہ گواہی دینے والا شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت بھی لگاتا ہو۔ تو کیا اس شخص کی یہ گواہی اثباتِ جرم کے لیے شرعاً کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گواہی دینے والے کیلئے اگرچہ عادل، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا بھی ضروری ہے مگر قبولِ شہادت کے لیے اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ شاہد نے مجرم کو جرم کے ارتکاب کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، صرف لوگوں سے سُنکر گواہی دینا قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا اس قسم کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہوگا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات لوگوں میں غلط مشہور ہو چکی ہو۔

لما فی مجلة الاحكام: يلزم ان يكون الشهود قد عاينوا بالذات المشهود به وان يشهدوا على ذلك الوجه ولا يجوز ان يشهدوا بالسماع يعنی ان يشهد الشاهد بقوله سمعت من الناس۔ (مجلة الاحكام العدلية المادة ۱۶۸۸) [1]

صرف عورتوں کی گواہی کا حکم

سوال: شہادت کے معاملہ میں صرف مرد گواہ کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کہیں صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے تنازعات کے حل کے لیے شرعاً دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا بطور گواہ ہونا ضروری ہے لیکن جہاں کہیں مرد گواہوں کی رسائی ممکن نہ ہو یا وہ ان حالات پر مطلع نہ ہوسکتے ہوں تو اس مجبوری کے تحت صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ اثباتِ دعویٰ ہے اور شرعاً ان کی شہادت کو قبول کیا جائے گا۔

لما فی مجلة الاحكام: نصاب الشهادة فی حقوق العباد رجلان او رجل وامرأتان ولكن تقبل شهادة النساء وحدهن بحق المال فقط فی الحال التی لا يمكن اطلاع الرجال عليها۔ (شرح مجلة الاحكام لرستم باز، المادة ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳ الباب الاول فی الشهادة) [2]

---

[1] لما قال العلامة محمد بن الحسين الحنفیؒ: لو قالوا نشهد لانا سمعنا من الناس فلا تقبل شهادته۔ (الفتاوى الانقروية ج ۱ ص۳۹۰ كتاب الشهادة، الباب السادس فی الشهادة بالتسامع)

[2] لما قال العلامة خالد آتاسیؒ: كالولادة فان شهادة المرأة الواحدة فی حق الارث تقبل عندهما خلافاً لابی حنيفةؒ وبقولهما قال الشافعیؒ واحمد وهو الراجح كما فی الفتح واما فی حق ثبوت النسب فتقبل اجماعاً..... حاصله ان شهادة النساء بانفرادهن فيما لا يطلع عليه الرجال حجة۔
(شرح مجلة الاحكام ج ۵ ص۱۲ الباب الاول فی الشهادة)

اثباتِ جرم کے لیے ریکارڈ شدہ شہادت کافی نہیں

سوال:۔ عصرِ حاضر کی سائنسی ایجاد ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ریکارڈ شدہ بیان کی بنیاد پر چوری، زنا، قتل وغیرہ کا جرم ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی کیسٹ کا بیان مثبت للحکم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً گواہوں کا عدالت میں حاضر ہو کر قاضی کے سامنے گواہی دینا ضروری ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں ٹیپ ریکارڈ یا دیگر جدید آلات سے گواہ کا بیان مثبت للحکم نہیں اور نہ قاضی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صرف ٹیپ ریکارڈ یا دوسرے آلات سے کسی کا بیان سنکر کوئی فیصلہ کرے، اس لیے کہ ایک آدمی کی آواز دوسرے کی آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے۔

کما فی مجلۃ الاحکام: الشہادۃ ھی الاخبار بلفظ الشہادۃ یعنی یقول اشہد باثبات حق احد ھو فی ذمۃ الآخر فی حضور الحاکم ومواجہۃ الخصمین فیقال للمخبر شاھد وللمخبَر لہ مشھود لہٗ وللمخبر علیہ مشھود علیہ وللحق مشھود بہٖ۔

قال الشیخ خالد اتاسیؒ: وقولہ فی حضور الحاکم المراد منہ أن یکون الاخبار فی مجلس الحکم فاخبار الحاکم فی غیر مجلس الحکم لا یعتبر شہادۃ۔

(شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص ۱۹۹، ۲۰۰ الباب الاول فی الشہادۃ)

اثباتِ جرم کے لیے تصویر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا ہو یا زنا کر رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص اچانک اس کی تصویر اُتار لے تو کیا وہ تصویر اثباتِ جُرم کے لیے قاضی کی عدالت میں پیش کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تصویر اور اس سلسلے کے دیگر جدید آلات کو فی زمانہ یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ ذرائع اثباتِ جرائم کے لیے کافی حد تک کارآمد بھی ہیں بشرطیکہ دیگر ذرائع وقرائن انکی تائید کرتے ہوں، اس لیے کہ آجکل کے تکنیکی دور میں تصاویر کے اندر جعلسازی کا قوی امکان موجود ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اتاری گئی تصویر اگرچہ کُلی طور پر اثباتِ جرم کے لیے کافی نہیں لیکن اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اگر دیگر ذرائع اس کی تائید میں نہ بھی ہوں اور قاضی کو مجرم پر قوی یقین ہو تو وہ اس پر کم از کم تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: القرینۃ القاطعۃ ھی الامارۃ البالغۃ حد الیقین

مثلاً اذا خرج احد من دار خالية مدهوشاً وفي يده سكين ملوثة بالدم ودخلت الدار ورؤي فيها شخص مذبوح في ذلك الوقت فلا يشتبه في كونه قاتل ذلك الشخص ولا يلتفت الى الاحتمالات الوهمية الصرفة كالذهاب الى كون شخص المذكور بما قتل نفسه۔ (مجلۃ الاحکام، المادہ ۱۷۴۱) لہ

قاتل کے جسم یا کپڑوں پر مقتول کا خون لگا ہو تو

سوال: اگر قتل کی کسی واردات میں عین موقع پر کوئی شخص پکڑا جائے کہ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر ہو اور اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں۔ ڈاکٹری تحقیق سے مقتول کا خون اور خنجر و کپڑوں پر لگا ہوا خون ایک ہی ہو تو کیا شرعاً اس شخص پر جرم ثابت ہوگا یا نہیں ؟

الجواب: مقتول کے خون اور قاتل کے جسم پر لگے ہوئے خون کا ایک ہونا قتل کے اثبات کا قرینہ ہے۔ صورت مسئولہ کے مطابق اگر مقتول اور قاتل کے کپڑوں اور خنجر پر لگا ہوا خون ایک ثابت ہو جائے تو شرعاً یہ شخص مجرم متصور ہوگا، اور اگر دیگر شواہد بھی تائید کرتے ہوں تو قاتل پر حد جاری کی جائے گی ورنہ قاضی اس پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

* * *

لہ قال العلامة خالد الاتاسیؒ: وفي معين الحكام قال بعض العلماء على الناظر ان يلحظ الامارات والعلامات اذا تعارضت فما ترجح منها قضى بجانب الترجيح وهو قوة التهمة ولا خلاف في الحكم بها وتبصرة الحكام، قال الله تعالى: تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُم دل على السيما المراد بها حال يظهر على الشخص والامارات ماخوذة من الشريعة قال الله: (وَجَاءُوا عَلٰى قَمِيصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ) قال عبد المنعم بن الفرس روي ان اخوة يوسف عليه السلام لما اتوا بقميص يوسف الى ابيهم يعقوب عليه تامله فلم يجد فيه خرقاً ولا اثر ناب فاستدل بذلك على كذبهم وقال متى كان الذئب حليما يأكل يوسف ولا يخرق قميصه۔
(شرح المجلة ج ۵ ص ۳۹ في بيان القرينة القاطعة۔ المادہ ۱۷۴۱)۔

مسوّدۂ قانونِ شہادت میں
مولانا سمیع الحق کی بعض دیگر ترامیم اور تقاریر

اقرار اور اقبالِ جرم مسودہ قانونِ شہادت میں دفعہ ۴۵ کا تعلق اقبالِ جرم اور اقرار سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ :-

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں، اقبالِ جرم تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہوسکتا ہے"۔

اس دفعہ کے متعلق مولانا سمیع الحق کی ترمیم (جو کہ فہرست ترامیم میں نمبر ۳۰ پر تھی) یہ تھی کہ اس دفعہ کو یوں بدل دیا جائے :-

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں اقبال تصفیہ کن ثبوت بھی ہے اور مانع تقریر مخالف (ESTOPPIL) بھی، اگر کوئی شخص اقبال (اقرار) کرے تو کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال (اقرار) کو اہمیت دے کر فیصلہ کیا جائے"۔

جناب چیئرمین نے یہ ترمیم پڑھ کر ایوان کے سامنے رکھی تو اس کے بارہ میں میاں نعیم الرحمن صاحب نے نقطۂ اعتراض اٹھایا کہ یہ ترمیم تقاضوں کے مطابق نہیں تو مسودۂ قانون میں کیسے آسکتی ہے، جناب چیئرمین نے اس ترمیم کی اصل عبارت جو کہ اردو میں تھی کی طرف ان کی توجہ دلائی اور خود بھی پڑھی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی درست کیا اور پھر محرک کو اس پر بحث کی اجازت دے دی، مولانا نے کہا :-

مولانا سمیع الحق جناب چیئرمین صاحب! یہ بالکل واضح ہے، ہمارے سامنے جو اصل دفعہ ہے اس میں یہ ہے کہ اقبال تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہوسکتا ہے۔ تو میرا مقصد یہ ہے کہ اقبال کو ثبوتِ قطعی اس شہادت کی رُو سے نہیں سمجھا گیا ہے کیونکہ انھوں نے انگریزی شہادت ایکٹ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا تو یہی تقاضا تھا، لیکن اسلامی قانون میں اقرار کو جس

مفہوم میں لیا گیا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے قطعی ثبوت بھی نہیں یعنی اس سے انکار نہیں کیا (۱۹۹۰ء) بھی ہے، واضح اصول   یؤخذ باقرارہ آدمی اس کے اقرار سے پکڑا جاتا ہے۔

اس مرحلہ پر جناب ملک محمد رمضان صاحب آف بلوچستان نے چیئرمین سے کہا کہ مولانا کی ترمیم کے الفاظ اور معانی کے چکروں میں پڑنے کی بجائے جذبے کو بھی دیکھنا چاہیئے اگر یہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہے تو اسے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر قبول کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔

اس کے بعد چیئرمین نے جناب سید معین الدین شاہ کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ قوانین آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ہم نے قاضی کورٹس پاس کیا ہے، یہاں حقوق کی بات نہیں ہے، یہاں یہ ترمیم زائد ہے قانون میں آ ہی نہیں سکتی۔ اور بھی کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ یہاں جو چیز لانا نہ چاہتے تو یہ حضرات قاضی کورٹس کا حوالہ دے دیتے، اقرار کے متعلق یہی انداز اختیار کیا گیا کہ قاضی کورٹ کا قانون یہی ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا سمیع الحق نے جواب بحث دیتے ہوئے کہا کہ:

مولانا سمیع الحق | جناب والا! میں نے ابھی ایک حصہ بیان کیا تھا، یہاں بار بار ہمیں قاضی کورٹس کا حوالہ دیا جاتا ہے، یہ بڑا عجیب سا نظام ہے کہ اس مسئلے کو دوسری کتاب سے مربوط کیا جائے اور اس کو تیسری سے۔ قانون شہادت تو یہ ہے کہ شہادت کے سارے امور گواہوں کے متعلق ہوں یا حلف کے متعلق ہوں یا اقرار کے متعلق ہوں تو اسے یکجا رکھا جائے، اس طرح آسانی رہے گی۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ایک صحیح اور مؤثر ڈھانچہ تیار ہو جائے تو یہاں اگر تفصیلات نہ بھی ذکر کی جائیں۔ تو میں نے ترمیم میں کہا ہے کہ "کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق" یہ اس لیے ضروری ہے کہ اقبال اور اقرار کو بھی شریعت نے کئی شرائط سے مشروط کر دیا ہے۔ مثلاً اقرار کرنے والا عاقل بالغ ہوگا، اگر نابالغ ہے اور ولی یا سرپرست نے اس کو کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے تو وہ بھی بالغ کے حکم میں متصور ہوگا۔ اسی طرح اور کئی شرائط ہیں، تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب مقر اقرار کرے، اقبال کرے (بغیر کسی جبر و اکراہ کے) تو اس میں شریعت کے واضح احکامات کو ملحوظ رکھا جائے، جبکہ یہاں معاملہ بالکل مبہم ہے۔ اور دوسرا مانع امر مخالف کا مسئلہ ہے کہ اسلام اقرار کو ثبوت قطعی بھی قرار دیتا ہے، اگر یہاں ہم نے اسے ثبوت قطعی قرار نہ دیا تو شریعت کا ایک اصول اس سے متاثر ہو جائے گا۔ اقرار ایک مستقل عظیم الشان باب ہے اسلامی قانون شہادت کا اس کے تقاضوں کو بھی ہر جگہ ملحوظ

رکھتا ہوگا۔ یہ عام مسلّمہ اصول ہے کہ المرء یؤخذ باقرارہ — اب ایک شخص نے اگر اقرار کرلیا تو یہاں تو اس کو مانع تقریر مخالف قرار دیا گیا، یعنی ایک شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں شخص میرا بھائی ہے تو وہ اس کا بھائی تو ہوگیا مگر یہ ضروری نہیں کہ اس اقرار سے وہ اس کے باپ کا بیٹا بھی ہو جائے، خلاصہ تو یہی ہے۔ مگر یہاں تو اس کو ثبوتِ قطعی قرار ہی نہیں دیا گیا، اگر ایسا ہی ہو تو پھر اقرار کی کوئی بنیاد اور حیثیت ہی نہ ہوئی۔

اقرار کے شرائط

دوسری گذارش میں نے یہ کی کہ اقرار کو شریعت نے کئی چیزوں سے پابند کردیا ہے، جیسا کہ ہم نے شاہد کے لیے بھی اہلیت اور شرائط کو ملحوظ رکھا ہے، تو یہاں بھی اگر ہم تفصیلات میں نہیں جاتے تو شہادت کے بعد ایک درجہ تو اقرار کرنے کا ہے، اس کی بھی شرائط ہیں اور کچھ مستثنیات ہیں، وضاحتیں ہیں، تو ان کو میرے اس مختصر جملے میں ملحوظ رکھ دیا جائے کہ شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال کو اہمیت دیں گے، اگر وہ شریعت کے احکام پر پورا نہیں اترتا تو جج کو اختیار ہو کہ وہ اس شخص کے اقرار کو اہمیت نہیں دے گا۔ صرف اتنا مطلب ہے کہ اس دفعہ کو بھی کسی طرح اسلامی اصولوں کے قریب لایا جائے۔

اس کے بعد جناب چوہدری فقیر اللہ صاحب اور جناب چوہدری الطاف حسین صاحب اور بعض دیگر ارکان نے ترمیم کی مخالفت کی اور مولانا قاضی عبداللطیف صاحب نے ترمیم کی پُرزور تائید کی، اس پر رائے شماری کے بعد جناب چیئرمین نے اسے ساقط قرار دیدیا۔

◆

شادی وغیرہ کا ثبوت

دفعہ ۶۴ کا تعلق شادی وغیرہ کی رشتہ داری کے ثبوت سے ہے اس میں مولانا کی ترمیم یہ تھی کہ اس کے آخر میں یہ الفاظ بڑھادیئے جائیں کہ: "یا قوانینِ حدود کی متعلقہ دفعات کے تحت ہو" تاکہ زناکاری کے انسداد کے سلسلہ میں یہ دفعہ بعض صورتوں میں رکاوٹ بن سکے۔ یہاں اصل دفعہ میں تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ کا ذکر تھا جبکہ وہ کالعدم ہوچکی تھیں مگر حدود سے متعلقہ دفعات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

جناب حکیم محمد سردار خان صاحب، جناب چوہدری محمد الطاف حسین صاحب، وزیر قانون جناب پیرزادہ صاحب نے بحث میں حصہ لیا اور کہا کہ اس ترمیم کے جملہ تقاضے حدود آرڈیننس سے پورے ہورہے ہیں البتہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ دفعات کا ذکر یہاں زائد ہے اسلئے کہ یہ ریپیل ہوچکی ہیں۔

جناب چیئرمین نے اس کے بعد محرک مولانا سمیع الحق کی رائے معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ جنابِ چیئرمین

ہم نے یہ بات مسودہ کو ترتیب دیتے وقت مفاہمتی مجلس میں بھی کہی تھی کہ اگر حدود آرڈی ننس کے ذکر کی ضرورت نہیں تو پھر تعزیراتِ پاکستان کی ان منسوخ شدہ دفعات (۴۹۷ اور ۴۹۸) کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تو میں حیران تھا کہ جو دفعات منسوخ ہیں ان کا تو ذکر ہے لیکن جو رائج الوقت ہے (یعنی حدود آرڈی ننس) اس کا ذکر تک نہیں۔ اس پر جناب چیئرمین نے منسوخ شدہ دفعات کا ذکر ہٹا دیا اور مولانا نے ترمیم واپس لینے کی اجازت شرطیہ طور پر لینی چاہی تو چیئرمین نے کہا کہ شرطیہ اجازت نہیں لی جا سکتی، اس کے بعد ترمیم پر رائے شماری ہوئی اور گر گئی۔

دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش

دفعہ ۱۲۸ کا تعلق دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش سے ہے کہ ایسی پیدائش بچے کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہوگا۔

مجوزہ ایکٹ ۱۸۷۲ء میں اسے بالکل مبہم چھوڑ دیا گیا تھا، صرف یہ کہ جائز شادی کے دوران بچہ پیدا ہونا اس کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ گویا اگر عقدِ نکاح کے چند دن بعد بھی بچہ پیدا ہو جائے تو اسے حلالی سمجھا جائے گا، جبکہ اسلامی شریعت کی رو سے عقدِ نکاح کے کم از کم ۶ ماہ گذرنے کے بعد پیدا ہونے والا بچہ جائز سمجھا جائے گا۔ اسی طرح یہ ایکٹ انفساخِ نکاح کی صورت میں ۲ دوسو اَسّی یوم کے اندر بعد انفساخِ ازدواج تولّد کو جائز ثبوت قرار دے رہا تھا جبکہ فقہائے کرام کے نزدیک کم از کم مدت دو سال ہے۔ یعنی فسخِ نکاح (طلاق یا وفات) کے بعد دو سال تک پیدا ہونے والا بچہ بھی حلالی سمجھا جائے گا، سوائے استثنائی صورتوں کے ـــ (جو کہ نیچے دفعہ میں آ رہی ہیں)ـــ

علماء کا اصرار تھا کہ اس دفعہ کو ہر حالت میں شریعت کے مطابق بنانا ہوگا، جبکہ مخالف گروپ وکلاء وغیرہ اس پر آمادہ نہیں تھے مگر بعد میں مفاہمتی مجالس میں اس پر جناب وزیر قانون وغیرہ کی سعی سے وکلاء حضرات نے اتفاق کر لیا اور اس دفعہ کو علماء کرام نے از سر نو مرتب کر کے مسودہ میں شامل کرا لیا۔

مدتِ حمل

دفعہ ۱۲۸ دورانِ ازدواج پیدائش پختہ ثبوت جائز ہونے کا ہے یہ واقعہ کہ کوئی شخص اپنی والدہ کے کسی مرد کے ازدواجِ جائز میں رہنے کے چھ ماہ یا اس کے بعد یا اس نکاح کے ختم ہونے سے دو سال کے اندر پیدا ہوا ہو اور اس اثنا میں اس کی ماں بے زوج رہی ہو تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ صحیح النسب بیٹا ہوگا، اِلّا یہ کہ عورت عدت گذر جانے کا اقرار کر چکی ہے اور بچہ کی پیدائش تاریخ اقرار سے ۶ ماہ بعد ہوئی یا شوہر انکاری ہو۔

ایوان میں یہ دفعہ جب سامنے آئی تو حکیم محمد سردار خان اور بعض وکلاء نے پھر اسے ترمیم کے ذریعہ

بدلنا چاہا اور نکاح ختم ہونے کے بعد کی مدت کو ۲۹۵ دن تک محدود کرنا چاہا۔ یہ مسئلہ مدت حمل کی اکثر مدت پر مبنی ہے۔ بعض ائمہ کے ہاں یہ مدت تین سال اور اس سے بھی زائد ہے، امام ابوحنیفہؒ کی رائے کم از کم میعاد پر مبنی ہے، مخالفت کرنے والوں کو یہ میعاد ناممکن اور مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی جبکہ انگریزی ایکٹ میں عقدِ نکاح کے دو دن بعد بچے کی ولادت کو قانوناً جائز قرار دیئے جانے پر حیرت اور اچنبھا نہ تھا۔

علماء کرام نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس میعاد کی حکمتوں پر روشنی ڈالی اور پیش کردہ ترمیم کی مخالفت کی، وکلاء حضرات نے اپنے مؤقف پر تقریریں کیں اور الحمد للہ کہ رائے شماری کے بعد مخالفانہ ترامیم ساقط ہو گئیں اور اکثریت سے علماء کی پیش کردہ دفعہ منظور ہو گئی۔

اس مسئلہ پر مولانا سمیع الحق نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ:

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق صاحب!

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! یہاں زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے کہ بظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے اور اس جدید دور میں اگر ہم دس مہینے سے زیادہ دو سال فرض کر لیں تو لوگ ہنسیں گے، گویا اس کے ناممکن ہونے کی وجہ سے ۲۹۵ دن پر زور دیا گیا ہے۔ میں مختصراً دو تین نکات بیان کرتا ہوں۔ ایک تو حکیم محمد سردار خان صاحب کی ترمیم میں بظاہر تعارض ہے، ابتداء میں تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ ۲۹۵ دن میں تبدیل کیا جائے، اور سب مقررین اسی پر زور دے رہے ہیں کہ چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیے ایسا ہونا چاہیئے، پھر یہ خود ہی آخر میں بارِ ثبوت والدہ پر ڈالتے ہیں تو وہاں کہتے ہیں کہ ۲۹۵ دن کے بعد اور دو سال کے اندر۔ میں کہتا ہوں کہ جو چیز ترمیم کی ابتداء میں واقعی ناممکن تھی تو پھر آخر میں وہ ممکن کیسے سمجھ لی گئی؟ اگر یہ بات بالکل ناممکن تھی تو پھر ایک ناممکن چیز کے لیے کسی دعویٰ کا بارِ ثبوت والدہ پر ڈالنا کتنے تعجب کی بات ہے، میں ابھی وضاحت سے بات کروں گا۔

چوہدری محمد ادریس تاج | پوائنٹ آف آرڈر! جناب چیئرمین! اگر میں قیاس سے یہ یہ کہوں کہ کسی خاتون کے پیٹ میں بچہ ہے تو آخر وہ میڈیکل چیک اپ آپ کروائیں گے تو پتہ چلے گا، اس طرح تو پتہ نہیں چلے گا۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھئے یہ پوائنٹ آف آرڈر نہیں ہے۔

اکثر مدتِ حمل میں اقوال اور حکمتِ خداوندی

مولانا سمیع الحق | تو اگر ایک چیز ترمیم کے آغاز میں مضحکہ خیز تھی تو وہ ترمیم کے آخر میں کیوں مضحکہ خیز نہیں بنتی؟ میری دوسری گذارش یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی بچے ڈیڑھ دو سال

ماں کے پیٹ میں نہیں رہتے تھے، اور عام حالات جو ہمیں ملتے ہیں اس میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں اس کے باوجود بھی تمام ائمہ نے جو رائے اختیار کی تو یہ نہیں تھا کہ ان میں عقل، تدبر اور یہ ساری باتیں نہیں تھیں اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے نعوذ باللہ ایسی جاہلانہ بات کہہ دی حالانکہ سب ائمہ بنیادی طور پر متفق ہیں کہ ایک سال نہیں ہے اور چاروں ائمہ میں اگر اکثر مدت حمل کے بارے میں اختلاف ہے بھی تو وہ دو سال سے زائد میں ہے، دو سال پر تو سب متفق ہیں، امام شافعیؒ تو تین سال کہتے ہیں، اور امام مالکؒ سے تو چار سے چھ سال تک کے اقوال ملتے ہیں (اس مرحلہ پر کئی ارکان نے مضحکہ خیز انداز میں ان اقوال کا مذاق اڑایا) اب آپ مذاق اڑائیں یا ہنسی کریں بہرحال یہ آپ کا دین ہے پھر سرے سے اس دین سے ہی دستبردار ہو جائیں، خواہ آپ جو بھی کریں آپ کو ان مسائل میں جرأتِ ایمانی کی بات کرنی چاہیے دین کی باتوں پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا کیا کہے گی، ایمانداری سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ دیں آپ تو پھر آپ کو کتاب و سنت پر مبنی ہر رائے کو ماننا پڑے گا۔

الغرض اس کو اجماع مرکب کہتے ہیں، اب وجہ کیا تھی کہ میں نے ایسا کہا؟ وجہ یہ تھی کہ یہ کچھ مخصوص حالات ہیں، مثلاً ایک شوہر بیوی کو طلاق دیدیتا ہے یا کوئی خاتون بیچاری بیوہ ہو جاتی ہے تو وہ ہزاروں مصائب اور مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے، اگر اس نے عدت پوری ہونے کا اقرار نہ کیا اور کسی اور سے شادی بھی نہ کی یا شوہر زندہ ہے اور انکار نہیں کرتا، تو ان مخصوص حالات میں اللہ نے ہر جگہ اپنے نظام میں یہ گنجائش رکھی ہے اور احکام میں اسے ملحوظ رکھا کہ کسی انسان کو ناجائز اور حرامی نہ کہا جائے کیونکہ کسی کو ایک دفعہ ناجائز اور حرامی کہہ دینا اس کو زندہ مار دینے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک پاکدامن اور عفیفہ عورت کو اسلام حتی الوسع اس الزام، تہمت اور بدنامی سے بچانا چاہتا ہے، اب جو دو سال کی گنجائش رکھی گئی ہے تو ایک بیچاری پاکباز عورت جب تک اس کے خلاف ثبوت ثابت نہ ہو تو شریعت اس کو اپنے حال پر رکھتی ہے۔

تیسری گذارش میری یہ ہے کہ یہ امت جو ہے یہ صرف سائنس کے زمانے کے لیے نہیں ہے وہ چودہ سو سال سے ہے اور قیامت تک رہے گی اور ساری بنی نوع انسان کے لیے اسلامی تعلیمات ہیں، ہر جگہ نہ تو سائنس تھی نہ ایکسرے ہیں نہ لیبارٹریاں ہیں نہ اس قسم کے ٹیسٹ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، آج بھی ہماری آبادی کا ۹۵ فیصد علاقہ دیہات ہے، جنگلات بھی ہیں، امتِ امی کا معنی یہ ہے کہ اسے دینِ فطرت میں تکلفات کا پابند نہ کیا جائے۔ شکریہ

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت | مروجہ شہادت ایکٹ میں وعدہ معاف گواہ موجود ہے یعنی

کسی شریکِ جرم کا اقرار اور اس کے اپنے کسی دوسرے شریک کار مجرم کے خلاف بطور شہادت استعمال ہو سکتا ہے جس کی شرعی نقطۂ نظر سے کوئی گنجائش نہیں، باہمی مفاہمت کی مجلس میں نئے مسودہ سے یہ شق حذف کرائی گئی تھی مگر ریٹائرڈ چیف جسٹس بشیر الدین خان صاحب اپنی ترمیم کے ذریعے اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے اس ترمیم پر بڑی زور دار تقریریں ہوئیں، ترمیم کی تائید کو کثرت سمجھا گیا اور وہ منظور ہو گئی۔ اس موقع پر مولانا سمیع الحق صاحب نے اپنی تقریر میں کہا :-

جناب چیئرمین | بہت شکریہ! مولانا سمیع الحق صاحب۔

جناب مولانا سمیع الحق | حضور والا! یہ واضح مسئلہ ہے کہ وہ خود ایک فریق مقدمہ بن گیا ہے اور اس کے بارے میں المغنی نے تصریحات نقل کی ہیں کہ کُلَّ مَنْ خَاصَمَ فِیْ حَقٍّ لَا تُقْبَلُ شَهَادَةٌ فیہ۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۶۷) ایک اور روایت میں ہے: قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تقبل شهادةُ الخصم۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریقِ مقدمہ کی گواہی فریق مخالف کے لیے قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ ایک فریقِ مقدمہ ہے اور اس فریق کے مخالف کو استعمال کرتا ہے جو اس فریق پر بڑی زیادتی ہے، دوسری روایت الدر المختار کی ہے، کل من صار خصماً فی حادثۃ لا تقبل شهادتہ فیها۔ (الدر المختار ج ص کتاب الشہادات)

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "ہر وہ شخص جو کسی شہادت میں فریقِ مخالف ہو تو اس میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔" تیسرا یہ کہ وہ گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد عادل نہیں رہا۔ اور شہادت کے لیے صریحاً اصول ہیں کہ وہ عادل ہو، جب خود اس نے یہ اعتراف کیا کہ میں نے قتل کیا ہے، چوری کی ہے، زنا کیا ہے، تو اس کے بعد اس کی شہادت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اُس کو معاف کر دے، کیونکہ اس سے تو حقوق العباد کی حق تلفی ہو گی، حکومت کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ملزم کو معاف کر دے کہ چلو تم نے چوری کی ہے، قتل کیا ہے تو کوئی بات نہیں تجھے معافی دی جاتی ہے، حقوق العباد کو تو حکومت بھی معاف یا ضائع نہیں کر سکتی جب تک کہ متاثرہ شخص اپنا حق خود معاف نہ کر دے ـــــ یہاں ریاست اور اسٹیٹ کی حفاظت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے تو اسلام کہتا ہے کہ اس کیلئے سخت سے سخت قوانین بنائے جائیں اور غدار کو سخت سزا دی جائے، مگر.....

جناب چیئرمین | شکریہ (یعنی وقت ختم ہو گیا ہے)

اِسلام اور خواتین کی شہادت

مجلسِ شوریٰ (وفاقی کونسل) میں مسودۂ قانونِ شہادت پر مولانا سمیع الحق صاحب کی تقریر جسے وفاقی کونسل سیکرٹریٹ نے ضبط کیا، فقہ اور قانونِ شہادت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے نذرِ قارئین ہے۔ (مُرتب)

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم ٭ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ٭

واذا دعوا الی اللّٰہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین ٭ افی قلوبھم مرضٌ ام ارتابوا ان یحیف اللّٰہ علیھم ورسولہ۔۔ (سورۃ النور)

جنابِ مولانا سمیع الحق | جنابِ چیئرمین! قانون سے متعلق مسائل بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں، ان حالات میں دس منٹ کی جو پابندی رکھی گئی ہے اور یہ جو تلوار سر پر لٹک رہی ہے تو حیران ہوں کہ میں کس کس مسئلہ پر عرض کروں، بہر حال اگر آپ دس منٹ مزید دیدیں تو یہ آپ کی عنایت ہوگی۔

جنابِ چیئرمین | نہیں! اگر آپ ۹ منٹ میں ختم کر دیں تو میں شکریہ ادا کروں گا۔

جنابِ مولانا سمیع الحق | جو مسودہ ہمارے سامنے لایا گیا ہے اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر تمام معزز ارکان کو بلا کسی اختلاف کے گہری نظر ڈالنی چاہیئے تھی اور اسکی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے تھی، لیکن بدقسمتی سے سارے مسودہ میں صرف یہ ایک مسئلہ ایسا اہم بن گیا ہے کہ سارے ایوان کی توجہات اس طرف ہی لگ گئی ہیں، یعنی ؎

آ لیے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور ہمارے مبصرین، وکلاء بھی قرآنِ کریم کی آیات اور مصحفِ الٰہی کی تفسیر اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں "مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب" کی روشنی میں کرنے لگ گئے ہیں، اکبر نے کہا تھا ؎

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
شیخ حاضر بھی ہوئے ہیں نئی تفسیر کے ساتھ

شیعہ مسلک اور خواتین کی شہادت

تو ہمارے یہ شیوخ حاضر بھی ہوتے تو نئی تفسیر کے ساتھ۔ پیر اشرف صاحب جو اس وقت موجود نہیں ہیں اور ہمارے علامہ[1] رضی صاحب (شیعہ مجتہد) بھی، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے اپنے اجتہادات ہیں یہ ان کا حق ہے کہ جیسے چاہیں انہیں ظاہر کریں، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ یہ شیعہ مسلک بھی نہیں ہے، اہلِ سنت اور اہلِ تشیع اللہ کے فضل و کرم سے قانونِ شہادت میں خواتین کے مسئلہ پر متفق ہیں بلکہ شیعہ تو ہم سے بھی چند قدم آگے ہیں، میں یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں کہ اس بارے میں شیعہ مسلک کیا ہے؟

اسلامی نظریاتی کونسل نے قانونِ شہادت کا جو مسودہ ہمیں بھیجا ہے اس کے صفحہ ۹۵ ضمیمہ (الف) کے ماتحت کونسل کے شیعہ رکن علامہ طالب جوہری صاحب کے اختلافی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں صرف حدود میں خواتین کی شہادت مسترد کی گئی ہے اور مقبول نہیں ہے لیکن علامہ طالب جوہری کے نزدیک حدود کے علاوہ طلاق، خلع، وصیت اور نسب میں بھی عورتوں کی گواہی کسی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہے، عورتوں کے متعلق مخصوص امور میں ہمارے ہاں صرف ایک عورت کی شہادت کافی ہے، مگر انہوں نے ان امور میں بھی چار عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ (مسودہ قانونِ شہادت مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل ص ۵۹)

ایک رکن | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! یہاں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ تو زیرِ بحث نہیں۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھیے، مولانا اس رپورٹ سے حوالہ پیش کر سکتے ہیں۔
مولانا! آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ علامہ جوہری کا مسلک ہے؟

مولانا سمیع الحق | نہیں جناب انہوں نے تو لکھا ہے کہ یہ ہماری فقہ جعفریہ میں ہے۔

---

[1] میر مجلسِ شوریٰ اور مشہور شیعہ عالمِ دین علامہ سید محمد رضی آف کراچی نے مولانا سے قبل پُرجوش انداز میں ایک عورت کی گواہی کافی ہونے پر زور دیا اور کہا کہ عورت امامت کر سکتی ہے اور حکومت بھی، اور میں اپنے اجتہاد کی روشنی میں جرأت سے کہتا ہوں کہ گواہی میں ایک عورت کو کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور بھول جانے سے متعلق آیت کو علت قرار دیا کہ اب نہیں بھولتی تو دو کی بجائے ایک کافی ہے۔ لاہور کے پیر محمد اشرف صاحب نے بھی اپنی تقریر میں ایسا ہی موقف اختیار کیا تھا۔ (مرتب)

عورت کی امامت اور حکمرانی

تو عرض یہ ہے کہ شیعہ مسلک خواتین کو معلوم نہیں ہے جس میں ہر مرحلہ پر ان کی شہادت کو قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ رضی صاحب نے عورتوں کی امامت کے بارے میں کہا ہے جو کہ ہمارے ہاں بھی جائز ہے یعنی آپس میں خواتین اگر ایک کمرے میں جمع ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اکٹھی نماز پڑھیں اور ایک عورت ان کی امامت کروا سکتی ہے لیکن عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ پھر عورت کی حکومت کی مثال دی ہے، تو یہ ملکہ سبا کا واقعہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ تو ہمارے نزدیک عورت کی حکومت کے جواز میں پیش کی گئی اس دلیل کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ لن یفلح قوم ولوا امورھم نساءھم (او کما قال علیہ السلام) یعنی اس قوم نے کبھی فلاح نہ پائی جس نے اختیار اور نظامِ اقتدار عورتوں کے سپرد کر دیا۔

حکمت اور علتِ حکم میں فرق

پھر علامہ رضی صاحب نے سورۂ بقرہ کی آیت فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کے بعد ارشاد ان تضلّ احدٰھما فتذکّر احدٰھما الاُخرٰی (کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے) کو حکم کی علت قرار دیا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ علامہ صاحب کو اس بارہ میں خلط مبحث ہوا ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ ایک علت ہوتی ہے اور ایک حکمت۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یاد دلانے کے مسئلہ کو بطورِ علت بیان نہیں کیا ہے بلکہ بطورِ حکمت بیان کیا ہے۔ علت تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قانون بنایا ہے۔ اب کسی قانون کی آپ حکمتیں بیان کریں تو اس حکمت کے ساتھ وہ چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ اگر حکمت بیان کی گئی ہے تو بہتر، نہیں ہے تو پھر بھی وہی حکم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارہ میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (الآیۃ) کہ روزے سے تقویٰ حاصل ہو گا، تو روزے کی فرضیت کے لیے تقویٰ علت نہیں ہے، یہ حکمت ہے کہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔

نماز کے بارے میں فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (الآیۃ) کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے، تو یہ اس کی حکمت ہے علت نہیں، تو اگر ایک شخص کبیرہ گناہ کرتا

ہے تو کیا اُسے اب یہ کہا جائے کہ تم نماز مت پڑھو کیونکہ علت حاصل نہیں ہو رہی ہے، یا اگر تقویٰ آ گیا ہے تو تم نماز ہی چھوڑ دو کہ مقصد حاصل ہو گیا تو اب نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ایک شخص کے اندر تقویٰ نہیں ہے تو اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم روزہ ہی نہ رکھو۔ تو اللہ تعالیٰ نے بطور حکمت اسے بیان کیا، اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی تفسیر روح المعانی کی دوسری جلد میں ایسی ہی روشنی ڈالی ہے اور سارے مفسرین اسے حکمت قرار دیتے ہیں۔ ... (یہاں مولانا نے کتاب سے اقتباس سنایا......) تو یہ حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک مصلحت کے تحت بیان فرمائی ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے اگر نہ بھی بیان فرماتے تو بغیر حکمت کے بھی مسلمان اللہ کے احکام ماننے کا پابند ہوتا ہے۔

بہر حال یہ گذارشات وضمناً آ گئیں اور میرے دس منٹ کا اہم حصہ تو ان کی نذر ہو گیا، اب اصل موضوع کا کیا کیا جائے؟ علامہ رضی صاحب تو اللہ کے فضل سے بہت وسیع الظرف انسان ہیں، ہماری آپس میں بات چیت ہوتی رہتی ہے، کھلے دل کے انسان ہیں ـــــ لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ اہلِ سنت کے مسلک کی رو سے اس کی بروقت تردید کروں، وہ اپنے مسلک کی وضاحت جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، ان پر کوئی قدغن نہیں ہے، یہ ان کا اپنا اجتہاد ہو تو ہو مسلک نہیں ـــــ

جناب چیئرمین صاحب یہاں خواتین کو بار بار یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر ہم فرائض اور حقوق کو ملحوظ رکھیں، تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

شہادت فرض ہے حق نہیں

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں ہمارے لیے فرض قرار دی ہیں مثلاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اسی طرح شہادت بھی ایک فرض ہے جو کہ فقہ کا مسئلہ ہے اور سارے فقہاء اور علماء ابواب الشہادت کی کتابوں میں اس کی تصریح کرتے ہیں۔ یہ میرے پاس فقہ کی معتبر ترین کتاب ھدایہ ہے اس کے آغاز میں ہی ہے کہ الشھادۃ فرض..... الخ شہادت ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر عائد کیا گیا ہے ـــ یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو دیدیا اور کسی کو نہیں دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کو اختیار حاصل ہے کہ کسی کے لیے کوئی عبادت لازم کرے کسی کے ذمہ نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خواتین کی نازک ذمہ داریوں اور خلقی کمزوریوں کی وجہ سے ان کو تمام عبادات میں رعایت بھی دی ہے۔

فرائض اور احکام میں عورتوں سے رعایت

یہ شہادت کا مسئلہ بھی اگر وہ سوچیں تو اس میں بھی ان کے لیے رعایت ہے

مثلاً نماز فرض ہے حق نہیں ہے، اب نماز کے لیے بھی یہ کہا گیا ہے کہ دس دن مہینے میں تمہیں (عذر ہونے کی وجہ سے) چھٹی ہے کہ جب حضور اکرمؐ سے عورتوں کے نقصانِ دین کے بارہ میں پوچھا گیا تو حضور نے یہی بات دلیل کے طور پر پیش کی۔ اسی طرح روزہ ایک فرض ہے خدا نے روزے میں بھی ان کو رعایت دی ہے کہ جن دنوں میں ان کو عذر ہو وہ دس دن روزہ نہیں رکھیں گی، سخت گرمی کے دن ہوں گے مگر انہیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے بعد میں اعادہ کریں گی۔ اسی طرح حج کا مسئلہ ہے، اس میں ہر مرد پر پابندی ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہے تو لازمی طور پر حج پر جائے، مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۝ (الآیۃ) اس کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں مگر جائے گا ضرور، ہزاروں خطرات مرد کے لیے بھی راستے میں ہوتے ہیں لیکن عورت کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہاری نگہداشت کرنے والا محرم مرد ہو تو تب تم پر حج فرض ہے ورنہ نہیں، تو یہ کتنی بڑی رعایت ہوئی۔ اور زکوٰۃ و عشر میں بھی میرا خیال ہے کہ اس میں بھی عورت سے رعایت ہے، مثلاً ڈھائی فیصد مرد پر بھی ہے اور ڈھائی فیصد عورت پر بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس میں رعایت نہ ہوتی تو عورت پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہوتی چاہیئے تھی کیونکہ مرد کے ذمے خدا نے خارجی ذمہ داریاں اور گھر کے تمام اخراجات لگائے ہیں، عورت کا نان و نفقہ اور رہن سہن سب کچھ مرد کے ذمہ ہے، مرد کے پاس اگر ہزار روپے ہیں تو اس پر دوگنی چوگنی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں اس کے برعکس اگر عورت کے پاس ہزار روپے ہیں اور کوئی ذمہ داری نہیں، نہ مرد کی کفالت کا فکر ہے اس کو، نہ بچوں کی اس پر ذمہ داری ہے، اس کے اپنے اخراجات بھی مرد پر ہیں، گھر کا نوکر چاکر بھی مرد کے ذمہ ہے، تو گویا پھر تو اس پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہونی چاہیئے تھی لیکن خدا نے اس میں بھی انہیں ایسی کنسیشن (CONCESSION) دی کہ ان پر بھی مردوں کے برابر ڈھائی فیصد ہی ہے۔

کسی غیر مکلف کو نصوص میں مخاطب نہیں بنائیں

اب آگے بات آتی ہے شہادت کی اور کہا جاتا ہے کہ جب اللہ نے شہادت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو عورتوں کو اس میں کیوں روکا جاتا ہے؟ تو عرض ہے کہ شہادت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب اسے مکلف ہی نہیں بنایا اور آیاتِ شہادت متوجہ ہی نہیں ہوئیں ان کو، مثلاً وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم ہے، تو اب اگر ایک شخص نابالغ ہے اس کو اقیموا الصلوٰۃ متوجہ ہی نہیں ہے، غیر مسلم ہو تب بھی متوجہ نہیں ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح

اٰتوا الزکوٰۃ ہے۔ ایک شخص فقیر ہے اور صاحبِ نصاب ہی نہیں ہے تو وہ مرد ہو یا عورت، ہو اس کو یہ آیت متوجہ ہی نہیں ہوتی، اللہ نے جب عورت کو مکلف نہیں بنایا اس فریضے کا، تو یہ آیات (۱) وَلَا یَاْبَ الشُّھَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا۔ الآیۃ۔ (۲) وَلَا تَکْتُمُوا الشَّھَادَۃَ وَمَنْ یَّکْتُمْھَا فَاِنَّہٗ آثِمٌ قلبه۔ الآیۃ۔ (۳) کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ۔ الآیۃ۔

یہ ساری آیات ان کو متوجہ ہی نہیں ہیں کہ وہ کہیں کہ ہمیں بھی اس میں مخاطب بنایا گیا ہے۔ جب کسی طبقہ کو مکلف ہی نہیں بنایا گیا ہو تو اس سے وہ آیت مطالبہ ہی نہیں کرتی۔ اور میں تو سوچتا ہوں کہ یہ تضادات خدا کے کلام میں کیسے ممکن تھے، جبکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ عورتوں کو یہ فرماتے ہیں کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی۔ الآیۃ کہ گھروں میں بیٹھی رہو، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔ (الآیۃ) کہ کوئی بھی چیز ان سے مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ ایک طرف تو خداوند تعالیٰ ان کو (عورتوں کو) پابند بناتا ہے گھر کا، پھر دوسری طرف ان پر فرض کیسے کرتا ہے کہ وہ عدالتوں میں جا کر گواہیاں دیتی رہیں اور پھرتی رہیں، اللہ کے کلام میں ایسا تضاد تو ہو نہیں سکتا۔ ان آیات کا سارا مضمون یہی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں یعنی پردہ کا حکم دیا ہے، اور دوسری طرف وہ تمام آیاتِ شہادت پیش کی جا رہی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ عدالتوں میں گھومتی رہو۔ تو یہ کوئی انسانی قانون اور انسانی لائر (LAWYER) اور انسانی قانون دان تو نہیں ہے۔! اللہ تعالےٰ کے کلام میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے۔ تو ایسی تمام آیات کا مخاطب اللہ تعالےٰ نے صرف مرد کو بنایا ہے نہ کہ عورتوں کو۔

جنابِ چیئرمین مولانا تشریف رکھیں آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

كتاب القسمة والأكراه

كتاب القسمة

(جائیداد کی تقسیم کے احکام و مسائل)

کسی ایک شریک کے مطالبہ پر جائیداد کی دوبارہ تقسیم کا حکم

سوال: چند ورثاء والد کی جائیداد میں اجتماعی طور پر حق رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ تمام جائیداد کی تقسیم کی ضرورت نہیں اُس کا صرف منافع اور آمدنی لے کر آپس میں تقسیم کرتے رہیں گے، لیکن اب ایک وارث اصرار کر رہا ہے کہ میرا حصہ الگ کر دیں اس لیے کہ میں مشترکہ طور پر جائیداد سے منافع لینے کے حق میں نہیں ہوں، کیا اس وارث کے مطالبہ پر جائیداد تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مورث کی وفات کے بعد متروکہ جائیداد میں ورثاء کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصہ کے مطالبہ کا حقدار ہے، ایسی حالت میں جب تقسیم سے متروکہ جائیداد کے منافع ختم نہیں ہوتے ہوں تو ہر ایک وارث اپنے حصہ سے استفادہ کر سکتا ہے، لہٰذا کسی ایک شریک کے مطالبہ پر عمل ہو کر جائیداد تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: وسببها طلب الشركاء او بعضهم الانتفاع بملكه على وجه الخلوص وقال شرطها عدم فوت المنفعة بالقسمة۔ وقال ابن عابدينؒ تحت قوله المنفعة اى المعهودة وهى ما كانت قبل القسمة۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۱۲۸ كتاب القسمة) ۔لہ

لہ قال العلامة اكمل الدين البابرتیؒ: سببها طلب احد الشركاء الانتفاع بنصيبه على الخلوص وركنها ما يحصل به الافراز والتميز لنصيبين وشرطها ان لا تفوت منفعة بالقسمة۔ (العناية على هامش فتح القدير ج ۸ ص ۳۴۸ كتاب القسمة)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج ۵ ص ۲۱۲ الباب الثالث فى بيان ما يقسم وما لا يقسم وما يجوز من ذلك وما لا يجوز۔

نابالغ کے حصہ کی تقسیم کا حکم

سوال: ۔ چند ورثاء نے مشترکہ جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کیا اُن میں سے ایک شریک نابالغ تھا، حاکمِ وقت نے نابالغ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے دیگر شرکاء کے مطالبہ پر ان کی جائیداد تقسیم کر دی، شرکاء نے اپنے اپنے حصہ کی جائیداد لے کر مدت دراز تک اُس میں تصرفات کئے لیکن اب نابالغ لڑکا بالغ ہونے کے بعد دوبارہ تقسیم کا مطالبہ کر رہا ہے، تو کیا یہ تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: ۔ ورثاء کسی نابالغ وارث کے حصہ میں تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتے اور نہ نابالغ کسی کو وکیل مقرر کر سکتا ہے، تاہم اگر حاکمِ وقت نابالغ کی نمائندگی کر کے ورثاء سے جائیداد تقسیم کرے تو ایسی تقسیم نافذ ہے اسے توڑنا جائز نہیں، حاکمِ وقت نابالغ کی طرف سے نمائندہ متصور ہوگا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وصحت برضاء الشركاء الا اذا كان فيهم صغير لا نائب عنه۔

وقال العلامة الحصكفیؒ: بعد هذا القول او غائب لا وكيل عنه لعدم لزومها حينئذ الا باجازة القاضي او الغائب او الصبي اذا بلغ۔ (تنوير الابصار والدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۰ كتاب القسمة) لہ

کسی ایک شریک کی غائبانہ حالت میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال: ۔ چند ورثاء میں سے ایک وارث عرصہ دراز سے غائب ہے، اب اگر حاضر ورثاء مورث کی جائیداد تقسیم کرنا چاہیں تو اس غائب وارث کے حصہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ جبکہ حاضر ورثاء کو جائیداد تقسیم کیے بغیر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے اور غائب شریک تک رسائی کا کوئی قابلِ عمل ذریعہ بھی نہیں ہے؟

لہ قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضي خانؒ: اذا قسم الورثة التركة فيما بينهم بغير امر القاضي وفي الورثة صغير او غائب او شريك الميت لا تتم القسمة الا باجازة الغائب او ولي الصغير او باجازة الصبي بعد البلوغ او باجازة القاضي قبل البلوغ۔

(فتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج ۳ ص ۱۵۶ كتاب القسمة)

ومثلهٗ في فتح القدير ج ۸ ص ۳۵۱ كتاب القسمة۔

الجواب: - اگر غائب وارث تک رسائی ممکن ہو تو تقسیم جائیداد کیلئے اس کی ذاتی طور پر حاضری ضروری ہے، تاہم اگر وہ ذاتی طور پر حاضری سے قاصر ہو تو کسی کو اپنی طرف سے نمائندہ مقرر کرے اور اگر وہ حاضری سے بلا وجہ پہلوتہی کر رہا ہو تو حاضر ورثاء کے لیے حاکم وقت کا سہارا لینا ضروری ہے کیونکہ حاکم وقت غائب وارث کی طرف سے نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وفیھم صغیر او غائب قسم بینھم ونصب قابض لھما۔ وقال الحصکفیؒ تحت قول المذکور نظرًا الغائب والصغیر ولابد من البینة علیٰ اصل المیراث عندہٗ خلافًا لھما کما مر۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص۱۸۲ کتاب القسمة)[1]

قرعہ اندازی کے بغیر جائیداد تقسیم کرنا

سوال: - ایک وسیع رقبہ اراضی ایک قوم کی مشترکہ جائیداد تھی، رؤسائے قوم نے باہمی رضامندی سے یہ زمین تقسیم کی لیکن قرعہ اندازی سے کام نہیں لیا گیا، شرکاء میں سے بعض نے اپنے حصہ کی زمین آباد کر لی ہے اور بعض کی زمین تاحال غیر آباد پڑی ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا قرعہ اندازی کے بغیر یہ تقسیم جائز ہے یا دوبارہ تقسیم کی جائے گی؟

الجواب: تقسیم کرنے کے لیے قرعہ اندازی صرف ایک اصلح صورت ہے شرط کے درجہ میں نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر قوم نے اپنے سرکردہ افراد کو باقاعدہ تقسیم کرنے کی اجازت دی ہو تو یہ تقسیم نافذ ہے، ہر ایک حصہ دار کو اپنے اپنے حصہ پر قائم رہ کر دوبارہ تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: والقرعة لتطییب القلوب وازاحة تھمة المیل

---

[1] قال العلامة قاضیخانؒ: وذکر الخصاف اذا کان فی الورثة صغیر او غائب لم یکن فی ید الغائب ولا فی ید الصغیر شیئ من الترکة بل کان الکل فی ید الحضور الکبار فطلبوا القسمة من القاضی فان القاضی یجعل للصغیر وصیا یقوم بالقسمة ویقبض حقه ویجعل للغائب وکیلا ویأمرھم بالقسمة۔ (الفتاویٰ قاضیخان علیٰ ھامش الھندیة ج۳ ص۱۵۶ فصل فی قسمة الوصی والاب)

حتی لو عین لکل منهم نصیباً من غیر اقتراع جاز لانه فی معنی القضاء فیملك الالزام۔ (الهداية ج۴ ص۴۱۶ کتاب القسمة۔ فصل فی کیفیة القسمة)[1]

غبن کی صورت میں تقسیم جائیداد کے اعادہ کا حکم

سوال:۔ چند شرکاء کے درمیان ایک مشترکہ جائیداد تقسیم ہوئی، ہر ایک شریک اپنے اپنے حصہ میں مدت دراز تک مالکانہ تصرفات کرتا رہا، اب شرکاء اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ تقسیم کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے شرکاء کے زیرِ قبضہ جائیداد میں تفاوت ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں جب ایک دفعہ شرکاء کی باہمی رضامندی سے تقسیم ہونے کے بعد جب ہر ایک نے اپنے اپنے حصہ میں مالکانہ تصرفات کرنے شروع کیے تو اب معمولی شبہات کی وجہ سے سابقہ تقسیم کو توڑ کر دوبارہ تقسیم کرنا بے سود عمل ہے، تاہم اگر غبن فاحش ہو تو شرکاء کے مطالبہ پر سابقہ تقسیم کالعدم قرار دے کر دوبارہ تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: ولو ظهر غبن فاحش فی القسمة بطلت ولو وقعت بالتراضی فی الاصح۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۱۸۷ کتاب القسمة)[2]

غلطی کی صورت میں تقسیم کا اعادہ

سوال:۔ ایک مشترکہ جائیداد تقسیم کر کے مالکان اس پر تصرف کرتے رہے، بعد میں

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله تطییب القلوب) اشار الی ان القرعة غیر واجبة حتی ان القاضی لو عین لکل واحد نصیباً من غیر اقراع جاز لانه فی معنی القضاء فیملك الالزام۔ (رد المحتار ج۵ ص۱۸۲ کتاب القسمة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۲ کتاب القسمة۔

[2] وقال العلامة المرغینانیؒ: ولو اختلفا فی التقویم لم یلتفت الیه لانه دعوی الغبن ولا معتبر به فی البیع فکذا فی القسمة لوجود التراضی الا اذا کانت القسمة بقضاء القاضی والغبن فاحش لان تصرفه مقید بالعدل۔ (الهداية ج۴ ص۴۲۰ کتاب القسمة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۶ کتاب القسمة۔

معلوم ہوا کہ تقسیم میں غلطی ہوئی ہے، کیا اس غلطی کے ازالہ کے لیے دوبارہ تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر تقسیم میں غلطی مبرہن یا مسلّم ہو اور تقسیم توڑنے کے بغیر غلطی کا ازالہ ممکن نہ ہو تو اس کے ازالہ کے لیے تقسیم دوبارہ کی جاسکتی ہے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واما صفات القسمة فانواع منها ان تکون القسمة عادلة غیر جائرة الی ان قال فاذا وقعت جائرة لم یوجد التراضی ولا افراز نصیبه بکماله لبقاء الشرکة فی البعض فلم تجز وتعاد وعلی هذا اذا ظهر الغلط فی القسمة المبادلة بالبینة او بالاقرار تستانف لانه ظهر انه لم یستوف حقه فظهر ان معنی القسمة لم یتحقق بکماله۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۶ فصل فی صفات القسمة۔ کتاب القسمة)[1]

مشترکہ منافع کو تقسیم کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر ایک پلازہ بنایا اور اس کو کرایہ پر دیدیا، اب ہم اس کے کرایہ کو ہر ماہ بقدر حصہ آپس میں تقسیم کریں یا ایک ماہ کا کرایہ میں لے لوں اور دوسرے ماہ کا میرا بھائی لے، ان دونوں میں کون سی صورت جائز ہے؟

الجواب: جس طرح عین مال مشترک ہوتا ہے اسی طرح اس کے منافع بھی مشترک ہوتے ہیں، اس منافع کو بھی بقدر حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ صورتِ مسئولہ میں کرایہ کی تقسیم شرکاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ جس طرح چاہے کرسکتے ہیں، چاہے تو ہر ماہ کا کرایہ برابر تقسیم کرلیں یا ایک ماہ کا کرایہ ایک بھائی وصول کرے اور دوسرے ماہ کا دوسرا بھائی، دونوں طرح درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله کذلک) ای یأخذ هذا شهرا والآخر شهرا او یأخذ هذا غلة هذه والآخر غلة الاخری۔ (ردالمحتار ج ۶ ص ۲۶۹ کتاب القسمة، مطلب فی الرجوع عن القرعة)

---

[1] وفی الهندیة: عن محمد قاسم قسم دار بین رجلین اعطی احدهما اکثر من الآخر غلطا وبنی احدهما فی نصیبه قال محمدؒ یستقبلون القسمة فمن وقع بناءه فی قسم غیره رفع بناءه ولا یرجعان علی القاسم بقیمة البناء ولکنهما یرجعان علیه بالاجر الذی اخذه کذا فی الظهیریة)

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۲۲۸ الباب الحادی عشر فی دعوی الغلط فی القسمة)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۱ کتاب القسمة۔

ایک فریق کی عدم موجودگی میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ دو بھائیوں مسمی محمد حنیف اور محمد صدیق نے کچھ زمین مشترکہ طور پر خریدی جس میں نو ہزار روپے (۹۰۰۰/-) محمد صدیق کے تھے اور تین ہزار روپے محمد حنیف کے تھے، بارہ ہزار روپے (۱۲۰۰۰/-) روپے کی ۲۴ کنال زمین آج سے تقریباً ۳۲ سال پہلے خریدی گئی اور یہ زمین دونوں بھائیوں کے نام انتقال بھی ہو گئی اور کافی عرصہ تک یہ زمین دونوں بھائیوں کے والد صاحب کے تصرف میں رہی، والد صاحب کی وفات کے بعد آج تک ۱۳ سال سے مذکورہ زمین محمد صدیق کے قبضہ اور تصرف میں ہے، انتقالِ زمین کے وقت بڑے بھائی محمد حنیف نے تمام اندراجات محمد صدیق سے پوشیدہ رکھے۔

آج سے ۱۳ سال پہلے جب والد صاحب فوت ہوئے تو وفات کے تیسرے دن بڑے بھائی محمد حنیف نے مذکورہ زمین کی تقسیم کی بات کی جبکہ محمد صدیق نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور کہا کہ والد صاحب کے چالیسویں کے بعد زمین کے تمام معاملات طے کر کے تقسیم کریں گے، اس کے بعد محمد صدیق کی موجودگی میں پانچ دن تک محمد حنیف نے پھر زمین تقسیم کرنے کی بات نہیں کی، تو محمد صدیق کسی کام کے سلسلہ میں پشاور چلا گیا، اس کی غیر موجودگی میں محمد حنیف نے چند اشخاص کو جمع کر کے زمین مذکورہ نصف نصف یعنی بارہ بارہ کنال تقسیم کر دی جبکہ نہ تو مروجہ طریقہ کار اختیار کیا گیا اور نہ ہی اس تقسیم کی کوئی نشاندہی یا حد بندی کی گئی، صرف زبانی معاملہ تھا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن بعد جب محمد صدیق گھر آیا اور اسے اس تقسیم کا علم ہوا تو اس نے اس تقسیم اور طریقہ کار کو فراڈ اور دھوکہ دہی قرار دے کر مسترد کر دیا اور کہا کہ میں نے اس زمین کی خرید میں تین حصے قیمت ادا کی ہے لہٰذا میرا حق تین چوتھائی بنتا ہے اور محمد حنیف نے ایک ربع قیمت ادا کی ہے لہٰذا اس کا حق ایک چوتھائی بنتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

(۱) آیا زمین کی تقسیم فریقین میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں اس کی رضامندی کے بغیر ہو سکتی ہے!

(۲) کیا ایک فریق اپنی مرضی کے چند اشخاص کو جمع کر کے گواہ بنا کر زمین تقسیم کر سکتا ہے؟ جبکہ تحریری اور مروجہ طریقۂ کار کا کوئی ثبوت نہ ہو؟

(۳) محمد صدیق کا دعویٰ اس زمین میں تین چوتھائی کا ہے اور محمد حنیف نصف کا دعویدار ہے تو کیا زمین خریدتے وقت دی گئی رقم کی بنیاد پر اس دعوے کا استحقاق رکھا جا سکتا ہے؟

(۴) کیا اتنا عرصہ گذرنے کے بعد محمد صدیق اپنے دعوے کا استحقاق رکھتا ہے یا نہیں؟ شریعت مقدسہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنونِ احسان فرمائیں۔

الجواب: شراکتی کاروبار ابتداء ہی سے چلا آرہا ہے اور یہ ناگزیر ہے، مگر جملہ شرکاء کے لیے ایک دوسرے کا خیال رکھنا بھی فرض ہے، یہ اس لیے کہ اس مشترکہ مال کے ہر ہر جزء میں سب شریک ہوتے ہیں، کوئی بھی حصہ دار یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کا مال ہے یا اتنا حصہ ہے، جس کی وجہ سے تقسیم کے وقت سب شرکاء کا حاضر ہونا یا سب کی اجازت ہونا شرعاً ضروری ہے، بدون اجازت یا کسی ایک شریک کے غائب ہونے کی صورت میں دیگر شرکاء مشترکہ مال تقسیم نہیں کرسکتے۔

لما فی الهندیة: ولو کانوا مشترین لم یقسم مع غیبة احدهم وان اقاموا البینة علی الشراء حتی یحضر الغائب۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۱۰ الباب الثالث فی بیان ما یقسم ولا یقسم)

اسی طرح شرح المجلۃ میں ہے: قسمة الفضولی موقوفة علی الاجازة قولاً و فعلاً فاذا قسم واحد المال المشترك بنفسه لا تکون القسمة جائزة ولکن اذا اجاز اصحابه قولاً۔ (شرح المجلة لرستم باز ص۶۲۳ الفصل الثانی فی شرائط القسمة)

فتاوی حامدیہ میں مرقوم ہے: اذا قسم الورثة الترکة بینهم بغیر امر القاضی وفی الورثة صغیر او غائب او شریك للمیت لا تصح الا باجازة الغائب او ولی الصغیر او اجازة الصبی بعد البلوغ۔ (بحوالہ شرح المجلۃ لرستم باز ص۶۲۲ الفصل الثانی فی شرائط القسمة)

صاحب درر الحکام نے بھی اس قسم کی تقسیم کو لاتجوز القسمة ولا تنفذ کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ اس قسم کی تقسیم ناجائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو تقسیم ہوچکی ہے وہ کالعدم ہے اور نافذ العمل نہیں ہے۔

جو اشیاء مشترکہ طور پر خریدی جائیں اور ابتداءً کسی قسم کا معاہدہ نصف یا ثلث وغیرہ کا نہ ہوا ہو مگر رأس المال کی ادائیگی کے وقت ایک شریک کے حصہ کی رقم زیادہ ہو اور دوسرے شریک کے حصہ کی رقم کم ہو تو پھر اس شے میں حصہ داری رأس المال کے اعتبار سے ہوگی، جس کی رقم زیادہ ہو تو وہ زیادہ حصے کا حقدار ہوگا۔ اس لیے کہ اگرچہ زبان وقال سے انہوں نے حصہ داری کا تعین نہیں کیا مگر زبانِ حال اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے رقم کی وجہ سے حصہ داری مقرر کی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محمد صدیق کا رأس المال ۹۰۰۰ روپے ہے

جو کل رأس المال کا تین چوتھائی ہے اس لیے محمد صدیق تین چوتھائی کا حقدار ہے اور محمد حنیف کا ایک چوتھائی رأس المال ہے اس لیے اس کا حصہ زمین بھی ایک چوتھائی ہے، اگرچہ مطلقاً شراکت تنصیف کی صورت اختیار کرتی ہے۔

نظیرہ فی درر الحکام: اذا اختلط دینار احد بدینارین لآخر من جنسہ بصورۃ لاتقبل التمییز ثم ضاع اثنان منہما فیکون الدینار الباقی بینہما مشترکاً اثلاثاً ثلثاہ لصاحب الدینارین وثلثہ لصاحب الدینار۔

(درر الحکام ج۳ ص۱۷ المادۃ ۱۰۶۱ الباب الاول فی بیان شرکۃ الملک)

کسی کے حق کے اسقاط میں طویل زمانے کا گذر جانا اسے متاثر نہیں کرتی بلکہ حق کسی صورت میں اور عرصہ دراز کے بعد بھی ساقط نہیں ہوتا لہٰذا محمد صدیق کا دعویٰ استحقاق اتنی مدت کے بعد بھی برقرار ہے اور اس کو دعویداری کا حق حاصل ہے۔

لما فی شرح المجلۃ: لایسقط الحق بتقادم الزمان۔ (شرح المجلۃ لرستم باز ص ۔ المادۃ ۱۶۷۴)

(ھٰذا ما ظھرلی واللہ اعلم)

مشترکہ اراضی کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ ہماری کچھ مشترکہ زمین ہے، اب اس کی تقسیم کا مسئلہ ہے کیونکہ یہ زمین فروع پر تقسیم کرنا ہے جبکہ فروع میں بہت اختلاف ہے اس لیے آسانی کے ساتھ ان پر تقسیم صحیح طریقے سے نہیں ہو سکتی، لہٰذا شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس زمین کی تقسیم کا طریقہ مطلوب ہے؟

الجواب:۔ میرے نزدیک یہ مشترکہ اراضی اصل مالکان پر ارث کے قاعدے کے مطابق تقسیم کی جانی چاہیئے اور پھر ان اصل مالکان سے ان کے فروع کو میراث کے ضابطہ کے مطابق منتقل کی جائے گی اگرچہ فروع کثرت وقلت میں مختلف کیوں نہ ہو۔

* * *

کتاب الاکراہ

(مجبوری کے احکام ومسائل)

حکومت کا رعایا کی کسی چیز پر جبراً قبضہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے آج سے پانچ سال قبل دس کنال زمین ایک لاکھ روپے کی بیع قطعی سے خریدی جس کا ثبوت حکومت کے متعلقہ دفتر میں موجود ہے، موصوف نے مذکورہ زمین پر پولٹری فارم کھولا، بعد میں حکومت نے مذکورہ زمین دس ہزار روپے کے عوض لینا چاہی لیکن مالکِ زمین نے انکار کردیا، حکومت نے جبراً اس کی زمین پر قبضہ کرلیا، توکیا حکومت کا اس طرح کسی کی ذاتی زمین پر قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر حکومت کا یہ قبضہ کسی معاہدہ کے تحت نہ ہو تو حکومت کا اس طرح کرنا اکراہ کے حکم میں ہے اسلئے یہ بیع المکرہ ہے نافذ نہیں لہٰذا زوالِ اکراہ کے وقت خود مالکِ زمین یا اس کے ورثاء زمین کو واپس لے سکتے ہیں، تاہم جہاں کہیں حکومت اپنے کسی قرض کی وصولی کے لیے ایسا اقدام کرے تو اس میں اکراہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: امر السلطان اکراه وان لم یتوعده وامر غیره لا الا ان یعلم المامور بدلالة الحال انه لو لم یمتثل امره یقتله او یقطع یده او یضربه ضربا یخاف علی نفسه او تلف عضوه۔

(رد المحتار ج۶ ص۱۳۲ مطلب بیع المکره فاسد وزوائده مضمونة بالتعدی)[1]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: لا یعتبر البیع الذی وقع بالاکراه المعتبر ولا الشراء ولا الایجار ولا الهبة ولا الفراغ ولا الصلح عن مال والاقرار والابراء وتاجیل الدین واسقاط الشفعة ملجئا کان الاکراه او غیر ملجئ۔ (شرح مجلة الاحکام، مادة ۱۰۰۶ ص۵۵۹ الباب الثانی فی بیان المسائل التی یتعلق بالاکراه)

ومثله فی الهدایة ج۳ ص۱۱۳ کتاب الکفالة۔

جبراً نکاح کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لے جائے اور پھر بزورِ شمشیر اس کے ساتھ نکاح کرلے اور وہ لڑکی جان جانے کے خوف سے مجبوراً اس کو قبول کرے، تو کیا شرعاً یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اس قبول کرنے میں عورت کے اختیار کا بھی کچھ دخل ہے اسلئے یہ نکاح صحیح ہے اور یہ عورت مکرہ کی بیوی شمار ہوگی، اگرچہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں۔

لما فی الہندیۃ: المرأۃ اذا اکرہت علی النکاح ففعلت صح النکاح۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص ۵۳ کتاب الاکراہ۔ الباب الرابع فی المتفرقات)[1]

جبراً زنا میں عورت گنہگار نہ ہوگی

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی عورت کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر جبراً اس سے زنا کرے اور وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہو اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہو جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوئی ہو تو کیا یہ عورت گنہگار ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت باوجود کوشش کے اپنی جان نہ بچا سکی اور نہ اس نے زانی کو تمکین (جگہ) دی ہو لیکن پھر بھی جبراً اس کے ساتھ زنا کیا گیا تو یہ عورت گنہگار نہ ہوگی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ واما المرأۃ ہل تأثم ذکر شیخ الاسلام ان اکرہت علی ان تمکن من نفسہا فمکنت تأثم وان لم تمکن وزنی بہا فلا وہذا لو بملجئ والا فعلیہ الحد بلا خلاف لا علیہا ولکنہا تأثم۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۷ کتاب الاکراہ)[2]

---

[1] لما قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو اکرہ علی عقد من العقود ان کان عقداً لا یبطلہ الہزل کالنکاح والطلاق والعتاق جاز العقد۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۲۰۶ کتاب الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۷۲ کتاب الاکراہ۔

[2] لما فی الہندیۃ: اما المرأۃ اذا کانت مکرہۃ علی الزنا ہل تأثم ذکر شیخ الاسلام فی شرحہ فی باب الاکراہ علی الزنا انہا ان اکرہت علی ان تمکن من نفسہا فمکنت فانہا تأثم وان لم تمکن ہی من الزنا وزنی بہا لا اثم علیہا وذکر ایضاً فی الاکراہ اذا اکرہت علی الزنا فمکنت من نفسہا فلا اثم علیہا وہذا کلہ اذا کان الاکراہ بوعید تلف۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص ۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)

اکراہ کی صورت میں کلمۂ کفر کہنا

سوال:۔ اگر کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ اپنی جان جانے کے خوف سے کلمۂ کفر زبان سے نکال دے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو کیا ایسا آدمی کافر شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں زبان سے کلمۂ کفر کہنے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا بشرطیکہ دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، البتہ اگر ایسا شخص کلمۂ کفر کہنے سے انکار کردے اور قتل کر دیا جائے تو شہادت کا درجہ پائے گا۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: وان اكره على الكفر بالله تعالى او سب النبي صلى الله عليه وسلم بقطع او قتل اخص له ان يظهر ما امر به على لسانه وقلبه مطمئن بالايمان ...... ويوجر لو صبر لتركه الاجراء المحرم۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۴، ۱۳۵ کتاب الاکراہ)[1]

حالتِ جبر میں زنا کا حکم

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! آجکل معاشرے کے حالات اخلاقی طور پر انتہائی ناگفتہ بہ ہیں، عیاشی، فحاشی اور بے حیائی عروج پر ہے۔ اگر کسی شخص کو زنا کرنے پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان کو یقینی خطرہ ہو تو کیا اس کو بصورتِ مجبوری زنا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زنا کی حرمت شرعاً وعقلاً دونوں طرح ثابت ہے، کسی بھی صورت میں اس کی حرمت ساقط نہیں ہوتی اگرچہ کرنے والے کی جان کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے بنا بر صورتِ مسئولہ ایسے شخص کے لیے زنا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں اور اگر وہ اس کا ارتکاب کر جائے تو عند اللہ مجرم ہوگا۔

لما قال الشيخ وهبة الزحيلي: وكذلك الزنا فانه لا يرخص ولا يباح للرجل

---

[1] لما قال العلامة الشيخ وهبة الزحيلي: التصرف الحسي المرخص بالاكراه هو كاجراء كلمة الكفر على اللسان مع اطمينان القلب بالايمان او سَبّ النبي صلى الله عليه وسلم او الصلاة الى الصليب او اتلاف مال المسلم فهذه الامور لا تباح ولكن يرخص فعلها عند الاكراه التام وان امتنع المستكره عن فعلها حتى قتل كان مثابا ثواب الجهاد۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۵ ص۳۹۲ البحث الثالث اثر الاكراه في التصرفات) ومثله في الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۸ الباب الثاني فيما يحل للمكره۔

بالاکراہ مطلقاً ولو فعل اثم لان حرمۃ الزنا ثابتۃ عقلاً قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیْلًا۔ وکذا المرأۃ لا یرخص لہا ایضاً عند الاکراہ ولو کان تاماً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث اثر الاکراہ)[1]

کسی مسلمان کو حالتِ جبر میں قتل کرنا

سوال:۔ اگر کسی مسلمان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ فلاں آدمی کو قتل کر دے نہیں تو تجھے قتل کر دیا جائے گا، اب اگر یہ شخص اپنی جان بچانے کی غرض سے کسی کو قتل کر دے تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اکراہ اور جبر کی صورت میں اگرچہ بعض افعال مباح یا مرخص ہو جاتے ہیں مگر کسی مسلمان کو ناحق قتل اس حکم کے تحت داخل نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ایسے مجبور شخص کیلئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی موت کے خوف سے کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کر دے، اور اگر وہ اس فعل کا ارتکاب کر جائے تو عند اللہ گنہگار ہوگا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: التصرف الحسی الحرام الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ ھو قتل المسلم بغیر حق او قطع عضو من اعضائہ ولو نملۃ لان القتل حرام محض، قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث، اثر الاکراہ)[2]

جبراً شراب پینے پر حد نہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص کو زبردستی یعنی مجبور کر کے شراب پلا دی جائے اور حکومت اسے گرفتار کر لے تو کیا شرعاً اس شخص پر حد نافذ ہوگی؟ یعنی اسے سزا دی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اکراہ کی صورت میں جب کسی شخص کو شراب پلا دی جائے اور حکومت اُسے

---

[1] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو اکرہ علی الزنا لا یرخص لہٗ لان فیہ قتل النفس بضیاعھا لکنہ لا یحد استحساناً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ)

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: النوع الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ اصلاً فھو قتل المسلم بغیر حق سواء کان الاکراہ ناقصاً او تاماً لان قتل المسلم بغیر حق لا یحتمل الاباحۃ بحال۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۷۷ کتاب الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۵ کتاب الاکراہ۔

گرفتار کرے تو شرعاً اس سے حد ساقط ہوگی۔

قال العلامة الکاسانیؒ: الحکم الذی یرجع الی الدنیا فی الانواع الثلاثة اما النوع الاول فالمکرہ علی الشرب لایجب علیه الحد اذا کان الاکراہ تاماً لان الحد زاجرًا عن المستقبل۔ (بدائع الصنائع جلد ۷ ص۱۷۸ کتاب الاکراہ)[1]

جبراً زنا کی صورت میں حد کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے جبراً زنا کا ارتکاب کرایا جائے اور حکومت اسے گرفتار کرلے تو کیا شرعاً اس پر حد نافذ ہوگی یا نہیں؟ اگر بالفرض یہ عورت ہو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں بھی زنا کرنا حرام ہے اور اس کی شرعاً اجازت نہیں، تاہم اگر اکراہ کی صورت تام ہو یعنی یقیناً اس میں جان جانے کا خطرہ ہو تو ارتکاب کی صورت میں بنا بر قولِ مفتی بہ حد نافذ نہیں ہوگی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اگرچہ بعض ائمہ کرامؒ کے ہاں مرد پر حد جاری ہوگی۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی: فاذا اکرهت المرأة علی الزنا فلا یقام علیها الحد عند جمهور الفقهاء سواءً کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً..... فاذا اکرہ الرجل علی الزنا..... قال الصاحبان: لایجب الحد حالة الاکراہ التام سواءً کان الاکراہ من السلطان ام من غیرہ ورأیهما هو الراجح عند الحنفیة وهو رأی ابی حنیفة اخیرًا۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۵ ص۴۰۲ المبحث الثالث، النوع الثالث)[2]

---

[1] لما قال الشیخ وهبة الزحیلی: الاکراہ علی شرب الخمر اذا کان الاکراہ تاماً فلا یجب الحد علی المستکرہ علی شرب الخمر اتفاقاً لان الحد شرع زاجرًا من الجنایة فی المستقبل والشرب المکرہ علیه لیس جنایة بل هو مباح۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج ۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۱۳۳ کتاب الاکراہ۔

[2] لما فی الهندیة: اذا اکرہ الرجل علی الزنا بامرأة فزنی بها کان ابوحنیفة اولاً یقول یجب علیه الحد ثم رجع وقال لاحد علیه وهو قولهما..... واما المرأة فلاحد علیها ولکنها تأثم۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ۔

مجبورِ مزنیہ پر حدِ زنا کا حکم

سوال :- اگر کسی عورت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر وہ زنا نہ کرائے گی تو اُسے اور اس کے مال کو ہلاک کر دیا جائے گا اور وہ اپنی جان اور مال کی ہلاکت کے خوف سے زنا جیسے قبیح عمل کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے تو کیا اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :- اکراہ اور جبر چاہے تام ہو یا ناقص دونوں عورت کے حق میں برابر ہیں ، اگر وہ جبر کی کسی بھی صورت میں زنا کا ارتکاب کر جائے تو شبہ کی وجہ سے حدِ زنا اس سے ساقط ہو جائے گی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واما فی حق المرأة فلا فرق بین الاکراہ التام والناقص ویدرأ بالحد عنها فی نوعی الاکراہ لانه لم یوجد منها فعل الزنا بل الموجود هو التمکین وقد خرج من ان یکون دلیل الرضا بالاکراہ فیدرأ عنها الحد۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۸۱ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً ہلاک شدہ مال کے ضمان کا حکم

سوال :- جنابِ مفتی صاحب! اگر مجبوری کی حالت (اکراہ) میں کسی کا مال ہلاک کر دیا جائے تو اُس مال کے تاوان کا ضامن کون ہوگا؟ کیا جبر و اکراہ کرنے والا اُس مال کا ضمان دے گا یا ہلاک کرنے والا ضامن ہوگا؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں چونکہ اکراہ کی نوعیت بیان نہیں کی گئی ہے اسلئے دونوں صورتوں کا جواب دیا جاتا ہے:

(۱) اگر اکراہ تام ہو یعنی ہلاک کرنے والے کی جان یا اس کے کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ضمان مجبور کرنے والے کے ذمے ہوگا اس لیے کہ مال کو ہلاک کرنے والا آلہ کے مانند ہے۔

(۲) اگر اکراہ ناقص ہو یعنی اس میں جان یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ وخوف نہ ہو تو

---

[1] لما قال العلامة وهبة الزحیلی : فاذا اکرهت المرأة علی الزنا فلا یقام علیها الحد عند جمهور الفقهاء سواء اُکان الاکراہ تاماً ام ناقصاً۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج ۵ ص ۴۰۲ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص ۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی۔

ضمان ہلاک کرنے والے کے ذمے ہوگا۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: المکرہ علی اتلاف مال الغیر اذا اتلفہ یجب الضمان علی المکرہ دون المکرہ اذا کان الاکراہ تاماً لان المتلف هو المکرہ من حیث المعنی وانما المکرہ بمنزلۃ الآلۃ علی معنی انہ مسلوب الاختیار...... وان کان الاکراہ ناقصا فالضمان علی المکرہ لان الاکراہ الناقص لا یجعل المکرہ آلۃ المکرہ لانہ لا یسلب الاختیار اصلاً فکان الاتلاف من المکرہ فکان الضمان علیہ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۷۹ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً کھلائے گئے مال کے ضمان کا حکم

سوال:- اگر کسی شخص کو اس بات پر مجبور کردیا جائے کہ وہ فلاں شخص کا مال (مرغی، بکری وغیرہ) کھا جائے ورنہ اس کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا اس مجبوری کے تحت اس نے دوسرے کا مال بغیر اس کی اجازت کے کھا لیا کیونکہ نہ کھانے کی صورت میں جانی نقصان کا قوی امکان تھا۔ اب جس آدمی کا مال جبراً کھایا گیا ہے وہ کھانے والے سے اپنے مال کے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً مالکِ مال اس شخص سے تاوان وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ یا وہ جبر کرنے والے سے مطالبہ کرے؟

الجواب:- اگرچہ جبر کی صورت میں مجبور شخص آلہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر کسی کا مال کھانے کی صورت میں اس شخص کا اپنا فعل بھی پایا جاتا ہے اس لیے اُس مال کا ضمان کھانے والے کے ذمے واجب الاداء ہے اور مالکِ مال اسی سے تاوان کا مطالبہ کرے گا۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: کذلك لو اکرہ علی ان یاکل مال غیرہ فالضمان علیہ لان هذا النوع من الفعل وهو الاکل مما لا یحمل علیہ الاکراہ

---

[1] لما قال الشیخ وهبۃ الزحیلی: فان کان الاکراہ تاماً فالضمان علی المکرہ عند الحنفیۃ والحنابلۃ فی الارجح عندهم وبعض الشافعیۃ لان المستکرہ مسلوب الارادۃ وما هو الا آلۃ للمکرہ ولا ضمان علی الآلۃ اتفاقاً...... وان کان الاکراہ ناقصاً فالضمان علی المستکرہ عند الحنفیۃ والمالکیۃ الخ

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۸ کتاب الاکراہ۔ المبحث الثالث)

لانہ لا یتصور تحصیلہ بآلۃ غیرہ فکان طائعاً علیہ فکان الضمان علیہ۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۷۱ کتاب الاکراہ)[1]

مجبور مفعول پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مہتمم صاحب جامعہ حقانیہ الحمد للہ آنجناب کی دعاؤں اور مساعی سے افغانستان میں امارتِ اسلامی قائم ہے اور شرعی قوانین کا اجراء بھی ہو چکا ہے، اب ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ اگر کسی کے ساتھ جبراً (یعنی اسلحہ کی نوک پر) لواطت کی جائے اور وہ دونوں اس قبیح فعل کے کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو کیا حد دونوں پر جاری ہوگی یا صرف فاعل کو سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق مفعول چونکہ مجبورِ محض ہے اور اس کے ساتھ یہ قبیح عمل جبراً (اسلحہ دکھا کر) کیا گیا ہے اس لیے سزا صرف فاعل کو دی جائے گی مفعول اس سے مستثنیٰ ہوگا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ظاہر تعلیلہم أنّ حکم اللواطۃ کحکم المرأۃ لعدم الولد فترخص بالملجی الا ان یفرق بکونہا اشد حرمۃ من الزنا لانہا لم تبح بطریق ما ولکون قبحہا عقلیا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ)[2]

---

[1] قال العلامۃ شیخ زادہ المشہور بدامادا فندی رحمہ اللہ: وان اکرہ علی اتلاف مال مسلم لاحدہما ای بالقتل او القطع رخص الاتلاف ای للمکرہ لان الاتلاف مال الغیر یستباح للضرورۃ کما فی المخمصۃ وقد ثبت والضمان علی المکرہ بالکسر لان المکرہ فی حق الاتلاف آلۃ للمکرہ فلم یلزم علیہ الضمان وفیہ اشارۃ الی الاحتراز عن الاکل والتکلم والوطء فانہ فیہا لا یصلح آلۃ۔
(مجمع الانہر ج ۴ ص۴۴ کتاب الاکراہ)

[2] قال العلامۃ محمد بن علی بن محمد الحصنی رحمہ اللہ، وعلی ہذا ظاہر تعلیلہم ان حکم اللواطۃ کحکم المرأۃ لعدم الولد فترخص بالملجئ الا ان یفرق بکونہا اشد حرمۃ من الزنا لقبحہا عقلاً ایضاً۔
(الدر المنتقی فی ذیل مجمع الانہر ج ۴ ص۴۹ کتاب الاکراہ)